احمد ندیم قاسمی کی نثر نگاری کا تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردُو)

ریگولر پروگرام

سیشن ۲۰۰۵ء ——— ۲۰۱۱ء

مقالہ نگار

سبینہ اویس

متعلمہ شعبہ اُردُو

اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

نگران

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

پروفیسر شعبۂ اردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

۲۰۱۱ء

B/1650/...
21-12-11

...R/788/Dean
O.C.
21/12/2011

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ سبینہ اویس ولد ملک اویس احمد نے ریگولر پروگرام کے تحت پی ایچ۔ڈی اُردو کی سند کے لیے ''احمد ندیم قاسمی کی نثر نگاری کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر میری نگرانی میں تحقیقی مقالہ قلم بند کیا ہے۔ ان کا تعلیمی دورانیہ (۲۰۰۵ء ۔ ۲۰۱۰ء) ہے۔ مقالے کے نگران کی حیثیت سے میں نے اس مقالے کو بغور پڑھا ہے اس لیے تصدیق کرتا ہوں کہ مقالہ نگار نے اسے نقل اور سرقے سے محفوظ رکھا ہے اور اصلی تحقیق کے ذریعے سے عمدہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

پروفیسر شعبۂ اُردو

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

(نگران مقالہ)

پروفیسر شعبہ اردو
اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور

صدرِ شعبہ اُردو

Hanis Rashid
21-12-2011
ڈین کلیہ علومِ شرقیہ

Dean
Faculty of Oriental Learning
University of the Punjab
Lahore.

فہرست ابواب

پیش گفتار

احمد ندیم قاسمی کا شمار اردو ادب کے جلیل القدر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ پون صدی تک ادب کی گراں قدر خدمات میں منہمک رہے۔ ادب کے مارکسی و سماجی محرکات پر گہری نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ فن پارے کے فنی و جمالیاتی پہلو کی بھی تحسین کرتے۔ ادب کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے والے ادیب تھے۔ انھوں نے ادب کی جس صنف پر قلم اُٹھایا اُس پر اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑی۔ اردو ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ شاعری، افسانہ، کالم، تنقید، خاکے، مضامین، مکتوبات، تراجم، بچوں کا ادب، فلیپ، دیباچہ غرض:

ع ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

کے مصداق تھے۔ جوں جوں ان کی شعری و نثری تخلیقات نگاہوں سے گزرتی ہیں، ان کی ادبی وفن کارانہ عظمت کا نقش پختہ ہو جاتا ہے۔ ادب کی جس صنف کی جانب گامزن ہوئے، اپنی علمیت و انفرادیت سے اہلِ ادب کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کرتے رہے۔ اُنھوں نے عمدہ قوتِ متخیلہ کے ساتھ ساتھ فکر و استدلال کی نئی راہیں بھی ہموار کیں۔ ترقی پسند تحریک سے ذہنی طور پر گہری وابستگی بھی رہی لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود پچھتر برس تک ان کے قلم کی روشنائی خشک نہ ہوئی اور علم و ادب کی آبیاری میں مصروفِ عمل رہے۔ اسی علت کے تحت میں نے اُن کے تحریر کردہ ادب سے نئے شگوفوں اور کلیوں کی خوش بوؤں کو محسوس کیا اور اپنے مقالے کا موضوع ''احمد ندیم قاسمی کی نثر نگاری کا تنقیدی جائزہ'' کا انتخاب کیا۔

زیرِ نظر مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں قاسمی کی سوانح و سیرت کے ساتھ ساتھ ان کی تمام نثری تحریروں پر تحقیق و تنقید کو تناسب و توازن سے پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی متفرق نثری اصناف میں قاسمی کی خامہ فرسائی، اثرات، اضافے، انفرادیت اور مقام و مرتبہ کو حتی الوسع منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل مختلف ابواب میں مل سکے گی۔

پیش نظر مقالے کا پہلا باب دو حصوں ''سوانح اور سیرت'' میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں قاسمی کے آباؤاجداد کا مختصر تذکرہ ہے۔ بعدازاں والدین کے حالات و واقعات، قاسمی کی ولادت، بچپن کے شب و روز، تعلیم، ملازمت، شادی، علمی و ادبی سرگرمیوں، اعزازات غرض تمام سوانحی حالات پر مشتمل اہم تفصیلات کو یکجا کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں قاسمی کے شمائل، عادات و مزاج، تعلیم سے وابستگی، حلقہ احباب، ادب سے لگاؤ، سیرت کی مختلف جہتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ ان کی سیرت کے خدوخال کو نمایاں کرنے کے لیے قاسمی کے اعزہ و اقربا، دوستوں اور دیگر اہلِ قلم کی آرا بھی پیش کی گئی ہیں جن کے تناظر میں ان کی مکمل شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ باب قاسمی کی شخصیت کے کئی ایک پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہوا اہم گوشوں پر محیط ہے۔

دوسرا باب قاسمی کی نثری نگارشات کے جائزے اور دیگر ناگزیر معلومات پر محیط ہے۔ اس باب میں قاسمی کی تخلیقات اور مرتبہ کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں آنے والے ابواب کے لیے تمہیدی و تعارفی فضا پیدا کی گئی ہے۔

مقالے کا تیسرا باب قاسمی کی ''افسانہ نگاری'' پر مشتمل ہے۔ تخلیقِ فن کے لیے فن کار کو بہت سے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ فن کار کا ایک دوربیں نگاہ اور حساس ذہن کا مالک ہونے کی بنا پر ہر حادثے و واقعہ سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔ قاسمی بھی ایک باشعور فن کار تھے۔ اُن کا ذہن غور و فکر کے در وا کرتا ہے۔ جب مواد پک کر تیار ہو جاتا ہے تو وہ تیار مواد تخلیقی صورت اختیار کر کے افسانہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ان کے متجسس ذہن کو قرار مل جاتا ہے۔ قاسمی نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور معاشرے میں موجود انتشار، استحصال، ظلم و جبر اور دیگر مسائل و معاملات کا باریک بینی سے تجزیہ کر کے افسانوی رنگ میں پیش کیا۔ یہ باب جہاں قاسمی کے ذہن کی گرہیں کھولتا ہے۔ وہیں ان کے افسانوں کی تکنیک اور فنی خصائص و نقائص پر بھی سیر حاصل بحث کرتا ہے۔

اس مقالے کا چوتھا باب قاسمی کی ''کالم نگاری'' پر مشتمل ہے جس میں ان کے فکاہیہ، نیم فکاہیہ اور سنجیدہ کالموں کو شامل کیا گیا ہے۔

پیش نظر مقالے کا باب پنجم قاسمی کے ''تنقیدی نظریات و تصورات'' پر مشتمل ہے۔ قاسمی ترقی پسند نقطہ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی و جدید ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ادبی تنقید کے اصول و نظریات سے بحث کی اور ادبی مطالعے کے لیے ان کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا۔ ان کے خیال میں عام قاری کی داخلی کیفیات کے ساتھ خارجی عوامل سے آگہی بھی ضروری ہے تاکہ ادب کا جامع انداز میں مطالعہ کیا جا سکے۔

مقالے کا چھٹا باب قاسمی کی ''خاکہ نگاری'' پر مشتمل ہے۔ یہ باب جہاں ادبی و غیر ادبی، سیاسی شخصیات کے سوانحی حالات و واقعات کے اہم بیانات پر مشتمل ہے، وہیں ادبی شخصیات کی نجی زندگی کے گم نام گوشوں کو بے نقاب کرتا ہوا ان کے فکر و فن کا تجزیاتی جائزہ بھی پیش کرتا ہے۔

ساتویں باب میں قاسمی کی دیگر نثری خدمات مثلاً دیباچے، ناول، ناولٹ، ترتیب و تدوین، تبصروں، خطوط، بچوں کا ادب، پنجابی ادب، فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ترجمہ نگاری، طنز و مزاح اور تنقیدی مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان نثری اصناف کا گراں قدر سرمایہ مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتا رہا۔ میں نے ان مضامین سے جابجا استفادہ کیا۔ پیش نظر باب میں قاسمی کی دیدہ ریزی اور کاوشِ فکر سے نقد و نظر کے کئی زاویے سامنے آتے ہیں۔

پیش نظر مقالے کا آخری باب محاکمہ ہے جس میں قاسمی کی سوانح و سیرت اور علمی و فنی نظریات اکائی کی

مانند یک جا ہو گئے ہیں۔ مجموعی جائزے پر مشتمل اس باب میں قاسمی کے مقام و مرتبہ اور ادبی قدر و منزلت کا تعین کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں کتابیات بھی درج ہیں، کتب و رسائل، اخبارات اور دیگر ماخذات کو کتابیات کے ضمن میں ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ ہذا کی تشکیل و تکمیل میں اگرچہ محنت سے کام لیا گیا ہے، اس کے باوجود تحقیق و تنقید کی دنیا میں نت نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں اور یہ عمل جاری و ساری رہتا ہے جس میں اصلاح و اضافے کی بہر حال گنجائش باقی رہتی ہے۔ خطا کار سے خطا نہ ہو یہ کیوں کر ممکن ہے لہٰذا پیش نظر مقالے میں بھی اس سے انکار ممکن نہیں۔

آج جب طویل مسافرت کے بعد اپنی منزل کے قریب پہنچ رہی ہوں تو کئی اشخاص کا شکریہ واجب ہے۔ اس سلسلہ میں، مَیں اپنے محترم اُستاد و نگرانِ مقالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم ملک کی بے حد ممنون ہوں جن کی بھرپور شفقت اور مخلصانہ رہنمائی، مسافتوں کے کٹھن گردِ سفر میں تازہ حوصلوں اور ہمتوں سے نوازتی رہی۔ اگر ان کی خصوصی توجہ اور پیہم حوصلہ افزائی اس تحقیق کے سنگ ہائے گراں میں زادِ راہ نہ بنتی تو یہ سفر احسن طریقے سے طے نہ ہو پاتا۔ میں ان کی رہنمائی اور شفقت پر صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

میں صدرِ شعبہ اردو ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری صاحب کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے مفید مشوروں اور مخلصانہ توجہ سے مقالے کے معیار کو بہتر بنانے میں رہنمائی فرمائی۔ اپنی مشکلات کے حل کے لیے جب بھی ان کے پاس گئی مایوس و نامراد نہیں لوٹایا۔ میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کی ممنون ہوں جنہوں نے مقالے سے متعلق بعض مفید معلومات فراہم کیں۔ اس کرم فرمائی کے لیے میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور شعبہ اُردو کے تمام اساتذہ کرام کی ممنون ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق، تنقیدی آرا سے نوازا وہیں بعض اہم کتب کے مطالعے کا مشورہ دیا جن سے مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ میں صائمہ شمس کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مقالہ کے دوران دوستانہ اور بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا جس انداز سے حوصلہ افزائی کی اس کی تلافی محض شکریے سے ممکن نہیں۔ خدا تعالیٰ انھیں دین و دنیا کی بلند تر سطحیں عطا فرمائے۔ راحیلہ بشیر بھی میرے شکریے کی مستحق ہیں۔ منصورہ احمد (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ناہید قاسمی اگرچہ اپنی مصروفیت کی بنا پر کم وقت دے پائیں ان کی بھی ممنون ہوں۔ اپنی نانی اماں، ماموں ملک غلام حسین اعوان (سیشن جج)، مقصود احمد اعوان (ایڈووکیٹ) کی شکر گزار ہوں، بالخصوص بڑے ماموں کی محبتیں اور دعائیں گھنے سائے کی طرح میرے ساتھ رہیں۔ خالہ مسز نسرین زاہد کی دعاؤں اور محبتوں کی شکر گزار ہوں۔ ان کی باغ و بہار شخصیت نے کسی بھی مرحلے پر منتشر نہ ہونے دیا۔

میں اپنے افراد خانہ کی بھی ممنون ہوں جن کی رفاقت و شفقت نے زندگی میں آسانیاں پیدا کیں۔

اپنے بھائیوں عادل، علی اور بہنوں نایاب، ایمان کے بھرپور تعاون کا اعتراف نہ کرنا یقیناً کفرانِ نعمت ہوگا۔ ان کی محبت، خلوص اور توجہ نے کڑے لمحوں میں مجھے سہارا دیا (خدا ان کا حامی و ناصر ہو)۔ اپنے والدین کی عظمت کو سلام کرتی ہوں جن کی دعاؤں اور بھرپور مالی تعاون سے تمام مراحل بخیر وخوبی طے ہوئے۔ اگر ان کی مہربانیاں اور دعائے نیم شبی شاملِ حال نہ ہوتی تو میرے لیے دو قدم چلنا بھی محال تھا۔ آج میں جس مقام پر بھی ہوں ان کے فیضانِ نظر کا نتیجہ ہے۔ بالخصوص اپنی والدہ کی ممنون ہوں ابتدائی تعلیم سے لے کر اب تک ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے غافل نہیں ہوئیں۔ دورانِ تحقیق انھوں نے اپنی ممتا کے اَن مول اور بے مثل جذبوں کا سہارا دیا۔ ان کی دعائیں اور محبتیں میرے دم توڑتے حوصلوں کے لیے آکسیجن سے کم نہ تھیں۔ ان کے پیار، توجہ اور احساس کا کوئی بدل نہیں۔ جس طرح پھل اپنے درخت کی محبت کا قرض نہیں چکا سکتا اسی طرح مجھے اپنی والدہ کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ کی تہی دامنی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔

میں خدائے بزرگ و برتر کی شکرگزار ہوں جس نے اس کام کو از اوّل تا آخر پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا کی۔ میں اللہ تعالیٰ سے دُعاگو ہوں کہ وہ میرے سوچنے، سمجھنے کی صلاحیتوں کو جلا بخشے۔ بے شک وہ وسیع علم کا مالک ہے۔

سبینہ اویس

❁❁❁❁❁

باب اوّل

سوانح و سیرت

سوانح:

صدیوں قبل علما کا ایک گروہ تبلیغ اسلام کے لیے عرب سے روانہ ہوا۔ ہندوستان کے کسی مسلمان تاجدار کے دور میں یہ گروہ ایران اور افغانستان سے ہوتا ہوا ملتان میں منتقل ہوا۔ بادشاہ نے انھیں تبلیغ اسلام کے اہم فریضہ کے لیے منتخب کیا۔ اس گروہ کے افراد شہروں میں، کچھ وسیع میدانی علاقوں میں، کچھ اونچے نیچے ٹیلوں میں آباد ہو گئے۔ جب کہ کچھ افراد کوہستان نمک کی دل پذیر وادی ''سون سکیسر'' میں بھی آن بسے۔ قاسمی کے آباؤ اجداد کا تعلق اسی وادی سے تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بزرگوں سے سنا ہے کہ اسلاف اسلامی ممالک عربیہ سے ایران میں اور پھر افغانستان میں آ کر آباد ہوئے۔ ہندوستان کے کسی مسلمان تاجدار کے دور میں وہ ہرات سے ملتان منتقل ہو گئے۔ یہ حضرات دینی علوم پر حاوی تھے۔ اس لیے انھیں ملتان سے سون سکیسر بھیجا گیا کہ وہ وہاں اسلام کی تبلیغ کریں۔'' [۱]

سنسکرت کے لفظ ''سوہن'' کی تبدیل شدہ صورت ''سون'' ہے جس کا مفہوم ''خوب صورت'' ہے اور ''سکیسر'' ایک جھیل کا نام ہے جس کی وجہ سے ''سوہن وادی'' کا نام ''سون سکیسر'' منتخب ہوا۔ سون سکیسر کے مفہوم کے متعلق محمد سرور اعوان کا نقطہ نظر یہ ہے:

> ''سکیسر مرکب ہے ''سکی'' اور ''سر'' سے۔ سنسکرت میں ''سر'' تالاب سے عبارت ہے اور ''سکی'' سے مراد منی گوتم ہے۔ ایک روایت کے مطابق ''ساکیا'' ایک قوم کا نام ہے اور ''ساکیانی'' کا اطلاق مہاتما بدھ پر بھی ہوتا تھا۔ یوں سکیسر کا لفظ ''ساکیہ سر'' سے ماخوذ ہے جس کے معانی ہیں ساکیہ کا تالاب۔'' [۲]

''سکیسر'' وادی سون کا ایک خوب صورت اور صحت افزا مقام ہے۔ وادی سون کے جغرافیائی حالات کے ضمن میں ''سکیسر'' کے نام کی ایک توجیہہ مسعود مفتی نے ''ٹریول گائیڈ آف پاکستان'' میں یہ پیش کی ہے:

> ''پہلا جز دراصل ''شک'' تھا جس کا معنی ''طوطا'' بتایا جاتا ہے۔ دوسرا جز ایشور تھا جو لسانی تبدیلیوں کے باعث ''ایسر'' بنا اور مرکب ''سکیسر'' بطور اسم مشہور ہوا۔ لفظی معنی ''خدائی طوطا'' بنتا ہے۔ شاید یہ سکیسر پہاڑ کی شبیہ ایک طوطے کے سر کی بنتی ہے اور دونوں طرف پھیلی ہوئی لمبی سرسبز چٹانیں اور پہاڑی پنیر پروں کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔'' [۳]

وادی سون سکیسر ایک قدیم وادی ہے۔ اس وادی کی قدامت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے منو بھائی لکھتے ہیں: ''وادی سون سکیسر پانی سے باہر آنے والی دنیا کی پہلی خشکی ہے۔ یعنی دنیا کی قدیم ترین وادی ہے۔ روئے زمین پر پھیلے سمندر کے اس پہلے اور واحد کنارے کا ثبوت ''کوہستان نمک'' ہے۔۔۔ بتایا جاتا ہے کہ مہابھارت کی جنگ بھی یہاں ہی لڑی گئی تھی۔ یہ وادی بدھ مت کی تہذیب کا مرکز رہی ہے۔'' [۴] اس دور میں کوہستان نمک کی وادی سون میں بدھ مت مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت مقیم تھی۔ اس لیے ان بزرگ علما نے اشاعت دین کے لیے

اسی علاقے کا انتخاب کیا۔ انھوں نے سکیسر جھیل کے شمال مشرقی کنارے پر اسلام آبادؒ* کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا۔ اس کے کھنڈرات کے نشانات دورِ حاضر میں بھی موجود ہیں۔ روز بروز سکیسر کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ پرامن زندگی بسر کر رہے تھے کہ اچانک نادر شاہ کے حملے نے انتشار پیدا کر دیا۔ قتل و غارت سے بچنے کے لیے لوگوں نے آس پاس کے پہاڑی علاقوں اور جنگلوں میں پناہ لی جب کہ ان بزرگوں نے اپنے علاقے کو خیر باد کہا اور شمال مغربی پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ گئے۔ نادر شاہ کی واپسی کے بعد یہ بزرگ اپنی پناہ گاہوں سے نکلے لیکن تب تک اسلام آباد لٹ گیا تھا اور انھوں نے ''اس کے شمال مشرق میں ایک اور پہاڑی پر موجود گاؤں انگہ (آں گاہ) آباد کیا۔'' ۵ انگہ ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ اس تک پہنچنے کا راستہ خاصا پیچیدہ اور کٹھن تھا۔ اس لیے بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ علاقہ تھا۔ اس گاؤں کو آباد کرنے کا مقصد اولیٰ بزرگوں کے نزدیک یہی تھا کہ مستقبل میں اگر کوئی حملہ آور اس جانب متوجہ ہو تو پچھلی پہاڑیوں میں منتقل ہو کر اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چناں چہ یہ بزرگ تبلیغ اسلام میں مشغول رہے اور انھوں نے کاشت کاری کو ذریعہ معاش بنایا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد دُور دراز علاقوں سے لوگ انگہ میں آ کر رہائش پذیر ہوئے۔ ان میں مختلف مذاہب مثلاً بدھ مت، ہندومت، سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد تھے۔ یہ افراد مسلمان علماء کے عادات و اطوار سے بہت متاثر ہوئے۔ ان افراد کا ذریعہ معاش کھیت اُگانا اور کنویں کھودنا تھا۔ ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

> ''انگریزوں کی حکومت سے قبل جب بھی حملہ آوروں کی اس سمت آمد کی اطلاع ملتی۔ سب گاؤں والے پہاڑ کے پیچھے چلے جاتے جب کہ مرد وہیں مورچے سنبھال لیتے اور خطرہ ٹل جانے کے بعد سب واپس گھروں کو پلٹ آتے۔ ملکی حالات بدلے تو یہ لوگ مستقل طور پر گاؤں ہی میں رہنے لگے۔'' ۶

یہ سادہ لوح دیہاتی، شہری سہولتوں سے ناآشنا نہایت پرامن اور مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان گھروں کے سپوتوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں شہری افراد سے رابطے قائم کیے اور اس طرح باہر کی دنیا سے اس پہاڑی علاقے کا تعارف ہوا۔ انگہ میں مقیم بزرگوں نے نیازمند محکوم کی طرح برطانوی سامراج کی بہت خدمت کی۔ ان بزرگوں نے سندوں کے پشتارے جمع کرنے شروع کیے۔ یہ پشتارے ان بزرگوں کی نسل نو کے فارغ التحصیل ہونے کی صورت میں مددگار ثابت ہوئے۔ یہ سندیں قاسمی اور ان کے عزیزوں کے لیے ناگزیر سامان بن گئیں۔ انگہ میں مقیم پیروں کا یہ خاندان کافی خوش حال تھا۔ ان کا مقصد چوں کہ تبلیغ اسلام تھا اس لیے اس خاندان کی شہرت دُور دراز علاقوں تک پہنچی۔ ریاست کشمیر کے جنوبی علاقے نیز سیالکوٹ اور گجرات کے افراد اس خاندان کے مرید ہوئے۔ اس خوش حال خاندان کے ایک فرد نے ۱۸۴۹ء میں خدا سے لو لگا لی۔ اس مرد کا نام ''غلام نبی'' تھا۔ غلام نبی ایک وجیہہ، سرخ و سفید

---

*۱ یہ دورِ حاضر کے اسلام آباد کا ذکر نہیں بلکہ وادی سون سکیسر میں واقع ایک گاؤں کا تذکرہ ہے۔

رنگ کے مالک تھے۔ اپنی خوب صورتی کی بنا پر لوگوں میں ''چن پیر'' (چاند) کے نام سے معروف ہوئے۔ چن پیر دین دار، صوم وصلوۃ کے پابند، خاموش طبع، متحمل مزاج، قانع، متوکل، خدا ترس انسان تھے۔ انھیں دنیاوی محافل، رقص وسرود اور مسائل لہو ولعب سے دل چسپی نہ تھی۔ شعائر مذہبی کی پابندی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ ہر وقت عبادت خداوندی، تسبیح اور تلاوت قرآن پاک میں منہمک رہنا ان کا وطیرۂ حیات تھا۔ چن پیر ریاضت کی افراط کے باعث فنا فی اللہ ہو چکے تھے۔ انھیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ دنیاوی حشمت بھی کوئی چیز ہے۔ کافی عرصہ تک ان کی بزرگی اور عبادت گزاری ضرب المثل رہی۔ درویش منش چن پیر کی یہ حالت قریبی عزیزوں نے دیکھی تو اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گدی پر قابض ہو گئے اور ڈیڑھ روپیہ ماہوار وظیفہ چن پیر کے اہل وعیال کے لیے مقرر کر دیا۔ اس خاندان میں اگر چہ دولت کی فراوانی تھی مگر اس معزز خاندان کے ایک فرد چن پیر کے گھر مفلسی کا راج تھا۔ چن پیر کے اہلِ خانہ اپنے گھرانے کی روایتی وضع داری نبھانے کے لیے اچھا لباس پہنتے لیکن بھوکے سوتے۔ جب کھانا میسر آتا تو جنگلی ساگ دست یاب ہوتا۔ قاسمی کی والدہ غلام بیوی نہایت صابر، شاکر، مہذب اور حوصلہ مند خاتون تھی جن کی آنکھوں اور باتوں سے ممتا کا جذبہ جھلکتا تھا اور گھریلو امور کی انجام دہی مستعدی اور چاق و چوبند ہو کر کرتیں۔ ان کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر عقابی نگاہ تھی۔ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتی۔ ان کی تربیت اور نگہداشت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ بچے وقت پر اسکول جائیں۔ تعلیم کی جانب بھرپور توجہ دیں۔ پڑھ لکھ کر افسر بنیں۔ یہ ممتا کے جذبے سے بھرپور ایک دیوانی ماں کی چاہ تھی۔ اگر چہ محولہ بالا نقطہ نظر اور اپنے فکر وعمل کے اعتبار سے وہ ایک مثالی ماں تھی۔ عسرت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود کبھی شکوہ و شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ شوہر کے حصہ میں آئی چند ایکڑ زمین سے جو اناج ملتا اسی پر نہایت کفایت شعاری سے سارا سال گزر بسر کرتیں۔ انھوں نے مفلسی کے عالم میں بھی پروقار زندگی بسر کی۔ ماں کی اس محنت مشقت میں بھی ننھے ہاتھوں نے بھرپور ساتھ دیا مثلاً غلام بیوی چرخہ کاتتیں اور بچے پونیاں بناتے۔ وہ چکی پیستیں اور بچے مل کر گیت گاتے۔ وہ کچی چھت اور گھر کی لپائی کرتیں تو بچے لکڑی کی سیڑھی سے چمٹے ماں کا انتظار کرتے رہتے۔ موسم برسات میں یہ دکھیاری بیوہ اپنے تینوں بچوں کو لے کر دروازے کی دہلیز پر بیٹھ جاتی۔ اپنے بچوں کو بڑے پیار سے دیکھتی اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کرتی۔ وہ برسات کی بوند بوند کے ساتھ اُترنے والے فرشتوں کو اپنے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کا واسطہ دیتی اور یوں لب گویا ہوتی:

> ''اے پاک فرشتو! خدا کے دربار میں جا کر مجھ دُکھیا کی طرف سے عرض کرو کہ میں نے تو دُکھ بھوگے سو بھوگے [برداشت کیے]۔ ان میرے بچوں کو کوئی دُکھ نہ دینا۔ میں نے انھیں بڑی مشکل سے پالا پوسا ہے۔ یہ پڑھیں لکھیں، نیک اور لائق بنیں اور دنیا میں نام پیدا

کریں۔ اللہ ان کی قسمت کے کانٹوں کو پھول بنا دے اور یہ نہ ہو سکے تو یہ کانٹے میری
قسمت میں لکھ دے۔ یہ بچے میرا اثاثہ ہیں۔ یہ بچے میرا غرور ہیں۔ مال تو سب تیرا
ہی ہے پر تو نے مجھے یہ مال عطا فرمایا ہے تو بس اتنا کر میں ان کا دُکھ نہ دیکھوں۔ بوند بوند
کے ساتھ فرشتہ اُترتا ہے اور میں بوند بوند کو پکار رہی ہوں۔ میری پھٹی ہوئی پوروں اور
کٹی ہوئی ایڑیوں کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے یارب العالمین۔'' ؎

پھر وہ نہایت پیار سے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آیت کریمہ پڑھ کر پھونک مارتیں۔ ناخواندہ ہونے کے باوجود غلام بیوی نے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کی۔ انتہائی کس مپرسی کے حالات میں بھی بچوں میں احساسِ کم تری کا جنم نہ ہونے دیا۔ غلام بیوی کی وفات ۱۹۵۶ء کو انگہ میں ہوئی۔

اللہ تعالٰی نے چن پیر کو تین بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا اللہ بخش بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گئے جب کہ سعیدہ بانو اور دو بیٹے بقیدِ حیات رہے۔ سعیدہ بانو کی ولادت ۱۹۰۸ء میں انگہ میں ہوئی۔ سعیدہ بانو ایک نہایت محبت و شفقت کرنے والی خاتون تھیں۔ ان کی شادی ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ سعیدہ بانو کے بطن سے ظہیر بابر پیدا ہوئے جو بعد میں معروف افسانہ نگار اور صحافی بنے۔ سعیدہ بانو کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا۔

چن پیر کے پہلے بیٹے کی ولادت دسمبر ۱۹۱۴ء بمقام انگہ ہوئی۔ بچے کا نام محمد بخش رکھا گیا۔ محمد بخش کی تعلیم کے فرائض چچا امیر حیدر بخش نے انجام دیے۔ محمد بخش نے بی۔اے، بی ٹی تک تعلیم حاصل کی۔ یہ کیمبل پور، نوشہرہ اور میاں والی کے سرکاری ہائی اسکولوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ موصوف صدر مدرس رہنے کے بعد ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کے منصب سے ریٹائرڈ ہوئے۔ محمد بخش نے قاسمی کے فن و شخصیت پر مضامین قلم بند کیے۔ پیر بخش اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتے اور قاسمی بھی بڑے بھائی کا سرپرست کی طرح احترام کرتے۔ قاسمی زندگی کے ضروری امور بڑے بھائی کے مشورے سے سرانجام دیتے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے چھوٹے بھائی سے محبت کرتے بلکہ انھیں فکرِ معاش کے سلسلے میں بے فکر رہنے کی تلقین بھی کرتے۔ وہ عمر بھر ہر دُکھ سکھ اور رنج و الم میں چھوٹے بھائی کا ساتھ دیتے رہے۔ محمد بخش کا انتقال ۲۰۰۱ء میں ہوا۔

مغربی پنجاب کے ایک چھوٹے گاؤں انگہ میں چن پیر کے گھر کی مذہبی فضا میں ایک خوب رو، گھنگھریالے بالوں والے بچے کی ولادت ہوئی۔ اس بچے کا نام غلام بیوی نے چوکھنڈی ضلع چکوال میں آباد اپنے ننھیال کے ایک بزرگ کے نام پر ''احمد شاہ'' رکھا۔ غلام بیوی کو چوں کہ اس بزرگ سے بہت عقیدت تھی لہٰذا گھر والے پیار سے اس بچے کو ''شاہ'' یعنی بادشاہ کہہ کر پکارنے لگے۔ جس سے بعض اہلِ قلم ان کو سید متصور کرتے تھے۔ وہ اعوان قبیلے کی ایک شاخ قسمال (مقامی زبان میں قاسمی سے صفت نسبتی سے تعلق رکھتے تھے چناں چہ قسمال کا اردو متبادل قاسمی ان کے نام کا جزو ٹھہرا)۔ احمد شاہ دنیائے اردو ادب میں احمد ندیم قاسمی کے نام سے معروف ہوئے۔ قاسمی کی تاریخ پیدائش کے متعلق

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے تحقیق کی غرض سے محمد بخش (قاسمی کے بڑے بھائی) کو خط لکھا۔ محمد بخش نے ۱۳ر جون ۱۹۸۰ء کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے گرامی نامے کا جواب دیا۔ انھوں نے قاسمی کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی۔ جب کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بذریعہ تحقیق ان کی تاریخِ ولادت ۲۰ جنوری یا فروری ۱۹۱۷ء قرار دی ہے۔ معین الرحمٰن نے جب قاسمی کو درست تاریخِ پیدائش جاننے کے لیے خط لکھا تو قاسمی جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں خود اپنے سالِ ولادت کے سلسلے میں حتمی طور پر کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ جب اسکول میں میرا داخلہ ہوا تو اس زمانے میں بچوں کی عمریں بڑھا کر لکھوائی جاتی تھیں۔ سو ۲۰ر نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ درج ہوئی اور یہی تاریخ میرے میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ میں درج ہے مگر اس حساب سے تو میں اپنے بڑے بھائی سے بھی عمر میں بڑا ہو جاتا ہوں! میں پانچ سال کا تھا جب پہلی جماعت میں میرا داخلہ ہوا اور یہ داخلہ ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اس لیے میری قریب قریب تاریخ پیدائش ۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء ہی بنتی ہے۔'' ۸

قاسمی اپنے بھائی سے دو برس چھوٹے تھے۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے راقم الحروف کو بتایا کہ میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ر نومبر ۱۹۱۴ء درج ہے۔ بڑے بھائی سے دو برس چھوٹے ہونے کی بنا پر انھوں نے تاریخ اور مہینہ میں تبدیلی نہ کی جب کہ سن کو تبدیل کر کے ۱۹۱۴ء کی بجائے ۱۹۱۶ء کر لیا۔

قاسمی کے والد عبادت خداوندی میں مشغول رہتے۔ چوں کہ وہ زہد و ریاضت کے باعث فنا فی اللہ ہو چکے تھے۔ ان کے گھر کے آنگن میں مفلسی اپنا جال بچھا چکی تھی اور ان کی اولاد زندگی کی بیشتر آسائشوں سے محروم رہی۔ یہ بچے بچپن میں روشنائی تیار کرنے کے لیے توے سے کالک اُتارتے، درختوں کی ٹہنیوں کے جوڑوں سے چمٹا ہوا گوند اُتارتے، گھر کا چولہا گرم کرنے کے لیے مویشیوں کا خشک گوبر اور خشک لکڑیاں اکٹھی کرتے۔ بچوں کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے لیے جو سہولتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ قاسمی ان سے کوسوں دور تھے۔ چناں چہ بچپن میں جن محرومیوں اور نارسائیوں نے انھیں درد کی دولت عطا کی اسی دردمندی کو وسعت دے کر انھوں نے اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ ایسے حالات بھی بارہا پیش آئے جب ایک ادنیٰ خواہش کے لیے سسکنا پڑتا لیکن ان تمام سنگین حالات کے باوجود قاسمی کے ظریفانہ مزاج میں تبدیلی نہ آئی۔ اپنے بچپن کی شرارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ بہت دیر تک رونے کے بعد جب مجھے ریوڑیاں خریدنے کے لیے ایک پیسہ ملا تھا اور میں پھیلے ہوئے آنسوؤں کو ملے بغیر ریوڑیاں چبا رہا تھا تو اچانک مجھے ایک شرارت سوجھی، ریوڑیاں سے تل اُتار کر ایک ننھی سی کنکری اُٹھائی، اُس پر ریوڑی کی شیرینی کو محنت سے رگڑا اور پھر اس پر تل چپکا کر یہ ریوڑی میں نے ایک ہم عمر دوست کو پیش کر دی اور اس سنگین ریوڑی کو چباتے ہی وہ جو چلا چلا کر رویا ہے تو آن کی آن میں سارا محلہ میری شرارت کی نوعیت معلوم کر کے قہقہوں سے چھلک اُٹھا۔'' ۹

اگر چہ قاسمی کو عہدِ طفلی میں محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انتہائی کٹھن حالات اور معاشی ابتری کے باوجود وہ احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوئے۔ اس کی وجہ حوصلہ مند؛ صابر و شاکر ماں کی تربیت تھی۔ جنھوں نے نہایت خوداعتمادی سے بچوں کو خودداری اور صبر و شکر کا درس دیا۔

قاسمی نے تعلیم کا آغاز قرآن مجید کے عربی پارے سے کیا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور خوش حال خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وادی سون سکیسر کے علاوہ دیگر اضلاع میں بھی اس خاندان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خاندان کے افراد صاف ستھرا اور نہایت قیمتی لباس پہنتے اور اتنے خوش خوراک تھے کہ چائے میں چینی کی بجائے شہد کا استعمال کرتے۔ موٹروں میں سفر کرتے، یہ خاندان پورے گاؤں میں امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کا مالک تھا۔ قاسمی کے دس چچا، ایک پھوپھی، پانچ خالائیں اور ایک ماموں تھے۔ ان کے بچوں کا طرزِ زیست قاسمی اور ان کے بہن بھائیوں سے قطعی مختلف تھا۔ لکھتے ہیں:

> ''ان کی کتابیں نئی تھیں۔ ان کی سلیٹوں کے ساتھ موٹے موٹے سنہری اسفنج لٹکتے تھے اور ان کی سلیٹوں پر ہتھیلیاں تھرک جاتی تھیں۔'' ۱۰

قاسمی کا تعلق بھی اسی امیر خاندان سے تھا لیکن والد گرامی کے فنا فی اللہ ہونے بعدازاں رحلت سے ان کے معاشی حالات کم زور ہو گئے۔ چنانچہ:

> ''۔۔۔یہاں توے کی کالک سے روشنائی تیار ہوتی تھی۔ ان گنت کناروں والے سلیٹ کے ٹکڑوں پر سوالات حل ہوتے تھے۔ ایک ہی قلم کو ''دہرے فرائض'' کے لیے دونوں طرف سے تراش لیا جاتا تھا۔ مٹی کی دواتوں میں روشنائی سے زیادہ صوف ہوتا تھا۔'' ۱۱

چن پیر کے عزیزوں نے چوں کہ گدی پر قبضہ جما لیا تھا۔ انھوں نے چن پیر کے اہل و عیال کے لیے ڈیڑھ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ لہٰذا ان حالات میں ان کی والدہ کا گزر بسر کرنا انتہائی دشوار تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بہ مشکل دو وقت کی روٹی تو دے سکتی تھی لیکن جیب خرچ نہیں۔ لہٰذا چند روپے جو عزیز و اقارب ان ننھے بچوں کو دیتے، یہ پیسے بچوں کو بطور جیب خرچ دینے کی بجائے ماں گھر کا سودا سلف خرید لیتی وہ پیسے دینے کی بجائے ان کے آنسو پونچھنا زیادہ آسان سمجھتی تھی۔ بقول قاسمی:

> ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسے جانے سے پہلے میرے آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دُکھ میں بہہ نکلتے۔'' ۱۲

عسرت زدہ زندگی گزارنے کے باوجود قاسمی کا لباس صاف ستھرا ہوتا۔ اسکول جانے کے لیے بستہ اور کتابیں بھی اچھی حالت میں ہوتی تھیں۔ وہ پہلی مرتبہ چوتھی جماعت میں وظیفہ کا امتحان دینے کی غرض سے خوشاب گئے تو سائیکل دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ یہ دو پہیوں پر کیسے چلتی ہے لیکن اپنے عہد طفلی کی تنگ دستی اور

غربت کا شکار ماحول و حالات کو بتاتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے۔ انھوں نے چوں کہ امیر خاندان میں جنم لیا لیکن جس ماحول میں آنکھ کھولی۔ اُس ماحول کا بہت تفاوت تھا۔ گھر سے باہر نکلتے تو احساسِ برتری کے ساتھ لیکن:

''گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے چور چور ہو جاتے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے۔ پیاز، سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی۔'' [۱۳]

خاندان کے باقی سب گھرانے خوش حال تھے۔ زندگی پر ملمع چڑھائے رکھنے کا تکلف انھی کے مقدر میں تھا۔ ساری ساری رات ان کے معصوم ذہن میں یہ خیالات گردش کرتے رہتے۔ انھی حالات و واقعات نے قاسمی کو وقت سے پہلے حساس و باشعور بنا دیا۔ اسی گداز نے احمد شاہ کے ذہن کو احمد ندیم قاسمی بنایا۔ قاسمی ساڑھے چار برس کے ہوئے تو انگہ کی ایک مسجد سے عربی قاعدہ سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ قاسمی کے ہم مکتب ننھے بچے اُن کے اُجلے لباس اور خاندانی وجاہت کی بنا پر اُن سے دور ہو کر بیٹھتے لیکن جب ایک روز قاسمی نے بے خیالی میں باجرے کی روٹی میں ملی ہوئی سرخ مرچوں کی گیند نکالی اور مزے سے کھانے لگے تو سب ننھے بچے نہ صرف ان کے قریب کھسک آئے بلکہ انھیں اپنا دوست سمجھنے لگے۔ قاسمی بچپن میں دہری ٹھوڑی، سرخ ہونٹ، گلابی گال، روشن پیشانی کے مالک تھے۔ غربت کے باوجود ان کی صحت قابلِ رشک تھی اور چہرہ بھی روشن تھا۔ چناں چہ پہلے دن ہی:

''موٹا سا مٹھن متھنا بچہ دیکھ کر مولوی جی نے پہلے روز ہی اعلان کر دیا کہ یہ لڑکا غبی ثابت ہوگا۔ موٹے لڑکے ذہین نہیں ہوتے۔ میرا ساٹھ برس کا تجربہ ہے۔'' [۱۴]

ایسے حالات میں دل لگا کر نہ پڑھنا گویا قاسمی کے بقول حیات اور حیات بعد الممات دونوں سے دشمنی تھی۔ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں والدہ کی تربیت کے آثار نمایاں ہیں۔ اُس دور میں دیہات میں شرفا اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام خود کرتے۔ گاؤں میں ایک مکتب ہوتا جس میں تعلیم کا آغاز قرآن پاک سے ہوتا۔ پھر عربی اور فارسی پڑھائی جاتی۔ انھوں نے اگر چہ ایک پرآشوب ماحول میں آنکھ کھولی۔ قدرت نے انھیں ذہن رسا عطا کیا چنانچہ انھوں نے فطری فہم و فراست کی بنا پر ابتدائی تعلیم کے مدارج بآسانی طے کر لیے۔ لہٰذا قاسمی نے والدہ کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے خوب محنت سے پڑھائی کی۔ جہاں ان کے ہم مکتب پڑھائی سے جان چھڑاتے رہتے قاسمی اپنی ذہانت کی بنا پر جلد ہی اپنا سبق یاد کر کے چھٹی لے لیتے۔ انھوں نے انگہ کی مقبول مسجد سے قرآن پاک ختم کیا۔ برسوں سے اسی مسجد میں ان کے خاندان کے بزرگ دینی تدریس کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ اسی مسجد سے حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی نے ان کے بزرگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ حضرت سلطان باہو اور ان کی والدہ محترمہ کا علاقہ بھی انگہ تھا۔ انگہ کی مسجد اور وہاں درس و تدریس کی اس قدر اہمیت تھی کہ دُور دراز سے لوگ اس مسجد کے حجروں میں قیام کی غرض سے آتے۔ روشن دل و دماغ کے مالک افراد ان بزرگوں سے درس لیتے

ڈاکٹر ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

> ''۔۔۔احمد ندیم قاسمی کے، ایک یہیں سے علم حاصل کرنے والے خالہ زاد بھائی مولوی ضیاء الدین صاحب (سُسر کی شریف، والد رابعہ ندیم) کو لاہور کی دو معروف مسجدوں کے لیے خطیب کی پیش کش ہوئی۔ وہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے لاہور نہ جا سکے۔ جب کہ ندیم صاحب کے دوسرے خالہ زاد بھائی مولانا غلام مرشد عرصہ دراز تک لاہور کی مشہور مسجد وزیر خان اور عالمگیری بادشاہی مسجد میں خطیب رہے۔'' ۱۵

مندرجہ بالا تمام نام وَر بزرگ روشن خیال عالم دین تھے۔ اسی لیے غلام بیوی نے بھی اس معروف مدرسہ سے اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلوائی۔

قاسمی نے دنیاوی تعلیم کا آغاز انگہ کے ایک پرائمری اسکول میں ۱۹۲۱ء میں کیا جہاں ان کے اولین مدرس منشی غلام حیدر صاحب تھے جو لگن اور محنت سے بچوں کو درس دیتے رہے۔ ان کے مشفق و مہربان؛ تعلیم یافتہ چچا نے جو سول سروس میں آفیسر تھے، چن پیر کی مذہبی مصروفیات اور گھر کی ابتری کا نقشہ دیکھ کر دونوں بیٹوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کی۔ انھوں نے غلام بیوی سے وعدہ کیا کہ دونوں بچوں کو انگہ سے پرائمری تک تعلیم دلوانے کے بعد شہر لے جائیں گے۔ چناں چہ قاسمی نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک انگہ کے پرائمری اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ اُس وقت پرائمری جماعت چار جماعتوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ قاسمی نہایت ذہین و فطین تھے۔ انھوں نے نہایت محنت سے نہ صرف پرائمری جماعت میں وظیفہ حاصل کیا بلکہ وظیفہ کے امتحان میں ضلع بھر میں اوّل آئے۔ انھوں نے وظیفہ کی پہلی کمائی ساٹھ روپے اپنی والدہ محترمہ کی ہتھیلی پر رکھی تو فرطِ مسرت سے والدہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

۱۹۲۴ء میں قاسمی آٹھ برس کی عمر میں اس وقت سایہ پدری سے محروم ہو گئے جب وہ زندگی کے جھمیلوں سے ناواقف تھے۔ نہ پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت تھی نہ ذہن میں سوچنے کی صلاحیت۔ ۱۹۲۵ء میں ابتدائی چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد اپنے چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ کے پاس کیمبل پور چلے گئے جہاں خان بہادر پیر حیدر شاہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ لاولد چچا نے بچوں کو نہایت ناز و نعم سے پالا اور تمام ضروریاتِ زندگی کے ساتھ آسائشِ زندگی بھی مہیا کیں۔ کیمبل پور میں قاسمی کے عربی کے استاد غلام ربانی عزیز تھے جن کی سنجیدہ شخصیت اور ادب سے گہرے لگاؤ نے انھیں بہت متاثر کیا۔ چناں چہ گورنمنٹ مڈل اسکول کیمبل پور (اٹک) سے ۱۹۲۸ء میں؛ مڈل کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کیا۔ ریڈ کراس سوسائٹی کے منعقدہ مقابلہ مضمون نویسی میں ضلع بھر میں اوّل آئے۔ یہ مقابلہ مضمون نویسی ۱۹۲۹ء میں ہوا کیوں کہ ان دنوں نویں اور دسویں جماعتیں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج کیمبل پور سے وابستہ تھیں۔ چناں چہ مڈل پاس کرتے ہی ''کالجیٹ'' ہو گئے۔ جب پیر حیدر بخش کا تبادلہ شیخوپورہ ہو گیا تو انھوں نے قاسمی کو گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ میں داخل کرا دیا جہاں اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب فضل الٰہی چشتی (ن۔م۔راشد کے والد) تھے۔ قاسمی نے

میٹرک کا امتحان ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ سے پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ہی اپنے عزیز اور پنجابی کے شاعر غلام جیلانی کی والدہ اور بہن کی بیک وقت اور دل خراش وفات پر مرثیہ لکھا۔ اس نظم کی تخلیق خاندانی حادثے کی بنا پر ہوئی۔ اس باوزن نظم میں قلبی کیفیات کو دل خراش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم نہ تو شائع ہوسکی اور نہ ہی اس کا عنوان یا دیگر تفاصیل کسی سے دریافت ہوسکی ہیں۔ انھوں نے پہلی مطبوعہ نظم ۱۹۳۱ء میں محمد علی جوہر کی وفات پر زعیم ملت کا نوحہ لکھا۔ قاسمی اگرچہ محمد علی جوہر کے علمی و سیاسی قد وقامت سے ناواقف تھے لیکن ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کے چچا کو بھی محمد علی جوہر سے بہت عقیدت تھی۔ اس نظم کے متعلق پیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں کہ چچا نے قاسمی کو حکم دیا:

> ''۔۔۔کاغذ پنسل لے کر کوٹھی کی چھت پر جاؤ اور وہاں تنہائی میں مولانا مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کر لاؤ۔ شاہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد دوسری منزل سے اُترا تو اس کے ہاتھ میں تیس چالیس اشعار کی ایک نظم تھی۔ اس نے اس نوحے کو چچا جان کے سامنے جھجکتے ہوئے رکھ دیا۔ چچا جان نظم پڑھتے جاتے تھے اور مارے مسرت کے سرخ ہوتے جاتے تھے۔'' [۱۲]

چچا ان کی تخلیق پر بے حد خوش تھے۔ ان اشعار میں پوشیدہ اظہارِ غم، نک سک سے درست نظم لکھنے اور ننھے بھتیجے کے شاعر بننے پر ان کی آنکھیں نم ہوگئیں اور انھوں نے فرطِ محبت سے قاسمی کی پیشانی پر بوسا دیا۔ اگلے روز یہ نظم سید حبیب نے اپنے روزنامہ ''سیاست'' لاہور کے صفحہ اوّل پر ''پیرزادہ احمد شاہ'' کے نام سے جلی حروف میں مختلف رنگوں میں شائع کی۔ چچا اسی وقت گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہم مکتب اور دیرینہ دوست ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے پاس لاہور آ گئے۔ اقبال نے بھی اس نظم کو بہت سراہا اور روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔

قاسمی نے صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں ۱۹۳۱ء میں داخلہ لیا۔ جلد ہی ان کا شمار کالج کے ذہین اور ہر دل عزیز طالب علموں میں ہونے لگا۔ کیوں کہ کالج میں مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد کرواتے اس کے علاوہ کھیل، ٹورنامنٹ، بیت بازی، ڈرامے اور تقریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے ساتھ ساتھ بزم ادب کے وائس پریذیڈنٹ بھی تھے۔ انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۱۹۴۳ء میں پاس کیا۔ قاسمی کے چچا پیر حیدر بخش کے گھر میں ان کی زندگی قدرے آسودگی سے گزر رہی تھی۔ ان کے باذوق چچا نہ صرف عربی اور فارسی کے عالم تھے بلکہ اردو زبان میں بھی عمدہ شعر کہہ لیتے تھے۔ وہ قاسمی اور ان کے بھائی کو تفسیر حقانی کا درس دیتے۔ درس کے دوران حسان بن ثابت، حافظ، سعدی، غالب، حالی اور اقبال کے اشعار سناتے، شعر کا مفہوم واضح کرتے، ان بچوں کا تلفظ اور ادائیگی شعر درست کراتے۔ پیر حیدر بخش (قاسمی کے چچا) کی لائبریری میں فلسفہ، ادب، تاریخ کے موضوعات پر مشتمل کتابوں کے علاوہ قرآن پاک کی تفاسیر، مسلمان فلسفیوں کی کتابیں، صوفیائے کرام کے ملفوظات، اقبال کا اردو و فارسی کلام بھی موجود تھا۔ وہ بڑے طمطراق سے پڑھتے۔ وہ زبان و بیان پر استادانہ مہارت رکھتے تھے۔ ان بچوں نے بہت کم عمری میں

معروف کتابیں پڑھ لی تھیں۔ محترم چچا کی صحبت اور تربیت کا اثر تھا کہ قاسمی نے چھٹی جماعت میں ہی بیاض میں اردو کے اشعار لکھنے شروع کیے اور ساتویں جماعت میں بارہ برس کی عمر میں اسّی صفحات پر مشتمل ایک ناول لکھا جس میں:

''ایک نوجوان نے ایک دوشیزہ کو دریچے سے جھانکتے دیکھا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔
دوشیزہ بھاگ کر آئی۔۔۔ محبت کی پینگیں بڑھیں لیکن لڑکی کے والدین کو سب راز معلوم
ہو گیا اور دونوں سنکھیا پھانک کر قربان گاہ محبت کی بھینٹ چڑھ گئے۔'' ۱۷

مضمون اگرچہ پامال تھا لیکن قاسمی کو لکھنے کا شوق بچپن سے تھا لہٰذا ان کی ادبی صلاحیتیں بچپن میں ہی نکھر کر سامنے آنے لگیں۔ بچپن میں ہی مختلف معروف شعرا کا منتخب کلام جمع کرتے، اُن کے اشعار ذوق وشوق سے گنگناتے۔ لکھتے ہیں:

''یاد پڑتا ہے کئی بار میں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی مگر ان کی نقل موجود نہیں۔'' ۱۸

قاسمی کے چچا اور چچی نہایت مشفقانہ مزاج کے مالک تھے۔ انھوں نے نہایت محبت و خلوص سے ان بچوں کی پرورش کی۔ قاسمی کی زندگی کی چند حسین یادوں میں چچا کے گھر کی یادیں بھی شامل ہیں۔ چچا کے گھر نہایت آسودگی سے دن گزرنے لگے۔ جب ہر سال تعطیلاتِ گرما میں اپنے گھر آتے جہاں مفلسی کھلی بانہوں سے ان کا استقبال کرتی۔ قاسمی نے اپنی خودنوشت میں اپنے احساسات کا اظہار یوں کیا ہے:

''۔۔۔جب میں ہر سال گاؤں میں آتا تو اچانک جیسے سدرئی کی بلندیوں سے تحت الثریٰ
میں پٹخ دیا جاتا۔'' ۱۹

عمر کے ساتھ ساتھ قاسمی کے احساسات و خیالات میں پختگی آتی گئی۔ عزیزوں کی ریاکارانہ بوالعجبیوں کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اب وہ جھوٹی انا اور امارت کے خول سے اُکتا گئے تھے۔

قاسمی نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۱۹۳۳ء میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ مضامین میں انگریزی، اردو، اقتصادیات، عربی اور تاریخ شامل تھے۔ ان کے چچا پیر حیدر بخش نے قاسمی کو بہاول پور کالج بھیج دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ حکومتِ پنجاب کی ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد بہاول پور میں مشیر مال کا عہدہ سنبھال لیں گے۔ چناں چہ ۱۹۳۴ء میں مشیر مال مقرر ہو کر بہاول پور چلے گئے۔ تقرری کے فوراً بعد عزیزوں سے ملنے انگہ آ گئے۔ وہیں حرکت قلب بند ہونے کے باعث وفات پا گئے۔ قاسمی اُس وقت بی۔اے (سال سوم) کے طالب علم تھے۔ روشن مستقبل کے خوابوں میں گم اس نوجوان پر یہ خبر قیامت بن کر گزری۔ انھیں اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا۔ لکھتے ہیں:

''زندگی کے بحرِ زخار میں یہ تنہا منارۂ نور بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دنیا اور اس کی
رعنائیوں سے نفرت سی ہو گی۔'' ۲۰

بقول قاسمی:

''کلبی ذہنیت کی شاید یہی بنیاد تھی۔ جس نے ۱۹۳۹ء تک میری زندگی کو اور ۱۹۴۲ء تک
میری شاعری کو ایک چیختے چلاتے ہوئے دھندلکے میں اندھا دھند بھٹکائے رکھا۔'' ۲۱

چچا مرحوم کی وفات کا قاسمی کو گہرا صدمہ ہوا۔ ایک تو محترم و محسن چچا سے ابدی جدائی کا دُکھ اور دوسرا اقتصادی حالات کی پریشانی تھی۔ قاسمی کو ایک بار پھر یتیمی کا احساس ہوا۔ چناں چہ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر واپس انگہ چلے گئے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے ملازمت کا سوچنے لگے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قاسمی لکھتے ہیں:

"۔۔۔اب میرے اقتصادی حالات ایسے نہ تھے کہ میں (ہاسٹل میں رہ کر) اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ جب میں چچا کے انتقال کے بعد گاؤں گیا تو مجھے بتایا گیا کہ چچا تو میرے فورتھ ایئر کے آخری مہینے تک کی کالج فیس ایک عزیز کے پاس جمع کروا گئے ہیں، جس پر میں دوبارہ گاؤں سے واپس آ گیا۔ یوں میں نے گریجویشن کی لیکن مرحوم اگر ایسا بندوبست نہ کرتے تو میں ایف۔اے سے آگے تعلیم حاصل نہ کر پاتا۔" ۲۲

چناں چہ قاسمی نے عبدالرشید صاحب کی دست گیری سے ۱۹۳۵ء میں بی۔اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ قاسمی انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے لاہور کے دو اہم کالجوں میں درخواستیں بھی دیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی میرٹ لسٹ میں ان کا نام بھی آ گیا لیکن بروقت داخلہ فیس نہ ہونے کے سبب داخلہ نہ لے سکے۔ ان کی غیرت اور خودداری نے انھیں کسی کے سامنے دست سوال سے باز رکھا۔

"کچھ عرصے بعد اُن کے نہایت عزیز اور امیر ہندو دوستوں منوہر اور نند کو معلوم ہوا تو انھوں نے گلہ کیا کہ ہم سے کیوں نہیں کہا۔ بہرحال تب تک وقت گزر چکا تھا۔" ۲۳

قیامِ بہاول پور کے دو برسوں نے ادبی ذوق کی کونپلیں پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قاسمی بی۔اے کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش کے پاس لاہور آئے جو "وطن ہائی اسکول" لاہور میں مدرس تھے۔ قاسمی بھی نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن مایوسی بار بار دروازے پر دستک دیتی رہی۔ پھر لوگوں کی نامہربانی اور بے دردی نے ان کے حساس دل کو مجروح کیا۔ اپنے دوستوں سے خط وکتابت بھی جاری رکھی۔ دلی جذبات سے بھرپور زندگی کی تلخیوں اور امنگوں سے بھرے ہوئے طویل خط لکھتے رہے۔ محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

"وہ اکثر میرے پاس بیرنگ آتے تھے کیوں کہ ڈاک کے عام لفافے کا ٹکٹ اتنے فراواں مواد کی ترسیل کے لیے کفایت نہیں کرتا تھا۔" ۲۴

بعدازاں انگہ لوٹ گئے جہاں اخبارات میں مختلف ملازمتوں کے اشتہار دیکھنا اور درخواستیں لکھ کر بھجواتے رہنا معمول بن گیا۔ جب کبھی فرصت ملتی تو اپنے گاؤں میں خوب صورت وادی، جھیل، پہاڑ، پرندے، پھول، کنکریوں، پتھر، غرض ہر مناظر قدرت اور حیاتِ انسانی کی ہر شے کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے جس نے اُن کی علمی اور ادبی شخصیت کے نکھار میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دوران مختلف افسانوں کے پلاٹ سوچتے رہے اور شعر و شاعری مختلف ادبی مجلوں کو بھجواتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مناسب نوکری کی تلاش بھی جاری رہی۔ جس جگہ بھی اُمید کی کوئی

کرن دکھائی دیتی نوکری کی درخواست دے دیتے۔ انھوں نے حصولِ ملازمت کے لیے ہر بڑی سے بڑی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی جگہ پر درخواست دی جو فی البدیہہ نامنظور ہوتی رہی۔ بالآخر بی۔اے پاس کرنے کے بعد معمولی ملازمتیں کیں لیکن مزاج سے مطابقت نہ رکھنے کے باعث چھوڑ دیں اور مسلسل کسی ایسی نوکری کی تلاش میں رہے جو ان کے مزاج سے میل کھاتی ہو۔ چناں چہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک کے چار برس انتہائی اذیت سے بسر ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء میں تقریباً سارے پنجاب کے چکر لگانے۔۔۔ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری، تحصیل داری اور نائب تحصیل داری سے لے کر انجمن حمایت اسلام میں کلرکی تک کے لیے نت نئے ڈھنگ کی درخواستیں لکھیں۔ ریفارمر کمشنر کے دفتر میں بیس روپیہ ماہانہ پر محرری کا کام کرتا رہا۔ ضلع منٹگمری میں نو روز ٹیلی فون آپریٹر رہا۔ دارالاشاعت پنجاب میں تہذیب نسواں کے لیے انگریزی کہانیاں ترجمہ کرتا رہا۔ ایک ہندو بزرگ کو پانچ سو صفحات کی ایک کتاب چالیس روپیہ کے بدلے لکھ دی۔۔۔ محکمہ پنچائیت سے لے کے محکمہ آرمی ریماؤنٹ تک کے دفاتر میں میرا نام بطور اُمیدوار درج رہا، ساتھ ساتھ مانگے تانگے کا لباس پہن کر ڈپٹی کمشنروں، کمشنروں اور فنانشل کمشنروں کے حضور باریاب ہوتا رہا۔۔۔ ہر جگہ ناکام ہوتا رہا اور ذہن کا زہر ابلتا اور بکھرتا رہا۔'' [۲۵]

قاسمی لاہور میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک رہائش پذیر رہے۔ بے روزگاری کے دنوں میں تین تین روز کے فاقوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ دو دو ہفتے شدید بخار کی حالت میں بغیر کسی تیماردار کے رہے۔ یہ تلخ اور ہول ناک یادیں ان کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ رہیں۔ ان کے زمانہ بے روزگاری کے متعلق محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

''جس دفتر میں وہ جاتا، کوئی آسامی خالی نہیں، کی تختی اس کا خیر مقدم کرتی۔ باہر کی دنیا کی نامہربانی اور بے دردی نے اس خام دہقانی نوجوان کے حساس دل کو بُری طرح مجروح کیا اور کئی بار اس نے خودکشی کا ارادہ کرنے کی ٹھان لی۔ اپنی بوڑھی ماں کی محبت اور اپنے ستارے کے ایمان نے اسے یہ انتہائی قدم اُٹھانے سے روکا۔ بہت سے دن اس نے بغیر کھائے پیے گزارے۔ کئی راتیں لاہور کے گلی کوچوں میں چلتے چلتے کاٹیں۔'' [۲۶]

قاسمی کو بے روزگاری کے دور میں ہی ۱۹۳۶ء میں ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ اس محبت کو انھوں نے ہمیشہ پردہ اخفا میں رکھا۔ البتہ اُن کی تحریری نگارشات سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ قاسمی نے کسی سے شدید محبت کی جس کا دورانیہ اگرچہ مختصر تھا مگر اس محبت نے قاسمی کی شخصیت میں گہرائی اور شدت پیدا کی۔ یہ وہی الم ناک دور تھا جب یہ زندگی کے مایوس کن زمانے سے گزر رہے تھے۔ تب لطیف محبت نے نہ صرف انھیں سہارا دیا بلکہ دل و دماغ کو زندگی کی جواں لطافتوں سے بھی آشنا کیا۔ ''جلال و جمال'' کے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں میری الم ناک زندگی کے تاریک اُفق پر اچانک ایک کوندا سا لپکا اور عام کوندوں کی طرح بجائے چمک کر تاریکیوں میں گھل جانے

کے اندھیروں کا ایک سنہری عنوان بن کر وہیں جم کر رہ گیا۔۔۔ دُکھ سکھ کے معیار بدلنے لگے۔ زندگی پر سے گرد و غبار کی تہیں اُکھڑنے لگیں اور میری ذہنی کلفت ایک خوشگوار نرم اور معصوم تبسم میں گھل کر کھو جانے لگی۔۔۔ ۱۹۳۷ء کے اواخر میں یہ کوندا تاباں رہنے کی ایک دردناک اور مایوسانہ کوشش کے بعد بجھ کر رہ گیا اور میرے خیالوں کے گلابی کہرے میں ایسی سرمئی لہریں دوڑا گیا جن کا آغاز کوندے کا غروب تھا اور انجام ہنوز ناپید ہے۔" ۲۷

قاسمی پہلی محبت کے طلسم اور لطیف لمحات کو تاحیات بھلا نہ سکے۔ شاعری کے ذریعے اپنی قلبی واردات کا اظہار کرتے ہیں:

گھڑی پہلی محبت کی عجب تھی

ابھی تک یاد کے در پر کھڑی ہے ۲۸

قاسمی کی داستانِ محبت کسی انٹرویو میں درج نہیں۔ صرف "جلال و جمال" کے دیباچے میں اشارہ ملتا ہے لیکن وہ بھی واضح انداز میں موجود نہیں کہ یہ محبت کتنے عرصہ پر محیط تھی؟ انجام کیا ہوا؟ اس طرح کے سوالات قاری کے ذہن میں گردش کرتے ہیں تاہم قاری کے ذہن میں موجود ان تمام سوالات کے جواب محمد طفیل بڑے تیقن سے دیتے ہیں:

"انھوں نے ایک دیہاتی لڑکی سے محبت کی تھی۔ اس لڑکی کے متعلق جو کچھ معلومات ہیں وہ یہ کہ بڑی خوب صورت مگر یتیم غریب اتنی کہ نوبت فاقوں تک آئے۔ آپ بھی ماشاء اللہ بے کار۔ مطلب یہ کہ صحیح معنوں میں عاشق، جب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے اپنے اس ارادے کا ذکر اپنی والدہ سے کیا تو انھوں نے سمجھایا بجھایا لیکن دل کی چوٹ نے کہیں زبان کی حلاوتوں سے تسکین نہ پائی جو انھیں تسکین ملتی۔ جب یہ کسی طرح نہ مانے تو شرط ٹھہری کہ پہلے دو تین سو روپے کما لاؤ، تب۔ چناں چہ اردو کا یہ بڑا ادیب اور شاعر پہاڑوں سے اُترا، میدانوں میں آیا، چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر کے روپے لے کر اپنے گاؤں پہنچا تو اس لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس واقعہ کا بڑا شدید اثر ان کی شخصیت پر پڑا۔ انھوں نے اپنی حالت پاگلوں ایسی بنالی۔ اس لڑکی کو بھی ان سے مثالی پیار تھا۔ شادی کے فوراً بعد بیمار ہوئی۔ انھیں بلا بھیجا تاکہ آخری سانس لینے سے پہلے انھیں ایک نظر دیکھ کر موت کی آغوش میں جا سکے۔" ۲۹

قاسمی ۱۹۳۶ء میں محبت کے الوہی جذبے سے آشنا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تخلیقات پکار پکار کر اعلان کرتی ہیں کہ انھوں نے کسی حسینہ سے بے پناہ محبت کی۔ اگر چہ اس محبت کی مدت کم تھی لیکن اس محبت نے قاسمی کی تحریروں کی ایک واضح راہ متعین کی۔ اس دور کی تحریروں میں جذبہ اور فکر ایک دوسرے کی انگلی تھامے دکھائی دیتے ہیں۔ قاسمی اس دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ انھوں نے اسی کے تخیل میں شاعری کی لیکن جب دیکھا تو عشق کندن بن چکا تھا۔ محمد طفیل لکھتے ہیں کہ: "قاسمی دل پھینک انسان نہ تھے۔ نہ ہی ان کا دل جگہ جگہ پھدکنے کا عادی تھا۔ انھوں نے اس خاتون سے ٹوٹ کر محبت کی۔" ۳۰ شاید اسی محبت کا اثر تھا کہ اُس کی وفات کے بعد زندگی بھر ان کی نظروں میں کوئی

چہرہ نہ بچ سکا۔ ان کی تخلیقات اسی رمز کی شہادت دیتی ہیں۔

قاسمی اپنی زندگی میں محبت کے متعلق ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

''میں نے زندگی میں بس ایک ہی محبت کی۔ میں دل پھینک قسم کا انسان نہیں ہوں۔ اس ایک محبت کے بعد پھر کوئی نظر میں جچا ہی نہیں اور نہ ہی پھر کبھی اتنی ذہنی فراغت نصیب ہوئی کہ اس بارے میں مزید کچھ سوچتے۔ وہی ایک محبت ایک سدا بہار پھول کی طرح میرے شعروں میں کھلی ہے۔ اس حوالے سے میرا ایک شعر یوں ہے:

میرے اشعار میں یوں دفن ہیں اثرات ترے
پردہ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

یہ محبت جنسی تجربات میں شامل نہ تھی۔'' ۳۱

قاسمی کی شاعری میں یہی لڑکی صبوحی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ محبت کا یہی وہ حسین دور تھا جس نے ان کی تحریروں کو رنگینی اور رعنائی عطا کی۔ ان کے مشفق پھوپھی زاد بھائی کیپٹن ملک امیر حیدر نے ۱۹۳۹ء میں محکمہ آب کاری کے شعبہ ایکسائز میں ان کا نام بطور سب انسپکٹر منظور کرا لیا۔ چناں چہ انھوں نے ۳رجولائی ۱۹۳۹ء کو ملتان شہر میں، دفتر آب کاری میں ملازمت کی ابتدا کی؛ جہاں اُن کی تنخواہ پچاس روپے اور سفری خرچ بائیس روپے تھا۔ اس ملازمت میں مختلف علاقوں میں انسپکشن کے لیے جانا پڑتا تھا۔ مختلف علاقوں میں بنی شراب کی بھٹیوں اور اڈوں کا معاینہ کیا جاتا۔ وہاں شراب کی کوالٹی چیک کی جاتی اور شراب کے سٹاک کی جانچ پڑتال کی جاتی۔ اس دور میں شراب کی بھٹی قائم کرنے کے لیے حکومت سے اجازت لی جاتی لیکن کچھ غیر قانونی بھٹیاں بھی چل رہی تھیں۔ یہ اپنے اہل کاروں کے ہمراہ ان بھٹیوں پر چھاپہ مار کر انھیں مسمار کرتے اور مالکان کو جیل بھجواتے۔ اس طرح بھنگ اور شراب کا غیر قانونی کاروبار ختم کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ اس ملازمت کے دوران ان کے بے تکلف دوستوں نے مختلف پیغامات بھیجے مثلاً کرشن چندر نے پیغام بھیجا:

''بے کاری سے آب کاری بھلی۔۔۔'' ۳۲

جوش ملیح آبادی نے لکھا:

جناب قبلہ و کعبہ کی آب کاری ہے
شراب جو نہ پیئے، آج کل وہ ناری ہے ۳۳

معروف افسانہ نویس سعادت حسن منٹو نے اپنے اخبار ''مصور'' بمبئی میں یہ خبر چھاپی کہ:

''شاعر محتسب بن گیا۔'' ۳۴

مذکورہ ملازمت کے فرائض قاسمی کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے خود کو پانی سے باہر آئی ہوئی مچھلی کی طرح محسوس کیا۔ مختلف جگہوں پر بھنگ کا محلول شیشوں میں بھر کر نشہ کیا جاتا لیکن یہ دھندا

چھوٹے پیمانے پر کیا جاتا۔ ایک مرتبہ ایک غریب شخص کو بھنگ کے غیر قانونی کاروبار کی پاداش میں رنگے ہاتھوں پکڑ کر جیل بھجوانے کے لیے ہتھکڑیاں پہنائیں تو اس کے بیوی بچے قاسمی کی ٹانگوں سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگے لہٰذا رنگے ہاتھوں پکڑنے کی وجہ سے معاف کرنے کا جواز پیدا نہیں ہوسکتا تھا چناں چہ حوالات میں اس پر مقدمہ چلا اور سزا ہوئی۔ تب انھیں ایک عجیب گناہ کا احساس ہوا۔ ان کا ضمیر بار بار ملامت کرتا رہا۔ اس طرح انھوں نے اپنی فائل مکمل کرنے اور اپنے افسروں کی نظروں میں عمدہ کارکردگی کی دھاک بٹھانے کے لیے کچھ بے گناہ افراد پر شراب و بھنگ کے نشے کا الزام لگا کر گرفتار کیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں سزا و جرمانہ ہوا چناں چہ قاسمی کا ضمیر انھیں بار بار ملامت کرتا۔ یہ نوکری ان کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ اپنے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش کو ۱۹۴۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''لالہ! اسلام جن نشوں سے ہمیں منع کرتا ہے انھیں کے ٹھیکوں کی نگرانی میرے ذمے ہے۔ پھر مجھے بے حد غریب۔۔۔ ماتم کی حد تک قلاش لوگوں پر چھاپے مارنے پڑتے ہیں اور وہ میری وجہ سے چھے چھے مہینے، سال سال بھر کے لیے جیل چلے جاتے ہیں اور ان کا قصور صرف یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے افیم کی ایک گولی یا بھنگ کا ایک گلاس فروخت کیوں کیا؟ جب کہ اس فروخت کا حق تو صرف حکومت انگلشیہ کو پہنچتا ہے۔ میں ہر چھاپے اور ہر استغاثے پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے اس دوزخ سے نکالیے اور مستعفی ہونے کی اجازت دے دیجیے۔'' ۳۵

یہ نوکری قاسمی کے مزاج سے میل نہ کھاتی تھی۔ اس لیے مشفق بھائی نے بھی نوکری چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ اس ملازمت سے بہتر (۷۲) روپے حاصل ہوتے تھے۔ یہ رقم اُس دور میں اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی مگر آہستہ آہستہ یہی رقم قاسمی کے سینے کا بوجھ بنتی جا رہی تھی۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ اونچے پیمانے پر تو ناجائز کاروبار چلتے ہیں لیکن غریب لوگ پھنس جاتے ہیں جو بہ مشکل اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتے ہیں لیکن انھیں اپنے افسروں کے سامنے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بادل ناخواستہ ایسے چھاپے مارنے پڑتے تھے جو ان کو سوائے پریشانی دینے کے اور کچھ عطا نہ کر سکتے تھے لیکن ایک روز قاسمی اس قدر جذباتی ہو گئے کہ بالآخر ۲۰ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو اس نوکری سے مستعفی ہو گئے۔ لکھتے ہیں:

> ''آج میری زندگی کا زریں ترین دن ہے۔ آج میں احمد شاہ ایکسائز سب انسپکٹر کی بجائے صرف احمد ندیم قاسمی ہوں! تجربات کا انبار سمیٹے میں اپنے ماضی کے کھنڈروں سے رخصت ہو رہا ہوں۔'' ۳۶

قاسمی مسلسل چار برس ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک جاں فشانی سے کسی معقول ملازمت کی تلاش میں رہے اور ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا جس سے زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا ہوا۔

اُنھوں نے محکمہ آب کاری سے لے کر بے روزگاری تک اپنی خودداری اور عزتِ نفس پر چوٹ نہ آنے دی۔ اسی ملازمت کے دوران ان کے آفیسر کو کسی بات پر غصہ آیا اور اس نے جلتا ہوا سگریٹ قاسمی کے منہ پر مارا۔ موصوف نے جواباً دوات آفیسر کے منہ پر ماری۔ انھوں نے نوکری کو بہتر معاشی ضروریات کے تحت اپنایا تھا۔ پھر ایک روز انھوں نے عبدالمجید سالک کو اپنی مشکلات سے آگاہ کیا۔ سالک نے انھیں لاہور مدعو کیا۔ جہاں انھوں نے مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض سرانجام دینے پر تفویض کا ارادہ کیا۔ قاسمی اپنے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش کو لکھتے ہیں:

> ''میرے لیے مولانا سالک صاحب نے لاہور میں ہفت روزہ ''پھول'' اور ہفت روزہ ''تہذیب نسواں'' کی ادارت کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ بس آپ کی اجازت کا منتظر ہوں۔'' ۳۷

چنانچہ لاہور میں ان کی ملاقات دو ادبی شخصیات اختر شیرانی اور عبدالمجید سالک سے ہوئی۔ اردو ادب کی ان شخصیات نے قاسمی کی شخصیت پر ایسے نقوش ثبت کیے جو ادبی زندگی کی اُٹھان میں معاون ثابت ہوئے۔ اختر شیرانی سے قاسمی کا غائبانہ تعارف رسالہ ''رومان'' کے حوالے سے بہت پہلے تھا۔ جب لاہور آئے تو ان کی سب سے پہلی ملاقات اختر شیرانی سے ۱۹۳۶ء کے آغاز میں ہوئی۔ انھوں نے گرم جوشی سے اس نوجوان کا استقبال کیا۔ قاسمی کاشانہ اختر شیرانی پر بلاناغہ جاتے جس سے ایک تو اختر شیرانی سے ان کے مراسم مضبوط ہوئے اور دوسرا دیگر ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقات ہوتی جس کی تفصیل ان کے سوانحی خاکوں کے مجموعہ ''میرے ہم قدم'' میں موجود اختر شیرانی کے خاکے سے عیاں ہوتی ہے۔ وہ اختر شیرانی کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری، ان کی مہر و وفا اور خوش اخلاقی کے بھی معترف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قاسمی کی ابتدائی شاعری میں اختر کے رنگ کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ قاسمی لکھتے ہیں:

> ''جس وقت میں نے شعر کہنا شروع کیا تو بیک وقت اقبال، جوش، ظفر علی خان اور اختر شیرانی سے متاثر تھا۔۔۔ بعد میں میری پسند میں غالب اور میر بھی شامل ہو گئے مگر اختر کا طلسم بھی قائم رہا۔۔۔ بلکہ بعض تحفظات سے قطع نظر اب تک قائم ہے۔'' ۳۸

قاسمی کی تخلیقات میں فطرت نگاری اور رومانیت کی جھلک اختر شیرانی کی مرہونِ منت ہے۔ علاوہ بریں اختر کے نسوانی کرداروں سلمیٰ، ریحانہ، عذرا سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی اپنی تخیلاتی دنیا کی ملکہ ''صبوحی'' کا کردار تخلیق کیا۔ یہ صبوحی اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی نہیں بلکہ پنجاب کے دیہاتی ماحول سے مطابقت رکھنے والی خوب صورت اور معصوم جذبات کی مالک ہے۔ ابتدا میں قاسمی نے اختر کے رنگ میں ہی شاعری کی۔

کسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں ۳۹

یہ شعر سن کر اختر شیرانی نے کہا تھا۔ یہ غزل تو مجھے کہنا چاہیے تھی تم نے کیسے کہہ دی۔

قاسمی کی ملاقات عبدالمجید سالک سے تلاشِ روزگار کے دوران لاہور میں ہوئی۔ سالک ان دنوں روزنامہ ''انقلاب'' کے مدیر تھے۔ سالک اپنی ہر دل عزیز شخصیت اور علمی مرتبے کی بدولت نووارد ادیبوں کے لیے مشعل راہ تھے۔ قاسمی بھی سالک مرحوم کی خاص شفقت، محبت اور خلوص سے متاثر ہو کر حلقۂ عقیدت میں آ گئے۔ یہ عقیدت و محبت سالک کی زندگی تک قائم رہی۔ سالک، قاسمی کو قیمتی مشوروں سے نوازتے۔ ان کے مشوروں کے طفیل چند برسوں میں ہی انھوں نے دنیائے ادب میں اپنا مقام پیدا کیا اور احمد ندیم قاسمی کے نام سے معروف ہوئے۔ سالک مرحوم سے والہانہ عقیدت کا اظہار اپنے دوست محمد فاضل کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''میں یقین سے کہتا ہوں کہ انشاء اللہ وہی کچھ بن کر دکھاؤں گا جو میرے آقا (سالک صاحب) نے مجھے سمجھ رکھا ہے۔ مستقبل کی وسعتیں میرے سامنے ہیں۔ خدا کا فضل، رسول کی نظر اور سالک صاحب قبلہ جیسے ہمدردوں کی خلوص بھری دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ میں اس راہ پر ثابت قدمی سے چلوں گا اور جب میں اس معیار پر پہنچوں گا جس کی رو سے میں قبلہ سالک صاحب کی اُمیدوں کے مطابق اچھا شاعر سمجھا جاؤں گا تو اپنے آپ کو قبلہ سالک صاحب کے قدموں میں گرا کر کہوں گا کہ ''میرے محترم'' مجھ میں جو کچھ ہے وہ آپ کا ہے اور میری ساری کامیابیوں کا سہرا آپ کے سر پر ہے۔ اس روز کے بعد اگر میں مر بھی جاؤں تو مجھے افسوس نہیں ہوگا۔'' [۱۴]

قاسمی کو عبدالمجید سالک سے بہت عقیدت تھی۔ انھی کے ایما پر قاسمی نے ملتان میں افسر آب کاری کی ملازمت کافی عرصے تک برقرار رکھی۔ انھی کی خواہش پر قاسمی نے فکاہیہ کالم لکھے جو سالک مرحوم نے روزنامہ ''انقلاب'' میں شایع کرائے۔ قاسمی کو سالک سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ یہ اسی محبت اور خلوص و احترام کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے شعری مجموعہ ''جلال و جمال'' میں انتساب کی جگہ ایک نظم بہ عنوان ''بارگاہِ سالک میں'' لکھی۔ اختر شیرانی اور عبدالمجید سالک نے قاسمی کی ادبی زندگی کی اُٹھان میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ قاسمی کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں لاہور میں آتے ہی ادب کی معروف شخصیات کی توجہ، شفقت اور محبت میسر آئی۔

قاسمی کی منگنی اپنے خالہ زاد بھائی مولوی ضیاء الدین صاحب کی صاحب زادی رابعہ بیگم (پیدائش ۱۹۳۰ء) بچپن میں ہو چکی تھی۔ رابعہ، وادی سون سکیسر کے ایک گاؤں ''کُھر کی'' میں مقیم تھیں۔ قاسمی مناسب ذریعہ آمدن نہ ہونے کے باعث ابھی رشتہ ازدواج سے منسلک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ بڑے بھائی اور والدہ کے اصرار پر شادی کے لیے رضامند ہوئے چناں چہ قاسمی اور رابعہ بیگم ۴ر جولائی ۱۹۴۸ء کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

> ''رابعہ بہت خوب صورت لڑکی تھی اور عمر میں ندیم سے بارہ تیرہ برس چھوٹی تھی۔ اُسے علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا لیکن اُس کے گاؤں میں ایسی سہولت نہ تھی۔ اپنے والد سے ہی گھر پر پڑھنا لکھنا سیکھا۔ اپنے منگیتر کے شعر و افسانے والے رسائل اُس کا سرمایہ

> تھے اور اُسے امید تھی کہ وہ بیاہ کے بعد ضرور تعلیم حاصل کر سکے گی۔ لیکن بوجوہ بیاہ کے بعد
> بھی اُسے اپنے شوہر سے بہت دور گاؤں میں ندیم صاحب کی والدہ کے پاس رہنا پڑا۔
> سال میں چند دن ہی رابعہ، ندیم کے پاس لاہور آپاتی تھی یا ندیم انگہ چلے جاتے۔'' [۱۴]

رابعہ، قاسمی کی والدہ کی وفات تک اُن کے ساتھ انگہ میں مقیم رہیں بالآخر مستقل طور پر ۱۹۶۲ء میں لاہور آ ئیں۔ اس وقت وہ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ رابعہ ایک شریف، ہمدرد، نیک دل، سراپا محبت، باحیا اور محبوب خصائل کی مالک خاتون تھیں۔ انھوں نے گھر میں ایک پُرسکون ماحول مہیا کیا جہاں ان کے شوہر نامدار اپنے اشعار کی تخلیق کرتے رہے۔ قاسمی اور رابعہ کے مزاجوں میں بہت تفاوت تھا۔ اختلافات رکھتے ہوئے بھی دونوں ایک دوسرے سے مخلص رہے۔ انتہائی کٹھن حالات میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہے۔ ذرائع آمدن محدود تھی جب کہ قاسمی فراخ دل تھے اور رابعہ بچیوں کی شادی اور گھر بنانے کی فکر میں گھلتی رہتیں۔ لہٰذا طے پایا کہ مشاعروں کی آمدن اور انعامات کی رقم قاسمی اپنی منشا سے خرچ کریں گے جب کہ کالم نگاری اور ملازمت کی آمدن گھر پر خرچ ہوگی اور رابعہ نے نہایت کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ذاتی گھر بھی تعمیر کرایا۔ انھوں نے ۱۹۸۷ء میں حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ زندگی کی گاڑی دو پہیوں پر بڑی ہموار رفتار سے چل رہی تھی۔ اگر اس کا ایک پہیہ بھی نکل جائے تو اس گاڑی کو کھینچ کر آخری منزل تک لے جانا نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ قاسمی نے تقریباً پینتالیس برس زندگی کے مختلف نشیب و فراز میں گزارے۔ رابعہ گزشتہ اڑتالیس برسوں کا حق رفاقت ادا کرتے ہوئے ۱۹۹۶ء کو خالق حقیقی سے جا ملی۔

قاسمی کو قدرت نے دو بیٹیوں ناہید قاسمی، نشاط قاسمی اور ایک بیٹے نعمان قاسمی سے نوازا۔ ناہید، قاسمی کی بڑی صاحب زادی ہیں جو ۱۹۴۹ء میں انگہ میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ۱۹۶۶ء میں میٹرک کا امتحان سی۔بی۔ماڈل اسکول سے پاس کیا۔ ایف۔اے کا امتحان ۱۹۶۸ء اور بی۔اے کا امتحان ۱۹۷۰ء میں لاہور کالج سے پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۷۳ء میں ایم۔اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں ۱۹۹۷ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ''جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ناہید قاسمی سمن آباد ڈگری کالج لاہور میں شعبہ اردو کی پروفیسر رہیں۔ اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہی ہیں اور قاسمی کی وفات کے بعد فنون کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دے رہی ہیں۔ ان کی شادی محمد حیات قاسمی سے اگست ۱۹۷۴ء میں ہوئی۔ محمد حیات قاسمی ہائی کورٹ کے مقبول وکیل ہیں۔ ناہید کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا نیرؔ اور تین بیٹیوں نفیسہ، نیلم اور ناموس سے نوازا۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتب میں ''ناصر کاظمی شخصیت اور فن'' (۱۹۹۰ء)، ''بنجر دل کو سیراب کرو'' (۱۹۹۱ء)، ''جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری'' (۲۰۰۲ء)، ''ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ'' (۲۰۰۲ء) شامل ہیں۔ علاوہ ازیں متفرق تنقیدی مضامین پر مشتمل ''اپنی رائے'' اور بچوں کے ادب پر مشتمل کتاب ''آؤ بچو سنو کہانی'' زیر طبع ہے۔

قاسمی کی دوسری بیٹی نشاط قاسمی کی پیدائش ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ نشاط نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ ان کی شادی پیرزادہ محمد بخش کے صاحب زادے پیرزادہ محمد خالد سے فیصل آباد میں ہوئی۔ نشاط کی دو بیٹیاں نوشین، نوشابہ اور ایک بیٹا خرم ہے۔ نشاط کی اولاد سمندری ضلع فیصل آباد میں مقیم ہے۔ نشاط خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھیں کہ ڈاکٹروں کی غفلت کا شکار ہو کر ۱۹۹۵ء میں ابدی نیند سو گئیں۔ نشاط کی بڑی بیٹی نوشین کی شادی ناہید کے اکلوتے بیٹے نیر سے ہوئی۔

قاسمی کے اکلوتے بیٹے کا نام نعمان ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۵۶ء بمقام انگہ میں ہوئی۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۷۶ء میں بی۔اے کیا۔ حصولِ تعلیم کے بعد واپڈا کے محکمے میں سرکاری نوکری اختیار کی۔ تا حال اسی شعبہ سے وابستہ ہیں۔ نعمان کی اولاد میں ایک بیٹا نمو اور تین بیٹیاں نوین، نایاب، نشا شامل ہیں۔

کئی افراد قاسمی کے دل کے قریب تھے۔ ان سے اگرچہ خون کا رشتہ تو نہ تھا لیکن عمر بھر ان سے تعلق نبھاتے رہے مثلاً خدیجہ مستور معروف ناول نویس و افسانہ نگار جو معروف صحافی اور افسانہ نگار ظہیر بابر کی اہلیہ تھیں۔ ان کا ناول ''آنگن'' تقسیم ہند کے مناظر کو حقیقی المیہ انداز سے بیان کرتا ہے۔ ہاجرہ مسرور ''نقوش'' میں معاون مدیر رہیں۔ یہ دونوں بہنیں قاسمی کو بہت عزیز تھیں۔ ہاجرہ اب ضعیف ہو چکی ہیں۔ وہ کراچی میں اپنے بچوں کے ہمراہ مقیم ہیں۔ قاسمی کی منہ بولی بیٹیوں میں پروین شاکر، منصورہ احمد شامل تھیں۔ منصورہ احمد نے قاسمی کی رفاقت میں تیس برس گزارے۔ ''فنون'' کی معاون مدیر رہیں۔ عمر بھر ان کی خدمت کرتی رہیں۔ منصورہ لاہور کے پبلشنگ ادارے ''اساطیر'' کی مالک تھیں۔ قاسمی کی رحلت کے بعد انھوں نے اپنا ذاتی مجلّہ ''مونتاج'' شایع کیا جس کا پہلا نمبر ''نذرِ ندیم'' تھا۔ منصورہ کا انتقال جون ۲۰۱۱ء میں ہوا۔

قاسمی کی ادبی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے لاہور میں دارالاشاعت پنجاب کے زیرِ اہتمام شایع ہونے والے دو رسالوں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کی ادارت سنبھالی۔ قاسمی نے اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ستر روپے ماہوار پر یہ ملازمت شروع کی۔ اس کی تفصیل امتیاز علی تاج کے خاکے میں درج ذیل الفاظ میں درج ہے:

> ''میں نے ملتان میں افسر آب کاری کی ملازمت کے یہ دو ڈھائی برس انتہائی بے چینی اور کرب میں بسر کیے۔ مولانا سالک کو اس کا علم تھا کیوں کہ وہی میری فریادگاہ تھے اور میں انھی کے سامنے کھل کر رو پیٹ سکتا تھا۔ وہ میری ہمت بندھاتے اور تسلیاں دیتے رہے اور آخرکار ایک خوشگوار صبح کو مجھے ان کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ لاہور آ کر ہفتہ وار ''تہذیب نسواں'' اور ہفتہ وار ''پھول'' کی ادارت سنبھال لو۔ میں مستعفی ہو کر ملتان سے بھاگا اور ۱۹۴۲ء میں دارالاشاعت پنجاب سے منسلک ہو گیا۔'' [۴۲]

کالج میگزین کے بعد کسی رسالے کی باقاعدہ ادارت کا یہ پہلا تجربہ تھا لیکن ذہین و ہونہار قاسمی نے اپنی نوآموزی کے باوجود احسن طریقے سے یہ فرض ادا کیا۔ یہاں قاسمی کی مدیرانہ صلاحیتوں کو نکھرنے کا بہت موقع ملا جس کی وجہ سے انھیں ایک بڑی ملازمت ملی۔ ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی ادارت سے فیض احمد فیض کے مستعفی ہونے کے بعد چوہدری برکت علی (بانیِ ادب لطیف) کی نگاہ انتخاب قاسمی پر ٹھہری۔ چناں چہ قاسمی نے ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی ادارت کا کام ستمبر ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۶ء تک تیس روپے معاوضہ کے طور پر قبول کیا۔ جب کہ ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' بھی انھی کے زیرادارت رہے۔ ''ادب لطیف'' ان دنوں ادبی رسائل کی دنیا میں ترقی پسند مجلّہ تھا۔ قاسمی نے اکتوبر ۱۹۴۳ء میں باقاعدہ طور پر ترقی پسند فکر کا اظہار علی الاعلان کیا۔ اسلام دوستی ان کا محورِ حیات تھا۔ وہ ترقی پسندی کے ملحدانہ نظریات کے خلاف تھے۔ خدا اور رسولؐ سے محبت کرنے والے سچے اور کھرے مسلمان تھے۔ ہادی اور ہادیِ اسلام سے محبت کا اندازہ ان کی حمد و ثنا اور نعتوں سے ہوتا ہے جو صمیم قلب سے عقیدت میں ڈوب کر لکھی گئیں۔

البتہ ترقی پسند نظریات میں انسان دوستی اور عظمت انسانی کے نظریات کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھا اور خدا کا خوف اس سے آگے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتا تھا اور پھر چچا جان مرحوم کا یہ فرمان کہ خدا کے وجود کے بارے میں سوچنا تک کفر ہے۔ وہ ہے۔ بس! وہ کیوں ہے اور کیسے ہے؟ یہ خیال صرف کافر ہی کے دل میں پیدا ہوسکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی ایک نظم ''تذبذب'' میں جو ''جلال و جمال'' میں شامل ہے۔ کہا ہے:
>
> خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک   کہاں خرد کی اُڑانیں، حریم ذات کہاں
>
> کہاں وہ زندہ و پائندہ حسنِ لامحدود   مرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں '' [۴۳]

قاسمی بہادر جفاکش انسان تھے جو اپنے نصب العین سے شدید محبت کرتے تھے۔ وہ شعروں کے ذریعے اپنے موقف کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت پیش آنے پر پرچم لے کر میدان میں بھی آئے۔ اسی نصب العین کی خاطر جیل کی ہوا کھانی پڑی لیکن ان کے جوش اور لگن میں کمی نہ آئی۔

قاسمی انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے پہلے سیکرٹری جنرل کے عہدے پر ۱۹۴۹ء میں فائز ہوئے۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو متحرک کیا۔ ہفتہ وار جلوس منعقد کرائے۔ چناں چہ مئی ۱۹۵۱ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت چند ماہ قید و بند کی صعوبتیں اُٹھائیں۔ بالآخر نومبر ۱۹۵۱ء میں رہا ہوئے۔ اس طرح وہ ترقی پسندانہ فکر کے مالک تھے یہ ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان کانفرنس کے آخری سیکرٹری بھی رہے۔ محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔اس طرح وہ گنتی کے چند ادیبوں میں شامل ہو گئے جنھوں نے ادب میں ترقی پسند فکریت کی سرخروئی کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں اُٹھائیں۔'' [۴۴]

قاسمی دوسری بار سیفٹی ایکٹ کے تحت (مارشل لا) دور میں اکتوبر ۱۹۵۸ء سے فروری ۱۹۵۹ء تک نظر بند رہے۔ اس نظر بندی کے متعلق قاسمی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔۔مجھے محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک مضمون ملا۔ اس کا عنوان تھا ''کیا یہ مارشل لا ہے؟'' مطلب یہ تھا کہ یہ نعمت خداوندی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں یہ مضمون نہیں چھاپ سکتا۔ اس پر مجھے اوپر سے پیغام ملا۔ ہم اپنے آدمی بھیج دیں؟ میں نے کہا: جناب بھیج دیجیے۔ چناں چہ ادھر ایک آدمی مضمون واپس لے کر گیا اور اُدھر دوسرا آدمی میرے وارنٹ گرفتاری لے آیا اور مجھے پکڑ کر اندر کر دیا گیا۔'' ۴۵

ہاجرہ مسرور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''۔۔۔ایک بار پھر ندیم بحیثیت ایڈیٹر ''امروز'' ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے لاہور جیل، راول پنڈی جیل اور وہاں سے شاہی قلعے لاہور کے چکر لگاتے رہے اور اس طرح انھوں نے اپنی قید کے سو (۱۰۰) دن پورے کیے۔'' ۴۶

ترقی پسند رسالہ ''ادب لطیف'' کے سالنامے میں منٹو کا افسانہ ''بو'' شایع کیا۔ اس مضمون سے خفا ہو کر حکومتِ پنجاب نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت ۱۹۴۴ء میں گرفتار کیا۔ یہ مقدمہ ایک برس تک چلتا رہا۔ بعدازاں مئی ۱۹۴۵ء میں مقدمہ سے بری ہوئے۔ جب مجلّہ چھپ کر آیا تو منٹو کی تحریر پر مقدمہ ہو گیا کیوں کہ افسانہ ''بو'' کی ہیروئن ایک عیسائی لڑکی تھی۔ عیسائی مستشرقین نے اس بنا پر مقدمہ کیا کہ منٹو نے عیسائی مذہب کی توہین کی ہے۔ ان مقدمات کی کارروائیاں بھگتتے رہے۔ ذہنی تناؤ، شدید اعصابی کم زوری کا شکار ہو کر ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ کچھ عرصہ زیرِ علاج رہنے کے بعد واپس انگہ چلے گئے۔ چناں چہ انگہ کے صحت افزا مقام کی آب و ہوا اور والدہ کی توجہ و محبت سے قاسمی کی صحت بہتر ہونے لگی۔ منٹو سے گہرے دوستانہ مراسم، مختلف رسائل و جرائد سے وابستگی اور ایک برس کی گرفتاری نے انھیں ایک پختہ مزاج ترقی پسند ادیب بنا دیا۔ اسی دوران سجاد سرور نیازی (پشاور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر) نے انھیں پشاور بلا لیا جہاں قاسمی اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ۱۹۴۸ء کے آغاز تک وابستہ رہے۔ ریڈیو کے توسط سے انھیں مختلف شعرا و ادبا سے ملنے اور ان کے خیالات جاننے کے مواقع ملے۔ یہ وہ دور تھا جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ قاسمی بھی دیگر افراد کی مانند ایک نئے ملک پاکستان کے حصول میں لگ گئے تاکہ وہ اپنے قلم کے ذریعے استحصال کو روک سکیں اور انسان کے بنیادی مسائل افلاس، بھوک، معاشرتی تنزل کو دُور کر کے نئے ملک کو امن و خوش حالی کا گہوارہ بنا سکیں۔ جب ان کی منہ بولی بہنیں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور لکھنو سے ترکِ وطن کر کے ۱۹۴۸ء میں لاہور آ گئیں تو ان کی سرپرستی کی خاطر قاسمی ریڈیو اسٹیشن پشاور کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور آ گئے۔ روز بروز ترقی پسند تحریک مضبوط تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ نووارد شعرا و ادبا اس تحریک میں شامل ہو کر اسے توانائی عطا کر

رہے تھے۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد بیشتر شعرا اردو ادب میں نظر آتے ہیں۔ ان کا خمیر ترقی پسند تحریک سے ہی اُٹھا تھا۔ احمد ندیم قاسمی کا شمار بھی انہی ادبا و شعرا میں ہوتا ہے۔ لاہور میں ماہنامہ ''سویرا'' کے ابتدائی چار شمارے قاسمی کی زیرِ ادارت شایع ہوئے۔ قاسمی اور ہاجرہ مسرور نے محمد طفیل کے تعاون سے ۱۹۴۸ء میں ادبی مجلّے ''نقوش'' کا آغاز کیا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر بھی قاسمی ہی تھے۔ انھوں نے بحیثیت پبلشر بھی کئی امور کی انجام دہی کی۔ اس کی تفصیل محمد خالد اختر بتاتے ہیں کہ انھوں نے ایک سال پبلشر کی حیثیت سے بھی کام کیا اور فسانہ خواں سے ہاجرہ اور اپنے مجموعے بھی شایع کیے لیکن پبلشر کے فرائض سے ناآشنا ہونے کے باعث فسانہ خواں زوال پذیر ہوا۔ البتہ ''نقوش'' کے ابتدائی دس شماروں کی ترتیب و تدوین کے بعد ۱۹۴۹ء میں قاسمی اور ہاجرہ مسرور اس ادبی مجلّے سے دست بردار ہو گئے۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہماری ترقی پسندانہ انتہا پسندی سے گھبرا کر ہمارے دوست محمد طفیل نے ہمارے ساتھ چلنے سے معذرت کر لی۔ ظاہر ہے ہم تو خالی ہاتھ تھے۔ اُن کے بغیر رسالہ چلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ''نقوش'' ان کے سپرد کر دیا اور خود بے روزگاری کے صحرا میں داخل ہو گئے۔'' [۴۷]

قاسمی نے لاہور سے ماہنامہ ''سحر'' کا ایک شمارہ ۱۹۵۰ء میں نکالا۔ انھوں نے روزنامہ ''امروز'' میں ''پنج دریا'' کے نام سے مارچ ۱۹۵۲ء میں کالم نویسی کی ابتدا کی۔ بعدازاں مارچ ۱۹۵۳ء میں ''امروز'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۹ء تک ''امروز'' کی ادارت کے فرائضِ منصبی سرانجام دیتے رہے۔ ان کی شبانہ روز کاوشوں سے ''امروز'' ایک ہر دل عزیز مجلّہ بن گیا اور عوامی مسائل اس میں اُجاگر ہونے لگے۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں نے مارشل لا نافذ کر کے ملک کا نظامِ حکومت سنبھالا تو قاسمی نے عوامی مسائل کو اُجاگر کیا جن کا حکومت نے سختی سے نوٹس لیا چنانچہ قاسمی کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں فروری ۱۹۵۹ء میں رہائی ملی۔ حکومت نے ''امروز'' کو سرکاری تحویل میں لے لیا۔ چنانچہ جب اپریل ۱۹۵۹ء میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا انتظام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انتظامیہ میں تبدیلیاں لائیں گئیں۔ قاسمی کا عہدہ بدستور قائم رہا لیکن انھوں نے اس ادارت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ نئے ایڈمنسٹریٹر کے استفسار پر قاسمی نے جواب دیا:

> ''اب تک میں بحیثیت ایڈیٹر جو کچھ لکھتا تھا وہ اخبار کی طے شدہ پالیسی کی روشنی میں لکھتا تھا اور جب یہ پالیسی ایک بار مجھے دے دی گئی تو پھر مجھے کسی مشورے یا مداخلت کا سامنا نہیں ہوا مگر اب صورتِ حال مختلف ہو گی۔ میں ہر روز نئے مشوروں اور نئی ہدایتوں کے تحت نہیں لکھ سکتا۔ دوسرے یہ کہ ایک اعلیٰ صحافتی اصول بھی ہے کہ جب اخبار کی پالیسی بدلے تو پرانے ایڈیٹر کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔'' [۴۸]

قاسمی کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ آزادی سے اخبار کے اداریے لکھنے والے کو اب پولیس ڈکٹیٹ کرائے۔ اس پر ایڈمنسٹریٹر نے قدرت اللہ شہاب جو (انفارمیشن سیکرٹری) تھے انھیں فون کیا تو انھوں نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد استعفیٰ منظور کر لیا۔ قاسمی ایک بار پھر بے روزگار ہو کر سڑک پر آ گئے۔ زندگی کے اس تلخ تجربے سے کئی بار دوچار ہوئے لیکن مخلص دوستوں اور عزیزوں کی محبت نے ان کے حوصلوں کو بلند رکھا۔ چناں چہ بے روزگاری کے اس کٹھن دور میں قاسمی نے بعض اہلِ قلم کے رویوں میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ لکھتے ہیں:

''میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ادیب برادری میں بھی کچھ لوگ کری سے اتنی محبت کر سکتے ہیں کہ میں ان کے مہمان کی حیثیت سے جاؤں اور وہ نظر بچا جائیں۔'' ۴۹

بے روزگاری کے اس کٹھن دور میں قاسمی نے تراجم کیے، اخباروں میں کالم لکھے، فلموں کے فیچر، مکالمے، گیت اور افسانے لکھے۔ غرض تحریری امور کی انجام دہی میں عار محسوس نہ کی۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں اپنا ذاتی مجلّہ ''فنون'' نکالنے کا منصوبہ کیا لیکن ترقی پسند ہونے کی وجہ سے رسالہ کا ڈیکلیریشن حاصل کرنا محال تھا چناں چہ انھوں نے حکیم حبیب اشعر دہلوی کے نام سے ڈیکلیریشن بھی اپنے نام کرا لیا۔ ''فنون'' کو قاسمی نے نہایت محنت سے جاری کیا۔ جلد ہی ''فنون'' اس مقام پر آ گیا کہ ادیب و شاعر اس جریدے میں اپنی تخلیقات شایع ہونے پر فخر کرنے لگے اور قاسمی نے دیگر تمام الجھنوں سے نجات حاصل کر کے ''فنون'' کے معیار کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ اس مجلّے نے نوارد شعرا اور ادیبوں کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ شعر و ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو قاسمی کی گرفت سے باہر ہو۔ ''فنون'' قاسمی کی زندگی تک شایع ہوتا رہا۔ ''فنون'' نے ۴۴ برس ادب کی خدمت کی اور اس کے ۱۲۶ شمارے منظرِ عام پر آئے۔ قاسمی ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک رسالہ ''اقبال'' لاہور کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ پروفیسر حمید احمد خان کی رحلت کے بعد ۱۹۷۴ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کے سرپرست اعلیٰ بھی رہے۔ انھوں نے مجلس ترقی ادب لاہور سے شایع ہونے والا مجلّہ ''صحیفہ'' کی ادارت تادمِ آخر جاری رکھی، ان کی زندگی کا مقصد اردو ادب کی خدمت اور نووارد تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی تھا۔ انھیں جہاں بھی تخلیق کاروں کی نگارشات میں توازن دکھائی دیا برملا اس کا اظہار کیا۔ قاسمی کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف انتظار حسین ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ادیب ہونے کے علاوہ قاسمی ایک ادبی شخصیت بھی رکھتے تھے۔ ہر ادیب ادبی شخصیت بن جانے کا اہل نہیں ہوتا کیوں کہ ان میں عام طور پر یہ کمی ہوتی ہے کہ اُن میں انا بہت ہوتی ہے۔ قاسمی صاحب دوسروں کے لیے بہت گنجائش رکھتے تھے۔ وہ اپنے خردوں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے اور جن میں ادبی صلاحیت نظر آتی ہمیشہ اُن کی سرپرستی کرتے۔'' ۵۰

۱۹۴۵ء میں جب آزادی پاکستان کی تحریک جاری تھی۔ تمام مسلمان جوش و خروش سے تحریک میں حصہ

لے رہے تھے چناں چہ قاسمی نے بھی اپنے بھتیجے ظہیر بابر کے ہمراہ تحریک آزادی کے لیے مختلف علاقوں سے کارکن تیار کیے، جلسے منعقد کرائے۔ پھر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے طالب علموں کو انگہ مدعو کیا تا کہ ان کے مشترکہ تعاون سے اس تحریک کو مزید تقویت ملے۔

قاسمی سیر وسفر کے نوعمری سے شوقین تھے۔ زمانہ طالب علمی میں وسائل نہ ہونے کے باعث پیدل چلتے رہتے۔ اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک جب بھی سفر کا موقع ملا، بہ خوشی قبول کیا۔ قاسمی بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت کے لیے بھی گئے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستانی اخبارات کے مدیروں کے ایک وفد کے ہمراہ چین گئے۔ اس وفد کے لیڈر فیض احمد فیض تھے۔ وہاں ایک ماہ قیام کے دوران قابل دید مقامات دیکھے۔ انھوں نے کینٹن، منچوریا، سنکیانگ کی سیر کی۔ دورانِ سفر ہانگ کانگ اور بنکاک میں بھی مختصراً قیام کیا۔ علاوہ ازیں روس، جاپان، سعودی عرب، ابوظہبی کی سیاحت بھی کی۔ قاسمی نے اپنی اہلیہ کے ہمراہ ۱۹۸۸ء میں فریضہ حج بھی ادا کیا۔ اپنے محسوسات اور روحانی واردات و کیفیات کا اظہار حج نامہ کی صورت میں کیا جو روزنامہ جنگ کے جمعہ ایڈیشن میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔

قاسمی کے چچا فارسی و اردو شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ وہ انگریزی زبان کے مقابلے میں اردو و فارسی کو ترجیح دیتے۔ ان کے مطالعہ کا دائرہ وسیع تھا۔ انھیں اردو، انگریزی اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ مطالعہ کتب ان کا مشغلہ تھا۔ جن دنوں آنکھوں میں تکلیف تھی مطالعہ کا شغل تب بھی جاری رہا۔ چچا کا مذہبی اور تاریخی مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ بڑے بڑے علما پر چھا جاتے تھے۔ فکر میں گہرائی تھی اور زبردست قوت استدلال کے مالک تھے۔ ان کی علمیت، فارسی دانی اور حسن اخلاق کے بیشتر افراد قائل تھے۔ قاسمی نے اپنے زمانہ طالب علمی میں چچا کا بہت اثر قبول کیا۔ درحقیقت قاسمی کو احمد ندیم قاسمی بنانے میں ان کی والدہ، اساتذہ کے علاوہ چچا کی ابتدائی تربیت اور قربت کا بہت عمل دخل ہے۔ چچا کو فارسی نظم و نثر پر ماہرانہ قدرت تھی۔ کلاسیکی شعرا کے گہرے مطالعہ کے علاوہ انھیں فردوسی، خاقانی، نظامی، انوری اور غالب کے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ پیرزادہ حیدر بخش نے انھیں بچپن ہی میں مولانا مودودی کی تفسیر، کلامِ اقبال، دیوانِ غالب کا مطالعہ کرایا۔ اس لیے اوائل عمری میں ہی قاسمی کو غالب اور اقبال کے اشعار ازبر تھے اور شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور عرفی سے بہت متاثر تھے لیکن جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو اقبال، راشد، فیض، میراجی، منٹو، محمد حسن عسکری اور مجید امجد کی شاعری اور افکار و نظریات کا مطالعہ کیا لہٰذا قاسمی کا رجحان بھی مغربی ادب کی جانب ہوا۔ انھوں نے شیکسپیئر، موپاساں، ترگنیف، چیخوف اور کامیو کا مطالعہ کیا۔ صہبا لکھنوی ''افکار'' کے ندیم نمبر میں لکھتے ہیں:

> ''انگریزی کے توسط سے یا بعض اردو تراجم کے ذریعے ہومر اور افلاطون سے لے کر
> ایلیٹ اور پاؤنڈ تک کو پڑھ ڈالا۔ نیز روس، فرانس، جرمنی اور انگلستان کی فکشن کا سلسلہ وار

مطالعہ کیا۔ شاعری میں گوئٹے اور شیکسپیئر اور فکشن میں ٹالسٹائی اور فلابیر نے دل موہ لیا،
فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ پھر بھی اس سے بے پناہ شغف ہے۔ فلسفہ تاریخ میں
آپ ابن خلدون اور ٹوائن بی کا اب تک نہایت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ علم نفسیات
کے زعما میں آپ کسی سے مطمئن نہیں۔ البتہ فرائڈ اور ژونگ کو ضرور پڑھا ہے اور ان کے
کمالات کے قائل ہیں۔'' ۵۱

قاسمی کو اُن کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ یہ طویل عمر کے باوجود آخری لمحوں تک ذہنی، علمی اور تخلیقی طور پر سرگرم، متحرک اور مستعد رہے۔ انھوں نے اپنے علمی و ادبی کاموں پر بہت سے ایوارڈ وصول کیے۔ انھوں نے اگرچہ عوام کا ساتھ دیتے ہوئے حکومت کے خلاف لکھا۔ غلام گردشوں کے ذریعے کسی حکمران یا سیاست دان سے ذاتی مفاد حاصل نہ کیے۔ قاسمی نے کل پاکستان مقابلہ اردو نظم بہ عنوان ''پیغام عمل'' بہ اہتمام انجمن حمایت اسلام (گولڈن جوبلی نمبر پر) ۱۹۳۹ء میں گولڈ میڈل حاصل کیا جسے قاسمی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے وصول کیا۔ ریڈیو پاکستان پشاور نے ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو اپنے پروگرام کا آغاز قاسمی کے نغموں اور ترانوں سے کیا۔ قاسمی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن تھے لہٰذا انھیں جنرل سیکرٹری کے عہدے پر ۱۹۴۹ء میں فائز کیا گیا۔ حکومت پاکستان نے ان کے شعری مجموعے ''دشت وفا'' پر ۱۹۶۴ء میں ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' سے نوازا۔ جنرل ایوب کے دور میں پرائیڈ آف پرفارمنس کا سول اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۷۶ء میں قاسمی کے شعری مجموعہ ''محیط'' اور ۱۹۷۶ء میں ہی دوسرے شعری مجموعے ''دوام'' پر آدم جی ادبی ایوارڈ حاصل کیا۔ ۱۹۷۹ء میں قاسمی نے دوحہ ادبی ایوارڈ (یو۔اے۔ای) اور غالب ایوارڈ (دہلی بھارت) سے حاصل کیا۔ حکومت پاکستان نے قاسمی کو ۱۹۸۰ء میں ''ستارہ امتیاز'' جیسے وقیع اعزاز سے نوازنے کا اعلان کیا۔ وہ فوجی حکومت سے انعام لینے میں متردد تھے۔ لیکن دوست احباب، عزیزوں اور محبوں کے مشورے سے طوعاً و کرہاً ایوارڈ وصول کر لیا۔ انھوں نے کمال فن ایوارڈ ۱۹۹۸ء میں حاصل کیا۔ نشانِ امتیاز ایوارڈ سے ۱۹۹۹ء میں نوازا گیا۔ فیض محمد ٹرسٹ بھکر نے سال کی بہترین تخلیقات پر ''احمد ندیم قاسمی ادبی ایوارڈ'' کا اجرا ۲۰۰۱ء میں کیا۔ قاسمی نے اے۔آر۔ وائے گولڈ ادبی ایوارڈ ۲۰۰۲ء میں حاصل کیا۔ امجد اسلام امجد نے قاسمی کی زندگی میں ہی اُن کی شخصیت و فن پر ایک ڈاکومینٹری ویڈیو فلم ''احمد ندیم قاسمی۔ ٹریبیوٹ ٹو اے لونگ لیجنڈ'' کے نام سے تیار کی۔ پنجاب یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر احمد بلال نے قاسمی سے بالمشافہ ملاقات کی اور ایک دستاویزی فلم اکتوبر ۲۰۰۵ء میں تیار کی۔ نفیسہ حیات قاسمی (قاسمی کی نواسی، ناہید قاسمی کی بیٹی) نے کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن، پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ''ایم ایف اے'' پینٹنگ کا مقالہ مئی ۲۰۰۵ء میں مکمل کیا۔ نفیسہ حیات قاسمی کے بنائے ہوئے قاسمی کے پورٹریٹس کی نمائش الحمرا آرٹ گیلری لاہور

میں نومبر ۲۰۰۶ء میں ہوئی۔ اپریل ۲۰۰۸ء کو بچوں کے بین الاقوامی یومِ کتب کے موقع پر بھارت میں منعقدہ تقریب میں پیش کی گئی کہانیوں میں قاسمی کی کہانی ''جلیبیاں'' کو بے حد سراہا گیا۔ ۲۰۰۹ء میں محکمہ ڈاک پاکستان نے قاسمی کی تیسری برسی پر ''ندیم یادگاری ٹکٹ'' جاری کیا۔ ملک اور بیرون ملک کے ٹی۔وی چینلز ندیم کے متعدد افسانوں کو ڈرامائی تشکیل دے چکے ہیں۔ بیرونِ ملک اور بہت سی غیرملکی زبانوں مثلاً ترکی، چینی، جاپانی، روسی، ہندی اور انگریزی میں قاسمی کی تخلیقات کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ بریں فیچر فلموں ''دو راستے'' اور ''لوری'' کے مکالمے لکھنے پر سال کے بہترین مکالمہ نویس کا ''نگار ایوارڈ'' بھی ان کے حصہ میں آیا۔ ڈاکٹر افشاں ملک قاسمی کے پروقار اعزازات کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''اتنے پروقار اعزازات کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے احمد ندیم قاسمی کسی شوونڈو میں لگے ہوئے کسی شوپیس یا عجائب گھر کی زینت بنے ہوئے کوئی ایسا بارعب مجسمہ تھے جس کو بس دُور سے ہی دیکھ کر مسرت محسوس کی جا سکتی ہے۔'' ۵۲

قاسمی عمر عزیز کے آخری حصہ میں ضعف کے باوجود ادبی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ عمر کی دیمک رفتہ رفتہ ان کے وجود کو چاٹ رہی تھی۔ قاسمی دل اور پھیپھڑوں کے امراض میں عرصہ دراز سے مبتلا تھے۔ عمر کے آخری وقت تک جینے کا ولولہ، کچھ کر جانے کا ارمان، علمی کتاب کے مطالعہ کا شوق اور دنیا کی نیرنگیوں سے دل چسپی رہی۔ زندگی کے آخری برسوں میں دمے کے مرض نے اذیت میں مبتلا کیا لیکن اس کے باوجود نہایت ہمت سے بیماری کا مقابلہ کرتے رہے۔ وقفے وقفے سے اسپتال میں داخل ہوتے، انجکشن لگوائے جاتے جس سے وقتی طور پر طبیعت سنبھل جاتی اور وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں پھر سے مستعد ہو جاتے۔ سانس لینے میں دشواری کے باعث انھیں ۶ رجولائی ۲۰۰۶ء کو پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں داخل کرایا گیا۔ قاسمی کارڈیالوجی سینٹر میں تین روز تک رہے۔ بروز اتوار طبیعت خاصی بہتر ہوگئی۔ سانس لینے میں قدرے آسانی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹروں نے آکسیجن ہٹا دی اور پرامید تھے کہ اگلے روز اسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔ قاسمی نہایت خوش گوار لہجے میں باتیں کر رہے تھے، چہرے پر اضمحلال کی بجائے بشاشت اور تازگی تھی کہ اچانک حالت بگڑنے لگی۔ سانس رکنے لگا، مصنوعی طریقے سے سانس دیا گیا لیکن ۱۰ رجولائی ۲۰۰۶ء بروز پیر ۱۳ رجمادی الثانی ۱۴۲۷ھ کو عالم فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ کر گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر نواسی (۸۹) برس تین ماہ بیس دن تھی۔ سوگواروں میں ایک بیٹا نعمان اور بیٹی ناہید قاسمی شامل تھیں۔ ناہید قاسمی اپنی کیفیات کو الفاظ کا پیرہن اس طرح پہناتی ہیں:

> ''۔۔۔میں نے ابرآلودہ صبح کی ہلکی سی گلابی روشنی میں دیکھا کہ بڑے سے صاف ستھرے سفید بیڈ پر میرے اباجی اپنے نیلے سے گرے رنگ کے نفیس لباس میں سیدھے لیٹے تھے۔

ان کا سنجیدہ پُرسکوں چہرہ میرے سامنے تھا۔ ان کے سنورے ہوئے سفید بال آہستہ سے لہرا رہے تھے۔ وہ اس وقت بہت خوب صورت، بڑے مطمئن اور بے حد پُروقار دکھ رہے تھے۔ ایک فاتح کی مانند جیسے پُرسکوں نیند میں دو تین گھنٹے پہلے کی دھیمی دھیمی ہل چل کے اب آثار تک نہ تھے۔ اسپتال کا عملہ ان کے بیڈ کو سلائیڈ پر اوپر کی طرف ہموار رفتار سے دھکیل رہا تھا اور ہمارے ندیم کا وجود اس زمین سے اُٹھتا، بلندی کی طرف اس نیلے آسمان کی طرف قوس بناتا ہوا اوپر ہی اوپر، اونچے بڑے دروازے کے پار لے جایا جا رہا تھا۔'' ۵۳

قاسمی ایک روشن ستارے کی مانند تھے جو غروب ہو گیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے:

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا ۵۴

قاسمی کے جنازے کا وقت شام ساڑھے پانچ بجے تھا۔ ان کی نمازِ جنازہ گھر کے قریب ہی واقع امام بارگاہ کے کشادہ صحن میں ادا کی گئی جہاں پر مختلف ٹی وی چینلز سے تعلق رکھنے والے نمائندے بھی پہلے سے موجود تھے۔ ان کی نمازِ جنازہ میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ۱۰ر جولائی بروز پیر انھیں سمن آباد کے شاہ مشائخ قبرستان میں رابعہ بیگم (قاسمی کی اہلیہ) کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ قاسمی کی وفات پر ہر چہرہ سوگوار اور ہر آنکھ نم تھی۔ ان کی وفات پر ریڈیو، ٹیلی ویژن نے خصوصی پروگرام نشر کیے۔ مزید برآں پاکستان اور بھارت کے مختلف ادبی جرائد نے ان کی شخصیت اور فن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے خاص نمبر شایع کیے۔ اس سلسلے میں چند ممتاز اہلِ قلم نے اپنے تاثرات و احساسات کو الفاظ کا پیرہن اس طرح عطا کیا مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی صاحب کا وجود ان کے چاہنے والوں کے لیے ایک ایسا مینارہ نور تھا جو نہ صرف ان کی زندگیوں کی رہنمائی کرتا ہے بلکہ ظلمتوں میں تیز اُجلی روشنی بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ سیاست کے نہیں پوری طرح ادب کے آدمی تھے۔ ساری عمر شعر و ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔'' ۵۵

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، قاسمی کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اردو ادب کی پوری تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسری مثال ایسی ہو کہ کسی صنف کا قلم پون صدی تک مسلسل رواں دواں رہا ہے۔ علاوہ ازیں بہت ہی کم ادیب ایسے ہوں گے جن کے تحریری کام کی اتنی جہتیں ہوں۔ اگرچہ ہمارے ہاں بہت سے ادیبوں نے بیک وقت نظم و نثر میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے مگر۔۔۔ کسی کی شاعرانہ حیثیت فائق ہوتی ہے تو کسی کی نثری مگر قاسمی صاحب کی اہمیت غالباً دونوں میں ترازو کے دو ہموار پلڑوں کی طرح ہے۔'' ۵۶

اردو ادب کے مقبول افسانہ نگار انتظار حسین اپنے مضمون ''نا قابل تلافی نقصان'' میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب کے شان دار مردِ بزرگ احمد ندیم قاسمی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ہمارے ادب کے ایک پر جوش دور کی یاد دلایا کرتے تھے۔ وہ ممتاز ادیبوں کی اس کہکشاں میں شامل تھے جو ہمارے ادب کے ایک پورے عہد میں جگمگا رہی تھی۔'' ۵۷

خالد احمد اپنی قلبی واردات کو الفاظ کے سانچے میں اس طرح سمیٹتے ہیں:

> ''جہاں تک میرے ذاتی تاثرات کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک بار پھر یتیم ہو گیا ہوں۔ اُن کی موجودگی میرے لیے شفقت کا ایک سائبان تھی۔ اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے تنہا دھوپ میں کھڑا ہوں۔'' ۵۸

بانو قدسیہ نے کہا کہ بڑے آدمی آہستہ آہستہ ہمیں چھوڑ کر رخصت ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ بھارت کے ادیبوں نے بھی قاسمی کی گراں قدر فنی عظمتوں کو سراہا۔ نند کشور وکرم لکھتے ہیں:

> ''۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء کو دنیائے ادب احمد ندیم قاسمی ایسی عظیم المرتبت شخصیت سے محروم ہو گئی جو گزشتہ پون صدی سے اُردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دینے میں منہمک تھی اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ہمارے دور کے ہشت پہلو ادیب تھے جو اتنے طویل عرصے تک میدانِ ادب میں سرگرم عمل رہے اور ہر صنف ادب میں اپنے قلم کے جوہر دکھا کر اتنی غیر معمولی شہرت حاصل کی جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔'' ۵۹

محمد حمید شاہد نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف درج ذیل الفاظ میں کیا:

> ''ایک سے زیادہ تخلیقی جہات رکھنا میری نظر میں ایک غیر معمولی عطا ہے اور احمد ندیم قاسمی غیر معمولی تخلیق کار تھا۔'' ۶۰

خالد اقبال یاسر، قاسمی کی علمی و ادبی نگارشات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُنھوں نے نہ صرف مقدار کے اعتبار سے بہت کچھ لکھا بلکہ معیار کو بھی سامنے رکھا۔ میرے نزدیک وہ Grand old man of letter ہیں۔'' ۶۱

قاسمی نے قرطاس و قلم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اس قرطاس و قلم نے مخلص دوستوں کی طرح قاسمی کو زندگی کے تمام ثمرات، اعزازات اور انعامات سے نوازا۔ ان کی عزت، شہرت اور نام پر دیگر راہ پیماؤں کے لیے بھی قابلِ رشک تھی۔ اگرچہ قاسمی اور وزیر آغا کے اختلافات سے ادب کے سنجیدہ قارئین بخوبی آگاہ ہیں۔ عمر بھر اختلافات کے باوجود جب قاسمی عالم بقا کو سدھارے تو وزیر آغا نے نہ صرف جنازے میں شرکت کی بلکہ اپنے تاثرات کا اظہار بھی

درج ذیل الفاظ میں کیا۔ کہتے ہیں:

> ''ندیم صاحب کی وفات اردو دنیا کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ اردو ادب اور زبان کے لیے وقف کیا تھا۔ انھوں نے ایسی گراں قدر خدمات انجام دیں جنھیں ادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی وفات کی خبر سن کر بے حد دُکھ ہوا ہے۔'' ۶۲

قاسمی کی رسمِ قُل ۱۱ر جولائی ۲۰۰۶ء بروز منگل، بعد نمازِ عصر، مسجد صدیقیہ فاروقیہ، قتیل شفائی سٹریٹ، ندیم شہید روڈ، سمن آباد میں ادا کی گئی۔ اس رسمِ قُل میں بھی ان کے عقیدت مندوں نے شرکت کی۔

قوم کے لیے ۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء کا دن انتہائی الم ناک دن تھا اور اس دن احمد ندیم قاسمی بقضائے الٰہی اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ اسی روز ملتان میں ہوائی جہاز کے حادثے میں پینتالیس اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے۔ اسی دن عوام نے ایک اور اندوہ ناک خبر سنی۔ معروف اردو شاعر حکیم معین الدین نجمی اس جہانِ فانی سے جہانِ جاوداں کو رخصت ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی، معین نجمی اور ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہونے والے افراد کی یادیں ہمیشہ اہلِ درد کے دلوں میں جاگزیں رہیں گی۔

سیرت:

متناسب قد و قامت اور موزوں خدوخال شخصیت کے ظاہر کو پرکشش بنانے میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ قاسمی کا ظاہری سراپا وجاہت اور وقار سے بھرپور تھا۔ متوسط قد، توانا جسم، چھریرہ بدن، گھنے سیاہ بال، روشن پیشانی، گھنی بھنوئیں، نظر کی عینک سے جھانکتی ہوئی گہری بادامی آنکھیں، ستواں ناک، خوب صورت ترشے ہوئے ہونٹ، گورا رنگ، چوڑا سینہ، بھاری بھرکم ہاتھ، سنجیدہ چہرے پر عالمانہ تمکنت، بائیں گال پر چاقو کے لمبے زخم کا نشان، آنکھوں میں ذہانت و فطانت کی چمک، یہ سراپا اردو کے معروف نثر نگار اور شاعر احمد ندیم قاسمی کا ہے۔ ان کے اکلوتے صاحب زادے نعمان ندیم کا کہنا ہے:

> ''اباجی بے حد حسین جسم کے مالک تھے۔ اُن کے اعضاء کا تناسب اور اپنے آپ پر کنٹرول بے مثال تھا۔ میں گواہ ہوں کہ اُن کا وجود کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، چلتے پھرتے ہوئے، ہنستے بولتے ہوئے، غرض ہر لحہ پرکشش اور پُروقار مردانہ جسمانی وجاہت ظاہر کرتا اور ان کے چہرے کی رنگت آخری لحوں میں بھی زندگی سے بھرپور سفیدی میں جان دار سرخی لیے ہوئے تھی۔'' ۶۳

قاسمی نے قدرت سے نہ صرف مردانہ حسن و رعنائی کا بھرپور حصہ لیا بلکہ وہ ذہانت، فطانت اور عالی دماغی میں بھی ممتاز تھے۔ یہ ایک وجیہہ، خوش رو، ہنس مکھ اور خوش پوش انسان تھے جس کے مزاج میں طنطنہ، طبیعت میں ہمہ ہمی،

زبان میں کھنک، گفتگو میں نفاست، شستگی اور شیرینی تھی۔ وہ گفتار میں نستعلیق انداز کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت ہر لحاظ سے ظاہر و باطن میں جاذبِ نظر اور دل کش تھی۔ آغا سہیل لکھتے ہیں:

''ہیئت کے اعتبار سے جس طرح ایک متوازن، معتدل، معقول اور نرم رو سیدھی سادی شخصیت کے حامل نظر آتے تھے۔ باطن میں ایسے ہی نارمل نرم رو اور نک سک سے درست انسان واقع ہوئے ہیں۔'' ۶۴

عمدہ پہلو اور جامع الصفات شخصیت کے مالک؛ قاسمی کو خدائے بزرگ و برتر نے بہترین قلبی و ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ علمی و ادبی زندگی میں ان کا کردار و شخصیت اس قدر قدآور ہے کہ سپہرِ عظمت و بزرگی پر آفتاب بن کر چمکے۔ یہ ایک خوش پوش انسان تھے۔ اپنے لیے ہمیشہ اچھے رنگ اور عمدہ ڈیزائن کا انتخاب کرتے۔ طالب علمی کے زمانے میں سادہ شلوار قمیض، چھوٹا کوٹ اور سر پر ترکی ٹوپی ان کا لباس تھا۔ بعدازاں شہر میں سکونت پذیر ہونے کے بعد پینٹ شرٹ اور پینٹ کوٹ بھی زیب تن کرتے۔ گھر میں سفید رنگ کی شلوار قمیض کو ترجیح دیتے۔ موسم سرما میں انگریزی لباس اور نکٹائی پہنتے کیوں کہ موسم سرما میں انگریزی سوٹ جسم کو سردی سے محفوظ رکھتا ہے جب کہ موسم گرما میں عموماً سفید شلوار قمیض پہنتے۔ البتہ جب اپنے گاؤں انگہ جاتے تو وہاں کا خاص لباس تہہ بند، ململ کا سفید کرتا، چولا اور بڑی سی پگڑی سر پر باندھتے۔ بعض اوقات دائیں کندھے پر چادر یا رومال بھی رکھتے۔ فارغ بخاری نے اس دیہاتی لباس میں انھیں دیکھ کر ''پٹواری'' کہا۔ بقول خدیجہ مستور:

''اچھے کپڑوں پر ہمیشہ جان دیتے ہیں اور اچھے کپڑوں کا اندازہ قیمت سے لگاتے ہیں۔ اپنے لیے جوتا، کنگھا، برش، بلیڈ، ریزر، تیل یا اس قسم کی جو چیز بھی لائیں گے قیمتی سے قیمتی۔'' ۶۵

قاسمی بچپن میں بہت شرارتی ذہن کے مالک تھے۔ ان کو سب گھر والے احمد شاہ کی رعایت سے ''شاہ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ ہر شرارت کے کام میں پیش پیش ہوتے۔ ان کا دماغ ہمہ وقت طرح طرح کی شرارتوں کے لیے بے چین رہتا۔ گویا بذلہ سنجی ان کے مزاج کا جزو لاینفک تھی۔ یہ تعلیم کے سلسلے میں اپنے چچا پیر حیدر شاہ کے ہاں مقیم تھے۔ چچا کو مویشی، ولایتی مرغیاں، بلیاں اور دیگر جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز اچانک دو بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نوکروں نے ہر جگہ تلاش کیا لیکن بلیوں کا کہیں نشان نہ پایا۔ مرغیوں کا شور سن کر ان کے چچا اور چچی بھی صحن میں آ گئے۔ اچانک ان کے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش کو قاسمی کی عدم موجودگی کا شبہ ہوا۔ لکھتے ہیں:

''مجھے یوں ہی شبہ سا ہوا کہ کہیں وہی شرارت نہ کر رہا ہو۔ چناں چہ میں نے سراغ لگا لیا کہ مرغیوں کے ڈربے کے پاس ملازم کا جو بستر پڑا ہے۔ اس میں گھس کر بلیاں لڑ رہی ہیں۔ میں نے تیزی سے اوپر کی چادر کھینچی تو نیچے دیکھا کہ شاہ انگوٹھے اور انگشت شہادت کا درمیانی حصہ منہ میں رکھے، باگڑبلوں کی سی آوازیں نکال رہا ہے۔'' ۶۶

پیر حیدر شاہ چوں کہ سخت طبیعت کے مالک تھے۔ قاسمی نے انھیں دیکھا تو خوف زدہ ہو گئے لیکن ان کے بچپن کی شرارت نے چچا جیسے سنجیدہ مزاج انسان کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ قاسمی کے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش ان کی ایسی شرارتوں سے بہت عاجز تھے۔ وہ نہ تو ان سے دوستی کرتے، نہ کھانے پینے کی اشیا دیتے، اُلٹا انھیں ڈانٹتے اور مارتے پیٹتے تھے جب کہ ننھا قاسمی بڑے بھائی کو مار نہیں سکتا تھا البتہ دھمکیاں دے کر روتا ہوا واپس چلا جاتا تھا۔ ان کے بڑے بھائی"۔۔۔بیری پر چڑھ کر مزے مزے کے بیر کھاتے اور یہ نیچے کھڑے پہلے تو بیر مانگتے اور پھر گٹھلیاں مارنے کی سوچتے۔ روز بیروں کے لیے ترستے مگر درختوں پر چڑھنے سے جان سرکتی۔"[۶۷] بچپن میں ہی قاسمی اسی واقعہ کو شاعرانہ پیرائے کی صورت میں گنگناتے، کبھی بڑی بہن بیروں میں کیڑوں سے ڈراتی اور قاسمی گاتے:

"کیڑا ہے بیر میں
دانہ ہے، ڈھیر میں
رتی ہے سیر میں
کھا جاؤ۔" [۶۸]

تو بڑے بھائی انھیں میراثی کے القاب سے نوازتے لیکن یہ اپنی دھن میں مگن گاتے جاتے اور ناچتے جاتے۔ قاسمی اپنے مضمون بعنوان "خودنوشت" میں بچپن میں شعر و شاعری سے لگاؤ کا واقعہ قلم بند کرتے ہیں جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز قاسمی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گنا چوس رہے تھے۔ اپنا گنا جلد ختم کر کے بڑے بھائی کے گنے میں حصہ دار بننے لگے جب قاسمی گنے پر جھپٹے اسی اثنا میں بڑے بھائی نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ بلند کیا تو چاقو قاسمی کے سفید گال کو ہونٹ سے گردن تک چیرتا ہوا چلا گیا۔ دونوں نہایت پریشان ہوئے کہ چچا اور چچی کو معلوم ہو گا تو وہ خفا ہوں گے۔ ننھے قاسمی کے صبر پر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ ایک دن بڑے بھائی ویزلین لگا رہے تھے جب قاسمی نے ایک پرانے شعر کی پیروڈی کی۔ بولے:

میرے زخموں پہ مت رکھو مرہم
میرے بھائی کی یہ نشانی ہے [۶۹]

غرض شاعرانہ اوصاف خدائے بزرگ و برتر نے انھیں بچپن میں ہی ودیعت کر دیے تھے۔ اپنے شاعرانہ مزاج، متحرک شخصیت، ذہانت و فطانت، حاضر جوابی کی بدولت گھر کے علاوہ اسکول و کالج میں بھی ہر دل عزیز شاگرد تھے۔ تقریری مقابلہ ہو یا ادبی مباحثہ، کوئی جلسہ ہو یا ادبی محفل، کوئی ٹورنامنٹ ہو یا مشاعرہ، کرکٹ ہو یا ڈراما، ہر تقریب کی انجام دہی میں پیش پیش ہوتے۔ کالج کا ہر کام ان کی بھرپور شرکت سے پایہ تکمیل تک پہنچتا تھا۔

قاسمی اگر چہ ایک سادہ اور کم گو انسان تھے جو اپنی خودداری کو چوٹ نہ لگنے دیتے وہ اپنے اندر اتنی طاقت رکھتے تھے کہ سچائی اور خلوص کی بات آ جائے تو پہاڑوں سے بھی ٹکرا جاتے تھے۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں جب محکمہ آب کاری

میں بطور انسپکٹر بھرتی ہوئے تو ایک روز بدمزاج آفیسر نے خفگی سے ایک جلتی ہوئی سگریٹ قاسمی کو ماری تو انھوں نے جواباً سیاہی کی دوات اس کے منہ پر ماری۔ اپنی زندگی کے انتہائی خطرناک نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ ان کے پایہ استقلال میں رتی بھر لغزش نہ آئی۔ انھوں نے اپنی خودداری کی ہر حال میں حفاظت کی۔ اس بااصول انسان نے کبھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہ کیا، اگرچہ صبر آزما مشکلات کا سامنا کیا۔ کبھی مالی منفعت حاصل نہ کی، انھوں نے صبر و استقلال سے بھرپور درویشانہ زندگی گزاری۔ تمام عمر سخت محنت کے باوجود تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ عمر عزیز کے ستر برس ٹیکسی کا انتظار کیا اور کبھی رکشہ میں سفر کیا۔ لاہور میں نسبت روڈ پر چار منزلہ گھر میں بالائی منزل پر کئی برس گزارے۔ اس گھر میں اونچائی کے باعث نل پانی پہنچانے میں ناکام رہتے۔ قاسمی اور ان کے بچے بالٹیاں بھر بھر کر چھت پر لے جاتے لیکن مفلوک الحالی اور تنگ دستی کے باوجود کبھی شکوہ لب پر نہ لاتے، نہ ہی کبھی اپنے حالات سے دوستوں کو آگاہ کیا۔

قاسمی علی الصبح بیدار ہونے کے عادی تھے۔ رات کو خواہ دیر سے کیوں نہ سوئے ہوں۔ عام طور پر صبح سویرے بستر چھوڑ دیتے۔ سب سے پہلے گلے کی خشکی کو دُور کرنے کے لیے پانی کا گلاس پیتے۔ پھر ایک سیب کھاتے اور دودھ کا گلاس پیتے۔ پھر سگریٹ کا طویل کش لگاتے۔ غسل کے بعد ضروری کاغذات کا جائزہ لیتے۔ دوست احباب کے موصول شدہ خطوط کے جوابات دیتے۔ کیوں کہ خط موصول ہوتے ہی جواب دینا اپنے اوپر فرض کر لیتے تھے۔ تقریباً آٹھ بجے ناشتہ کرتے، اخبار دیکھتے، اس کے بعد تیار ہو کر مجلس ترقی ادب چلے جاتے یا معمولاتِ زندگی میں مصروف ہو جاتے۔ تفریح کا وقت اگرچہ بہت کم میسر آتا، تفریح کا وقت گزارنے کے لیے ٹی وی دیکھتے یا کرکٹ میچ کی کمنٹری سنتے۔ قاسمی زمانہ طالب علمی میں کرکٹ کھیلتے تھے لہٰذا عمر کے آخری حصہ میں کرکٹ کھیلنے کی بجائے دیکھنے اور سننے پر ہی اکتفا کرتے۔ قاسمی موسیقی، مصوری، بت تراشی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اگر انھیں زندگی میں موقع ملتا تو وہ یقیناً ان فنون میں بھی شاہکار تخلیق کرتے۔ ڈاکٹر ناہید ندیم نے راقم الحروف کو بتایا کہ:

''ابا جی موسیقی، مصوری اور بت تراشی کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔'' ۶۰

انھوں نے متحرک اور بھرپور زندگی گزاری۔ قیامِ پاکستان سے قبل مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا۔ جلوس نکالے، مسلمانوں کو متحد کیا، قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگیوں کے بدلے رویے نے انھیں بدظن کر دیا۔ ''اگر وہ چاہتے تو ہزارہا مصلحت پرستوں کی صف میں کھڑے رہتے اور اپنی سابقہ قومی خدمات کا تمغہ سینے پر سجا کر کوئی پریس، کوئی کوٹھی یا کوئی مل الاٹ کرا لیتے اور اب تک لاکھوں کے مالک بن گئے ہوتے لیکن ان کے سامنے تو صرف قیام پاکستان کی منزل تھی۔ انھوں نے مسلم لیگ کا ساتھ اُس وقت دیا جب اس جماعت کا ساتھ دینا گھاٹے کا سودا تھا۔ جب مسلم لیگ

فائدے کی چیز بن گئی تو قاسمی صاحب اس سے دُور بہت دُور چلے گئے۔''[۱]

قاسمی نے زندگی کو اپنے تجربے سے سیکھا اور اس کے نشیب و فراز کو محسوس کرنے کے لیے کتابی مطالعے سے بھی مدد لی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مطالعے اور تجربے کا تمام جوہر ان کی تحریروں میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ مطالعہ کتب ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ مطالعہ ہی انھیں سکونِ قلب بخشتا۔ اس عادت کے متعلق ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

> ''اگر آپ اباجی کو مسرت اور سکون دینا چاہتے ہیں تو ایک چھوٹے سے کمرے میں فرش سے لے کر چھت تک کتابوں کے مینار کھڑے کر دیجیے۔ نیچے اوپر، دائیں بائیں، ہر طرف کتابیں ہی کتابیں بکھیر دیں۔۔۔ پھر اباجی کو کمرے میں لے آیئے۔ اس کے بعد دیکھیے کہ وہ کتنے خوش نظر آئیں گے جیسے انھیں دنیا میں جنت مل گئی۔''[۲]

انھیں پڑھنے لکھنے سے عشق تھا۔ بسا اوقات جب پڑھنے بیٹھتے تو دنیا سے بے نیاز ہو کر پڑھتے۔ جمعہ کو ہفتہ اور اتوار کو پیر میں بدل دیتے۔ اگر کبھی کسی مجبوری کی بنا پر لکھ پڑھ نہ سکتے تو طبیعت بیزار ہو جاتی۔ بسا اوقات ساری ساری رات لکھنے پڑھنے میں گزر جاتی۔ یہ اگرچہ ''نیند کے دشمن تھے۔ نیند کو بھگانے کے لیے چائے اور سگریٹ پیتے رہتے۔ ان کی بیشتر نظمیں اور افسانے دو بجے رات کے بعد کی تخلیق ہیں۔''[۳] لکھنے پڑھنے کا خاص وقت اور جگہ مقرر نہ تھی۔ کئی کئی دن اور ہفتے بھی لکھے بغیر گزر جاتے۔ انھوں نے ٹھٹھرتی راتوں میں بھی لکھا اور تپتی چلچلاتی دوپہروں میں بھی۔ گھر پر بھی لکھا اور سفر و حضر میں بھی، اپنے دیس میں اور پردیس میں بھی لکھا اور بعض اوقات کئی کئی دن، کئی کئی ہفتے قلم اٹھائے بغیر گزر جاتے۔ ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں: ''۔۔۔ویسے تو کئی کئی دن کئی کئی ہفتے قلم اُٹھائے بغیر گزر جاتے ہیں مگر ذہنی طور پر بہت کچھ سوچتا رہتا ہوں۔ یہ دماغ کی تختی پر لکھنے کے برابر ہے۔ بہت باقاعدگی سے روزانہ کسی زمانے میں لکھتا تھا مگر اب نہیں۔ البتہ روزانہ پڑھنے میں کم ہی ناغہ کیا۔''[۴] اکثر تخلیقی کام عشا کے بعد رات گئے تک کرتے۔ لکھنے کے لیے عمدہ کاغذ اور قلم کا انتخاب کرتے۔ تخلیقی کام کے دوران اگر کوئی کمرے میں آ جاتا یا باتیں شروع کر دیتا تو انھیں ناگوار گزرتا۔ کاپی پنسل لے کر بستر پر بیٹھ جاتے۔ تکیے کی ٹیک لگا کر لکھتے۔ بسا اوقات پلنگ پر لیٹ کر یا اوندھے ہو کر یا کروٹ کے بل لیٹ کر ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر، کبھی بیٹھ کر، بسا اوقات گود میں تکیے پر کاغذ رکھ کر، ہاتھ میں قلم تھام کر لکھا جاتا۔ ان کی تحریریں عموماً تین مراحل طے کرتیں۔ پہلی بار جو کچھ، جس وقت ذہن میں آتا لکھ لیا جاتا۔ دوسری بار فنی انتخاب کا مرحلہ آتا اور تحریر کی خامیاں رفع کی جاتیں۔ تیسری بار تحریر خوش خطی کے مرحلے سے گزرتی۔

قاسمی کا حافظہ قابلِ رشک تھا۔ خدا نے انھیں ایسا ملکہ ودیعت کیا تھا کہ انھیں کلاسیکی و جدید شعرا کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے جو موقع و محل کی مناسبت سے سنائے جاتے۔ اگر زندگی میں ایک بار کسی شخص سے ملاقات

ہوتی اور دوبارہ چاہے تیس برس کے بعد ملاقات ہوتی، قاسمی دیکھتے ہی پہچان لیتے۔ اُسے اس کے نام سے پکارتے۔ ان کے قابلِ رشک حافظے کے متعلق علی تنہا لکھتے ہیں:

''انھیں ۱۹۳۵ء کے زمانے کے خانیوال کی بے شمار سماجی، دینی اور ادبی شخصیات یاد تھیں۔ ان کے تذکرے یوں کرتے کہ یہ گویا پرسوں کی بات ہو حالاں کہ نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔'' ۵؎

قاسمی باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے اور ان کی گفتگو بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے بھرپور ہوتی۔ بالخصوص نجی محفلوں اور دوست احباب کی محفلوں میں خوب چہکتے۔ اپنی خوش گفتاری کے باعث محفل کو زعفران بنا دیتے۔ دوستوں کو لطیفے سناتے۔ اگر لطیفے ختم ہونے لگتے تو فی البدیہہ لطیفے گھڑ گھڑ کر سناتے۔ قاسمی جہاں طنز لطیف اور دل چسپ جملے کہنے کے ماہر تھے۔ وہاں دوسروں کے شرارتی جملوں سے بھی محظوظ ہوتے۔ ان کا وصف خاص تھا کہ جن جملوں کی زد میں آ کر دوسروں کے لیے ہنسی کا سامان بنتے وہ واقعہ یا فقرہ ناواقف احباب کو خود سناتے۔ یہ رویہ ان کے بڑے پن کو ظاہر کرتا ہے مثلاً ایک مرتبہ فیض سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو قاسمی کو شرارت سوجھی۔ کہنے لگے:

''ان دنوں لاہور بلکہ پنجاب میں آپ کی غزل ''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'' بہت مقبول ہوئی ہے۔ فیض صاحب جو ہمہ تن گوش تھے، مسکرائے اور بولے: اس غزل کی مقبولیت کا اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟ قاسمی صاحب بولے: ایک میوزک ڈائریکٹر بتا رہے تھے کہ بازارِ حسن کی ایک گلشن نامی طوائف نے نہ صرف یہ مصرع ''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'' ایک تختی پر لکھوا کر اپنے دروازے پر نصب کروا دیا ہے بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے اشتہارات ہینڈز بل کی صورت اسے چھپوا کر جہازوں سے بھی پھنکوا رہی ہے۔'' ۶؎

فیض مرحوم اس سے بہت محظوظ ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد جب قاسمی یہ واقعہ فراموش کر چکے تھے کہ ایک مرتبہ ملتان کے مشاعرے میں انھوں نے غزل پڑھی جس میں لفظ ''فردوس'' کچھ اس طرح استعمال ہوا تھا:

اے خدا اب تیرے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے جہنم میں جلایا ہے مجھے ۷؎

قاسمی غزل پڑھ کر فیض کے پاس آ کر بیٹھے تو فیض بولے: یہ آپ نے کیا کیا۔ مونث کو مذکر باندھ دیا ہے۔ قاسمی جب پریشان ہوئے تو فیض مسکرا کر بولے:

''بھئی فردوس (اداکارہ ہیروئن فلم ہیر رانجھا) مونث ہے جب کہ آپ نے اسے اپنے شعر میں مذکر باندھا ہے۔'' ۸؎

یہ برجستہ مذاق و جملہ سن کر قاسمی لاجواب بھی ہوئے اور لطف بھی اُٹھایا۔ یہ محولہ بالا واقعہ ان کی زندگی کے دل چسپ

واقعات میں سے ایک تھا۔ اپنے دوست احباب کی محفلوں میں اکثر یہ واقعہ سناتے اور محفل کو کشتِ زعفراں بنا دیتے۔ ان کے دوست، عزیز و اقارب ان کی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کے قائل تھے۔ اکثر افراد ان کے چہرے کی سنجیدگی سے دھوکا کھا جاتے۔ بعض اوقات تو وہ اپنے مخاطب پر ایسے چست فقرے کس جاتے کہ مخاطب ان کے سنجیدہ چہرے کی جانب حیرت سے دیکھنے لگتا مثلاً ایک مرتبہ ملتان میں مشاعرہ کے دوران ایک شاعر نے حیرت سے قاسمی سے پوچھا:

''اچھا؟ تو آپ ملتان میں بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن آپ میرے زمانے میں نہیں تھے۔
ندیم صاحب نے جواب دیا: جی ہاں! میں جارج ششم کے زمانہ میں تھا۔'' ۷۹؎

قاسمی کی بچپن کی شرارتوں اور بذلہ سنجی نے وقت کے ساتھ ساتھ سلیقہ اور تہذیب و شائستگی کی صورت اختیار کی اور یہی بذلہ سنجی ان کے افسانوں، فکاہی کالموں میں مزاحیہ چاشنی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ لطیفہ سنانے کا انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ایک روز ابراہیم جلیس، اے حمید اور احمد راہی نے شرط باندھی کہ اگر قاسمی ایک ہی نشست میں پچاس سے زائد لطیفے سنائیں گے تو اگلی کتاب کی رائلٹی پر وہ دوستوں کو پرتکلف دعوت دیں گے۔ اسی شام ''یومِ غالب'' کے سلسلے میں بہت سے ترقی پسند ادبا کو لاہور سے کراچی کا سفر بذریعہ ریل طے کرنا تھا جو دو دن اور ایک رات پر مشتمل تھا۔ ابراہیم جلیس اور قاسمی کے مابین لطیفوں کا مقابلہ ہوا۔ ابراہیم جلیس لکھتے ہیں:

''۔۔۔قاسمی صاحب نے جیسے صرف لاہور سے کراچی تک ہی نہیں بلکہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ہر قسم کے لطیفے شیطان کی آنتوں کی طرح اپنے ذہن کی چرخی پر لپیٹ رکھے تھے۔ ان کے جو لطیفے شروع ہوئے تو کراچی سے لاہور تک کا دو دن اور ایک رات کا لمبا یعنی ۳۶ گھنٹے کا سفر ختم ہوا۔ قاسمی صاحب کے لطیفے ختم نہ ہونے تھے اور نہ ہوئے۔'' ۸۰؎

جب کبھی ماحول بوجھل ہوتا تو قاسمی، ابراہیم جلیس کو یہ کہہ کر چھیڑتے ''دوں ایک لطیفہ'' یومِ غالب کی تقریب کے بعد قاسمی اور دیگر دوست احباب نے ساحل سمندر پر جانے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت سمندر میں طوفانی قسم کا مدوجزر تھا۔ لہریں شور کرتی ہوئی اُچھل اُچھل کر ساحل کی جانب آ رہی تھیں۔ قاسمی چند لمحوں تک فوج کی یہ یلغار دیکھتے رہے۔ پھر الٹے پاؤں بھاگنے لگے۔ دوستوں نے حیرت سے پوچھا تو بولے:

''یارو ___ آیا تو تھا میں سمندر دیکھنے ___ مگر یہ سمندر تو اُلٹا مجھے دیکھنے آ رہا ہے اور کچھ ایسا غصے میں معلوم ہوتا ہے جیسے کہہ رہا ہو ___ ٹھہر اوئے احمد ندیم قاسمی تو مجھے دیکھنے نو سو میل دور لاہور سے کراچی آیا ہے تو دیکھے سو دیکھے ___ پہلے میں ذرا تجھے دیکھ لوں۔'' ۸۱؎

مئی ۱۹۶۱ء میں سنٹرل جیل لاہور کی سی کلاس کے ایک وارڈ میں رہے۔ حمید اختر ''چند یادداشتیں۔۔۔ چند خیالات'' میں قاسمی کے ساتھ جیل میں گزرے دنوں کو زندگی کے سنہری دنوں میں شمار کرتے ہیں۔ سارا دن

بیٹھے تاش کھیلتے، لطیفے سناتے، گپ لگاتے۔ وہیں حمید اختر سے انھوں نے فارسی زبان سیکھی۔ جیل میں انھیں ناشتے میں بھنے ہوئے چنے ملتے تھے۔ قاسمی کی رگ ظرافت پھوٹی کہتے ہیں: ''حمید اختر! اگر ہم ایسے ہی چنے کھاتے رہے تو جیل سے ہنہناتے ہوئے ہی نکلیں گے۔''[۸۲]

قاسمی صاف گو انسان تھے اور ادیب حساس ہونے کے علاوہ زود رنج بھی ہوتا ہے۔ ان کا کسی ایسے دوست و ہم عصر سے رنجیدہ ہونا قدرتی عمل تھا جو ان کی شاعرانہ وادیبانہ حیثیت کا منکر ہو یا ان کی شاعرانہ حیثیت کو نظر انداز کرے۔ مثلاً فیض احمد فیض نے ماسکو میں افروایشیائی ایڈیٹرز کانفرنس میں قاسمی کو بطور ایڈیٹر متعارف کرایا جس پر اس حساس ادیب و شاعر کو رنج ہوا۔ چناں چہ انھوں نے دیگر انسانوں کی مانند دلی منافقت رکھنے کی بجائے فیض احمد فیض سے براہ راست بھی اور اپنے مضمون کے ذریعے بھی اس بے رُخی کا واشگاف گلہ کیا۔ کیوں کہ فیض سے اس امر کی توقع نہ تھی یہ ان کا خلوص و صاف گوئی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے نہایت سوچ و بچار کے بعد ذمہ دار الفاظ کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ نجی محفلوں میں غیبت کا ارتکاب کرنے کی بجائے اپنے احساسات و جذبات کو تحریری صورت میں پیش کرتے۔ یہ ان کے بلند کردار کی نشانی اور راست بازی تھی۔ لفظ کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔ وہی لکھا جو محسوس کیا اور اپنے دور کے نمرود اور فرعون سے بھی یہی کہا:

؎ کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں [۸۳]

جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں لاہور میں خاصی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ شعرا اپنے دور کے حالات کی بنا پر قاتل، دار و رسن، مقتول، مقتل، قتل وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے۔ قاسمی نے اپنے دوستوں کو محولہ بالا الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا۔ جب ان کے عزیز دوست اکبر حمیدی نے حکومت کے خلاف آواز اُٹھانے کی تجویز پیش کی تو انھوں نے صاف گوئی سے جواب دیا: ''میں اب اس عمر میں جیل نہیں جا سکتا۔'' قاسمی اکثر بغیر کسی تاویل کے سچائی و صداقت کا دامن تھام کر بات کرتے۔

قاسمی درویش منش انسان تھے۔ انھوں نے اعلیٰ حکومتی مناصب حاصل کیے لیکن اپنے تخلیقی جوہر کو متاثر نہ ہونے دیا۔ انھیں اگرچہ بے شمار اعزازات سے نوازا گیا۔ انھیں پاکستان کے سب سے بڑا سول ایوارڈ ''نشانِ امتیاز'' دیا گیا لیکن کبھی انھوں نے اپنے نام کے ساتھ اس ایوارڈ کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ ان کے خیال میں تخلیقی جوہر سرکاری منصب سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہ ایک روشن خیال اور مثبت اندازِ فکر کے مالک تھے۔ وہ زندگی کے کارزار میں اپنی جنگ خود لڑتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری رہے۔ تمام مخالفت کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ مقدمے ہوئے، جیل گئے، الزامات بڑے تحمل سے برداشت کیے مگر مرکزی عہدہ کے تمام فرائض دیانت داری سے ادا کیے۔

پنجاب کے وقیع پیروں کے خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود مذہب کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے جو فرقوں کے تنگنائے میں مسدود نہیں رہتا۔ وہ ایسے ترقی پسند انسان تھے جو ترقی پسندی کو معاشرے کے قیام کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ وہ مذہبی اس حد تک تھے کہ خدا کے وجود کا اثبات کرتے اور نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انسانیت کا فخر قرار دیتے۔ اس سے زیادہ مذہبیت کے قائل نہ تھے کہ ڈاڑھی رکھ لی جائے یا اللہ ہو اللہ ہو کا ورد کیا جائے۔ وہ عبادات کی بجائے اخلاقیات پر زور دیتے تھے۔ ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> ''رہی میری ترقی پسندی، تو میرا مذہب میری ترقی پسندی میں نہ صرف یہ کہ حائل نہیں ہوا بلکہ وہ تو میری ترقی پسندی میں میرا مددگار ثابت ہوا ہے۔ آخر رسول مقبولؐ سے بڑا ترقی پسند کون ہوگا۔ یہ میرا کوئی کمال نہیں ہے کہ مذہبی ذہن رکھنے کے باوجود ترقی پسند ہوں۔ یہ سب میرے رسولؐ کی دین ہے۔'' ۸۴

قاسمی کے سینے میں محبت کرنے والا دل دھڑکتا تھا۔ وہ ہر دُکھی انسان کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے۔ بقول منصورہ احمد ''بابا کا طریق کار ایسا ہی تھا۔ انھیں کبھی اپنا دُکھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ خود ہی بوجھ لیتے تھے کہ اس وقت دوسرے کے اندر کیا طوفان مچل رہا ہے۔ وہ سب کچھ جان لیتے اور پھر مداوا کرنے میں لگ جاتے۔'' ۸۵ ان کے عزیز دوست پیرزادہ افضل نے محبت میں ناکامی کے باعث دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی۔ افضل کے والدین بھی ان سے ناخوش تھے۔ قاسمی انھیں اسپتال لے گئے۔ جب افضل نے دم توڑا تو مسعود اشعر کے الفاظ میں:

> ''ان کے سرہانے احمد ندیم قاسمی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ان کی لاش لینے کے لیے بھی کوئی نہ آیا۔ چناں چہ ندیم صاحب تنہا ان کی میت دوسری منزل سے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا کر لائے اور اسی طرح اُن کے گھر پہنچائی۔'' ۸۶

قاسمی اگر دوست بناتے تو آخر تک دوستی نبھاتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں اور نیازمندوں کو دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل جاتے تھے۔ ان کے ملاقاتیوں میں علمی و مالی اعتبار سے بہت کم تر لوگ بھی ہوتے تھے لیکن کبھی کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ اتنے بڑے انسان و فن کار سے محوِ گفتگو ہیں۔ دورانِ گفتگو وہ یا تو مخاطب کو اپنی سطح پر لے آتے یا خود مخاطب کی سطح پر پہنچ جاتے۔ اس طرح اجنبیت ختم ہو جاتی اور محبت و مساوات کی روشنی چارسُو پھیل جاتی۔ احمد شفیع اور قاسمی جو بچپن میں اسکول کے زمانے میں ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے تھے اور کالج میں بھی ان کے ہم جماعت تھے، بتاتے ہیں:

> ''اس زندگی کے باون برسوں میں اسکول میں بھی پڑھا، کالج میں بھی رہے، ملازمت کے اب کم و بیش تیس برس ہونے کو ہیں، بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑا۔ چند لوگ دوست یا دوست نما کہلائے لیکن میرا ایمان ہے کہ کسی کو ندیم جیسا دوست اور بھائی ملنا مشکل ہے۔'' ۸۷

قاسمی کی دوستی مذہبی عقائد سے بالاتر تھی۔ وہ خصائل انسانی پر نظر رکھتے تھے۔ نند اور منوہر ان کے دو ہندو دوست تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب کا انتساب بھی ان کے نام معنون کیا۔ جب بھی قاسمی ان کا ذکر کرتے تو حالت غیر ہو جاتی اور اس دلی درد کی کیفیات کا بھرپور ساتھ ان کی پرنم آنکھیں اور مغموم چہرہ دیتا۔ انھوں نے قاسمی کو بھارت سے ایک خوش رنگ کمبل تحفے میں دیا۔ ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

''وہ کمبل اب پرانا ہو چکا ہے۔ اُس میں پہلی سی گرمی بھی نہیں ہے لیکن ابو کو گھر کے دوسرے کمبلوں میں وہی عزیز ہے۔ اب بھی سردیوں میں وہ اس کے پھٹتے ہوئے گوشوں کو مزید پھٹنے سے بچانے کے لیے اُن میں گرہیں ڈالتے اور وہی کمبل اوڑھے نظر آتے ہیں۔'' ۸۸

قاسمی بے تکلف احباب سے اپنے معاشی حالات بھی مخفی نہ رکھتے۔ یوں خط کے ذریعے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ وہ غموں کو خوش دلی سے قبول کرنے کی طرز سے واقف ہو چکے تھے اور دُکھوں میں بھی ہنسنے مسکرانے کا فن کوئی قاسمی سے سیکھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''چھتیس برس کا ہونے کو آیا ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام ناہید اور ایک کا نشاط۔ معاش کی مصیبتیں بے شمار ہیں مگر اب مجھے مصیبتوں سے بھڑتے رہنے اور بھڑتے ہوئے مسکرانے اور ہنسنے کا ڈھب آ گیا ہے۔ اس لیے بڑے مزے سے زندہ ہوں۔'' ۸۹

قاسمی جب تنہائی محسوس کرتے تو خط لکھ کر یا ٹیلی فون کے ذریعے گزرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے احباب کی محفل سجاتے۔ عمر کے آخری حصے میں خود کو بھری دنیا میں، ہر دل عزیز دوستوں کی موجودگی اور اپنے عقیدت مندوں کے درمیان بھی خود کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ قاسمی اگرچہ اپنے دوست احباب کے دُکھ درد کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی حاجت روائی کرتے لیکن بعض بے تکلف احباب کے سامنے مکتوب الیہ اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے۔ ساقی فاروقی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔مجھے خط لکھتے رہا کیجیے۔ کبھی کبھار سہی، مختصر سہی، مگر یہی رابطے اور ان سے پیدا ہونے والی مسرت ہی تو زندگی ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔'' ۹۰

بڑھاپے میں اگر بیوی وفات پا جائے تو خاوند کا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ رابعہ کی وفات کے بعد ان کے دوست احباب کو خدشہ تھا کہیں اکلاپہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سلب نہ کر لے چناں چہ اکلاپے کی تخریب سے خود کو مصروف رکھنے کے لیے دوست احباب کو خط لکھتے۔ قاسمی اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے۔ ممتاز مفتی کی گرتی مخدوش صحت پر

متفکر ہوتے۔ ان کو باقاعدگی سے دوا کھانے، ذہنی تناؤ سے باز رہنے اور صحت کا خیال رکھنے کی ترغیب دیتے۔ قاسمی محبت و شفقت کا مجسمہ تھے۔ عطاالحق قاسمی نے ان کے ہمراہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کئی سفر کیے کیوں کہ دونوں کے مابین محبت وعقیدت کا مضبوط تعلق تھا۔ ان کی ذات غرور وتکبر سے مبرا تھی۔ بتاتے ہیں کہ قاسمی اور عطا کئی بار ایک کمرے میں بھی ٹھہرے۔ انھوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ:

> ''ایک روز لندن میں قیام کے دوران، میں ان کے ساتھ ایک فلیٹ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک صبح جب میں بستر پر محو خواب تھا کہ مجھے محبت و شفقت سے لب ریز ایک آواز سنائی دی۔ عطاء صاحب، عطا صاحب میں نے کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا ندیم صاحب میرے سرہانے چائے کا کپ لیے کھڑے ہیں۔ مجھے بہت شرمندگی اور حیرت ہوئی کہ مجھے ایک بار پھر اُن کی آواز سنائی دی۔ میں جانتا ہوں آپ بیڈ ٹی کے عادی ہیں۔ یہ چائے پیجیے اور تیار ہو جایئے۔ میزبان ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔'' ۹۱

قاسمی کی اسی شفقت اور توجہ سے عطا حیران ہو گئے کہ کیا ہماری معاشرتی زندگی میں ایسے مشفق بزرگ بھی ہیں جن کی عنایت کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ قاسمی اپنی تحریروں کے علاوہ عملی زندگی میں بھی انسان دوست تھے۔ عطاالحق قاسمی نے راقم الحروف کو بتایا کہ:

> ''رمضان کا مہینہ تھا۔ میں ندیم صاحب کے دفتر گیا تو دیکھا کہ وہ چاقو پکڑے سلاد کاٹنے میں مشغول ہیں اور تھوڑے سے ناراض بھی نظر آتے ہیں۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا: میرے ایک پارسی دوست ہیں جو فیروز سنز میں کام کرتے ہیں۔ وہ بزرگ آدمی ہیں اور اس وقت بھوکے بیٹھے ہیں کیوں کہ رمضان کی وجہ سے کھانے پینے کی سب دکانیں بند ہیں۔ میں رمضان میں کھانا پکوا کر اُن کے لیے بھیجتا ہوں لیکن آج میرے نائب قاصد کی وجہ سے بہت دیر ہو گئی ہے اور یہ چیز مجھے پریشان کر رہی ہے۔'' ۹۲

قاسمی باشعور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ محب الوطن بھی تھے۔ پاکستان سے گہری وابستگی ان کی تخلیقات میں نمایاں ہے۔ انھیں پاکستان کے کونے کونے سے محبت تھی۔ وہ اپنے دین، ملک اور تہذیبی اقدار پر سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ کسی معاملے میں اگر اپنے عقائد پر زد پڑنے لگتی تو بڑی سے بڑی شخصیت، پرانے تعلقات اور دوست احباب کی بھی پروا نہ کرتے۔ ایک مرتبہ فیض مجلس ترقی ادب آئے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد کہنے لگے ہم روس پاکستان دوستی کی انجمن بنا رہے ہیں۔ آپ اس میں ہمارا ساتھ دیں۔ قاسمی چند لمحے کے سکوت کے بعد کہنے لگے کہ ہمارے ملک کو دولخت کرنے میں ہندوستان کے بعد روس کا حصہ ہے۔ میری غیرت کو یہ گوارا نہیں کہ میں اس ملک کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں جس کے ہاتھ ہمارے وطن کے نوجوانوں سے آلودہ ہیں۔ فیض صاحب یہ جواب سُن کر

کچھ توقف کے بعد رخصت ہو گئے۔

قاسمی روزمرہ کے ذاتی امور کی انجام دہی اپنے ہاتھوں سے کرنے میں فرحت محسوس کرتے۔ اطاعت شعار بیوی اور سعادت مند اولاد کے باوجود وہ اپنے جوتے خود پالش کرتے۔ کپڑوں کو خود استری کرتے۔ اپنے لیے خریداری خود کرتے۔ بلکہ اہل خانہ کے لیے بھی بازار سے سودا سلف خرید لاتے۔ قاسمی ابتدا سے ہی زندگی میں سلیقے اور اہتمام کے قائل تھے۔ چاہے یہ لباس میں ہو یا عادات و اطوار میں۔ بقول رابعہ ندیم:

> ''مجھے ان کی صفائی ستھرائی بہت پسند ہے۔ زندگی گزارنے کا وہ خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور یہ سلیقہ مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ بے حد خوش مزاج اور صاف گو ہیں۔ مجھے ان کی صاف گوئی سے پیار ہے۔'' ۹۳

قاسمی اپنے گھر میں عام آدمی کی طرح زندگی گزارتے۔ ان کے جذباتی رشتے اور تعلقات بھی عام آدمی کی طرح مستحکم تھے یعنی ان میں اپنائیت، خلوص، محبت اور مروت کی فراوانی تھی جو کسی بھی فرد کے لیے خوش گوار زندگی گزارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

قاسمی نے دیباچے اور فلیپ لکھے۔ ادبا و شعرا کی تخلیقی وتنقیدی کتب پر مضامین لکھے۔ بعض جگہوں پر علامتی انداز اختیار کیا۔ بعض مقامات پر تحریر کی خوبیوں اور خامیوں کا اظہار واشگاف الفاظ میں کیا۔ بعض جگہ اس احتیاط کے ساتھ لکھا ہے کہ معنی دربطن شاعر والا معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ جوہر قابل کی ہمت افزائی کرنا ان کا وطیرہ تھا۔ ان نوارد ادبا و شعرا کے خطوں کا جواب بھی دیتے۔ بعض اوقات خط طویل ہوتا اور بعض اوقات عنوان کے پیش نظر مختصر ہوتا۔ یہ کتابوں پر تبصرہ بھی کرتے جس میں مصنف و شاعر کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ اگر اعتراض کی ضرورت پیش آتی تو اس طرح کرتے کہ مصنف و شاعر کی دل شکنی نہ ہو اور اس کا حوصلہ بھی پست نہ ہو۔ وہ بغیر کسی لالچ کے ان کی فن کارانہ صلاحیتوں اور تخلیقی اوصاف کو نکھارنے کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ یہ ان نو وارد ادبا و شعرا کو ایک تن آور درخت بنانے کی آرزو دل میں رکھتے تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں طمانیت محسوس کرتے۔

پرویز حمید لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی۔۔۔ شاعروں، ادیبوں اور نئے لکھنے والوں کے لیے چشمہ حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اچھا شعر لکھنے کی صلاحیت رکھنے والوں کے لیے ایک بے بدل اُستاد ہیں۔ ادبی میلانات رکھنے والی ہر تحریک کے امین ہیں اور لوگوں میں ادبی شعور کو فروغ دینے والوں کے ہر طرح سرپرست ہیں۔ قاسمی صاحب کے اس چشمہ فیض سے ہزاروں لوگ شاعر اور ادیب بن گئے ہیں۔'' ۹۴

عطاالحق قاسمی نے راقم الحروف کو بتایا کہ کئی مرتبہ فنون کی کاپیاں پریس میں اس لیے نہ جا سکیں کہ انھیں

کسی نوجوان کی تازہ تخلیق کا انتظار ہوتا۔ اُسے باور کراتے کہ جب تک اس کی تازہ تخلیق نہیں آئے گی، ''فنون'' پریس میں نہیں جائے گا۔ ان بے لوث تقاضوں سے ادیبوں وشاعروں میں نئی روح بیدار ہو جاتی اور ان کے کام کرنے کی رفتار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا۔ وہ نہایت برادرانہ و پدرانہ شفقت سے متین و شائستہ انداز میں نصیحت کرتے۔

یوں تو ماں کے لیے اس کا ہر بچہ اس کے جگر کا ٹکڑا ہوتا ہے لیکن کئی مائیں کسی خاص بچے پر زیادہ ہی فراخ دلی سے اپنی ممتا کا خزانہ لٹاتی ہیں۔ قاسمی کی والدہ کو بھی اپنے تمام بچوں میں سب سے زیادہ محبت ان سے تھی اور قاسمی بھی والدہ پر جاں نثار کرتے تھے۔ وہ انھیں دنیا کی عظیم ترین عورت تصور کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل اور ذہنی تربیت پر سب سے زیادہ گہرے اور دیرپا اثرات ان کی والدہ کے ہیں جو خود بھوکی رہتی لیکن بچوں کے لیے کھانا کھانے کے لیے گڑ یا پیاز کا انتظام کرتی۔ اس بہادر ماں نے بچوں کو صبر وشکر، غیرت مندی اور خودداری کا درس دیا۔ ان کے افسانے آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں اس ماں کی سرگزشت دردمندانہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ قاسمی کی زندگی میں ایسے پُراذیت کرب ناک لمحے بھی آئے جب خودکشی کا ارادہ بھی کیا لیکن ماں کی محبت آڑے آگئی جس نے انتہائی قدم اُٹھانے سے باز رکھا۔ ماں کے لیے کئی بار راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر روتے۔ ماں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میری زندگی میں سب سے عظیم اثر میری ماں کا ہے۔ مجھے ماں کی محبت نہ ملتی تو ممکن ہے آج میں نہایت کلبی اور قنوطی ہوتا۔۔۔ اُس ماں کی محبت نے مجھے پتھر نہیں بننے دیا۔'' ۹۵

قاسمی اپنی اکلوتی بہن سے غیر معمولی محبت کرتے۔ جب بھی اپنی بہن کے گھر جاتے تو ان کا حق لے کر جاتے خواہ اس کے لیے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی۔ ان کے اکلوتے بیٹے ظہیر بابر قاسمی کو بہت عزیز تھے۔ قاسمی بڑے بھائی کا والد کی طرح احترام کرتے۔ زندگی کے ہر کام میں ان سے مشورہ لیتے۔ بھائی کے ایما پر رابعہ سے شادی کی اور بھائی سے رشتہ مضبوط کرنے کے لیے اپنی بیٹی نشاط کی شادی اسی بھائی کے بیٹے سے کی۔

قاسمی کی اہلیہ رابعہ بیگم نہ تو شاعرہ تھی اور نہ ہی بہت تعلیم یافتہ بلکہ ایک سادہ مزاج، سلیقہ شعار خاتون تھی۔ ان کے ذہنی تفاوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاسمی اگر تخلیقی لمحات میں مصروف ہوتے تو رابعہ اپنے شوہر کے لیے حلوہ پکا رہی ہوتی لیکن اس کے باوجود ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار تھی۔ قاسمی ایک محبت کرنے والے شوہر تھے جو اپنی بیوی کے سکھ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے ''دوام'' کا انتساب اپنے اہلِ خانہ کے نام کیا ہے جن میں سرفہرست اپنی اہلیہ کا نام ہے۔ ان سطور میں رابعہ سے محبت کا اظہار موجود ہے:

> رابعہ وہ مری شریک حیات ـــــ میرے دُکھ سُکھ میں میرے ساتھ رہی
> دو جہاں میری دسترس میں رہے ـــــ میرے قبضے میں کائنات رہی ۹۶

قاسمی نہایت متحمل مزاج شوہر تھے۔ انھوں نے کبھی بیوی سے لڑائی کر کے گھر کے برتن نہیں توڑے اور نہ ہی بیوی کو بُرے القابات سے نوازا۔ بیوی کے نزدیک وہ حوصلہ مند، باہمت، صاف گو، خوش مزاج انسان تھے جو چوبیس گھنٹوں میں سے معقول وقت اپنے اہل خانہ کے لیے بھی نکال لیتے تھے اور بچوں کی تفریح کا خاص خیال رکھتے تھے۔ میاں بیوی میں اختلافات بھی عموماً ہو جاتے ہیں جس کا ذکر رابعہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''لڑائی عموماً خرچ اخراجات کے مسئلے پر ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ندیم صاحب روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں بہت تیز ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو روپیہ پیسہ ہے وہ اسے ایک دفعہ خرچ نہیں کر دیں گے تو بیمار ہو جائیں گے مثلاً میں پانچ دس روپے کے پھل لانے کو کہتی ہوں تو وہ چالیس پچاس روپے کا ٹوکرا اُٹھا لاتے ہیں۔ روپیہ خرچ کرنے کا معاملہ ہو تو آنے والا دن ان کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے سو ان کی اس عادت پر بعض اوقات تلخی ہو جاتی ہے۔'' ۹۷

ان کی دریا دلی اور فضول خرچی سے اہلِ خانہ عاجز تھے لہٰذا طے پایا کہ ملازمت اور کالم کی رقم گھر پر خرچ ہو گی جب کہ انعام اور مشاعروں کی آمدن ندیم اپنی مرضی سے خرچ کریں گے۔

قاسمی تین بچوں کے شفیق و مہربان باپ بھی تھے۔ اگر گھر میں کوئی پریشانی ہو جاتی تو وہ کوشش کرتے کہ ان کی پریشانی سے بچے متاثر نہ ہوں۔ اس لیے وہ لطائف اور پیاری پیاری باتوں سے بچوں کا دل بہلاتے۔ وہ بچوں کو سکھ اور پرآسائش زندگی دینے کے لیے بہت محنت کرتے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی ناہید ندیم انھیں اپنا اچھا دوست سمجھتی کیوں کہ قاسمی بچوں کی سطح پر آ کر ان سے بات کرتے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھتے۔ ناہید قاسمی نے راقم الحروف کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ ان کے اباجی دوسروں سے زیادہ شفیق اور محبت کرنے والے والد تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ شاعر اور ادیب تھے۔ اس لیے ان کا زاویہ فکر مختلف تھا۔(۹۸) قاسمی بچوں کے بہت اچھے دوست تھے۔ وہ بچوں کو وقت دیتے۔ ان کے ساتھ لڈو، کیرم، تاش اور دیگر کھیل کھیلتے۔ بچوں کے نزدیک وہ ایک مثالی باپ تھے جن کی شخصیت خامیوں سے پاک تھی۔ کبھی انھوں نے بچوں سے سختی سے بات نہ کی۔ وہ بچوں کی تفریح کے لیے انھیں اچھی فلم دکھانے کے لیے لے جاتے۔ نئی فصل کا میوہ اور نیا لباس بچوں کے لیے شوق سے خرید کر لاتے۔ منجھلی بیٹی نشاط ندیم کے نزدیک یہ بے حد پیار کرنے والے والد تھے۔ ناہید ندیم نے نشاط ندیم کے متعلق راقم الحروف کو بتایا کہ نشاط ندیم کہتی تھیں:

''مجھے اباجی کی یہ عادت بہت پیاری لگتی ہے۔ جب وہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہم بچوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیتے ہیں اور جب امی پوچھیں ''کیا بات ہوئی'' تو کہتے ہیں: بس یوں ہی پیار آ گیا تھا۔'' ۹۹

''دوام'' کا انتساب بیٹیوں کے نام معنون کرتے ہیں:

میری ناہید اور میری نشاط ____ مجھ کو یہ بیٹیاں خدا نے دیں
خیر کی مشعلیں بلند کیے ____ وہ مرے ساتھ ساتھ چلتی رہیں
ریگ زارِ حیات میں مجھ کو ____ ذوق و شوقِ سفر انھی سے ملا
رات کی بے افق طوالت میں ____ اعتمادِ سحر انھی سے ملا
ان کے کردار میں گداز بہت
ان کی سیرت پہ مجھ کو ناز بہت ۱۰۰

قاسمی اپنے بچوں سے بے حد محبت کرنے والے والد تھے۔ وہ بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتے تھے۔ قاسمی کے اکلوتے بیٹے نعمان ندیم نے راقم الحروف کو بتایا:

''میرے اباجی چاہتے تھے کہ ساری خوشیاں ہمیں دے دیں، چاہے انھیں حاصل کرنے کے لیے اباجی کو اندھا دھند محنت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔'' ۱۰۱

انھیں اپنے لختِ جگر نعمان سے بہت محبت تھی۔ ''دوام'' کے منظوم انتساب میں لکھتے ہیں:

میرا نعمان ___ مرا نورِ نظر ____ روح کا چین ، آنکھ کا تارا
میرا بیٹا بھی میرا ساتھی بھی ____ میرا پیارا ، مرا جگر پارا
فن انھی سے ہے معتبر میرا
جن سے جنت بنا ہے گھر میرا ۱۰۲

قاسمی بچوں سے بے حد پیار کرنے والے والد تھے۔ وہ بچوں کے اچھے دوست تھے جو بچوں کی کامیابیوں پر خوش ہوتے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ انھیں انعام و اکرام سے نوازتے۔ انھیں کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے۔ اچھے شعر سنا کر ان کے ذوق کی تربیت کرتے۔ وہ مشفق باپ کی حیثیت سے عظمت کا مینار تھے۔ وہ بچوں کے طفلانہ و معصوم سوالات کا جواب محبت سے دیتے۔ یہی محبتیں زندگی کے دشوار گزار مراحل اور سخت رکاوٹوں کے باوجود انھیں زندہ رکھے ہوئے تھیں۔ قاسمی کا اپنے دامادوں سے رویہ دوستانہ تھا۔ ان سے محبت و مروت سے ملتے۔ جب داماد ان کے گھر آتے، اُن کے قیام و طعام کا خاص خیال رکھتے۔ اُنھیں عمدہ زندگی گزارنے کے سنہری اصول بتاتے اور عیدوں پر ان کو عیدی بھی دیتے۔ قاسمی اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب بھی ناہید کے گھر جاتے ان کے بچوں کے لیے پھل، مٹھائی، کھلونے اور چاکلیٹ لے کر جاتے۔ بچوں کے ساتھ ان کی سطح پر آ کر بات کرتے۔ ان کی ننھی منی باتیں سنتے۔ انھیں کہانیاں سناتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کا حوصلہ بڑھاتے کہ ہر بچہ یہ محسوس کرتا کہ قاسمی اس سے دیگر بچوں کی نسبت زیادہ محبت کرتے ہیں جب کہ ان کی محبت و شفقت بحرِ بے کراں

تھا جس سے ہر کوئی مستفید ہو سکتا تھا۔

قاسمی عورت کا بہت احترام کرتے تھے خواہ وہ کسی بھی روپ میں موجود کیوں نہ ہو۔ ان کی زندگی میں عورت بہن اور بیٹی کی صورت میں بھی موجود ہے۔ خدیجہ مستور رقم طراز ہیں:

''ندیم عورت کا بڑا احترام کرتے ہیں۔۔۔ عورت کسی روپ میں بھی ہو بیوی، بہن، ماں یا دوست، وہ اسے رگِ جاں سے زیادہ عزیز اور محترم رکھتے ہیں۔'' ۱۰۳؎

ناہید قاسمی نے صنفِ نازک کے اس احترام کے محرک کی سراغ رسانی کی۔ انھوں نے اس احترام کی بنیاد غلام بیوی اور سعیدہ بانو کی دل کش شخصیتوں اور اثر انگیز باتوں اور نعتوں نے ڈالی۔ بقول ناہید قاسمی:

''یوں تو ہر انسان کا احترام کرتے ہیں مگر خاص طور پر صنف نازک کا جو احترام اُن کے دل میں ہے اس کی بنیاد دادی جان اور پھوپھی جان کی دل رُبا شخصیتوں میں پوشیدہ ہے۔'' ۱۰۴؎

قاسمی کی زندگی میں کئی افراد جو ان کی زندگی کے بہت قریب تھے مثلاً ان کی منہ بولی بہنیں ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور وغیرہ۔ ان کے طبعی رجحان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہاجرہ اور خدیجہ کو منہ بولی بہنیں بنایا اور تادمِ آخر بھائیوں کی شفقت، محبت، دست گیری اور حسن سلوک سے نوازا بلکہ ناصح، مشفق اور مشیر کار کا روپ بھی اختیار کیا۔ انھوں نے اپنی ننھی منی خوشیوں سے لے کر عہد طفلی کی بے بنیاد پریشانیوں میں انھیں شریک کیا اور مشورہ لیا۔ انھوں نے ان کی کفالت کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ اگر چہ لوگوں نے بہت اعتراضات کیے لیکن قاسمی نے ان کی رتی بھر پروا نہ کی۔ عبداللہ ملک بتاتے ہیں:

''ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور ان کا پورا خانوادہ نقل مکانی کر کے لاہور آیا اور ان کی کفالت کی ذمہ داری احمد ندیم قاسمی نے سنبھالی اور انھوں نے اس ذمہ داری کو ایک خاندان کے سربراہ کے طور پر نبھایا۔ اس میں بڑے کٹھن مقام بھی آئے۔ انگلیاں بھی اُٹھیں۔۔۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی اور نہایت بردباری کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کیا۔'' ۱۰۵؎

ہاجرہ مسرور ''نقوش'' میں معاون مدیرہ کے فرائض سرانجام دیتی رہیں ان کی شادی پر معاشی مسائل کی بنا پر بے حد پریشان تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب کا معاوضہ ناشر سے طلب کیا۔ اُس کی مہلت مانگنے پر بولے:

''ہاجرہ کی شادی اب ہے۔ بعد میں مجھے کیا ضرورت ہو گی؟'' ۱۰۶؎

یوں حقیقی بھائیوں کی مانند ان کے مسائل پر رنجیدہ اور خوشیوں پر خوش ہوتے۔ ان کے مسائل کم کرنے کی مقدور بھر مساعی کرتے۔ خدیجہ مستور کی شادی ان کے بھانجے ظہیر بابر سے ہوئی۔ خدیجہ جب بھی اپنے میاں کی شکایت ان سے

کرتی تو قاسمی، ظہیر کو سمجھاتے بلکہ کئی بار جب خدیجہ ظہیر کی شکایت لگاتی تو قاسمی ان سے ناراض بھی ہوتے۔ قاسمی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ جوانی میں نٹھی، بانکی اور خوب صورت لڑکی کو بہن بناتے اور بڑھاپے میں بیٹی بنا لیتے ہیں اور کئی افراد حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ساقی فاروقی کے ایک سوال کا جواب بذریعہ خط ۲۵/جون ۱۹۸۰ء کو دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''کاش! اس جملے میں آپ حسرت کی جگہ مسرت لکھ سکتے۔ مسرت اس بات پر کہ کوئی ایک شخص تو آپ کے حلقہ تعارف میں ایسا ہے جو اپنی مردانگی کو اپنے کندھے پر نہیں اُٹھائے پھرتا اور اپنے ماتھے پر نہیں لگائے پھرتا۔ میں نے جو محبت کی ہے اس سے احترام کرنا بھی سیکھا ہے۔ بصورت دیگر میں بھی اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو بھول کر دوسروں کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو حسرت سے دیکھتا، کڑھتا اور ترستا رہتا۔ میری جو بہنیں ہیں اور بیٹیاں ہیں ان میں کوئی ذہنی اور ضمیری جوہر ایسا ہے جو مجھے اس تقدس کے رشتے میں پرو لیتا ہے اور میں اس رشتے کو نبھاتا ہوں اور میں نے ایسا کر کے دکھایا ہے۔ سو میرے ان رشتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ۱۰۷

قاسمی نے پروین شاکر کو منہ بولی بیٹی بنایا۔ شاعری میں ان کی اصلاح کی۔ پروین انھیں ''عمو'' کہتیں۔ پروین نے شادی کے کارڈ پر صرف اپنے عمو کا نام لکھوایا۔ پروین کی حادثاتی موت کے بعد قاسمی نے خاکہ لکھا جو پروین سے اُن کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۱۹۷۷ء میں قاسمی نے اپنے دوست حبیب احمد ایڈووکیٹ کی بیٹی منصورہ احمد کو منہ بولی بیٹی بنایا اور سانس کے آخری لمحے تک باپ کی شفقت جاری رہی۔ منصورہ نے بھی بیٹیوں کی طرح عزت وتکریم میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لوگوں نے اگر چہ بہت چہ مگوئیاں کیں مگر باپ بیٹی کے تعلق میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس سے ان کی طبعی محبت، شفقت، ہمدردی کا انداز بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ''دوام'' کا انتساب اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ اپنی منہ بولی بیٹیوں پروین اور منصورہ کے نام بھی معنون کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> میری دو اور بیٹیاں ہیں جنھیں ــــ منتخب میرے قلب و جاں نے کیا
> میری اولاد کی طرح میری ــــ ایک پروین ، ایک منصورہ
> غم کی حدت میں ان کا طرزِ تپاک ــــ سرد جھونکوں ، گھنی گھٹاؤں سا ہے
> زندگی کی تمازتوں میں ندیم ــــ پیار ان بیٹیوں کا چھاؤں سا ہے ۱۰۸

منصورہ نے حقیقی بیٹیوں سے بڑھ کر ان کا خیال رکھا۔ قاسمی کی طویل عمر کا راز منصورہ کی توجہ بھی تھی۔ وہ ''فنون'' میں معاون مدیرہ کے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ قاسمی کی رحلت کے بعد انھوں نے اپنا مجلّہ ''مونتاج'' نکالا جس کا پہلا شمارہ ''نذرِ ندیم'' ہے جو قاسمی کی شخصیت اور فکر وفن پر روشنی ڈالتا ہے۔

اکبر حمیدی اپنے مضمون ''ندیم عصر ــــ احمد ندیم قاسمی'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''ندیم صاحب نے بعض معاملات اپنے زمانے کی اخلاقی قدروں سے اتنے بلند اور اتنے مختلف اختیار کیے ہیں کہ لوگ انھیں تسلیم کرنے سے ہی منکر ہو گئے اور ہذیان گوئی میں مبتلا ہو گئے۔ ندیم صاحب نے محترمہ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کو بہنیں کہا اور پھر زندگی بھر ان سے سگے بھائیوں کی طرح حسن سلوک کرتے رہے۔ منصورہ احمد کو بیٹی بنایا تو بیٹیوں سے بڑھ کر منصورہ احمد کو تحفظ دیا۔ عزت دی، شفقت دی، رفاقت دی اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگوں کی ہذیان گوئی کی کبھی پروا نہیں کی اور ہمیشہ زندگی کے مثبت رویے اور حسن و خیر کے عمل جاری رکھے۔ آج کے زمانے میں یہ باتیں ہماری اخلاقیات سے اتنی بلند و بالا ہیں کہ ہمیں یقین ہی نہیں آتا کہ کوئی شخص اتنا بڑا بھی ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے لیے بھی اپنا دامن شفقت اس حد تک پھیلا دے جو حیران کن حد تک لائق ستائش اور قابل تقلید ہے۔'' ۱۰۹

احمد شاہ نے احمد ندیم قاسمی بننے سے پہلے اپنے گھر کی برسات میں ٹپکتی ہوئی چھت اور مفلوک الحالی بھی دیکھی اور سول آفیسر چچا کا ڈرائنگ روم بھی۔ ان دو متضاد زندگیوں سے جیسے جیسے گزرتے گئے۔ ویسے ویسے ان کا حساس ذہن بالیدہ ہوتا گیا اور ان کی شخصیت میں دردمندی اور گداز پیدا ہوتا گیا۔ یہ اگرچہ مرنجان مرنج، رحم دل اور فیاض انسان تھے۔ جو کچھ کماتے نہایت خاموشی سے غریبوں، دوستوں، ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے۔ اس کا محرک اول یہی تھا کہ انھوں نے اپنا بچپن اور جوانی مفلسی میں بسر کی۔ اس لیے جو روپیہ محنت شاقہ سے کماتے دوسروں کی مالی مدد کر کے اطمینانِ قلب حاصل کرتے۔ ایک مرتبہ ہاجرہ مسرور نے ان کی آمدنی کا حساب کتاب کیا تو ایک معقول رقم کا حساب نہ ملا۔ ہاجرہ کے استفسار پر خفگی سے یوں مخاطب ہوئے:

''دیکھو انسان صرف اپنے اور بال بچوں کے لیے ہی تو سب کچھ نہیں کماتا۔۔۔ تمھیں بھی اسی طرح اپنی آمدنی کی کچھ رقم کو بھول جانا چاہیے۔'' ۱۱۰

قاسمی توکل و استغنا؛ صبر و قناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کی بے پناہ کشش کا راز یہی تھا کہ دوسروں کے دکھ درد کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ ذرا سی تکلیف سے ان کا دل بھر آتا۔ زندگی کی بیشتر آسائشوں سے تہی دست ہونے کے باوجود ''ان کا دل ہر کسی کے لیے محبت، شرافت اور ہمدردی سے معمور تھا۔۔۔ وہ چند لمحوں کی قلبی تسکین اور مسرت کی خاطر اپنی جیب کی آخری پائی بھی دوسروں پر خرچ کر دیتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا سنہری اصول تھا۔'' ۱۱۱

ایسے موقعوں پر ان کی بادامی رنگ کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو جاتا اور طمانیت قلب کے باعث ہونٹوں کی مسکراہٹ دل کش ہو جاتی۔

اگر چہ قاسمی نے محکمہ آب کاری میں باقاعدہ ملازمت بھی کی اور ان کے عزیز دوست منٹو، کرشن چندر، فیض اور اختر شیرانی شراب کے رسیا تھے۔ قاسمی ان کی شخصیت وفن کے مداح بھی تھے۔ منٹو انھیں شراب نہ پینے پر ڈانٹتے، فیض شراب پینے پر اُکساتے۔ اس کے باوجود ان کے ہونٹ شراب کے ذائقے سے یکسر نا آشنا تھے۔ اختر شیرانی سے گہری عقیدت ومحبت کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو اختر کی شخصیت کے منفی اثرات سے محفوظ رکھا۔ اختر شیرانی اگر چہ سرِ عام شراب پیتے لیکن قاسمی کے اُستاد ہونے کے باوجود ان سے چھپ کر شراب پیتے تھے۔ قاسمی اس ام الخبائث سے نفرت کرتے تھے۔ بقول محمد خالد اختر:

''۔۔۔گو وہ ایک کہنہ اور بلا کا سگریٹ نوش ہے، اس نے کبھی شراب نہیں چکھی اور بیئر یا وسکی کا ذائقہ اس کے ہونٹوں کے لیے نا آشنا ہے۔۔۔شراب نوشی کو سات فقہی گناہوں میں سے ایک گردانتا۔'' ۱۲

قاسمی سگریٹ اور چائے کے بہت رسیا تھے۔ ان کے دفتر میں بھی ہر وقت چائے کا دور چلتا یا پھر سگریٹ کا دھواں ہوتا۔ انھوں نے اگر چہ تنہائی دُور کرنے کے لیے سگریٹ کو ساتھی بنایا۔ ۲۳ برس کی عمر میں جب ایکسائز انسپکٹر بھرتی ہوئے ایک تو غیر شاعرانہ ملازمت، دوسرے ہم سخن، ہم مزاج اشخاص کی کمی، تیسرے تنہائی کے باعث انھوں نے سگریٹ پینا شروع کیے۔ سگریٹ نوشی کی ابتدا کے متعلق مسعود اشعر رقم طراز ہیں:

''۔۔۔ایک دن تنہائی سے گھبرا کر پاسنگ شو کا سگریٹ منگوایا اور گویا اپنی واحد عیاشی کا آغاز کیا۔ کہتے ہیں کہ مہینے کے شروع میں ''کریون اے'' پیتے تھے اور باقی دنوں میں وہی ''پاسنگ شو'' یا ''کیپسٹن''۔'' ۱۳

ان کے اہلِ خانہ بھی سگریٹ نوشی کی عادت سے بہت تنگ تھے۔ رابعہ ندیم لکھتی ہیں:

''۔۔۔ندیم صاحب کے سگریٹوں کے ہاتھوں تو میرے گھر کی کوئی چادر، کوئی گدا، کوئی لحاف، کوئی بھی پلنگ کی نواڑ محفوظ نہیں ہے۔ پلنگ پر بیٹھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر پڑھتے اور شعر کہتے، ایش ٹرے بھی پلنگ پر ہی رکھتے ہیں۔ کچھ لکھنے کے لیے جلتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ دیتے ہیں اور پھر اسے بھول جاتے ہیں اور سگریٹ انھیں اپنی یاد یوں دلاتا ہے کہ چادر، گدے یا لحاف میں سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے۔ یقین مانیے تو میرے گھر میں بستر کی کوئی ایک بھی چادر ایسی نہیں ہے جس پر ندیم صاحب کے سگریٹ کی مہر آر پار ثبت نہیں ہے۔'' ۱۴

قاسمی کو ایک نارمل انسان کی طرح غصہ بھی آتا تھا۔ اکثر و بیشتر معاشرے میں ناانصافی، ریاکاری، ظلم و جبر کو دیکھ کر مغموم ہو جاتے۔ کبھی کالموں کے ذریعے ہلکے پھلکے انداز میں طنز کر کے اپنی خفگی کا اظہار کرتے۔ نعمان ندیم نے

راقم الحروف کو ایک انٹرویو میں بتایا:

''انھیں دغابازی، جھوٹ، الزام تراشی پر غصہ آتا تھا لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ اُداسی کو جلد ہی جذب کر لیتے۔ وہ صبر و تحمل اور حیرت انگیز قوتِ برداشت کے مالک تھے۔'' ۱۵

قاسمی غذا کے معاملے میں بہت شوقین نہ تھے۔ گھر میں جو پکا ہوتا، تناول فرما لیتے۔ زیادہ مرچ مصالحہ والی چیزیں پسند نہ تھیں۔ انھیں بہت کم کھانے کی عادت تھی خصوصاً رات کو تو ہلکا پھلکا کھاتے البتہ کھانے کے بعد میٹھا ضرور کھاتے۔ اگر میٹھی ڈش دست یاب نہ ہوتی تو شکردان سے تھوڑی سی شکر کھا لیتے۔ انھیں اپنی بیگم کے ہاتھ کا بنا ہوا حلوہ مرغوب تھا لیکن جب ''میٹھے کی فرمائش کرتے ہیں اور کچھ اس شوق سے کہ جتنا ملے گا سب کھا جائیں گے مگر جب میٹھا سامنے آئے گا تو دو چار نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیں گے۔'' ۱۶ ان کا ایقان تھا کہ کھانے کے لیے نہ جیو بلکہ جینے کے لیے کھاؤ۔ وہ جو بھی کھاتے وہ بہت سادہ اور ہلکا پھلکا ہوتا۔ قاسمی کھانے میں کبھی نقص نہ نکالتے۔ اگر سالن میں کوئی کمی بیشی ہوتی تو ان کے چہرے کے تاثرات سے عیاں ہو جاتا کہ آج سالن میں نمک زیادہ ہے یا کچھ اور۔۔۔ کبھی کبھار یہ کہہ دیتے ہیں کہ:

*''آج گل نیں بنڑی شین کہیں کی آہے ضرور۔'' ۱۷

اگر چہ بہت کم خوراک کھاتے تھے مگر لذیذ اور نفیس کھانے پسند کرتے، آلو گوشت، کھیر، حلوہ اور کباب شوق سے کھاتے۔ اگر کوئی پسند کی کتاب مل جاتی تو کھانا پینا بھول جاتے اور عمر کے آخری حصہ میں تو کھانا کھا کر بھول جاتے تھے۔

قاسمی کی محبت وسعت کی حامل تھی۔ وہ اپنے دوست احباب سے محبت کرتے تھے۔ وہ اپنے ملک، اپنے وطن کی غریب عوام سے محبت کرتے ہیں۔ پھر یہ محبت اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ پوری دنیا کے مظلوم عوام اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ عطا الحق قاسمی لکھتے ہیں:

''۔۔۔ندیم وہ بلند و بالا مینار ہے جہاں سے محبت کی اذان بلند ہوتی ہے اور دُکھی دلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔'' ۱۸

محبت و پیار کی ہلکی ہلکی آنچ نے ان کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ محبت اور انسان دوستی کا درس تادم آخر دیتے رہے۔ انسان دوستی ان کا فلسفہ زندگی بھی تھا اور عملی طور پر بھی عمل پیرا تھے۔ ان کی تخلیقی نگارشات اس امر کی گواہی دیتی ہیں مثلاً ان کی مقبول نظم ''انسان عظیم ہے خدایا'' بنی نوع انسان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھیں مخلوقِ خدا سے بہت پیار تھا۔ یہ احترام آدمیت کے قائل تھے جس کی بدولت انھیں زندگی میں بہت محبت ملی۔ دوستوں کی محبت، عزیزوں کی محبت، عوام کی محبت، غرض ان سے محبت کرنے والے سالگرہ کا دن اہتمام سے مناتے۔ انھیں اپنا پیر و مرشد

* [ترجمہ: آج بات نہیں بنی۔ کسی چیز کی کمی ہے ضرور]

تسلیم کرنے والوں نے ان کی زندگی میں ہی بزم ندیم قائم کر رکھی تھی۔ ان کی ۷۵ویں سالگرہ کے موقع پر ملک کے نام وَر نقاد فتح محمد ملک نے ان کی شاعری کے موضوع پر تازہ تصنیف زیورِ طبع سے آراستہ کرا کر تحفتاً پیش کی۔ قاسمی سراپا محبت و شفقت تھے۔ وہ محبت و خلوص کے بل بوتے پر ہر اجنبی کو اپنا بنا لیتے تھے۔ بقول منصورہ احمد:

> ''بابا محبت ہی محبت تھے۔ محبت کے چھوٹے سے اظہار پر سیال کی طرح بہہ جاتے، اُن سے تھوڑی سی محبت سے ہی آپ انھیں عمر بھر کے لیے جیت سکتے تھے۔ محبت کرنے والے بدل بھی جاتے تب بھی وہ اُن کا ماضی یاد کرتے رہتے۔'' [۱۱۹]

قاسمی نہایت خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ شعر و ادب میں ان کے بلند مقام اور حسن اخلاق کے باعث ''فنون'' کے دفتر اور مجلس ترقی ادب میں خاص و عام ملاقاتیوں کا ہجوم رہتا۔ قاسمی بلند اخلاق کے باعث اپنی نشست سے اُٹھ کر ملاقاتیوں کا استقبال کرتے۔ بعض نو وارد ادبا و شعرا بلاوجہ وقت کے ضیاع کا باعث بنتے لیکن ان کی پیشانی پر بل نہ آتا بلکہ خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ان کی مشکلات کو حتی الوسع حل کرنے کی مسائی کرتے۔

قاسمی تواضع پسند اور مہمان نواز انسان تھے۔ ان کے گھر اکثر مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا اور قاسمی بہتر سے بہتر ضیافت کے اہتمام میں مصروف ہوتے۔ ہر مہمان کے حال احوال میں ذاتی دل چسپی لیتے۔ اس کے کھیتوں کا حال، بیوی بچوں کا حال پوچھتے۔ دُکھوں کا مداوا کرتے، اظہارِ ہمدردی کرتے۔ اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ خود چائے تیار کرتے۔ توس پر مکھن لگاتے، غسل کے لیے پانی وغیرہ گرم کرتے۔

قاسمی انسان میں موجود رذائل اخلاق کے باوجود اس کی بے کراں صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ یہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ان کا نقطۂ نظر رجائی ہے۔ اس لیے وہ زندگی کے وسیع تر نقطۂ نظر کے حامل ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کو دریا سے سمندر میں اُتر جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ قاسمی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ یہ حساسیت خود اعتمادی کی بدولت نکھر گئی تھی۔ یہ انسان تو کجا پرندوں کو بھی اہمیت دیتے تھے کہ ان کے کسی فعل سے پرندوں کو نقصان نہ پہنچے۔ ایک دن یہ دفتر سے پیدل گھر آ رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ شدید گرمی میں ایک چڑیا گڑھے میں جمع شدہ پانی پی رہی ہے۔ یہ دُور ہی رُک گئے کہ کہیں چڑیا ڈر کی وجہ سے اُڑ نہ جائے اور جب چڑیا نہا دھو کر، پانی پی کر اپنی مرضی سے اُڑ گئی تو پھر قاسمی گھر آئے۔

قاسمی نے مشاعروں کے سلسلے میں اندرون ملک و بیرون ممالک کی سیاحت کی۔ مشاعرہ میں محفل کے آداب کا خاص خیال رکھتے۔ بڑھاپا آ جانے کے باعث بھی کبھی مشاعرہ میں نیم دراز ہوئے بغیر سیدھے بیٹھتے۔ عمر کے آخری حصہ میں عوارض کی شدت اور معالجوں کے اصرار سے اتنی تبدیلی آ گئی تھی کہ وہ مشاعروں اور محفلوں میں شرکت کم کرتے تھے لیکن اگر جاتے تو وضع غالب آ جاتی۔ نتیجتاً انھیں سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا لیکن جب مشاعرہ

تحت اللفظ پڑھتے تو سامع کے دل پر اثر کرتا۔ ڈاکٹر انور سدید ان کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''قاسمی صاحب جس کرب سے خیال کو شعر میں ڈھالتے ہیں۔ اسی کرب میں اسے پڑھتے بھی ہیں۔ چناں چہ الفاظ کے پتھر ان کی داخلی رقت سے گداز ہو جاتے ہیں اور یہ گداز تحت اللفظ میں شامل ہو جاتا ہے اور احمد ندیم قاسمی سامع پر وہ اثر انگیز کیفیت پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے ہیں، جو ان کے اپنے بطون کے کسی تہہ در تہہ گوشے میں منہ بند سیپ کی طرح موجود ہوتی ہے۔'' [۱۲۰]

قاسمی ایک سیلف میڈ انسان تھے۔ انھوں نے زندگی میں اپنی محنت، تخلیقی اثاثوں کی بدولت سماجی حیثیت بنائی۔ اگر چہ دن رات کی محنت شاقہ کے باوجود معاشی نا آسودگیوں کا شکار رہے۔ گلڈ نے لاہور میں جناب حنیف رامے کے ہاتھوں ادیبوں کو سستے داموں زمین الاٹ کرائی تو کچھ رقبہ انھیں بھی ملا۔ جب مکان بنانے بیٹھے تو بقول جمیل الدین عالی:

> ''۔۔۔مجھ سے اور میری معرفت میر خلیل الرحمٰن مرحوم مدیر ''جنگ'' سے اٹھارہ ہزار روپے قرض لیے (مجھ سے چھے ہزار لیے۔ میں نے اپنا ذکر اس لیے کیا کہ ان کی ایک اور صفت سامنے آجائے۔۔۔) انھوں نے تین چار برس بعد میری طرف سے کسی یاددہانی کے بغیر جو قرض مجھ سے لیا تھا مجھے واپس کر دیا اور میرا غالب قیاس ہے کہ میر خلیل الرحمٰن کا قرض بھی ''جنگ'' سے اپنے ماہانہ معاوضے میں سے منہا کراتے رہے۔'' [۱۲۱]

قاسمی جوانی میں محکمہ ایکسائز و ٹیکسیشن میں عمدہ عہدے پر فائز تھے۔ انھیں اگر دولت کی ہوس ہوتی تو اسی محکمے سے منسلک رہتے مگر انھوں نے اپنے مزاج اور فطری شوق کی پاس داری کی۔ خدائے بزرگ و برتر نے انھیں شاعرانہ خصائص ودیعت کیے تھے جن کے استعمال سے انھوں نے طمانیت کی زندگی بسر کی۔ انھوں نے اپنے نجی تجربے اور مشاہدے کو اپنی تحریروں میں کامیابی سے پیش کیا۔ قاسمی اپنے ماتحتوں سے شائستہ روی سے پیش آتے۔ کبھی ملازموں کو ڈانٹتے نہیں بلکہ شائستہ اور مہذب لہجے میں ہم کلام ہوتے اور براہ کرم، براہ مہربانی، شکریے کے الفاظ استعمال کرتے۔ ہمیشہ ''آپ'' کہہ کر مخاطب ہوتے۔ کبھی ملازم کو ادنیٰ انسان نہیں سمجھتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں ملازموں کے ساتھ چائے پیتے۔ انھیں اپنی زندگی کے گزرے واقعات سناتے۔ انھیں نہ صرف لطیفے سناتے بلکہ باقاعدہ ایکٹنگ کر کے دکھاتے جس کی بدولت ملازم ہمیشہ ان لمحوں کے منتظر رہتے۔ قاسمی کے ڈرائیور عبدالغفار نے راقم الحروف کو بتایا کہ ''فنون'' کے دفتر میں عمدہ وقت وہ ہوتا جب تمام سٹاف ان کے کمرے میں چائے پیتے۔ وہ اپنی زندگی کے لطیف و دل چسپ واقعات بہت عمدگی سے سناتے۔ قاسمی صرف مسکراتے تھے جب کہ دیگر افراد قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے۔ (۱۲۲)

مجلس ترقی ادب کا دروازہ ہر خاص و عام کے لیے کھلا ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی ادب کا طالب علم ان کی

خدمت میں حاضر ہوتا، کوئی اصلاح کا طلب گار ہوتا تو محبت سے پیش آتے۔ اسی طرح اگر کوئی تصنیف کے حوالے سے رہنمائی کا خواستگار ہوتا تو مفید مشوروں سے نوازتے۔ کوئی اپنی کتاب پر دیباچہ یا فلیپ لکھوانے کی خواہش کا اظہار کرتا تو اس کی خواہش ضرور پوری کرتے۔ نجیب احمد نے راقم الحروف کو بتایا:

''وہ واحد شخص تھے جن تک ہر شخص کی رسائی تھی۔ دفتر میں ہر شخص اُن کے کمرے تک بلاجھجک جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ضرورت مند افراد کے لیے وظائف لگاتے اور ہر مہینے انکساری سے لفافہ بھی پیش کرتے اور چائے بھی پلاتے۔'' [۱۲۳]

قاسمی کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔ انھیں کسی کے اعلیٰ عہدے یا معاشرے میں اس کے مرتبے سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ وہ انسان میں اچھائیاں تلاش کرتے تھے۔ منصورہ احمد نے راقم الحروف کو بتایا کہ میں جب بھی ان کے دوست نما دشمنوں کے بھیانک عزائم کی طرف ان کی توجہ دلاتی تو وہ نہ مانتے اور کہتے کہ انسانوں کی اکثریت اندر سے بہت خوب صورت ہے تاہم انسانوں کے ہجوم میں بعض لوگ بھیڑیوں کی صورت میں بھی موجود ہوتے ہیں۔

قاسمی کبھی کبھار جھوٹ بھی بولتے تھے۔ اس جھوٹ میں شرارت کا عنصر شامل ہوتا تھا اور اتنے اعتماد سے جھوٹ بولتے کہ کسی کو شبہ نہ ہوتا۔ جو لوگ ان کے قریب تھے وہ بآسانی ان کا جھوٹ پکڑ لیتے تھے۔ لیکن اس جھوٹ میں بھی محبت کا عنصر شامل ہوتا۔ مثلاً (ان کی منہ بولی بہن) خدیجہ مستور نے ان سے ضروری مشورہ کے لیے گھر مدعو کیا۔ انھوں نے اگلے روز دس بجے کا وعدہ کیا اور چائے بنا کر رکھنے کی بھی تاکید کی۔ خدیجہ سارا دن منتظر رہی۔ جب شام کو خدیجہ نے فون کیا اور نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو بولے:

''کمال کرتی ہو، آیا کیوں نہیں۔ دس منٹ تک پھاٹک پر ٹیکسی رکوا کر کھڑا رہا۔ تم نے اتنا پہاڑ سا کتا پال رکھا ہے اور اسے باندھتی بھی نہیں ہو۔'' [۱۲۴]

خدیجہ کا غصہ رفو چکر ہو گیا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی:

''لالہ! ہمارا کتا پچھلے ہفتے مر گیا ہے۔'' [۱۲۵]

اس قسم کے جھوٹ وہ اکثر بولا کرتے تھے جس سے کسی کا نقصان نہ ہوتا تھا۔ قاسمی کو خدیجہ مستور سے بہت لگاؤ تھا۔ اس کی وجہ ایک تو خدیجہ کی ذہانت و فطانت اور حاضر جوابی تھی اور دوسری وجہ یہ کہ خدیجہ ان کے ہر دل عزیز بھانجے کی بیوی بھی تھی۔ وہ ان سے ملاقات کے لیے بہانے تراشتے رہتے تھے۔ ایک روز خدیجہ سے کہنے لگے: ناہید نے تمھارے لیے مٹھائی بنائی ہے۔ شام کو آنا اور کھا جانا۔ خدیجہ شام کو گھر گئیں اور ناہید سے مٹھائی لانے کا کہا تو ناہید نے پریشان ہو کر کہا کہ پھوپھی ہمیں آپ کی آمد کی اطلاع نہیں تھی اور وہ انھیں بیٹھنے کا کہہ کر مٹھائی بنانے چلی جاتی

اور خدیجہ جب قاسمی کی جانب دیکھتی تو مسکراتے ہوئے بولتے:

''یار میں گھر میں کہنا ہی بھول گیا تھا کہ تمھیں کسی بہانے سے بلا رہا ہوں۔'' ۱۲۶

قاسمی پر کانوں کے کچا ہونے، دوسروں پر اعتبار کرنے اور دوسروں کی باتوں پر یقین کرنے کا انکشاف بھی ہوتا ہے۔ قاسمی کی عقیدت مند فریدہ حفیظ کے متعلق انھیں کسی نے بھڑکایا۔ جب وہ اپنے میاں سید سرفراز کے ہمراہ قاسمی کے گھر گئیں تو خندہ پیشانی سے استقبال کرنے کے بعد ''ہونٹ جس انداز سے بھینچے اس سے اندازہ ہوا کہ معاملہ خراب ہے۔ اس لیے انھوں نے فوراً ہی پوچھ لیا کہ'' قاسمی صاحب کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ چہرے سے ایک سایہ سا گزر گیا مگر پھر جب وہ بولے تو بالکل ناراض نہیں تھے۔ کہنے لگے: جا کر بھابھی سے مل آؤ۔ وہ رابعہ سے اندر والے کمرے میں ملنے کے لیے گئیں اور ناراضی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا:

''ناراضی کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ خواہ مخواہ کسی نے بھڑکا دیا ہوگا۔'' ۱۲۷

بشیر موجد معروف آرٹسٹ ہیں۔ انھوں نے عمر کا ایک طویل حصہ قاسمی کی رفاقت میں گزارا۔ جہاں وہ ان کی شخصیت میں موجود محبت و ایثار، ہمدردی، اعلیٰ ظرف کی توصیف کرتے ہیں وہیں ان کی شخصیت کے ایک کمزور پہلو کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔ان کی شخصیت میں ایک کمزوری بھی تھی وہ اپنی ذات پر یا اپنے فن پر ہلکی سی تنقید بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ادب و فن سے وابستہ اکثریت کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن ندیم صاحب اس کا اظہار بہت ہی کم کرتے تھے۔ اندر ہی اندر صاحب تنقید سے دُور ہو جاتے اور اندر ہی اندر کوئی نہ کوئی المیہ بن جاتا۔'' ۱۲۸

صحت کے معاملے میں نہایت لاپرواہی برتتے جس کے نتیجے میں ضعفِ قلب اور ضعفِ معدہ میں مبتلا ہوئے۔ یہ پابندی وقت کا بالکل خیال نہ رکھتے۔ نہایت سکون سے تیاری کرتے۔ جب مشاعرہ میں جانا ہوتا تو اکثر اُس وقت اسٹیشن پہنچتے جب ریل گاڑی چلنا شروع ہو جاتی تو دوسرے احباب ہاتھ بڑھا کر انھیں ریل گاڑی میں کھینچ لیتے۔ ایک دو بار تو بقول ناہید ندیم اسٹیشن سے گھر واپس آ گئے کہ چند لمحوں کی تاخیر سے پہنچے تھے اور ریل گاڑی جا چکی تھی۔

قاسمی مرحوم کو اگرچہ اس طویل عمر میں آزردگیوں، دل آزاریوں، پشیمانیوں کا بھی خاصا حصہ ملا لیکن کسی ملاقاتی کے سامنے شکوہ سنج نہ ہوئے۔ انھوں نے ان سب کو اپنے باطن میں مخفی رکھا۔ ہمیشہ مسکراہٹیں اور محبتیں تقسیم کرنا ان کا شیوہ رہا۔ قاسمی ہمیشہ ہمدرد دوست کی طرح دوسروں کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے۔

سیرت و کردار کے اس تفصیلی جائزے کے بعد جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ایک ایسے انسان کی ہے جس نے ساری زندگی نہایت شرافت، پاک بازی اور وضع داری سے بسر کی ہو۔ انکسار کے باوجود انا اور خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان کی شخصیت خوبیوں سے بھرپور تھی۔ انسان ہونے کے ناطے اگرچہ خامیوں سے مبرا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن

ان خامیوں کی بازگشت ادبی دنیا میں بہت کم سنی گئی۔ قاسمی کی شخصیت کو رحیم گل نے ''پورٹریٹ'' میں کیکر کے جنگل میں آم کا پیڑ کہا ہے۔ اس کے نزدیک اس دورِ تلخی میں ان کا وجود سراپا مٹھاس کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس شہر میں اور اس ملک میں کتنے لوگ ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا جا سکے کہ ان میں کوئی عیب نہیں ہے۔ تحقیق کریں تو چپراسی سے لے کر ملک کے صدر تک میں کوئی نہ کوئی عیب نکل آئے گا لیکن ایک شخص اس ''Q'' سے باہر تنہا کھڑا ملے گا اور اس کی روشن پیشانی پر جلی حروف میں پیرزادہ احمد شاہ لکھا ہو گا۔'' ۱۲۹

مرزا ادیب سے قاسمی کا قریبی تعلق تھا۔ وہ ان کے محبت و خلوص کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی شخصیت و کردار کو گلاب کے پھول سے تشبیہ دیتے جو آنکھوں کو نہ صرف رعنائی بخشتا بلکہ جس کی خوش بو کے ہر خاص و عام دلدادہ ہوتے۔

قاسمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہایت روادار، محبت کرنے والے، نرم دل، عجز و انکسار کا پیکر، مروت سے بھرپور انسان تھے۔ قاسمی کی شخصیت کے متعلق ان کے دوست احباب اور معاصرین کے تاثرات حسبِ ذیل ہیں۔

اشرف جاوید نے قاسمی مرحوم کی وفات پر ایک نظم بعنوان ''تمام شہرِ سخن اندھیر ہوا'' لکھی۔ مذکورہ نظم کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

ہوائے مرگِ وفا بُرا ہو تیرا
وصالِ مہ تاب کی خبر لائی
سحر بھی آئی تو چشمِ تر لائی

رہِ جدائی ہے ، ہم ہیں اور ترا غم
چراغِ دل بھی تو ہے بجھا جاتا
اب آگے کچھ بھی نظر نہیں آتا

فسانے نظمیں کہانیاں ہیں اُداس
غزل غزل نقشِ غم ہے، غرق فغاں
''فنون'' ماتم بپا و گریہ کناں ۱۳۰

معروف شاعر امجد اسلام امجد ان کی نرم مزاجی کا برملا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''۔۔۔اُن کی طبیعت میں جو نرمی، گداز، برداشت اور معاف کر دینے کی حیرت انگیز خوبی تھی، اس کا مظاہرہ میں اکتالیس برس سے دیکھتا آ رہا ہوں۔'' ۱۳۱

پاکستان کے نام ور نقاد سید عابد علی عابد ان کے افسانوی مجموعے ''طلوع و غروب'' کے فلیپ پر رقم طراز ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کے متعلق گفتگو یوں شروع ہونی چاہیے کہ وہ پہلے انسان ہیں، پھر شاعر

ہیں، فن کار ہیں، نقاد ہیں، مزاح نگار ہیں اور گفتگو یوں ختم ہو گی کہ وہ آخر میں بھی انسان ہیں اور درجہ اوّل کے۔'' ۱۳۲

جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''ندیم صرف اچھے شاعر ہی نہیں اچھے انسان بھی ہیں اور چوں کہ اچھا انسان ہر دور میں نایاب رہا ہے۔ اس لیے میں ندیم کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مجھے اُن سے محبت بھی ہے۔'' ۱۳۳

جمیل الدین عالی ''آخری آدمی'' میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''اس طرح کی شخصیت آج ہماری ادبی دنیا میں کم یاب ہی نہیں بالکل نایاب ہے۔'' ۱۳۴

مظہر محمود شیرانی اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''ندیم بھائی جان نے پہلی ملاقات سے لے کر دم واپسیں تک مجھے اتنا پیار دیا اور میرے ایسے ناز اُٹھائے کہ کوئی حقیقی بڑا بھائی تو کیا شاید باپ بھی بیٹے کے نہ اُٹھاتا ہو۔ ان سے میرے نیاز مندانہ اور برادرانہ مراسم کا شجر سایہ دار کوئی نصف صدی تک سرسبز و شاداب رہا۔ ان کے جانے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں کھونٹ اندھیرا چھا گیا ہو۔'' ۱۳۵

پاکستان کے نام وَر ادیب و نقاد ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''زندگی سے بھرپور ہنسی سے معمور، دوستوں سے پیار کرنے والا اور اپنے بیگانے کا ساتھی، ایسا شخص کیسے مر سکتا ہے۔'' ۱۳۶

معروف نقاد مجتبیٰ حسین رقم طراز ہیں:

''احمد ندیم قاسمی بنیادی طور پر نہایت شریف، باظرف اور شائستہ انسان تھے۔'' ۱۳۷

معروف مزاح نگار اور سفرنامہ نویس عطاالحق قاسمی نے راقم الحروف کو بتایا:

''میں نے ان کی شخصیت میں سب انسانی خوبیاں دیکھیں۔۔۔ وہ عجز و انکسار کا پیکر تھے۔ پسے ہوئے طبقوں کے لیے ان کا قلم ہی نہیں، ان کا دل بھی روتا تھا۔'' ۱۳۸

محمد خالد اختر سے قاسمی کے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے۔ یہ قاسمی کی ساحرانہ شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''۔۔۔اس کی شخصیت میں مقناطیسیت تھی، گفتگو میں چمک اور لوگ چھوٹے بڑے اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔'' ۱۳۹

قاسمی کی بے لوث محبت اور مشفقانہ برتاؤ نے بہت سے احباب کو اعتماد بخشا۔ بشیر موجد اپنی کتاب

''بولتے رنگ سوچتی لکیریں'' میں رقم طراز ہیں:

> ''میرے نزدیک ندیم نام ہے بے لوث محبت کا۔۔۔ سراپا شفقت کا۔۔۔ احترام اور دوستی کے گہرے سمندر کا۔۔۔ دوستی کے اس گہرے سمندر میں دوست تو دوست اگر دشمن بھی غوطہ زن ہو تو ان کی محبت کے موتی ضرور نکال لائے گا۔'' ۱۴۰

قاسمی کی شفقت و محبت اور صحبت سے ہر خاص و عام مستفید ہوتا۔ جمیل یوسف ان کی شخصیت کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''ندیم صاحب صحیح معنوں میں ایک شجر سایہ دار کی طرح تھے۔ وہ اپنے قریب آنے والوں کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیتے تھے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھتے تھے۔ ان کی پریشانیوں پر پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کی دست گیری کرتے تھے۔ صدق دل سے اپنے اثر و رسوخ کو اپنے عقیدت مندوں کے حق میں بروئے کار لاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے چاہنے والوں، ان سے محبت کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ روز افزوں رہی ہے۔ بڑے شاعر اور بڑے افسانہ نگار تو کئی اور بھی ہوتے ہیں مگر ندیم صاحب کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے ایک مشفق اُستاد بلکہ ایک محبت کرنے والے باپ کی طرح علم و ادب سے شغف رکھنے والی کئی نسلوں کی راہ نمائی اور سرپرستی کی۔ ان کی حیثیت ایک سدا بہار چشمے کی تھی۔ جہاں تشنگانِ علم آ کر ستاتے، اپنی پیاس بجھاتے اور تازہ دم ہو کر ایک نئے شوق اور ولولے کے ساتھ عازمِ سفر ہوتے تھے۔'' ۱۴۱

قاسمی کی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد جنہوں نے عمر عزیز کا طویل حصہ قاسمی کی رفاقت میں گزارا، قاسمی کی وفات پر اظہارِ خیال کرتی ہیں:

> ''وہ میرے باپ تھے، دوست تھے، اُستاد تھے، میری روحانی قوت تھے۔ وہ ایک ایسا ستون تھے جو زمین سے آسمان تک بلند تھے۔۔۔ باپ وہ ایسے تھے جن کی شفقت کے سمندر کا دوسرا کنارہ نظر ہی نہیں آتا۔'' ۱۴۲

عطاالحق قاسمی انھیں اپنا پیر و مرشد سمجھتے۔ یہ سفر و حضر میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ وہ قاسمی کی زندگی میں مثبت جہتوں سے متاثر اور دل و جان سے ان کے عقیدت مند تھے۔ وہ ان کی مسلسل شفقت کے مداح تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''ندیم صاحب آج ہم میں نہیں ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی شفقتوں کا تسلسل میرے لیے آج بھی موجود ہے۔ میں آج بھی ہر مشکل وقت میں اپنے کندھوں پر اُن کا ہاتھ محسوس کرتا ہوں۔ بڑے لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہا کرتے ہیں۔ اُن کو

زندہ رکھنے والے اُن کے یہ ہاتھ ہی ہوتے ہیں جو خلق خدا کے راستے کے کانٹے چنتے رہتے ہیں۔'' ۱۴۳

بقول الطاف گوہر:

''قاسمی میرے نزدیک ایک نہایت ہی شریف النفس، بے تعصب، بے ریا، پرخلوص اور سچ بولنے والا انسان ہے جس کے عزم اور ارادہ میں تمام عمر جھول نہیں آئی۔ قلم اس کا ایمان ہے اور ہر حال میں اس نے اس کی عصمت کی پاس داری کی ہے۔ شاید یہی عظمتِ فکر وفن ہے۔'' ۱۴۴

شہزاد احمد نے راقم الحروف کو بتایا:

''احمد ندیم قاسمی ایک نفیس انسان تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی اردو ادب کا ایک عہد ختم ہو گیا ہے۔ ان جیسا ادبی قد کاٹھ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔'' ۱۴۵

نعمان ندیم نے راقم الحروف کو بتایا:

''اباجی بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔۔۔ کس کس خوبی کا ذکر کروں وہ ہمارے لیے شفقت کا سائبان تھے۔ ان کی وفات کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چلچلاتی دھوپ میں تنہا کھڑا ہوں۔'' ۱۴۶

ارشاد احمد مجلس ترقی ادب میں قاسمی کے نائب قاصد تھے۔ وہ ۱۹۸۴ء سے قاسمی کی وفات تک ان کے ملازم رہے۔ انھوں نے قاسمی کے متعلق درج ذیل الفاظ میں اظہارِ خیال کیا:

''وہ بہت ہی اچھے، شریف النفس اور نفیس انسان تھے۔ وہ اپنا ہر کام خود کرنا پسند کرتے تھے۔ تمام ملازمین کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ اگر کسی کو کوئی مشکل ہوتی وہ اُس کی مدد کر دیتے بلکہ اُترے ہوئے چہرے سے ہی اندازہ لگا لیتے تھے پھر پریشانی رفع کر کے ہی دم لیتے۔'' ۱۴۷

قاسمی کا کردار چھتناور درخت کی مانند تھا جو بھی ان کے سایہ میں آتا محبت کا سلوک، ممتا کا پیار اور سکون حاصل کرتا۔ اسرار زیدی ''ندیم کے تاثرات'' میں لکھتے ہیں:

''ان کی شخصیت فی الواقع ایسا تن آور پیڑ ہے، جس کی خنک اور گھنی چھاؤں میں ہر آنے جانے والا ستانے کے لیے رُکتا ہے تو ایک راحت بخش سکون محسوس کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان رہروان طلب میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو آنکھ بچا کر اس کی سبز شاخوں کی قطع و برید سے بھی گریز نہیں کرتے مگر جب یہ چلتے پھرتے اس تن آور پیڑ کے نیچے ستانے آ نکلتے ہیں تو اس کی خنک اور گھنی چھاؤں پہلے کی طرح ہی ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتی ہے۔'' ۱۴۸

انھوں نے جس راہ گزر پر کڑی دھوپ دیکھی وہیں پر شجر سایہ دار بن گئے۔ ان کی مثال ایسے درخت کی ہے جس کی شاخیں محبت کے پھل سے جھکیں ہوئی تھی چناں چہ فرماتے ہیں:

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گزر ہوں ۱۴۹

قاسمی نے بچپن سے وفات تک کئی نشیب وفراز عبور کیے لیکن بدستور نظم وضبط اور صبر کا دامن تھامے رکھا۔ اپنی زندگی میں بڑے بڑے حادثات، عزیزوں کی وفات مثلاً چچا کا انتقال، بیگم کی وفات، جوان بیٹی نشاط کی بے وقت موت، ظہیر بابر کی وفات ایسے جاں کاہ حادثات پر بھی تحمل کا مظاہرہ کیا۔ بیگم اور بیٹی کی وفات نے اگر چہ زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ اس کمی کو خاموشی سے خود محسوس کرتے رہے لیکن اپنے دُکھ درد کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کبھی نہ کیا۔ یہ وسیع اور روشن دل و دماغ کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں ہمدردی، خلوص، شرافت، ملنساری، تہذیب وشائستگی، وضع داری، معاملہ فہمی، خوش اخلاقی موجود تھی۔ قاسمی کی تخلیقات ان کی شخصیت ونظریات کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ گلزار جاوید، براہ راست حصہ اول، لاہور، ایریز پرنٹرز، ۲۰۰۴ء، ص ۴۷

۲۔ محمد سرور اعوان، وادی سون سکیسر، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۲۹ء، ص ۲۱

۳۔ مسعود مفتی، ٹریول گائیڈ آف پاکستان، لاہور، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۲

۴۔ منّو بھائی (دیباچہ)، وادی سون سکیسر، از احمد غزالی، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰

۵۔ احمد ندیم قاسمی (تمہید)، جلال و جمال، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰، ۱۱

۶۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱

۷۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، شمارہ ۵۹، جنوری، فروری ۱۹۷۵ء، ص ۹۰

۸۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، شخصیات و ادبیات، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹۹

۹۔ آغا شیدا کاشمیری، آتش زیرپا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۰۳ء، ص ۳۸

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، جلال و جمال، محولہ بالا ۵، ص ۱۱

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ محمد شاہد حمید، احمد ندیم قاسمی کا افسانہ: تخلیقی بنیادیں، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۰

۱۳۔ عالمی اردو ادب، مرتبہ کشور وکرم (احمد ندیم قاسمی نمبر)، دہلی، جلد ۱۴، ۱۹۹۶ء، ص ۱۹

۱۴۔ آغا شیدا کاشمیری، آتش زیرپا، محولہ بالا ۹، ص ۳۷

۱۵۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، محولہ بالا ۶، ص ۲۲

۱۶۔ محمد بخش پیرزادہ، ندیم کا بچپن، مشمولہ افکار (ندیم نمبر)، محولہ بالا ۷، ص ۱۲۷

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، خودنوشت، مشمولہ ادبی مجلّہ ادبیات، اسلام آباد، محولہ بالا ۱۲، ص ۱۲

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، جلال و جمال، محولہ بالا ۵، ص ۱۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، محولہ بالا ۶، ص ۳۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۵، ۳۶

۲۴۔ محمد خالد اختر، ایک آدمی احمد شاہ نامی، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، شمارہ ۱، ۲، مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۲۱

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، جلال و جمال، محولہ بالا ۵، ص ۱۳، ۱۴

۲۶۔ محمد خالد اختر، ایک آدمی احمد شاہ نامی، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا۲۴

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، جلال و جمال، محولہ بالا۵، ص۱۳، ۱۴

۲۸۔ عباس طوروی، احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص۹ ۷

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۷

۳۰۔ عباس طوروی، احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک، محولہ بالا ۲۷، ص۹ ۷

۳۱۔ محمد عاصم بٹ، دوسرا آدمی (انٹرویو)، لاہور، جنگ پبلشرز، اگست ۱۹۹۲ء، ص۲۱، ۲۲

۳۲۔ احمد ندیم قاسمی، جلال و جمال، محولہ بالا۵، ص۱۶

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں مشمولہ عالمی اردو ادب، محولہ بالا۱۳، ص۲۲

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ احمد عقیل روبی، ندیم صاحب، مشمولہ سہ ماہی عبارت (ندیم ایڈیشن)، شمارہ ۵، ۶، اکتوبر تا مارچ ۱۹۹۷ء، ص۱۹۳

۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۱

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ خورشید ربانی، مرتبہ آدھی ملاقات، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص۲۸، ۲۹

۴۱۔ ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، محولہ بالا۶، ص ۴۸

۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۶۵

۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ ماہنامہ افکار، کراچی، محولہ بالا ۷، ص۹۲، ۹۳

۴۴۔ محمد علی صدیقی، احمد ندیم قاسمی چند یادیں، مشمولہ عالمی اردو ادب مرتبہ نند کشور وکرم، محولہ بالا۱۳، ص۳۰۲

۴۵۔ احمد ندیم قاسمی استفسار ندیم اُپل، مشمولہ مٹی کا سمندر از ضیا ساجد، لاہور، مکتبہ القریش، ۱۹۹۱ء، ص۵۲

۴۶۔ ہاجرہ مسرور، مشمولہ ندیم نامہ از محمد طفیل، بشیر موجد، لاہور، مجلس ارباب فن، ۱۹۷۶ء، ص۶۴، ۶۵

۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو مشمولہ عالمی اردو ادب مرتبہ نند کشور وکرم، محولہ بالا۱۳، ص۵۲

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ ایضاً، ص۴۷

۵۰۔ انتظار حسین، نا قابلِ تلافی نقصان، مشمولہ ندیم نامہ، مرتبہ اسلم فرخی، کراچی، ادارہ تصنیف و ترجمہ، ۲۰۰۶ء، ص۸۵

۵۱۔ ندیم کا خاکہ مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، لاہور، محولہ بالا ۷، ص۲۳

۵۲۔ ڈاکٹر افشاں ملک، احمد ندیم قاسمی آثار و افکار، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص ۳۹

۵۳۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، محولہ بالا ۶، ص ۱۸۲

۵۴۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۰

۵۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ماہنامہ کتاب نما، دہلی، جلد نمبر ۴۷، شمارہ نمبر ۲، فروری ۲۰۰۷ء، ص ۱۴

۵۶۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور، روزنامہ جنگ، ۱۲؍جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۱۳

۵۷۔ انتظار حسین، ناقابلِ تلافی نقصان، محولہ بالا ۵۰، ص ۸۴

۵۸۔ خالد احمد، لاہور، روزنامہ جنگ، ۱۴ جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۱۳

۵۹۔ نند کشور وکرم، احمد ندیم قاسمی ہشت پہلو ادیب، مشمولہ سورج، لاہور، جلد نمبر ۲۶، شمارہ ۳، ۴، جنوری تا جون، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶

۶۰۔ محمد حمید شاہد، احمد ندیم قاسمی تخلیقی بنیادیں، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۱

۶۱۔ خالد اقبال یاسر، احمد ندیم قاسمی کی شخصیت، مشمولہ اکادمی ادبیات، محولہ بالا ۶۰، ص ۲۱۵

۶۲۔ وزیر آغا، لاہور، روزنامہ جنگ، ۱۲؍جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۱۳

۶۳۔ ناہید قاسمی، میرے اباجی، محولہ بالا ۴۶، ص ۱۳۰

۶۴۔ آغا سہیل، ندیم ایک دل کش شخصیت، مشمولہ افکار، محولہ بالا ۷، ص ۱۶۹

۶۵۔ خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، نقوش (شخصیات نمبر)، لاہور، ادارہ فروغ اردو، شمارہ ۴۹، ۵۰، لاہور، ص ۴۰

۶۶۔ محمد بخش پیرزادہ، ندیم کا بچپن، مشمولہ افکار (ندیم نمبر)، محولہ بالا ۷، ص ۱۲۴

۶۷۔ محمد بخش پیرزادہ، احمد ندیم قاسمی، نقوش (شخصیات نمبر)، محولہ بالا ۶۵، ص ۴۰۳

۶۸۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا ۷، ص ۹۰

۶۹۔ ایضاً

۷۰۔ راقم الحروف، استفسار از ڈاکٹر ناہید قاسمی، چوہدری کالونی، A-15 سمن آباد، لاہور، ۱۴؍جون ۲۰۰۸ء

۷۱۔ قتیل شفائی، عظیم فن کار عظیم انسان، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا ۷، ص ۲۳۵

۷۲۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، میرے اباجی، مشمولہ ندیم نامہ مرتبہ محمد طفیل بشیر موجد، محولہ بالا ۴۶، ص ۱۳۱

۷۳۔ فکر تونسوی، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ مٹی کا سمندر، محولہ بالا ۴۵، ص ۱۷

۷۴۔ منور علی ملک، پس تحریر، لاہور، ٹمپل روڈ، ۱۹۹۱ء، ص ۹۴

۷۵۔ علی تنہا، احمد ندیم قاسمی کی ادبی تربیت اور جنوبی پنجاب، مشمولہ سہ ماہی معاصر، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۴

۷۶۔ افتخار احمد صدیقی، ہنستے مسکراتے قاسمی صاحب، مشمولہ ماہنامہ بیاض (ندیم نمبر)، لاہور، جلد ۱۴، شمارہ ۱۱۰، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۱

۷۷۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، محولہ بالا ۵۴، ص ۸۰

۷۸۔ افتخار احمد صدیقی، ہنستے مسکراتے قاسمی صاحب، مشمولہ ماہنامہ بیاض، محولہ بالا۷۶، ص۱۸۱

۷۹۔ مسعود اشعر، ندیم صاحب، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۶۴

۸۰۔ ابراہیم جلیس، جلا وطن احمد ندیم قاسمی، مشمولہ افکار (ندیم نمبر)، محولہ بالا۷، ص۱۹۳

۸۱۔ ایضاً، ص۱۹۴

۸۲۔ حمید اختر، چند یادداشتیں۔۔۔ چند خیالات، مشمولہ راوی، لاہور، جلد ۸۹، ۲۰۰۲ء، ص۱۲۳

۸۳۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، محولہ بالا۵۴، ص۸۶

۸۴۔ منور علی ملک، پس تحریر، محولہ بالا۴۷، ص۱۰۲

۸۵۔ راقم الحروف، استفسار از منصورہ احمد (منہ بولی بیٹی)، ۸۔۵۷ پی بلاک جوہر ٹاؤن لاہور، مورخہ ۱۱ رجولائی ۲۰۱۰ء

۸۶۔ مسعود اشعر، ندیم صاحب، مشمولہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۵۷

۸۷۔ احمد شفیع، میرا بھائی میرا دوست ندیم، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۷۵

۸۸۔ ناہید قاسمی، میرے اباجی، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۳۱

۸۹۔ ساقی فاروقی، چند یادیں، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۹۶

۹۰۔ ساقی فاروقی کے نام خط، مشمولہ معاصر، لاہور، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص۱۱

۹۱۔ راقم الحروف، استفسار از عطاء الحق قاسمی بمقام معاصر: ۱۳/۶ سی گلبرگ ہائٹس وارث روڈ لاہور، مورخہ ۱۵ رفروری ۲۰۰۹ء

۹۲۔ ایضاً

۹۳۔ شہناز پروین سحر، بیگم رابعہ ندیم سے انٹرویو، مشمولہ افکار (ندیم نمبر)، محولہ بالا۷، ص۱۳۰

۹۴۔ پرویز حمید، ندیم شفقت ہی شفقت، مشمولہ مٹی کا سمندر، محولہ بالا۴۵، ص۶۹۰

۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۹۰، ۹۱

۹۶۔ احمد ندیم قاسمی، (انتساب) دوام، لاہور، اساطیر پبلشرز ۱۹۹۱ء

۹۷۔ شہناز پروین سحر، بیگم رابعہ ندیم سے انٹرویو، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۳۰

۹۸۔ راقم الحروف، استفسار از ڈاکٹر ناہید قاسمی، مکان نمبر ۱۵۱، بلاک نمبر F-2، واپڈا ٹاؤن لاہور، مورخہ ۲۸ ردسمبر ۲۰۱۰ء

۹۹۔ ایضاً

۱۰۰۔ احمد ندیم قاسمی، دوام، محولہ بالا ۹۶

۱۰۱۔ راقم الحروف، استفسار از نعمان ندیم، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ سمن آباد لاہور، مورخہ ۱۹ رجون ۲۰۱۱ء

۱۰۲۔ احمد ندیم قاسمی، دوام، محولہ بالا۹۶، ص۱۱

۱۰۳۔ خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ مٹی کا سمندر، محولہ بالا۴۵، ص۳۴۷

۱۰۴۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت وفن، محولہ بالا۶، ص۴۰

۱۰۵۔ عبداللہ ملک، میرا دوست اور بزرگ احمد ندیم قاسمی، مشمولہ مجلّہ راوی، لاہور، جلد۸۹، ۲۰۰۲ء، ص۱۲۱

۱۰۶۔ ایضاً

۱۰۷۔ ساقی فاروقی کے نام جناب احمد ندیم قاسمی کا خط، مشمولہ سہ ماہی معاصر، لاہور، محولہ بالا۹۰، ص۱۱۹

۱۰۸۔ احمد ندیم قاسمی، دوام، محولہ بالا۹۶، ص۱۲

۱۰۹۔ اکبر حمیدی، ندیم عصر۔۔۔احمد ندیم قاسمی، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا۲۴، ص۳۲۲

۱۱۰۔ ہاجرہ مسرور، ندیم اور غمِ روزگار، مشمولہ ندیم نامہ، مرتبہ محمد طفیل بشیر موجد، محولہ بالا۱۶، ص۱۸۷

۱۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، ماہ نامہ بیاض، لاہور، ۲۰۰۶ء، جلد۱۴، شمارہ۱۰، ص۱۱۵، ۱۱۶

۱۱۲۔ محمد خالد اختر، ایک آدمی احمد شاہ نامی، مشمولہ ماہ نامہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۴۶

۱۱۳۔ مسعود اشعر، ندیم صاحب، مشمولہ ماہ نامہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۶۵

۱۱۴۔ شہناز پروین سحر، بیگم ندیم سے انٹرویو، مشمولہ ماہ نامہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۴۲

۱۱۵۔ راقم الحروف، استفسار از نعمان ندیم، ۲۱ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ سمن آباد لاہور، مورخہ ۳رجولائی ۲۰۱۱ء

۱۱۶۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، اباجی، مشمولہ ماہ نامہ افکار، محولہ بالا۷، ص۱۳۵

۱۱۷۔ ایضاً

۱۱۸۔ عطاالحق قاسمی، قاسمی صاحب، مشمولہ مٹی کا سمندر، محولہ بالا۴۵، ص۱۰۷

۱۱۹۔ منصورہ احمد، میرے بابا، مشمولہ ماورا، لاہور، شمارہ۰۷، جلد۸، جولائی ۲۰۰۷ء، ص۴۳

۱۲۰۔ ڈاکٹر انور سدید، ندیم اور مشاعرے، مشمولہ ماہ نامہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۲۵۰

۱۲۱۔ جمیل الدین عالی، آخری آدمی، مشمولہ سہ ماہی معاصر، لاہور، محولہ بالا، ص۴۴

۱۲۲۔ راقم الحروف، استفسار از عبدالغفار (ڈرائیور) بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۴رنومبر ۲۰۱۰ء

۱۲۳۔ راقم الحروف، استفسار از نجیب احمد بمقام الحمرا آرٹ گیلری لاہور، ۲۰رنومبر ۲۰۱۰ء

۱۲۴۔ خدیجہ مستور، لالہ اور جھوٹ، مشمولہ ماہ نامہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۱۲۴

۱۲۵۔ ایضاً

۱۲۶۔ ایضاً، ص۱۲۶

۱۲۷۔ فریدہ حفیظ، قاسمی صاحب، ملیے بھی تو ہیں، مشمولہ مٹی کا سمندر، محولہ بالا ۴۵، ص۴۸۹، ۴۹۹

۱۲۸۔ بشیر موجد، ایک عہد تھا جو اختتام پذیر ہوا، مشمولہ ماہنامہ الحمرا، لاہور، جلد۹، شمارہ۷، ص۳۳

۱۲۹۔ رحیم گل، پورٹریٹ، پشاور، مکتبہ ارژنگ، ۱۹۷۹ء، ص۲۱

۱۳۰۔ اشرف جاوید، داغ چراغ ہوئے، لاہور، ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۰۹ء، ص۱۹۲، ۱۹۳

۱۳۱۔ امجد اسلام امجد، قاسمی صاحب، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا۲۴، ص۹۵

۱۳۲۔ سید عابد علی عابد (فلیپ)، مشمولہ طلوع و غروب، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء

۱۳۳۔ جوش ملیح آبادی، پیغامات و تاثرات، مشمولہ ماہ نامہ افکار، کراچی، محولہ بالا۷، ص۳۳

۱۳۴۔ جمیل الدین عالی، آخری آدمی، مشمولہ سہ ماہی معاصر، لاہور، محولہ بالا۹۰، ص۴۴

۱۳۵۔ مظہر محمود شیرانی، سانجھ بھئی چودیس، مشمولہ ماہ نامہ مخزن، لاہور، جلد ۱۸، شمارہ ۱، ۲۰۰۸ء، ص۱۹

۱۳۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، قاسمی کی تخلیقی شخصیت، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا۲۴، ص۴۳

۱۳۷۔ مجتبیٰ حسین، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا۲۴، ص۳۶۴

۱۳۸۔ راقم الحروف، استفسار از عطاالحق قاسمی، محولہ بالا۹۱

۱۳۹۔ محمد خالد اختر، ایک آدمی، احمد شاہ نامی، مشمولہ سہ ماہی معاصر، لاہور، محولہ بالا۹۰، ص۳۱

۱۴۰۔ بشیر موجد، بولتے رنگ سوچتی لکیریں، لاہور، فنون پریس رائل پارک، ۲۰۰۲ء، ص۲۶

۱۴۱۔ جمیل یوسف، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ماہنامہ الحمرا، لاہور، جولائی ۲۰۱۰ء، جلد ۱۰، شمارہ ۷، ص۲۰

۱۴۲۔ راقم الحروف، استفسار از منصورہ احمد، ۵۷۸ پی بلاک، جوہر ٹاؤن لاہور، مورخہ ۱۱ر جولائی ۲۰۱۰ء

۱۴۳۔ عطاالحق قاسمی، وہ انسان دوست تھے، مشمولہ ماہ نامہ مخزن ۶، لاہور، جلد شمارہ ندارد، ص۳۷

۱۴۴۔ الطاف گوہر، تحریریں چند، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۲۱۲

۱۴۵۔ راقم الحروف، استفسار از شہزاد احمد، مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۲۴ر نومبر ۲۰۱۰ء

۱۴۶۔ راقم الحروف، استفسار از نعمان ندیم، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ سمن آباد لاہور، مورخہ ۱۹ر جون ۲۰۱۱ء

۱۴۷۔ راقم الحروف، استفسار از ارشاد احمد (نائب قاصد)، مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۲۴ر مئی ۲۰۱۰ء

۱۴۸۔ اسرار زیدی، ندیم کے تاثرات، مشمولہ مٹی کا سمندر، محولہ بالا ۴۵، ص۵۱۵

۱۴۹۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، محولہ بالا۵۴، ص۱۳۰

✿✿✿✿✿

باب دوم

نثری نگارشات کا جائزہ

احمد ندیم قاسمی کا نثری سفر تقریباً ستر برسوں (١٩٣٦ء سے ٢٠٠٦ء) پر محیط ہے۔ اس نثری سفر کی کہانی بہت دل چسپ ہے۔ انھوں نے نثر سے جس طرح اپنا رشتہ استوار رکھا وہ تخلیق اور تخلیقی عمل سے ان کی محبت اور گہری وابستگی کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ ادب سے ان کی کمٹ منٹ کو بھی عیاں کرتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی متفرق اصناف میں اپنے قلم کی جولانیاں دِکھائیں اور معروف یادگار کتابیں چھوڑیں۔ اظہار کے مختلف و منفرد وسیلوں اور گرد و پیش کی دنیا کے نت نئے روپ چشمِ بینا سے دیکھنے اور اظہار کا پیرہن عطا کرنے میں مشغول رہے۔ انھوں نے افسانے تخلیق کیے۔ کالم لکھ کر اپنے دور کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو منظرِ عام پر لائے۔ تنقید کے ذریعے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، خاکوں سے اپنے دور کی ادبی اور غیرادبی شخصیات کو متعارف کرایا اور ان کی زندگیوں کے عجیب و حیرت انگیز پہلوؤں کو آشکار کیا۔ ننھے بچوں کے لیے دل چسپ، سبق آموز اور حکمت آمیز کہانیاں لکھ کر انھیں اپنا گرویدہ بنایا۔ ڈرامے، ناول اور ناولٹ تخلیق کیے۔ فلموں کے اسکرپٹ اور گیت لکھے۔ کتابیں ترتیب و تدوین کیں۔ دیباچے اور فلیپ لکھ کر تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔ ساری زندگی وہ اپنی تخلیقات پاکستان و ہندوستان سے شایع ہونے والے اہم ادبی جرائد کو بھجواتے رہے اور ادبی جرائد کے مدیران ان تخلیقات کو اعزاز کے ساتھ شایع کرتے رہے۔ اس ضمن میں ''رومان'' (لاہور)، ''ادبی دنیا'' (لاہور)، ''ماہِ نو'' (لاہور)، ''ادبِ لطیف'' (لاہور)، ''بیاض'' (لاہور)، ''سویرا'' (لاہور)، ''اوراق'' (لاہور)، ''نقوش'' (لاہور)، ''شعور'' (دہلی)، ''شب خون'' (الہ آباد) اور ''عالمی اردو ادب'' وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جنھیں ان کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ اپنی تخلیقات کو ادبی جرائد کے ذریعے قارئین تک پہنچانا اور تخلیقی و تنقیدی سرگرمیوں میں مشغول رہنا ان کے رجائی تخلیقی رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی نثری نگارشات کا جائزہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

افسانوی مجموعے

قاسمی کو زمانہ طالب علمی میں ان کے عزیز دوست محمد خالد اختر نے فکشن کی جانب مائل کیا۔ اسکول کے دور میں اگرچہ انھوں نے ایک ناول لکھا جو اسّی (٨٠) صفحات پر مشتمل تھا۔ بعدازاں انھوں نے شاعری کی جانب توجہ مبذول کی۔ بالآخر ایس۔ای۔ کالج میں محمد خالد اختر کے ایماء پر افسانے کی ابتدا کی۔ ان کا پہلا افسانہ ''بدنصیب بُت تراش'' اختر شیرانی کے رسالہ ''رومان'' میں اپریل ١٩٣٦ء میں شایع ہوا۔ اختر شیرانی سے ان کا قلمی تعارف تھا۔ اختر شیرانی نے اس افسانے کی ستایش کی۔ اس تعریف و توصیف نے ان کے حوصلے کو بلند کیا چناں چہ رومان میں افسانے اشاعت کی غرض سے بھجواتے رہے۔ وہ اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ نوجوان نسل کی حوصلہ افزائی کرنا اختر شیرانی کا وطیرہ حیات تھا۔ تین برس بعد قاسمی کا افسانوی مجموعہ ''چوپال'' منظرِ عام پر آیا۔

ا۔ چوپال:

قاسمی تئیس (۲۳) برس کے جوان رعنا تھے جب ان کا اوّلین افسانوی مجموعہ ''چوپال'' شائع ہوا۔ ''چوپال'' کے افسانے سادہ لوح دیہاتیوں کی محبت، خلوص، غربت، جفاکشی، معاشی مسائل، رومانویت، انسانی بے کسی، انا اور باثروت افراد کے جبر کو شیریں بیانی سے بے نقاب کرتے ہیں۔ ''چوپال'' کے مندرجات کی ترتیب حسب ذیل ہے:

بے گناہ۔	دیہاتی ڈاکٹر۔	بوڑھا سپاہی۔	ننھا مانجھی۔	ہرجائی۔
مسافر۔	غیرت مند بیٹا۔	حق بجانب۔	آرام۔	وہ جا چکی تھی۔
انتقام۔	غرور نفس۔	یہ دیا کون جلائے۔	بے چارہ۔	

خالد اختر اور قاسمی کے مابین دوستانہ مراسم تھے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنے جذبات و احساسات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی تخلیقات کی جانب بھی گامزن رہتے تھے۔ قاسمی اپنی اوّلین نثری تحریر کو خالد اختر کے نام درج ذیل عبارت کے ساتھ معنون کرتے ہیں:

> ''خالد! میرے افسانے تمہارے ان خطوط سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور میں نے کالج کے حسین دنوں میں تم سے وعدہ بھی کیا تھا۔ چناں چہ میری اوّلین اور اس لیے عزیز ترین تصنیف تمہارے نام سے معنون ہے۔'' [۱]

عبدالمجید سالک اور امتیاز علی تاج نے زیرِ نظر مجموعے کا دیباچہ تحریر کیا۔ انھوں نے اپنے مشاہدے اور قوتِ احساس و جذبات کے بل بوتے پر جو کچھ تخلیق کیا، اسے داد و تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔ معروف ادیب عبدالمجید سالک کو نوجوان قاسمی سے بہت توقعات وابستہ تھیں۔ وہ ان کی ذہانت و فطانت کے معترف ہونے کے ساتھ ساتھ اس نوجوان کے روشن مستقبل سے بھی پُراُمید تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''میرے نزدیک ندیم آئندہ دور کا ممتاز ترین شاعر اور افسانہ نگار ہے۔ اس کے ساتھ پنجاب اور اردو کی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اگر موقعوں اور سامانوں نے مساعدت کی تو انشاء اللہ میری پیشین گوئی پوری ہو گی اور اہلِ فن ندیم کے شہکار روپ کو آنکھوں میں جگہ دیں گے۔'' [۲]

مقبول ڈراما ''انارکلی'' کے خالق سید امتیاز علی تاج، قاسمی کے اوّلین افسانوی مجموعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ ادبی دنیا میں ''چوپال'' کو خوش آمدید کہا۔ اس مجموعہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کی اس ابتدائی کوشش کو دیکھ کر ہر پڑھنے والے کو بے اختیار اس امر کا احساس ہو گا کہ اردو ادب مستقبل کے بڑے مصنف سے روشناس ہو رہا ہے۔'' [۳]

اردو ادب کے معروف افسانہ نویس سعادت حسن منٹو اور مقبول نقاد سید وقار عظیم نے ''چوپال'' کا فلیپ لکھا۔ منٹو نے اس مجموعے میں شامل افسانہ ''بے گناہ'' کو سراہا جب کہ سید وقار عظیم ان کی افسانہ نگاری کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''۔۔۔ان کی کہانیاں زندگی کے زہر اور اس کے تریاق کی کہانیاں ہیں اور ان کی کہانیاں انسانیت اور فن کی بہترین قدروں کی غیر واعظانہ تلقین کی کہانیاں ہیں۔'' ؎

قاسمی کا یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شایع ہوا۔ لیکن راقم الحروف کے پیش نظر مجموعہ احمد ندیم قاسمی کی حیات میں ۱۹۹۵ء میں نقوش پریس لاہور سے شایع ہو کر اساطیر پبلی کیشنز لاہور کے زیرِاہتمام اشاعت پذیر ہوا اور یہ مجموعہ مجلد صورت میں ۱۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

مظفر علی سید، قاسمی کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے قاسمی کے بہترین افسانوی انتخاب میں زیرِنظر مجموعے کا ایک افسانہ ''انتقام'' شامل کیا۔ جب کہ قاسمی نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں ''مسافر'' کو شامل کرنا مناسب سمجھا۔ فتح محمد ملک اردو ادب کے نقاد ہیں وہ نہ صرف قاسمی کے دیرینہ دوست تھے بلکہ ان کے شخصی و فکری رویوں سے بھی شناسا تھے۔ انھوں نے قاسمی کے فکر و فن پر مختلف مضامین کے علاوہ ایک کتاب ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار'' لکھی جو ۱۹۹۱ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیرِاہتمام شایع ہوئی۔ انھوں نے اپنے مرتبہ انتخاب ''جب بادل اُمڈے'' میں ''بوڑھا سپاہی'' کو شامل کیا۔ یہ انتخاب ۲۰۰۲ء میں الحمرا پبلشنگ اسلام آباد سے شایع ہوا۔ سجاد شیخ نے قاسمی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کیے۔ انھوں نے Selected Short Stories of Ahmad Nadeem Qasmi میں ''بوڑھا سپاہی اور مسافر'' کو شامل کیا۔

۲۔ بگولے:

''بگولے'' کے افسانے حقیقت پسندی، احترامِ آدمیت، انسانی محبت، عہدِ شباب کی خوش گن ساعتوں، جوش و ولولے، انسانی مسائل و مصائب، معاشرتی ماحول، مقامی حسن، بغاوت فوجی محاذ، جنگی حالات اور محبت و رفاقت کے جذبات کی عکاسی پُرتاثیر انداز سے کرتے ہیں۔ ''بگولے'' میں ان کے مندرجہ ذیل بیس افسانے شامل ہیں۔

طلائی مہر۔ توبہ میری۔ بھوت۔ ننھے نے سلیٹ خریدی۔ بچپنہ۔
کریاکرم۔ کھیل۔ بچے۔ میرا رانجھا۔ چوری۔

السلام علیکم۔ پاؤں کا کانٹا۔ ان بن۔ قلی۔ سرخ ٹوپی۔
خوش رہو۔ سپنوں کا محل۔ مانو کی میاؤں۔ ماں۔ پرچھائیاں۔

قاسمی کے والد گرامی کی وفات کے بعد مشفق و مہربان چچا کی شفقت اور بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش کی محبت و رفاقت ان کے ساتھ رہی۔ من پسند نوکری کا حصول ہو یا استعفیٰ دینا، دلی کیفیات کا اظہار ہو یا کوئی تمنا، یہ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ بڑے بھائی کے مشورے اور پرخلوص حمایت کی روشنی میں کرتے۔ یہ اپنے بڑے بھائی کا دل سے احترام کرتے اور بڑے بھائی نے بھی انھیں زندگی کی کڑی دھوپ کی پرچھائیوں سے ممکنہ حد تک بچائے رکھا۔ قاسمی ان کی حکم عدولی نہ کرتے تھے۔ ایک روز پیرزادہ محمد بخش نے انھیں انگہ بلایا اور ماں کے مشورے سے ان کی شادی برادری کی ایک ناخواندہ خاتون رابعہ بیگم سے کر دی۔ ذہنی تفاوت کے باوجود مصنف نے اس رشتے کو تادمِ آخر قائم رکھا۔ رابعہ ہی ان کی جیون ساتھی رہی۔ یہ قاسمی کی ادبی فتوحات پر مسرت کا اظہار کرتے۔ قاسمی کو بڑے بھائی سے بہت عقیدت و محبت تھی۔ ''بگولے'' کا انتساب اپنے بڑے بھائی کے نام منسوب کرتے ہیں۔

''نذر

برادرِ بزرگ پیرزادہ محمد بخش صاحب قاسمی کے نام!
جنھوں نے میرے بچپن کی نیم شگفتہ نیم پژمردہ گھڑیوں سن بلوغ کے احساس کی آنچ سے
تپتے لمحوں اور شباب کی دھڑکتی اور بھڑکتی ساعتوں میں متبسم چہرے اور پرخلوص ولولے سے
میرا ساتھ دیا اور بارہا مجھے نا اُمیدی اور تذبذب کے غاروں میں گرنے سے بچایا۔'' ۵

زیرِنظر مجموعے کا دیباچہ برصغیر پاک و ہند کے مقبول افسانہ نگار کرشن چندر نے تحریر کیا جن سے قاسمی کے دوستانہ اور گہرے تعلقات تھے۔ کرشن چندر نے قاسمی کے فکر و فن، موضوعات، تکنیک اور اسلوب کی خصوصیات کو جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''چوپال کے بعد ''بگولے'' اس افسانوی رہگذار پر سنگِ میل ہے جو ہمیں احمد ندیم قاسمی کے ذہنی ارتقا کو ماپنے میں مدد دیتا ہے۔ چوپال میں شیرینی اور رنگینی ہے۔۔۔ لیکن ''بگولے'' میں جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے۔ اِک کربناک فکری تلخی اور صحرائی وحشت پائی جاتی ہے۔'' ۶

اردو ادب کے معروف نقاد سید احتشام حسین، قاسمی کے افسانوں میں موجود گہرے مشاہدے، رومانی دفور، حقیقت پسندی، گداز قلب اور انسان دوستی کو قابلِ ستایش نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ''بگولے'' کے فلیپ پر اظہارِ رائے کرتے ہیں:

> ''۔۔۔ایک اچھے شاعر اور افسانہ نگار، ایک اچھے دوست اور اچھے انسان کی ساری خوبیاں قاسمی میں جمع ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انھیں پنجاب کے دیہاتوں نے

ماحول کی کشمکش نے پیرزادگی کے اخلاقی تصور نے علم و آگہی کی پیاس نے اور انسانی
محبت کے احساس نے جو کچھ دیا ہے وہ ان کے حسین اور توانا پہلوؤں کو اپنے افسانوں
اور اپنی نظروں کے ذریعے عام کر رہے ہیں۔'' ۷

یہ مجموعہ مکتبہ اردو لاہور سے ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا۔ راقم الحروف کے پیش نظر مجموعہ دو سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے؛ اس کی قیمت مبلغ ایک سو اسی روپے ہے۔ پیش نظر مجموعہ ''شرکت پرنٹنگ پریس'' سے چھپا اور اساطیر پبلشرز لاہور کے زیرِاہتمام شایع ہوا۔ قاسمی کے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے کے شمول میں ''چوری''، ''پاؤں کا کانٹا''، ''قلی''، ''السلام علیکم'' اور ''سرخ ٹوپی'' ہیں۔

۳۔طلوع وغروب:

قاسمی کے تیسرے افسانوی مجموعے کے افسانے دیہاتی باشندوں کے جذبات و احساسات کی کہانی سنانے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں کے نشیب و فراز کو حقیقت پسندی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ چوپال کی محفلوں کا ذکر ہو یا حقہ کشی کا دور، دیہاتیوں کا خلوص و اعتماد ہو یا محنت کشوں کی بے کسی، زمین داروں کا استحصال ہو یا کسانوں پر ظلم و جبر، یہ مجموعہ ان تمام تلخ اور حقیقی دل پذیر واقعات پر محیط ہے۔ ''طلوع وغروب'' درج ذیل نو افسانوں سے ترتیب دیا گیا ہے:

طلوع وغروب۔ کنگلے۔ فقیر سائیں کی کرامات۔ گونج۔ جلسہ۔
میرا دیس۔ جوانی کا جنازہ۔ پکا مکان۔ چھاگل۔

''طلوع وغروب'' ایک طویل افسانہ ہے جو طویل مختصر افسانہ بھی کہلاتا ہے۔ اس مجموعے کا انتساب قاسمی نے اپنے مشفق و مہربان عزیز محمد حیات قاسمی کے نام منسوب کیا ہے جو عمر میں ان سے چند برس بڑے تھے۔ انہی کی بدولت، چچا کی وفات کے بعد روزگار کی فراہمی میں آسانیاں پیدا ہوئیں اور قاسمی نے زندگی کے کئی حسین لمحات ان کی معیت میں گزارے۔ لکھتے ہیں:

''پیرزادہ محمد حیات قاسمی کے نام!
اس دل آویز رات کی یاد میں، جب ہم
نے اپنے گاؤں کے مغرب میں ایک اندھی گہری
کھاڑی میں چھپ کر سوئے ہوئے جنگلی کبوتروں
پر اندھیرے میں فائر کیے تھے اور جب واپسی پر ہم
نے اپنی اس عجیب وغریب حرکت کے حق میں صرف
یہ دلیل پیش کی تھی کہ:

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے'' ۸

اس افسانوی مجموعے کا دیباچہ مصنف نے خود تحریر کیا ہے۔ اُنھوں نے پنجاب کے دیہاتی مناظر اور کرداروں کے انتخاب و انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ قاسمی نے چوں کہ ابتدائی عمر دیہات میں گزاری۔ اس لیے تلاشِ معاش کے سلسلے میں شہر میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود دیہات سے ان کا ناتا ختم نہیں ہوا۔ انھوں نے دیہاتی ماحول کو قریب سے دیکھا۔ دیہاتیوں کا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے حالات کی ستم ظریفی کے ستائے ہوئے محنت کش اور مفلس کسانوں کے احساسات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔میرے لیے یہی اطمینان کافی ہے کہ میں نے ان بے زبانوں کی نمائندگی کی ہے جن کی زندگیاں محبوس ہیں اور جن کے لبوں پر رواج اور قانون نے مہر لگا رکھی ہے۔'' ۹

اردو ادب کے نقاد سید عابد علی عابد ''طلوع و غروب'' کے فلیپ پر قاسمی کے فنِ افسانہ نگاری کو قابلِ تحسین گردانتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''افسانہ نگاری اور شعرگوئی دونوں اصنافِ ادب میں وہ زندہ رہیں گے۔ تاریخ انسانیت کے احترام کے نقیب کو پہچان کر، ایک محرابِ خاص میں جگہ دے گی۔۔۔ان کی خدمات کا اعتراف ہم لوگ رسماً کر رہے ہیں۔ زمانہ اپنا فیصلہ صادر کر چکا ہے، گو وہ اس کے محتاج نہ تھے، نہ ہیں۔'' ۱۰

پیشِ نظر مجموعے کو ۱۹۴۳ء میں ''نیا ادارہ'' (لاہور) نے ایک ہزار کی تعداد میں شایع کیا۔ مقالہ نگار کے پیشِ نظر ''اساطیر پبلی کیشنز'' (لاہور) کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہونے والا مجموعہ ہے۔ مجلد صورت میں ایک سو اکاون صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پر قیمت ایک سو تیس روپے درج ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۹۵ء میں شرکت پرنٹنگ پریس سے طبع ہوا۔ مجموعہ ''طلوع و غروب'' کے افسانوں ''کنگلے'' اور ''جلسہ'' کو قاسمی نے ''خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے'' میں بھی شامل کیا۔ فتح محمد ملک نے اپنے مرتب کردہ مجموعہ ''جب بادل اُمڈے'' میں ''طلوع و غروب'' کے افسانوں ''طلوع و غروب'' اور ''جلسہ'' کو شامل کیا۔

۴۔ گرداب:

قاسمی کے چوتھے مجموعے کے افسانے سیاسی، طبقاتی، سماجی اور معاشی تناظر کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے خالق کے ذہنی و فکری ارتقا کو اُجاگر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ''گرداب'' پندرہ دل آویز افسانوں پر مشتمل ہے جس کے مندرجات کی ترتیب درج ذیل ہے:

مسجد کے مینار۔ کھوٹے سکے۔ نرم دل۔ استعفیٰ۔ ادھورا گیت۔
روشن دانوں کے شیشے۔ بگلی۔ غریب کا تحفہ۔ افیونی۔ ایک رات چوپال پر۔
رنگ و سنگ۔ فساد۔ انسان اور حیوان۔ ہسپتال سے نکل کر۔

''گرداب'' کا انتساب شیخ خورشید احمد کے نام منسوب ہے۔ دیباچہ مصنف نے خود لکھا ہے جب کہ اس کی اشاعت ''اردو'' حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔

۵۔ سیلاب:

''سیلاب'' کے افسانے زندگی کے روبہ تغیر حقیقتوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ یہ زندگی کے زندہ مسائل اور تلخ حقائق کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ ''سیلاب'' میں بارہ افسانے، ایک ڈراما اور ایک مکالمہ شامل ہے:

نیم وا دریچے۔	بڈھا کھوسٹ۔	شادی۔	جوانی کی سرانڈ۔
مستقبل کے سوداگر۔	پلکوں کے سائے۔	اُلجھن۔	کانی آنکھ۔
من کی ڈالی۔	آزاد منش غلام۔	معطر لفافہ۔	من کی کرچیاں (مکالمہ)۔
سونے کا ہار۔	نئی سارنگی۔		

''سیلاب'' کا انتساب قاسمی کے عزیز دوست نندلال اینجہ ایم۔ایس۔سی کے نام ہے۔ یہ مجموعہ دارالاشاعت ''اردو'' حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۳ء میں شایع ہوا۔ یہ مجموعہ اب ناپید ہے۔

قاسمی کے مندرجہ بالا مجموعے ''گرداب'' اور ''سیلاب'' اُن کے فکری تنوع اور اسالیبِ فن کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں مگر اصل مسئلہ جوان نگارشات کے ضمن میں سامنے آتا ہے وہ صحتِ متن اور خام مواد کا تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے مجموعہ ''سیلاب'' ترمیم و اضافے کے بعد موجودہ صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اُنھوں نے ۱۹۶۱ء میں دونوں مجموعوں ''گرداب'' اور ''سیلاب'' سے فنی پختگی کے حامل افسانے منتخب کر کے ایک مجموعے کی صورت میں یکجا کیے۔ اس مجموعے کا نام ''سیلاب و گرداب'' تجویز کیا۔ قاسمی نے ''گرداب'' سے پانچ افسانے: ایک رات چوپال پر، ادھورا گیت، حیوان اور انسان، غریب کا تحفہ، استعفیٰ کا انتخاب کیا جب کہ دیگر دس افسانوں کو رد کر دیا۔ بایں ہمہ ''سیلاب'' سے: الجھن، بڈھا، کانی آنکھ، من کی ڈالی، سونے کا ہار اور نیم وا دریچے کو شامل کیا۔ اُنھوں نے ''بڈھا کھوسٹ'' کا عنوان تبدیل کر کے ''بڈھا'' رکھا۔ قاسمی ''گرداب'' اور ''سیلاب'' کے رد کردہ افسانوں کے متعلق ''سیلاب و گرداب'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے اعتراف ہے کہ ان میں سے بیشتر خام تھے اور میں اپنی زندگی کے آغاز میں ہر نئے ادیب کی طرح کڑے انتخاب کے بجائے فوری اشاعت کو ضروری سمجھتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کہانیاں بھی جنھیں زیادہ سے زیادہ ایک نومشق کی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ ان مجموعوں میں شامل ہوگئیں۔ اب ان افسانوں کا انتخاب ایک ہی مجموعے کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نے وہ افسانے خارج کر دیے ہیں جو کسی صورت میری نمایندگی نہیں کرتے بلکہ محض لکھنے کی خاطر لکھے گئے ہیں۔'' [۱۱]

پیشِ نظر مجموعہ کا انتساب شیخ خورشید احمد ایڈووکیٹ کے نام منسوب ہے۔ دیباچہ قاسمی نے ۱۹۶۱ء میں لکھا۔ فلیپ میں سید وقار عظیم کی رائے درج ہے۔ افسانوں کا مجموعہ ایک سو ترپن صفحات پر مشتمل ہے جس پر اُنتالیس روپے قیمت درج ہے۔ اُسے گلوب پبلشرز لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شایع کیا۔

مظفر علی سید نے قاسمی کے بہترین افسانوں کے انتخاب میں ''سیلاب'' کے مسترد کردہ افسانوں کو دوبارہ جانچا اور ''معطر لفافہ'' کو شامل کیا۔ جب کہ قاسمی نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں ''بڈھا'' کو شامل کیا۔

۶۔ آنچل:

''آنچل'' کے افسانے فن اور مقصد کے خوب صورت امتزاج پر محیط ہیں۔ یہ پنجاب کی رومانوی فضا، تعصب، تنگ نظری، معاشرتی جبر، بے انصافیوں اور سماجی بغاوت کو حقیقت پسندی سے پیش کرتے ہیں۔ ''آنچل'' میں کل گیارہ افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

محدب شیشے میں سے۔	جان ایمان کی خیر۔	نشیب و فراز۔	خربوزے۔
نامرد۔	سائے۔	حدِ فاصل۔	انصاف۔
مہنگائی الاؤنس۔	سانولہ۔	شعلہ نم خوردہ۔	

قاسمی نے زیرِ نظر افسانوی مجموعہ میں شامل افسانہ ''محدب شیشے میں سے'' کو ''آبلے'' کے ایڈیشن میں شامل کر دیا۔ مصنف نے اس تبدیلی کی وضاحت نہیں کی۔ راقم الحروف کے مطابق ''محدب شیشے میں سے'' ایک طویل افسانہ تھا۔ اس کی طوالت کے باعث مصنف نے ''آبلے'' کی طویل کہانیوں کے ہمراہ شامل کرنا مناسب سمجھا۔

اختر شیرانی رومانوی شاعر تھے جن کا طوطی بولتا تھا۔ قاسمی کا اولین افسانہ ''بدنصیب بُت تراش'' اختر شیرانی کے رسالہ ''رومان'' کے فروری کے شمارہ میں ۱۹۳۶ء میں شایع ہوا۔ یہ مجلّہ نوارد ادبا و شعرا کو ادبی دنیا سے متعارف کراتا۔ اسی روایت کی تقلید کرتے ہوئے انھوں نے سویرا، نقوش، ادبِ لطیف بالخصوص فنون میں نئے ادبا و شعرا کو جگہ دی۔ انھوں نے حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کے ذریعے بہترین ادب کی تخلیق کا فریضہ بھی احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ قاسمی، اختر شیرانی کی فنی عظمت کے معترف ہونے کے علاوہ ان کی شخصیت کے سحر میں بھی گرفتار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی شاعری پر اختر کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ وہ اختر کو اپنا معنوی اُستاد سمجھتے تھے۔ ''آنچل'' کے مجموعے کا انتساب اس کرم فرما شخصیت کے نام معنون کرتے ہیں جنھوں نے

ان کے علمی و ادبی شعور کو جلا بخشی۔ لکھتے ہیں:

''اختر شیرانی کے نام!
جن کی شخصیت ان کی شاعری
سے بھی دل چسپ اور پیاری ہے۔'' [۱۲]

قاسمی کو دنیائے افسانہ میں اپنی برتری کا احساس تھا۔ ۱۰ر مئی ۱۹۴۴ء کو پیش نظر مجموعہ کا دیباچہ سپردِ قلم کرتے ہوئے نہایت اعتماد سے لکھتے ہیں:

''وقت بہترین نقاد ہے اور میں اپنی ادبی کاوشوں کو وقت کے حوالے کرتا ہوں، اگر ان میں کوئی جوہر ہے تو دنیا کی کوئی قوت ان کی تابانیوں کو نہ چھین سکے گی اور اگر یہ محض ذہنی آوارگی کی پرچھائیاں ہیں تو یہ خود بخود مٹ جائیں گی۔'' [۱۳]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے قاسمی کے افسانوں میں فن اور مقصد کے خوب صورت امتزاج کو سراہا ہے۔ وہ قاسمی کی افسانہ نگاری کی ستائش درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی اُردو کے اُن فن کاروں میں سے ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اپنے دور کی تاریخ پر اپنا نقش ثبت کر دیتے ہیں۔ مقصد اور فن کا حسین توازن ان کی کامیابی کی ضمانت بن گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں زمین اور انسان سے ان کی بے پایاں محبت اور بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔'' [۱۴]

افسانوں کا یہ مجموعہ ایک سو اسی صفحات پر محیط ہے جس پر قیمت مبلغ پچاس روپے درج ہے۔ ''مکتبہ فروغ اردو' لاہور نے ۱۹۴۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ قاسمی نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں ''خربوزے'' اور ''مہنگائی الاؤنس'' کا انتخاب کیا ہے جب کہ سجاد شیخ نے ''جان ایمان کی خیر'' کا انتخاب کیا۔

۷۔ آبلے:

ان افسانوں میں معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف کی فکر آئینہ کی مانند صاف و شفاف ہے۔ زیر نظر مجموعہ دیہاتی معاشرت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جنگ کے اثرات اور اس کی ہولناکیوں پر منتج ہے۔ تین طویل افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

کفارہ۔	ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد۔	عبدالمتین ایم۔اے۔

اس مجموعہ کی مقبول کہانی ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' ہے جو جنگ کی تباہ کاریوں کی دل خراش تصویر پیش کرتی ہے۔

قاسمی، منٹو کے بہت عقیدت مند تھے۔ لیکن دونوں میں ذہنی تفاوت بھی تھا۔ مزاجاً منٹو تلخ اور اکھڑ تھے

جب کہ قاسمی نرم اور دھیمہ لہجہ رکھتے تھے۔ باوجود اس کے دوستی آخر تک قائم رہی۔ منٹو نے قاسمی کے اوّلین افسانوی مجموعہ ''چوپال'' کا فلیپ تحریر کیا جب کہ قاسمی نے منٹو کے ایما پر فلمی گیت، مکالمے اور اسکرپٹ لکھے اور منٹو کے خطوط قاسمی کے نام کتابی صورت میں پیش کیے۔ قاسمی، منٹو کی شخصیت بالخصوص فن سے بہت مرعوب تھے۔ دونوں میں فکری وفنی بُعد تھا۔ اس تفاوت کے باوجود اگر کوئی قدر مشترک تھی تو وہ حقیقت نگاری تھی۔ دونوں کے موقف اگر چہ مختلف تھے لیکن دونوں حساس فن کار ہماری زندگی اور معاشرے سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے قاری بہت جلد ان کی تحریروں سے خود کو ہم آمیز کر لیتا ہے۔ یہ دونوں معاشرے کی برائیوں اور تلخ حقائق کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ ''آبلے'' کا انتساب اسی شہرۂ آفاق ادیب کے نام منسوب کرتے ہیں:

''سعادت حسن منٹو کے نام!
اس کے دماغ سے زیادہ اس کے دل
سے متاثر ہو کر۔'' ۱۵

اس مجموعہ میں دیباچہ شامل نہیں لیکن صفحہ نمبر آٹھ پر ''مدبروں کا تدبر'' کے عنوان سے لارڈ سالبری، سرڈی ہملٹن ہنٹر کے خیالات و الفاظ درج ہیں۔ اس مجموعے کا فلیپ محمد احسن فاروقی نے لکھا جس میں ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' کو قابلِ ستایش جانا گیا۔ یہ افسانہ پہلی بار ادبی مجلّہ ''نقوش'' میں شایع ہوا۔ اس کے بعد افسانوی مجموعہ میں شامل کیا گیا۔ لکھتے ہیں:

''یہ افسانہ اس ادب میں اہم اضافہ ہے جو پیدا تو وقت ہی سے ہوتا ہے مگر وقت سے اس قدر بالاتر ہو جاتا ہے کہ لافانی چیزوں میں جگہ پاتا ہے۔ اس طرح قاسمی صاحب چوٹی کے افسانہ نگاروں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔'' ۱۶

زیرِ نظر مجموعے کا بارِ اوّل ۱۹۴۶ء میں اور بارِ دوّم ۱۹۴۹ء میں ادارہ فروغ اردو لاہور سے شایع ہوا۔ راقم الحروف کے پیشِ نظر مصنف کی زندگی میں شایع ہونے والا آخری مجموعہ ہے جو ''شرکت پرنٹنگ پریس'' لاہور سے طبع ہو کر ''اساطیر پبلی کیشنز'' لاہور سے ۱۹۹۵ء میں ایک ہزار کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مجموعہ مجلد صورت میں ایک سوستر صفحات پر مشتمل ہے جس پر قیمت مبلغ ایک سو چالیس روپے درج ہے۔ اپنے شہرہ آفاق افسانے ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' کو قاسمی نے اپنے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں شامل کیا۔

۸۔ آس پاس:

قیامِ پاکستان کے بعد شایع ہونے والا یہ قاسمی کا پہلا مجموعہ ہے جو حیاتِ انسانی کے مسائل کی خوب صورت ترجمانی کرتا ہے۔ قحط بنگال ہو، جنگ کا زمانہ، تقسیمِ ہند کے واقعات ہوں یا ہجرت کے مسائل، ہر موضوع و مسائل پر

ان کا قلم روانی سے چلتا ہے۔ آٹھ افسانوں پر مشتمل پیش نظر مجموعے کی فہرست کا تعارف حسب ذیل ہے:

اکیلی۔ بھری دنیا میں۔ افق۔ کرن۔

موت۔ تکمیل۔ ارتقا۔ چڑیل۔

خدیجہ مستور مقبول افسانہ نگار اور معروف ناول نویس ہونے کے ساتھ ساتھ قاسمی کی منہ بولی بہن بھی تھیں۔ قاسمی کے اکلوتے بھانجے ظہیر بابر سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ ان کا سوانحی خاکہ بھی لکھا جو ''میرے ہم سفر'' میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں خدیجہ کی وفات کے بعد ''فنون'' میں ''گوشہ خدیجہ مستور'' بھی شایع کیا جو ان کی شخصیت اور فن پر اہلِ قلم کے تنقیدی مضامین کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کی وفات کا قاسمی کو گہرا دلی صدمہ پہنچا۔ یہ ''آس پاس'' کا انتساب خدیجہ مستور کے نام معنون کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اُس پرخلوص شخصیت کے نام!
> جو افسانوں کی دنیا میں خدیجہ مستور ہے
> اور میری دنیا میں صرف میری خدیجی بہن۔'' ۱۷

خلافِ معمول ''آس پاس'' میں دیباچہ، مقدمہ اور پیش لفظ شامل نہیں البتہ فلیپ پر اختر حسین رائے پوری کے تعارفی وتوصیفی کلمات موجود ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''عہدِ حاضر کے اردو ادب میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ بیک وقت بلند پایہ شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔۔۔ تقریباً ۳۵ سال سے انھوں نے ادب کی خدمت کو وظیفہ حیات بنا رکھا ہے۔۔۔ یہ ان کے ریاض کا کرشمہ ہے کہ عمر کے ساتھ ان کے قلم کی رفتار زیادہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔'' ۱۸

قاسمی نے پہلی بار یہ مجموعہ اپنے ذاتی اشاعتی ادارے مکتبہ فسانہ خواں لاہور سے ۱۹۴۸ء میں شایع کیا لیکن ناتجربہ کاری کے باعث یہ ادارہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس مجموعے کی اساطیر پبلی کیشنز لاہور کے زیرِاہتمام شایع ہونے والی اشاعت پیش نظر ہے جو مجلد صورت میں ایک سو چھتیس صفحات کا احاطہ کرتی ہے۔ قیمت مبلغ ایک سو بیس روپے ہے۔ اسے ''شرکت پرنٹنگ پریس'' لاہور نے ایک ہزار کی تعداد میں طبع کیا۔

مظفر علی سید نے قاسمی کے بہترین افسانے مرتب کرتے وقت زیرنظر مجموعے کا اوّلین افسانہ ''اکیلی'' کا انتخاب کیا۔ فتح محمد ملک نے ''جب بادل اُمڈے'' میں ''آس پاس'' اور ''ارتقا'' کو شامل کیا۔ سجاد شیخ نے انگریزی تراجم میں ''بھری دنیا'' کو شامل کیا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''قاسمی صاحب نے فن بیانیہ کی ایک نئی تکنیک استعمال کی ہے جو اردو کے قارئین کے لیے جدید بھی ہے اور عجیب بھی۔'' ۱۹

مصنف نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں ''آس پاس'' اور ''ارتقا'' کا انتخاب کیا۔

۹۔ در و دیوار:

''در و دیوار'' کے افسانے وطن سے محبت، عصمت دری، انسانی بے بسی اور جنگ کی ہولناکیوں کو دل خراش پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ پیش نظر مجموعہ آٹھ افسانوں اور ایک ریڈیائی کھیل پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں شامل تخلیقات کا اجمالی ذکر پیش خدمت ہے:

میں انسان ہوں۔ نیا فرہاد۔ تسکین۔ جب بادل اُمڈے۔ سپاہی بیٹا۔
ووٹ۔ کہانی لکھی جا رہی تھی۔ راجے مہاراجے۔ مصور (ریڈیائی کھیل)

''در و دیوار'' کا انتساب، قاسمی اپنے ہندو دوست نندلال کے نام درج ذیل عبارت میں منسوب کرتے ہیں:

''نہایت پیارے دوست نندلال کے نام!
جو ملتان کا رہنے والا ہے
دہلی میں ملازم ہے اور
جسے رہتک میں مکان الاٹ ہوا ہے۔'' ۲۰

خلافِ معمول اس مجموعے میں دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ، تمہید اور عرضِ مصنف شامل نہیں البتہ فلیپ پر قاسمی کے بڑے بھائی محمد بخش پیرزادہ کی رائے درج ہے جس میں حصولِ پاکستان کے لیے مصنف کی جدوجہد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کے مطابق انھوں نے انہی احساسات و جذبات کو کہانی کی صورت ''سبز جھنڈا'' میں دی ہے۔ اس افسانوی مجموعہ کا بار اوّل مکتبہ اردو لاہور سے ۱۹۴۹ء میں شایع ہوا۔ میرے پیش نظر اس مجموعے کی مصنف کی زندگی میں شایع ہونے والی آخری اشاعت ہے جو مجلد صورت میں ایک سو تراسی (۱۸۳) صفحات پر محیط ہے۔ اس پر قیمت ایک سو چالیس روپے درج ہے۔ یہ مجموعہ ''شرکت پرنٹنگ پریس'' سے ایک ہزار کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوا۔ زیرنظر مجموعہ اساطیر پبلی کیشنز کے زیراہتمام ۱۹۹۵ء میں شایع ہوا۔

شیخ سجاد نے اپنے انگریزی تراجم میں ''ووٹ'' کو شامل کیا۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے ''جب بادل اُمڈے'' کو منتخب کیا۔ اس افسانے کی پسندیدگی کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ فتح محمد ملک نے اسی افسانے کو کتاب کا عنوان دے کر افسانے کی پسندیدگی پر مہر تصدیق ثبت کی۔ قاسمی نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں سے ''جب بادل اُمڈے'' اور ''کہانی لکھی جا رہی تھی'' کو قابلِ تحسین گردانا ہے۔

۱۰۔ سناٹا:

''سناٹا'' میں انسانی بربریت، تقسیم ہند کے واقعات، اقتصادی حالات، جنس اور استحصال کو شدتِ احساس

سے پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے مندرجات کا تذکرہ حسب ذیل ہے:

بڑی سرکار کے نام۔ رئیس خانہ۔ آتش گل۔ مامتا۔ نمونہ۔

الحمدللہ۔ کنجری۔ گنڈاسا۔ چور۔ سناٹا۔

قاسمی نے پیش نظر مجموعہ کا انتساب اپنے عزیز دوست، برصغیر پاک و ہند کے ممتاز افسانہ نویس کرشن چندر کے نام معنون کیا ہے۔ ''سناٹا'' کا دیباچہ سید وقار عظیم نے دس صفحات پر رقم کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔احمد ندیم قاسمی کے افسانے جسم یا مادہ کی دنیا اور اخلاق اور روح کی دنیا کی بہترین قدروں کے حامل ہونے کے باوجود صرف ایک محدود طبقے کے لیے دل چسپی اور تاثیر کا سرمایہ فراہم نہیں کرتے۔ ان میں خواص اور عوام دونوں کے لیے یکساں دل چسپی بھی ہے اور تاثیر بھی۔ اس لیے کہ دونوں اپنے مزاج اور مذاق کے اختلاف کے باوجود انسان ہیں۔ دل سے نکلی ہوئی ہر بات دونوں کے دل میں گھر کرتی ہے۔۔۔ یہ افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس قبائے گل پر مزید گل کاری کی کوشش تکلف محض ہے۔'' ۲۱

''سناٹا'' کا طبع اوّل نیا ادارہ لاہور سے ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا۔ اس کا گیارھواں ایڈیشن راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔ دوسوستر صفحات پر محیط اس مجموعے کی قیمت مبلغ دوسو روپے ہے۔ یہ کتاب اساطیر پبلی کیشنز لاہور سے اکتوبر ۱۹۹۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ سجاد شیخ نے اپنے انگریزی تراجم میں ''مامتا'' اور ''کنجری'' کا انتخاب کیا۔ ''مامتا'' کو سجاد شیخ نے قابلِ تحسین گردانا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔مامتا، جسے ایک طویل عرصہ تک نظرانداز کیا گیا میرے نزدیک قاسمی صاحب کا بہترین افسانہ ہے۔'' ۲۲

حساس مصنف کی گرد و پیش پر گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے واقعہ پر کہانی کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ قاسمی کو اگرچہ جنگ کا عملی تجربہ حاصل نہ ہوا لیکن سجاد شیخ کے نزدیک افسانے کا ہیرو ان کا دوست اور ہم جماعت تھا۔ اُس نے کئی نشستوں میں جنگ کے واقعات ان کے گوش گزار کیے۔ چناں چہ قاسمی نے کمالِ مہارت سے حقائق پر مبنی یہ حیرت انگیز افسانہ تخلیق کیا جو بیک وقت پنجاب کے دیہات اور ہانگ کانگ میں دوسری جنگ عظیم کے پس منظر اور پیش منظر کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے۔ پروفیسر آفتاب اقبال شمیم اور سجاد شیخ کا اتفاق ہے کہ ''مامتا'' افسانہ پاک چین دوستی کی علامت ہے۔ آفتاب اقبال شمیم نے:

''پیکنگ میں قیام کے دوران اس افسانے کا چینی زبان میں ترجمہ کرایا اور اسے چینیوں کے اردو نصاب میں شامل کر دیا۔'' ۲۳

مظفر علی سید نے اس افسانے کو نظر انداز کر دیا۔ قاسمی کے افسانوں کا اردو ترجمہ فاروق حسن نے کیا۔ انھوں نے ''نمونہ'' کو شامل کیا۔ قاسمی نے ''رئیس خانہ''، ''مامتا''، ''الحمدللہ''، ''گنڈاسا'' اور ''سناٹا'' کو شامل کر کے ان تخلیقات کی اہمیت دو چند کر دی۔

۱۱۔ بازارِ حیات:

''بازارِ حیات'' کے افسانوں میں خوفِ خدا، خدمتِ خلق، معاشرتی بغاوت، انسانی ہمدردی، اقتصادی بدحالی، اور جسم فروشی کے حالات و واقعات کا دور بین نگاہ سے جائزہ لے کر گہری ہمدردی اور راست اندازی سے پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں افسانوں کے ساتھ ماہ و سال کے اندراج میں زمانی ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ یہ مجموعہ نومبر۱۹۵۲ء سے ستمبر۱۹۵۴ء کے دورانیے میں لکھے گئے کل تیرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اندراجات کی تفصیل درج ذیل ہے:

پرمیشر سنگھ	:	نومبر۱۹۵۲ء	گل رُخ	:	دسمبر۱۹۵۲ء
خونِ جگر	:	دسمبر۱۹۵۲ء	دار و رسن	:	جنوری۱۹۵۳ء
زلیخا	:	فروری۱۹۵۳ء	بدنام	:	فروری۱۹۵۳ء
ست بھرائی	:	نومبر۱۹۵۳ء	موچی	:	دسمبر۱۹۵۳ء
کفن دفن	:	دسمبر۱۹۵۳ء	بابا نور	:	جنوری۱۹۵۴ء
آئینہ	:	مئی۱۹۵۴ء	ہیرا	:	ستمبر۱۹۵۴ء
مخبر	:	دسمبر۱۹۵۴ء			

اس مجموعے کا انتساب قاسمی نے عابدہ کے نام منسوب کیا ہے۔ وہ ان کی خوش ذوقی اور محبت ارزائی کے قائل تھے۔ عابدہ کی رحلت کے بعد انھیں کارزارِ حیات میں تاریکیاں ہی دکھائی دینے لگیں۔ لکھتے ہیں:

''اپنی چھوٹی بہن عابدہ کے نام!
تمہارے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔'' [۲۴]

پیش نظر مجموعہ دیباچہ، پیش لفظ، تمہید اور عرضِ مصنف پر مشتمل نہیں ہے البتہ فلیپ پر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی رائے رقم ہے۔ انھوں نے ''پرمیشر سنگھ'' کے کردار کو سراہا ہے۔ لکھتے ہیں:

''پرمیشر سنگھ کی معصوم اور دل کش شخصیت۔۔۔ اپنے فطری، روایتی اور مانوس تہذیبی رنگ سے ہم آہنگ رہنے کی نہ مٹنے والی خواہش، حیرت انگیز بصیرت، ایجازِ بیان اور گہری ہمدردی کے ساتھ واضح کی گئی ہے۔'' [۲۵]

''بازارِ حیات'' کا بار اوّل، ادارہ فروغ اردو لاہور سے ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا۔ مصنف کی زندگی میں اشاعت پذیر ہونے والا آخری مجموعہ راقم الحروف کے پیش نظر ہے جو ایک سو اکانوے صفحات پر مشتمل ہے؛ اس پر قیمت ایک سو چالیس روپے درج ہے۔ زیرِنظر افسانوی مجموعہ کو ''نقوش پریس لاہور'' نے ایک ہزار کی تعداد میں چھپوایا۔ یہ کتاب ''مکتبہ اساطیر'' لاہور سے ۱۹۹۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ مظفر علی سید نے اس افسانوی مجموعے سے ''مخبر'' کا انتخاب کیا۔ فتح محمد ملک نے ''پرمیشر سنگھ''، ''ہیرا'' اور ''بابا نور'' کو منتخب کیا۔ سجاد شیخ نے ''مخبر'' کو انگریزی تراجم میں شامل کیا جب کہ فاروق حسن نے ''کفن دفن''، ''بابا نور'' اور ''پرمیشر سنگھ'' کا چناؤ کیا۔ قاسمی نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں ''پرمیشر سنگھ''، ''بابا نور''، ''موچی'' اور ''ہیرا'' کو شامل کر کے ان افسانوں کی افادیت اُجاگر کی ہے۔

۱۲۔ برگِ حنا:

''برگِ حنا'' کے افسانے رومان و حقیقت کا حسین امتزاج ہیں۔ یہ مثالیت پسندی، رشتوں کے مسائل، وٹہ سٹہ کی شادی، مغربی تہذیب کی تقلید، خودکشی اور تعلیم نسواں کے موضوعات پر محیط ہے۔ یہ مجموعہ تعداد کے لحاظ سے دس افسانوں پر مشتمل ہے:

بیٹے بیٹیاں۔	ماتم۔	کھمبا۔	دوربین۔	شگنیں۔
نصیب۔	ہم بیگ۔	وحشی۔	جن وانس۔	امانت۔

اس مجموعہ کے افسانے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۹ء کے دورانیے میں تحریر کیے گئے۔ قاسمی وسیع نقطہ نظر کے مالک، مذہبی تعصب سے بالاتر اور عظمتِ انسانی کے حامل انسان تھے۔ ان کے نزدیک دوستی کا انحصار مذہب کی بنیاد پر نہ تھا۔ ''برگِ حنا'' کا انتساب اپنے عزیز دوست منوہر کے نام ہے۔ ناہید قاسمی کے بقول انھیں اپنے ہندو دوست منوہر، نند اور کرشن چندر بہت عزیز تھے۔ منوہر نے انھیں ایک کمبل تحفتاً عنایت کیا۔ انھیں اس کمبل سے بہت محبت تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمبل پرانا اور بوسیدہ ہو گیا تھا۔ وہ سردی کی شدت کو بھی روک نہ سکتا تھا لیکن پھر بھی قاسمی اسے اوڑھتے اور حرزِ جاں بنا کر رکھا۔ اس مجموعہ میں دیباچہ، مقدمہ شامل نہیں البتہ اختر اور رینوی کا فلیپ درج ہے۔ اختر اور رینوی، قاسمی کو ''اختر درخشاں'' کہا کرتے تھے۔ وہ مصنف کی حقیقت نگاری اور دیگر فنی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''ندیم افسانہ نگاری میں بڑے حقیقت پسند ہیں۔۔۔ ان کی حقیقت پسندی تہہ دار اور گہری ہے۔۔۔ ندیم صاحب۔۔۔ آپ نے زندگی کی آبرو بھی بچائی ہے اور ادب کی

بھی۔ میں جانتا ہوں آپ کے دل میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ انساں بھی اور یہی وہ قیمتی سرمایہ درد و داغ ہے جس نے ہماری آبرو بچالی اور یہی ایک جوازِ حیات ہے ورنہ زندگی کی کیا قیمت۔'' ۲۶؎

جولائی ۱۹۵۹ء میں ''ناشرین'' لاہور نے اس مجموعہ کا بار اوّل شائع کیا۔ مکتبہ اساطیر کے زیر اہتمام ۱۹۹۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ایک سو چھیاسٹھ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کی قیمت ایک سو چالیس روپے ہے۔ مظفر علی سید نے دو افسانے ''جن و انس'' اور ''وحشی'' کو شامل کیا۔ فتح محمد ملک نے ''بیٹے بیٹیاں'' کا انتخاب کیا؛ فاروق حسن اور سجاد شیخ نے انگریزی تراجم میں ''وحشی'' کا چناؤ کیا جب کہ قاسمی نے ''جن و انس''، ''وحشی'' اور ''بیٹے بیٹیاں'' کو منتخب کیا۔

۱۳۔گھر سے گھر تک:

''گھر سے گھر تک'' کے افسانے سفید پوش طبقہ کے تصنع، شہری زندگی کے حقائق، پنجاب کی رسومات، تعصب، گھریلو ناچاقی، ترقی کے حصول کی خاطر جائز و ناجائز تمام حربوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ معاشرے کے روح فرسا واقعات کو تلخی کی بجائے نرم گفتاری سے پیش کرتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں شامل گیارہ افسانے ترتیب کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں:

گھر سے گھر تک۔	ثواب۔	هذا من فضل ربی۔	اصول کی بات۔
موج خون۔	شیش محل۔	بھرم۔	فالتو۔
سلطان۔	بھاڑا۔	بندگی بے چارگی۔	

قاسمی نے پیش نظر مجموعہ کا انتساب اپنے عزیز دوست محمد صادق کے نام دل چسپ عبارت کے ساتھ رقم کیا ہے:

''چودھری محمد صادق کے نام!
جو میرے بڑے عزیز دوست ہیں
اور مولانا مودودی کے بڑے معتقد ہیں۔'' ۲۷؎

انھیں محمد صادق سے محبت اس حد تک تھی کہ ان کی صحت کی بحالی اور تندرستی کے لیے شہر میں دیسی گھی کے ڈبے بھجوائے۔ یہ مجموعہ دیباچہ سے خالی ہے البتہ فلیپ پر مجتبیٰ حسین کی رائے درج ہے۔ لکھتے ہیں:

''ندیم کے یہاں نظم و نثر دونوں میں جو گاؤں کی مٹی کی مہک ہے۔ اس میں ایک ایسی طہارت اور دل جوئی ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے یہاں ایک ''ارضی تصوف'' ہے۔'' ۲۸؎

زیرِ نظر مجموعے کا بار اوّل، راول کتاب گھر، راول پنڈی سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ پیش نظر اشاعت میں بار کا اندراج

نہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ ایک سو اسی صفحات پر محیط ہے؛ اس پر قیمت ایک سو چالیس روپے درج ہے۔ اس مجموعہ کو ''شرکت پرنٹنگ پریس'' سے ایک ہزار کی تعداد میں مطبع کیا گیا اور ۱۹۹۵ء میں ''اساطیر پبلی کیشنز'' لاہور کے زیراہتمام اشاعت پذیر ہوا۔ پیش نظر مجموعہ میں شامل افسانہ ''گھر سے گھر تک'' کو بہت پذیرائی ملی۔ یہ افسانہ پاکستانی ٹیلی ویژن سے قاسمی کہانیاں میں بھی پیش کیا گیا، جسے ناظرین نے بہت پسند کیا۔ مظفر علی سید نے قاسمی کے افسانوں سے ''گھر سے گھر تک'' اور ''سلطان'' کا چناؤ کیا۔ فتح محمد ملک نے ''سلطان'' اور ''بندگی بے چارگی'' کا انتخاب کیا، جب کہ قاسمی نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں ''گھر سے گھر تک'' اور ''سلطان'' کو شامل کرنا مناسب سمجھا۔ فاروق حسین نے ''فالتو'' کا چناؤ کیا۔

۱۴۔ کپاس کا پھول:

قاسمی کے پیش نظر افسانوی مجموعے میں ماں کی محبت، لڑائی جھگڑے، گھریلو ناچاقی، نافرمان اولاد، توہم پرستی، سائنسی ایجادات، امیر طبقہ کی بے راہ راوی، ہم جنس پرستی، بے روزگاری، غربت، قرض کی لعنت، مزدوروں کی ہڑتالوں اور اساطیری عناصر کو نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ قاسمی نے دوسری بار افسانوں کو تاریخی ترتیب سے طبع کیا اور ہر تخلیق کا سن بھی درج کیا۔ زیرنظر مجموعہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۲ء (نو برس) کے افسانوں پر محیط ہے۔ سترہ افسانوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ کے اندراجات سنین کے ساتھ پیش خدمت ہیں:

تبر:	۱۹۶۳ء	فیشن:	۱۹۶۳ء	سفارش:	۱۹۶۳ء
مائیں:	۱۹۶۳ء	پہاڑوں کی برف:	۱۹۶۴ء	گڑیا:	۱۹۶۴ء
تھل:	۱۹۶۴ء	پاگل:	۱۹۶۴ء	ماسی گل بانو:	۱۹۶۵ء
بے نام چہرے:	۱۹۶۵ء	کپاس کا پھول:	۱۹۶۷ء	سفید گھوڑا:	۱۹۶۷ء
سکوت وصدا:	۱۹۶۹ء	آسیب:	۱۹۶۹ء	لارنس آف تھلیبیا:	۱۹۷۰ء
قرض:	۱۹۷۱ء	مشورہ:	۱۹۷۲ء		

اس مجموعے کا انتساب پاکستان کے معروف مصور بشیر موجد، مرزا ادیب کے داماد، قاسمی کے عزیز دوست کے نام معنون ہے۔ قاسمی نے بشیر موجد کی شخصیت اور فن پر مضامین رقم کیے جب کہ بشیر موجد فنون کے سرورق کی تزئین و آرائش میں مصروف رہے۔ بشیر موجد نے محمد طفیل کے اشتراک پر، قاسمی کی شخصیت وفن پر ''ندیم نامہ'' مرتب کیا جسے ''مجلس ارباب فن'' ملتان نے ۱۹۷۶ء میں شایع کیا۔ ان کی محبت اور دوستی آخر تک قائم رہی۔ یہ مجموعہ دیباچہ اور مقدمہ سے خالی ہے البتہ فلیپ پر شاہد احمد دہلوی کی رائے درج ہے جن کے خیال میں قاسمی ادب کے آسمان پر

چاند کی مانند روشن ہوئے اور چشم زدن میں اس کی روشنی دُور و نزدیک تک پھیل گئی۔ لکھتے ہیں:

"۔۔۔احمد ندیم قاسمی مطلع ادب پر ہلال کی طرح نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بدر بن کر چمکنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں ایک شاداب قلم تھا جو رنگ برنگ پھول کھلاتا تھا اور چمنستان ادب کو مہکاتا تھا۔" ۲۹

اس مجموعہ کا بار اوّل مکتبہ فنون لاہور سے دسمبر ۱۹۷۳ء میں شایع ہوا۔ زیرِنظر اشاعت دو سو چھہتر (۲۷۶) صفحات پر مشتمل ہے؛ اس پر قیمت دو سو روپے درج ہے۔ شرکت پرنٹنگ پریس کے تحت گیارہ سو کی تعداد میں طبع ہوا۔ اساطیر پبلی کیشنز کے زیرِاہتمام ۲۰۰۲ء میں شایع ہوا۔ سجاد شیخ نے اپنے انگریزی تراجم میں "کپاس کا پھول" اور "تھل" کو شامل کیا۔ فاروق حسن نے اپنے انگریزی تراجم میں "تھل"، "لارنس آف تھیلیبیا" اور "آسیب" کا انتخاب کیا۔ قاسمی نے اس مجموعے کے چھے افسانے "سفارش"، "مشورہ"، "لارنس آف تھیلیبیا"، "ماسی گل بانو"، "پہاڑوں کی برف" اور "فیشن" کا انتخاب کر کے مہر تصدیق ثبت کر دی کہ زیرِنظر مجموعہ انھیں تمام افسانوی مجموعوں سے زیادہ پسند ہے۔

۱۵۔ نیلا پتھر:

انسانی عظمت و محبت کے تمنائی؛ قاسمی کے افسانے دل میں اُترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پیش نظر مجموعہ میں دبی دبی محبت کے قصے، شہری زندگی کے کھوکھلے پن اور تصنع، بیوہ عورت کی زندگی کے مسائل، معاشرتی تضادات، سقوطِ ڈھاکا کے دل خراش واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کے دلدادہ افراد اور تنہائی پسند افراد کی نفسیات کو وسیع انسانی ہمدردی کے تناظر میں نہایت ملائمت سے پیش کرتے ہیں۔ نو افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کے مندرجات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

احسان۔ عورت صاحبہ۔ جوتا۔ اندمال۔ عالاں۔

بارٹر۔ نیلا پتھر۔ ایک عورت تین کہانیاں۔ ایک احمقانہ محبت کی کہانی

"نیلا پتھر" کا انتساب قاسم کے نام درج ذیل عبارت کے ساتھ معنون ہے:

"قاسم کے نام!
جو میرا عزیز بھی ہے اور ہم دونوں کا موضوع
فن بھی مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ میرا فن
افسانہ نویسی ہے اور اُس کا فوٹوگرافی۔" ۳۰

پیش نظر مجموعہ کا دیباچہ مصنف نے ''گزارش'' کے نام سے ۲۰ر مارچ ۱۹۸۰ء کو سپردِ قلم کیا۔ جب ان کی عمر تریسٹھ برس چار ماہ تھی۔ ''نیلا پتھر'' کا فلیپ سید ضمیر جعفری نے لکھا۔ وہ مصنف کا ادبی مقام و مرتبہ اس طرح متعین کرتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی ہماری ادبی تاریخ میں ایک ستون، ایک مینار، ایک سنگِ میل، ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ زندگی نے، ان کے فن و فکر سے توانائی بھی حاصل کی ہے اور رعنائی بھی۔'' ۳۱

اس مجموعے کا بارِ اوّل، غالب پبلشرز لاہور سے ۱۹۸۰ء میں شایع ہوا مگر پیش نظر اشاعت مجلد صورت میں سو صفحات پر مشتمل ہے؛ قیمت مبلغ ایک سو دس روپے ہے۔ یہ مجموعہ ایک ہزار کی تعداد میں ''نقوش پریس'' لاہور سے طبع ہو کر مکتبہ اساطیر سے ۱۹۹۵ء میں شایع ہوا۔ ''نیلا پتھر'' سے مصنف نے احسان، جوتا اور عالاں کو خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں کی فہرست میں شامل کیا۔

۱۶۔کوہ پیما:

''کوہ پیما'' میں شامل افسانوں میں سیاسی عدم استحکام، غرباء کے مسائل، عشقِ رسولؐ، خوفِ خدا، سرمایہ دارانہ نظام، سائنسی ایجادات، خانقاہی نظام اور توہم پرستی کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیا گیا ہے پھر ان پیچیدہ حالات، واقعات اور مصائب کا ہنرمندی سے تجزیہ کر کے افسانوں کی زینت بنایا گیا ہے۔ ''کوہ پیما'' کے مشمول افسانے یہ ہیں:

بین۔	کوہ پیما۔	چبھن۔	اخبارنویس۔	عاجز بندہ۔
چرواہا۔	ایک یک لباس آدمی۔	پیپل والا تالاب۔	چھلی۔	ٹریکٹر۔

پیش نظر مجموعہ کا انتساب ان کے عزیز دوست محمد کاظم کے نام ہے:

''برادرِ عزیز حبیبِ مکرم
محمد کاظم
کے ہمہ جہت ذوقِ فن کی نذر۔'' ۳۲

دیباچہ اور مقدمہ سے عاری اس مجموعہ کے فلیپ پر ڈاکٹر قمر رئیس کا عندیہ درج ہے جس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ بھارتی ادیب و نقاد بھی قاسمی کی فنی و فکری صلاحیتوں کے معترف تھے۔ لکھتے ہیں:

''خارجی زندگی کا ہر مظہر اور ہر منظر ندیم کا دامنِ دل کھینچتا ہے اور وہ ہر لحظہ اپنی ذات اور کائنات کے مابین نئے رشتوں کا ادراک حاصل کر کے اپنے ذہن اور تخیل کو سمت، نیرنگی اور شادابی بخشتا ہے۔ تاریخی ترتیب سے ندیم کی کہانیوں کا مطالعہ ایک ضخیم ناول کا

مطالعہ ہے جس میں گزشتہ پچاس سال کے شعور و احساس کے ارتقا کی داستان رقم ہوتی ہے۔ اس نے اپنی ہر نئی کہانی میں انسان کی اس ازلی معصومیت، آسودگی، مسرت اور محبت کو تلاش کیا ہے جس کے لیے خود اس کی روح تڑپ رہی ہے۔'' ۴۳

ڈاکٹر قمر رئیس نے نہایت فن کاری سے قاسمی کے افسانوں کی خصوصیات اور ان کے نصب العین کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ طیبہ پرنٹرز سے ایک ہزار کی تعداد میں طبع ہوا۔ ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی قیمت دو سو روپے ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اساطیر پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔

ہندوستانی ادبی مجلّہ ''عالمی اردو ادب'' ۱۹۹۲ء کی جلد نمبر ۷ میں ان کا افسانہ ''کوہ پیما'' شامل ہے جب کہ پاکستانی ادب حصہ نثر مرتبین ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد کی ضخیم کتاب میں افسانہ ''چھلی'' ملتا ہے۔ فاروق حسن نے ''کوہ پیما'' سے ''پیپل والا تالاب'' کو شامل کیا۔ قاسمی نے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں میں ''بین'' کو مطبوعہ افسانہ قرار دیا ہے جب کہ یہ افسانہ ''کوہ پیما'' میں شامل ہے جس کا بارِ اوّل اساطیر پبلشرز سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا جب کہ خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانوں کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں ہوئی۔ مصنف نے محولہ بالا افسانوں کو دیکھے بغیر کسی تردد، جستجو اور تلاش کی بجائے اس افسانے کو غیر مطبوعہ قیاس کر لیا۔ یوں مصنف کا غیر مطبوعہ کا دعویٰ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ پت جھڑ:

''پت جھڑ'' کے افسانے زندگی کے زہر و تریاق کے ساتھ ساتھ شیریں و تلخ واقعات کے فکر انگیز پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ مجموعہ گیارہ افسانوں، ایک ناولٹ، ایک ناول کے ابتدائی حصے اور قاسمی کے سوانحی کوائف پر محیط ہے۔ ''پت جھڑ'' ابھی تکمیلی مراحل طے کر رہا تھا جب بلاوا اجل آ جانے کے باعث اس مجموعے کی اشاعت خود نہ کرا سکے۔ چناں چہ ان کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی ان کی مکمل و منتشر تحریروں کو ''پت جھڑ'' کے نام سے منظرِ عام پر لائیں۔

''پت جھڑ'' کی فہرست درج ذیل اصناف و موضوعات پر منتج ہے:

ہم سفر۔	شہنشاہ۔	مجبور۔	لسی۔	سیکرٹری۔
بچے۔	بہزاد، آرٹ گیلری میں۔	استغاثہ۔	چاچا چوکھارام۔	نامکمل افسانہ۔
دودھ پتی۔	پت جھڑ (ناول کا ابتدائی حصہ)۔		ایک ریوڑ ایک انبوہ (ناولٹ)۔	

احمد ندیم قاسمی کے سوانحی کوائف۔

اس مجموعے کا افسانہ ''ہم سفر'' فنون کے شمارہ نمبر ۱۱۱، اگست تا دسمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کا انتساب قاسمی کے بیٹے نعمان اور بہو شاہین کے نام معنون ہے، جب کہ دیباچہ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے مئی ۲۰۰۷ء کو سپردِ قلم کیا۔ ایک سو چوالیس صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز سے طبع ہوا۔ سنگِ میل پبلی کیشنز نے اس مجموعے کو ۲۰۰۷ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ کیا۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے وقعت کا حامل ہے، کیوں کہ اس میں قاسمی کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ نثری تخلیقات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی ایک جھلک

یہ کتابچہ مصنف کے افسانے ''خوش رہو'' پر مشتمل ہے۔ یہی افسانہ من وعن دوسرے افسانوی مجموعے ''بگولے'' میں بھی شامل ہے۔ اس کتابچہ پر سن، فلیپ یا دیباچہ درج نہیں۔ کتاب کے سرورق پر ''سلسلہ تعلیم و ترقی نمبر ۱۷۷، کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے'' درج ہے اور بائیں جانب قاسمی کے عہدِ شباب کی تصویر ہے۔ بعدازاں دائیں جانب شمع روشن کی گئی ہے جس کے شعلوں میں جاگو اور جگاؤ مندرج ہے۔ ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ لمیٹڈ نے کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔

کالم

اظہار و بیان کی بھرپور صلاحیتوں کے مالک، احمد ندیم قاسمی اردو ادب کے معروف کالم نویس تھے۔ صحافت کے میدان میں اُن کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ انھوں نے کالم نویسی کی ابتدا ۱۹۵۲ء میں روزنامہ ''امروز'' لاہور سے بعنوان ''حرف و حکایت'' کی اور ۲۰۰۶ء تک معاشی مجبوریوں کے تحت مسلسل کالم لکھتے رہے۔ تقریباً چون برسوں پر محیط ان اخباری کالموں میں فکاہیہ، نیم فکاہیہ، بیانیہ اور سنجیدہ تمام کالم شامل ہیں۔ ۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۶ء تک مختلف اخبارات میں منفرد عنوانات کے تحت جو کالم لکھے اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء تک روزنامہ ''امروز'' لاہور میں ''حرف و حکایت'' کے عنوان سے کالم لکھے پھر ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک اسی اخبار میں ''پنج دریا'' کے عنوان سے کالم تحریر کیے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء تک روزنامہ ''ہلالِ پاکستان'' لاہور سے ''موج در موج'' کے نام سے کالم لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک روزنامہ ''احسان'' لاہور سے بعنوان ''مطائبات'' کالم لکھے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۲ء تک روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں ''لاہور لاہور ہے'' کے عنوان سے کالم تحریر کیے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء تک روزنامہ ''حریت'' لاہور میں ''موج در موج'' بعدازاں ''لاہوریات'' کے

عنوان کے تحت کالم لکھے۔۱۹۷۲ء سے ۲۰۰۶ء تک روزنامہ ''جنگ'' میں رواں دواں کے عنوان سے کالم لکھ کر سیاسی، ملکی، ادبی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی حالات کو کبھی سنجیدہ، کبھی طنزیہ و مزاحیہ انداز سے قارئین کے لیے صفحہ قرطاس پر بکھیرتے رہے۔

ا۔کیسر کیاری:

قاسمی کے مزاحیہ مضامین و تراجم کا ایک مجموعہ ''کیسر کیاری'' قیامِ پاکستان سے قبل اشاعت پذیر ہوا۔ اس ناپید مجموعے کا نام عبدالمجید سالک نے تجویز کیا۔ قاسمی چوں کہ عبدالمجید سالک کے عقیدت مند تھے۔ تلاش بسیار کے باوجود یہ مجموعہ دست یاب نہ ہو سکا۔ بعدازاں قاسمی نے اپنے اُستادِ محترم عبدالمجید سالک کے تجویز کردہ نام پر ہی اپنے نئے فکاہی کالموں کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' مرتب کیا۔ یہ مجموعہ دس عنوانات کے تحت ننانوے ضمنی کالموں پر مشتمل ہے۔ ان کالموں میں سیاست، سیاسی جماعتوں، بجٹ، تصورِ پاکستان، مشاعرہ کی روداد، تلفظ شعر، شاعری سے بیزاری، سائنسی ایجادات، رشوت، معاشرتی رذائل اخلاق، تعلیم کے مسائل، شہروں کی حالتِ زار اور شہریوں کے مسائل کو طنزیہ و مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ زیرِنظر مجموعہ کے مندرجات کی تفصیل و ترتیب درج کی جاتی ہے۔

کچھ ارباب سیاست کے بارے میں:

سیاسی جماعتوں کے نام۔	سیاسی جماعتوں کی اقسام۔	مسلم لیگ کی قسمیں۔
لیگ سے استعفیٰ۔	سیاست سے ریٹائرمنٹ۔	چند سیاسی پارٹیاں۔
شلوار قمیص۔	وزارت تعمیر مکانات۔	بجٹ۔
امریکی کمالات۔	چینی اور چودھری۔	ہندوستان اور اچانک حملہ۔
تصورِ پاکستان۔	مسمی تسلی بخش۔	جمہوریت کی گت

دنیائے شعر وفن میں حادثات:

ایک منجمد مشاعرہ۔	شعر کا حلیہ بگاڑنا۔	علی پور کا یادگار مشاعرہ۔
شاعری سے بیزاری۔	ادیب اور کاریں۔	پسندیدہ ادیب۔
کتابت کی غلطیاں۔	تحقیق۔	چند تحقیقیں۔
لسانی تنازعہ۔	رسم الخط اور رائے عامہ۔	پرانے بیکار محاورے۔
فن اور امراء۔	بڑے لوگوں کی یادیں۔	قصہ ایک فلم کے گیتوں کا۔

سائنس کی بے لگامیاں:

اکتساب اور سائنس۔ ملاوٹ کی سائنس۔ صنعتی ترقی۔

ہوائی جہاز میں اونٹ۔ رویت ہلال عید۔ رویت ہلال۔

انسانی بالوں کی اون۔ مینڈک اور ملکی درآمد۔ جگنو کی دم۔

وہ جنھیں زندہ رہنا نہیں آتا:

کھوکھلا معاشرہ۔ ہم نے بھی رشوت دی تھی۔ رشوت کا روشن پہلو۔

سیلاب کے دنوں میں۔ رمضان شریف کے احترام میں۔ عید شاپنگ۔

قربانی کا بکرا۔ چینی اور گڑ۔

لاہور لاہور ہے:

لاہور کی سڑکیں۔ سڑکوں کی مرمت۔ لاہوری ٹریفک کے مسائل۔

انارکلی بازار۔ مکھی کارپوریشن۔ پھول دیکھنے پر ٹیکس۔

طوفانِ باد و باراں۔ آتش بازی۔ آگ بجھانے والے انجن میں آگ۔

ریل کی پٹریاں اور سڑکیں:

ریل کے ڈبے۔ ایرکنڈیشنڈ۔ ایشیا کی سب سے خراب سڑک۔

تعلیم کے نرغے میں:

اساتذہ کو سادگی کی تلقین۔ پاس فیل کا چکر۔ اطفال اور یومِ اطفال۔

کچھ آموں کے بارے میں:

آموں کا کچھ بیاں ہو جائے۔ ملتان کے آم۔

کچھ ناموں کے بارے میں:

نام میں کیا رکھا ہے۔ انسانوں کے نام شہروں کے نام پر۔ مال روڈ کا نام۔

سڑکوں کے نام۔ ناموں کی اُلجھنیں۔ ویت نام کا شہر۔

مختصر اشتہارات۔ ننھے منے اشتہار۔ گم شدہ سوٹ کیس۔

یہاں وہاں کی باتیں:

ہفتے ہی ہفتے۔	سنگِ بنیاد۔	ایک رسمِ افتتاح۔
جگنوں اور ہڑتالوں کے فوائد۔	ہاکی اور کرکٹ۔	کشمیر اور آدم وحوا۔
کچھ پھلوں اور سبزیوں کے بارے میں۔	محبت اور پسلیاں۔	غلط اندیشیاں۔
ٹی وی کا کامیاب پروگرام انتظار کیجیے۔	مزیدار خبر۔	کلیم کا نسخہ۔
کنپٹی مار قاتل۔	پان کی پیک۔	اخبار بینوں کی کچھ قسمیں۔
ذکر کچھ نگلنے کا۔	ہم شکلی۔	اخبار نویس اور جنات۔
پپی مخلوق۔	ایک استعفےٰ کا ذکر ہے۔	گدھا۔
سگریٹ نوشی کا انسداد۔	بھیس بدلنے کا فن۔	

''کیسر کیاری'' منتخب کالموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ قاسمی اس مجموعے کے دیباچے میں اپنے خیالات کو الفاظ کا پیرہن یوں عطا کرتے ہیں:

> ''کیسر کیاری کے نام سے میرے مزاحیہ مضامین و تراجم کا ایک مجموعہ قیامِ پاکستان سے بھی چند برس پہلے شایع ہوا تھا۔ کتاب کا نام محترم سالک صاحب نے تجویز فرمایا تھا۔ جو ان کے ارشاد کے مطابق ''زعفران زار'' کا سلیس اور سچا ترجمہ تھا۔ یہ مجموعہ کب کا ناپید ہے۔ میں نے بھی اپنی تصانیف میں کم ہی اس کا ذکر کیا ہے کیوں کہ اس کے مشمولات میں بیشتر تحریریں عنفوانِ شباب کی جلد بازیوں کا شکار ہوگئی تھیں۔ اب میں اپنے نکاہی کالموں کا انتخاب اسی نام سے پیش کر رہا ہوں تاکہ میرے اُستادِ مکرم کا تجویز کردہ یہ نام ضائع نہ ہو۔'' ۳۴

''کیسر کیاری'' کی کتابت عمدہ قسم کے تین سو اٹھائیس صفحات پر کرائی گئی۔ قیمت دو سو روپے درج کی گئی۔ ''شرکت پرنٹنگ پریس'' سے ''شفیق پبلی کیشنز'' کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۹ء میں شایع ہوئی۔

تنقید

قاسمی دیگر اصنافِ سخن کی طرح تنقیدی مضامین بھی تواتر سے لکھتے رہے۔ احتشام حسین، آل احمد سرور، اور وقار عظیم کی مانند باقاعدہ نقاد ہونے کا شرف تو حاصل نہ کر سکے، نہ ہی تنقید میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کر سکے۔ لکھتے ہیں: ''مجھے باقاعدہ تنقید نگار ہونے کا دعویٰ نہیں۔'' اگرچہ ان کے تنقیدی مضامین کی تعداد افسانوں کے مقابلے

میں کم ہے تاہم ان کی تنقید بعض ناگزیر اُمور کی جانب توجہ دلاتی ہے۔ مندرجہ ذیل تنقیدی کتب میں ان کا تنقیدی طریقہ کار فن کار کے تخلیقی وتنقیدی رجحانات کی نشان دہی کے ساتھ نظریہ فن کی توجیہہ پر مرکوز ہے چناں چہ افہام وتفہیم کا یہ طریقہ کار فن کار کے بنیادی فکر ونظر کی بازیافت بھی کرتا ہے۔ ان کی اردو تنقید کا بہت اجمالی اور تعارفی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ تعلیم اور ادب وفن کے رشتے:

قاسمی کا اولین تنقیدی مجموعہ ادب، تعلیم فن اور ثقافتی میلانات ورجحانات پر محیط ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں غریب بچوں کی ناخواندگی اور حالت زار کو المیہ انداز سے پیش کرتی ہے۔ حصولِ تعلیم کی بجائے ننھے بچے حصولِ معاش کی فکر میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ ہر شخص کو حصولِ تعلیم کے یکساں مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔ اسکولوں میں نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی تعلیم بھی ضروری ہے تاکہ بہترین ادبی ذوق پروان چڑھے۔ علاوہ ازیں نصابی کتب میں افکارِ اقبال کا شامل ہونا ضروری ہے۔ نسلِ نو کے لیے کلاسیکی وجدید ادب کی تعلیم ضروری ہے تاکہ وہ ثقافتی قدروں کی پہچان کے ساتھ ساتھ قدیم وجدید ادب کا موازنہ اور تقابلی جائزہ لے سکے۔ ادبی تعلیم سے مراد سائنسی تعلیم کی نفی نہیں بلکہ ادب کا اپنا مقام ہے اور سائنس کی افادیت اور ضرورت واہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ قاسمی نے ایک قومی تربیتی سیمینار میں بچوں کے ادب پر مقالہ پڑھا جسے قابل تحسین گردانا گیا۔

> ''اس مقالے پر گفتگو کے دوران پاکستان کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مندوبین نے مطالبہ کیا کہ جناب احمد ندیم قاسمی کے تعلیم وتدریس کے گوناگوں پہلوؤں پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے مضامین کو یکجا کر کے پاکستان کے اُن ماہرین تعلیم تک پہنچایا جائے جو نصاب تعلیم کی ترتیب وتدوین میں مصروف ہیں تاکہ وہ جان سکیں کہ پاکستان کے تخلیقی فن کار نصاب تعلیم سے کیا تقاضا کرتے ہیں۔'' ۳۵

چناں چہ قاسمی کے ادبی اور سائنسی تعلیم جدید فکری رجحانات پر مشتمل خیالات کو کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ اصل کتاب کے مندرجات کی ترتیب درج ذیل ہے:

کتاب کے آغاز میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا شعر درج ہے:

شکایت ہے، مجھے یارب، خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا ؎۳۶

پیشِ نظر کتابچے میں دیباچہ، مقدمہ نہیں ہے۔ اسّی صفحات پر مشتمل اس کتابچے کی طباعت محدود اشاعت کے ساتھ منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتابچہ ادارہ التحریر لاہور کے زیرِ اہتمام ۱۹۷۴ء میں شایع ہوا۔

۲۔تہذیب و فن:

قاسمی روزنامہ ''امروز'' میں کالم لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنے کالموں اور تنقیدی مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت عطا کی اور ''تہذیب و فن'' نام تجویز کیا۔ ''تہذیب و فن'' کے مضامین پاکستانی تشخص کی پہچان تہذیب و ثقافت کی بقا، ادیب کے بین الاقوامی مسائل اور اظہارِ آزادی کو دل چسپ پیرایہ اظہار میں بیان کرتے ہیں۔ زیرِنظر مجموعہ کو پانچ عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے جس کی تفصیل پیشِ خدمت ہے:

ادیب اور قومی بین الاقوامی مسائل:

اہلِ قلم بے حسی کا شکار ہیں۔
روح عصر کے تقاضے۔
کیا انسان دوست ہونا گناہ ہے۔(۱)
کیا انسان دوست ہونا گناہ ہے۔(۲)
انسانی اختلافات یا انسانی مساوات۔
فن کار کے مخاطب کون ہیں۔
ہم کس کے لیے لکھتے ہیں۔
''کومیٹ منٹ'' کا مسئلہ۔
یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔
ہم الفاظ کے تعصّبات میں مبتلا ہیں۔

پاکستان کا قومی کلچر:

پاکستان کا قومی کلچر کیا ہے۔
حسن و جمال کا مفہوم محدود نہیں۔
ہماری تہذیبی انفرادیت نمایاں نہیں۔
پاکستانی تہذیب کی صورت پذیری۔
پاکستانی تہذیب کے بارے میں بعض غلط فہمیاں۔
ہم قومی کلچر کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔
بیرونی ممالک میں پاکستان کا تصور۔
سرسید کی تحریک کے خلاف تحریک چلانے والے۔

ادیب اور عوامی مسائل:

دانش ور عوام کے قریب آئیں۔
عوامی مسائل سے بدکنے والے۔
کچھ لوگ فن کے بارے میں۔
قومی یک جہتی میں علاقائی ادب کا کردار۔

اردو اور علاقائی زبانیں نئے پس منظر میں۔
اردو اور علاقائی زبانوں کے مثبت اور منفی رشتے۔
پاکستانی ادیب کے پاکستانی زبانوں کے تراجم۔

ادیب اور آزادی:

تحریکِ آزادی میں ادیبوں کا کردار۔
شاعری اور ملکی آزادی کا موضوع۔
پاکستانی ادب میں قومی شعور کا مسئلہ۔
ادیب اور قومی مسائل۔
سیاست کی آزادی اور ادیبوں کے فرائض۔
احساس کم تری کے چنگل سے نکلیے۔

پاکستانی ادیب اور غیر ملکی جارحیت:

ستمبر کی جنگ اور ہمارا ادب۔
پاکستانی ادب پر جنگ کے اثرات۔
پاکستانی شعرا کا جذبہ نفرت یا جذبہ حریت۔
ہندوستانی ادیبوں کا ضمیر کیا کہتا ہے۔
ہندوستان کے اربابِ علم وفن کے نام۔
پاکستانی ہونے پر فخر کرنا سیکھیے۔
ایک بھارتی ادیب کی طرف سے پاکستان کی نظریاتی بنیاد پر حملہ۔
وطن دوستی جرم نہیں ہے۔

''تہذیب وفن'' کا انتساب انھوں نے اپنے اکلوتے بھانجے ظہیر بابر کے نام معنون کیا ہے جو ان تنقیدی مضامین کے محرک بھی تھے۔ ظہیر بابر معروف صحافی اور افسانہ نگار تھے۔ یہ خدیجہ مستور سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ قاسمی کے اپنے اس بھانجے سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ہر مشکل مرحلے میں وہ ہم رکاب رہے۔ انھوں نے اس کتاب کا دیباچہ یکم مارچ ۱۹۷۵ء کو سپردِ قلم کیا۔ جس میں مصنف بعنوان تمہید اپنے تاثرات و خیالات کو الفاظ کا پیرہن عطا کرتے ہوئے کتاب پر شامل مضامین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔یہ نہ صرف میرے ضمیر کی آواز ہیں بلکہ پاکستان کے محبِ وطن باشعور اہلِ قلم کے خلاف اس الزام کی بھی تردید کرتے ہیں کہ جبر اور پابندی کے دنوں میں ان کی حیثیت خاموش تماشائی سے زیادہ نہیں تھی۔'' ۳۷

قاسمی ایک محب الوطن پاکستانی تھے جو ملک میں عدل وتوازن اور امن وخیر سگالی کے خواہاں تھے۔ اس مجموعہ میں شامل مضامین کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ان مضامین کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے مفید رہے گا کہ یہ ایک ایسے تخلیقی فن کار کے تاثرات ہیں جس کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے وطن اور قوم سے محبت نہیں کرسکتا۔ وہ کسی سے محبت نہیں کرسکتا اور جو محبت نہیں کرسکتا اسے حسن وخیر اور عدل وتوازن کا شعور ہی حاصل نہیں ہوسکتا۔'' ۳۸

اس مجموعے کی قیمت دوسو چالیس روپے ہے۔ یہ مجموعہ طیب اقبال پرنٹرز سے دوسو تراسی صفحات پر چھپوا کر طاہر اسلم گورا؛ پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ سے ۱۹۹۱ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوا۔ اس کتاب کا مقصد نقاد کے تنقیدی افکار کو قارئین کے وسیع حلقے تک پہنچانا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ کتاب زمانے کی گرد کا شکار نہ ہوئی اور اپنے اصل مقصد کو پورا کر سکی۔

خالد احمد تہذیب وفن کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کی کتاب ''تہذیب وفن'' بین السطور صرف ایک بات پر زور دیتی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ثقافت کا منبع اشتراک کے قراقرم بلندیوں میں واقع ہے نہ کہ اختلافات کے متعفن نشیبوں میں۔'' ۳۹

۳۔علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء — ۱۹۳۸ء):

یہ تعارفی نوعیت کی کتاب ہے جسے قاسمی نے اقبال کے صدسالہ جشنِ ولادت پر شایع کرایا۔ یہ کتاب اقبال سے محبت اور ان کے ادبی کمالات کے اعتراف پر مشتمل ہے۔ زیرنظر کتاب میں اقبال کے اسلاف سے لے کر شاعرِ مشرق کی وفات تک کے چیدہ چیدہ حالات و واقعات اور ان کے نظریات و افکار کو اختصار کے ساتھ دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ تعارفی نوعیت کی اس کتاب کے مندرجات درج ذیل ہیں:

اقبال کے اسلاف۔	ولادت اور تعلیم۔	شہرت کا آغاز۔
تعلیمی سفر۔	مراجعت۔	اعزاز۔
عملی سیاست۔	مدراس لیکچر۔	دوقومی نظریہ۔
گول میز کانفرنس میں شرکت۔	بیماری اور وصال۔	مزارِ اقبال۔
شخصیت و کردار۔	اولاد۔	تصنیفات (اردو، فارسی، انگریزی)۔
نظریہ حیات۔	منصب کی ادائیگی۔	خودی کا تصور۔

پیش نظر کتاب میں مقدمہ، دیباچہ، فلیپ یا انتساب شامل نہیں البتہ حیاتِ اقبال کے متعلق پُرمغز معلومات کے ساتھ ساتھ ان کے والدین اور دوست احباب کی تصویریں شامل ہیں۔ اُنیس عنوانات پر مشتمل یہ جلد اُنسٹھ صفحات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کا سرورق فنون پریس رائل پارک لاہور نے بنایا۔ کتاب کے سرورق پر مغموم و اُداس اقبال کی تصویر ہے۔ یہ کتاب ''سمیر پرنٹرز'' رائل پارک لاہور کے زیراہتمام مطبع ہوئی اور نومبر ۱۹۷۷ء کو مجلس ترقی ادب لاہور کے زیراہتمام شایع ہوئی۔ قاسمی نہایت مہارت سے اقبال اور ان کی تخلیق کو اپنے دامنِ تقدیس میں بھر کر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ قاسمی کو اقبال اور فکر اقبال سے بہت رغبت تھی۔ اس امر کو تقویت درج ذیل نکات

سے ملتی ہے:

۱۔ چراغ حسن حسرت کے ہمراہ قاسمی کی اقبال سے ملاقات بھی ہوئی۔ اقبال نے ان کی اوّلین شعری تخلیق کو سراہا اور روشن مستقبل کی بشارت دی۔

۲۔ قاسمی نے فنون کا اقبال نمبر شایع کیا۔

۳۔ ''معنی کی تلاش'' تنقیدی کتاب میں گوشہ اقبال ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۴۔ اقبال کے فکر و فن اور شخصیت پر تحریر مقالات کو فنون میں بخوشی جگہ دی جاتی۔

۵۔ قاسمی کی اکثر تقاریر اور مضامین میں اقبال کے اشعار کا حوالہ ملتا ہے۔

۶۔ ان کی شعری کتب میں ''نذر اقبال'' کے عنوان سے نظمیں ملتی ہیں۔

۷۔ انھیں اقبال کے کئی اشعار از بر تھے۔

۴۔ پسِ الفاظ:

قاسمی ایک ایسے تخلیق کار تھے جو ادب اور فن کے گوناگوں مسائل کے متعلق سوچتے تھے۔ پیش نظر مجموعہ میں شامل مضامین انہی تفکرات کا نتیجہ ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل بیشتر مضامین ظہیر بابر کے ایما پر لکھے گئے۔ بعض ادبی مسائل پر باہمی گفتگو کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ان خیالات کو تغیر و تبدل کے بعد مضامین کی صورت عطا کی گئی۔ کتاب کو چار عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ مضامین ادیب اور مملکت کے مسائل کو منظرعام پر لاتے ہیں۔ وہیں عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔ قاسمی کی غالبؔ شناسی پر منتخب مضامین اپنی معنویت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کے فکر و فن کا تجزیہ کر کے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں سجاد حیدر یلدرم کی بیٹی قرۃ العین حیدر کے مقبول ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ بایں ہمہ ''میرا نظریہ فن'' کے عنوان سے لفظ کی افادیت و مقام، فن میں ریاضت، عوامی ادب، ادیب کا نقطہ نظر اور ادب میں حقیقت نگاری کے فروغ کے متعلق اپنے افکار کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ بہر حال مضامین کے مندرجات حسب ذیل ہیں:

دو اہم کلیدی خطبے:

ادیب اور مملکت۔	ادیب اور آزادیِ اظہار۔

خصوصی مطالعہ غالب:

غالب خستہ کے بغیر۔	غالب کی صد سالہ برسی۔	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
جیتا جاگتا غالب۔	فکر و فن کا امتزاج غالب۔	غالب کی حسرت تعمیر۔
غالب کا اندازِ گل افشانئ گفتار۔	غالب کی جستجوئے جمال۔	سخن ناشناسی۔

خصوصی مطالعہ قرۃ العین حیدر:

میرے بھی صنم خانے۔

میرا نظریہ فن:

کیا لفظ مر رہا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ زندگی افروزی کی روایت۔

تخلیقِ فن میں محنت اور لگن۔ زندگی کا دخل ناگزیر ہے۔ نئی قسم کا عوامی ادب۔

پسند اور ناپسند۔ شعور و دانش کے مطالبے۔ نئے اور پرانے اہلِ قلم۔

ادیب کا نقطہ نظر۔ ادب میں بے اطمینانی۔ حقائق سے کترانے کا رجحان۔

ذات کی گمشدگی کا مسئلہ۔ دنیائے ادب اور تنگ دلی۔ عجزِ اظہار یا عجزِ فہم۔

ادب اور بڑے لوگ۔ ادب اور افادیت۔

اس کتاب کا انتساب قاسمی کی منہ بولی بیٹیوں کے نام درج ذیل عبارت کے ساتھ معنون ہے:

''اپنی پیاری بیٹیوں
منصورہ، فوزیہ، نصیرہ، ناصرہ
طاہرہ اور ننھی مریم
کی بیکراں محبتوں کے نام۔'' [۴۰]

''پس الفاظ'' میں شامل حرفِ اوّل کو ''یہ مضامین'' کا عنوان دیا گیا ہے جس میں قاسمی نے ان مضامین کے محرک بتانے کے ساتھ ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے:

''میرے مضامین نہ نفسیاتی ڈھکوسلے ہیں اور نہ سائنسی فارمولے ہیں۔ ان میں تو ایک تخلیقی فن کار زندگی کے ہر اُس مسئلے پر ایک تجزیاتی نظر ڈالتا رہا ہے جو آج کے ادب و فن کے علاوہ تمام عالمِ انسانیت کو بھی درپیش ہیں۔'' [۴۱]

پیشِ نظر کتاب میں منصورہ احمد کی پیش بینی اور تصرف کا عمل دخل بھی نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے ''کچھ باتیں'' کے عنوان سے اس تنقیدی مجموعے کے پس منظر میں کی گئی کاوشوں اور مشکلات کا اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب دل کش سرورق کے ساتھ دو سو چالیس صفحات پر تیار ہوئی۔ اس کی قیمت مبلغ دو سو روپے ہے۔ مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور میں مطبع ہوئی اور ۲۰۰۳ء کے اوائل میں اساطیر پبلی کیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام ایک ہزار کی تعداد میں شایع ہوئی۔

۵۔ معانی کی تلاش:

اس مجموعے میں مصنف کی ایسی تنقیدی تحریریں شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف ادبی رسائل و جرائد کی زینت بنتی رہیں۔ اب نقاد کا نقطہ نظر پختہ ہو گیا ہے۔ اب اقبال کے خصوصی کلام وفن کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن مثلاً

غزل، تنقید، آزاد نظم، پابند نظم اور نظم معریٰ پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ تین عنوانات پر مشتمل اس کتاب کی تفصیل و ترتیب ذیل میں درج کی جاتی ہے:

خصوصی مطالعہ اقبال:

اقبال کے ساتھ انصاف کیجیے۔ اقبال اور ہمارا نصابِ تعلیم۔ عہد ساز اقبال۔
اقبال کا نظریہ شعر۔ اقبال کی ایک نظم، شمع اور شاعر۔ اقبال بحیثیت شاعر۔
پورا اقبال۔

خصوصی مطالعہ ـــ احتجاج و احتیاط:

احتجاج و احتیاط۔

میں سوچتا ہوں:

قومی ثقافت اور اس کے علاقائی عوامل۔ میرا نظریہ فن۔ شاعر اور شاعری
صداقت اور شاعرانہ صداقت۔ غزل کی تجدید کا مسئلہ۔ لحمہ رواں کی غزل۔
جدید غزل۔ نظم آزاد، نظم معریٰ۔ فن کی روایات اور فن کار۔
ادب و فن میں خود تنقیدی۔ تنقید میں دیانت۔ تنقید کے سانچے۔
ایک تنقیدی بوالعجبی۔ موضوعات محدود کیوں۔ ادب میں انفرادیت۔
تحریکِ آزادی ادب اور ادیب۔ آزادی کا تحفظ اور اہلِ شعروفن۔
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں۔ اکیسویں صدی ایک آزمائش ایک چیلنج۔ کامیاب زندگی کا تصور۔
ایک خطبہ صدارت۔ ارتقا کا عمل۔

اس کتاب کا انتساب قاسمی نے اپنے تینوں بچوں کے نام منسوب کیا ہے:

''پیاری بیٹیوں ناہید، نشاط (مرحومہ)

اور

عزیز بیٹے نعمان

کی محبتوں کے نام۔'' ۴۲

قاسمی نے اس کتاب کا دیباچہ ۲۳ر ستمبر ۲۰۰۳ء کو سپردِ قلم کیا۔ ''عرضِ مولف'' کے نام سے نصیرہ حبیب احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پیش نظر مجموعہ طیبہ پرنٹرز سے دو سو چھپن صفحات پر چھپوا کر اساطیر پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ ۲۰۰۳ء میں اشاعت پذیر ہونے والے اس مجموعے کی قیمت دو سو روپے درج ہے۔

۶۔ثقافت کیا ہے:

پاکستانی تہذیب وثقافت قاسمی کا من پسند موضوع تھا۔تنقیدی کتب میں بارہا اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔''پاکستانی ثقافت'' کے عنوان سے چھے صفحات پر مشتمل اس مضمون کو کتابی صورت عطا کی گئی اور ''ثقافت کیا ہے'' میں شامل کیا گیا جس کی ادارت میں قاسمی کے ساتھ خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر محمد اجمل بھی شامل تھے۔ چونسٹھ صفحات پر مشتمل اس کتابچے میں دیباچہ یا انتساب شامل نہیں ہے۔ اس مختصر کتابچے کی قیمت پچیس روپے درج ہے۔ یہ مجموعہ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپا اور ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہوا۔

سوانحی خاکے

جہاں تک خاکہ نگاری کا تعلق ہے۔ قاسمی نے نقوش کے دورِ ادارت سے ہی شخصیات کے شخصی و سوانحی خاکے لکھنے شروع کر دیے تھے جنھیں قابلِ تحسین جانا گیا۔ چناں چہ اس پذیرائی کے بعد انھوں نے اپنے قریبی دوست احباب پر دل چسپ، پُرمغز معلومات سے بھرپور، سنجیدہ اور نفیس خاکے لکھے۔ یہ خاکے مختلف ادبی رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے جنھیں بعدازاں یکجا کر کے کتابی صورت عطا کی گئی۔ یہ خاکے دو مجموعوں ''میرے ہم سفر'' اور ''میرے ہم قدم'' کی صورت میں پیش کیے گئے۔ ان خاکوں میں مصنف کا انداز تجزیاتی اور اسلوبِ نگارش شگفتہ ہے۔ ان مجموعوں میں شامل خاکے ان شخصیات پر مشتمل ہیں جو ان کے دل کے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں موجود نہ تھیں۔

ا۔میرے ہم سفر:

قاسمی نے ان مشاہیر کی یادداشتیں قلم بند کیں جو اپنے دور کی مقبول ومعروف شخصیات تھیں جو اپنے ہنر وکمال کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بٹھا چکے تھے۔ انھوں نے اپنے اولین سوانحی مجموعے میں تیرہ شخصیات کو شامل کیا جن میں دس ادیب اور تین شاعر حضرات تھے۔ یہ ادیب وشاعر فلکِ ادب پر درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔

مولانا عبدالمجید سالک۔	مولانا غلام رسول مہر۔	مولانا چراغ حسن حسرت۔
سعادت حسن منٹو۔	ن۔م۔راشد۔	فیض احمد فیض۔
سید ضمیر جعفری۔	امتیاز علی تاج۔	حکیم محمد سعید۔
خدیجہ مستور۔	ابن انشا۔	سجاد سرور نیازی۔
محمد طفیل۔		

پیش نظر مجموعہ برصغیر پاک و ہند کی اہم ادبی و سیاسی شخصیات کی زندگی کے کئی گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ منصورہ احمد کی تحریک پر چند یادداشتیں قلم بند ہوئیں۔ دیباچہ مصنف نے ''سرآغاز'' کے نام سے تحریر کیا جب کہ ''میری رائے میں۔۔۔'' کے عنوان سے منصورہ احمد نے تفصیلاً ان خاکوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ سوانحی خاکے قاسمی کی خودنوشت کے چند واقعات کو بھی سامنے لاتے ہیں اور موضوع شخصیت کے ظاہری و باطنی حالات و واقعات کو بھی قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ قاسمی نے اس کتاب کا انتساب اپنی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد کے نام کیا ہے:

''منصورہ بیٹی کے نام!

جو ان تحریروں کی محرک بھی ہے

اور انسپریشن بھی۔'' ۴۳

دو سو تیئس صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت دو سو روپے ہے۔ ایک ہزار کی تعداد میں شایع ہونے والے اس مجموعے کو مکتبہ جدید پریس لاہور سے طبع کیا گیا۔ اس کا سرورق شاہ نواز زیدی نے ترتیب دیا۔ اسے اساطیر پبلی کیشنز نے ۲۰۰۲ء میں شایع کیا۔

قاسمی نے رسالہ ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں مولانا عبدالمجید سالک اور ہاجرہ مسرور کے خاکے لکھے جب کہ ''میرے ہم سفر'' کی اشاعت کے دوران ہاجرہ مسرور کا خاکہ حذف کر دیا اور کوئی جواز پیش نہیں کیا۔ راقم الحروف کے پیش نظر اس کا محرک اوّل ہاجرہ کی طویل عمری ہے جب کہ زیرنظر مجموعے میں شامل خاکے اس دنیا سے کوچ کر جانے والی شخصیات پر مشتمل ہیں۔ عبدالمجید سالک کا خاکہ نقوش کے شخصیات نمبر میں شایع ہوا۔ ''خدیجہ کی شخصیت اور فن کے رشتے'' کے نام سے یہ مضمون فنون میں بھی شامل ہوا۔ بعدازاں خاکہ نگاری کی صورت عطا کر دی۔ قاسمی کو خدیجہ سے بڑی محبت و شفقت تھی۔ اس کی وجہ خدیجہ کی ذہانت و فطانت تھی۔ ضمیر جعفری کا خاکہ مجلّہ فنون لاہور اپریل تا جولائی ۱۹۹۹ء، شمارہ ۱۱۰ کے صفحہ نمبر ۲۴ سے ۲۸ تک مشتمل ہے۔ ''محبتوں کا کروڑ پتی'' کے نام سے ''گوشہ ضمیر جعفری'' میں شامل ہے۔ خاکہ نویس نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مضمون ضمیر جعفری کی زندگی میں بھی شایع ہوا تاہم ان کی رحلت کے بعد صیغہ حال کو صیغہ ماضی میں تبدیل کر دیا گیا۔ فیض احمد فیض کے خاکے پر بہت چہ مگوئیاں ہوئیں۔ اسے فیض کی کردار کشی کہا گیا۔ یہ خاکہ معاصر میں بھی شایع ہوا اور سہ ماہی ''نیا ورق''، جلد ۹، شمارہ ۲۲، ۲۰۰۶ء میں بھی اشاعت پذیر ہوا۔ یہ خاکہ فیض احمد فیض کا اصل روپ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ محمد طفیل کا خاکہ سالنامہ ''تحریریں'' میں بھی شایع ہوا جو کتابی صورت والے خاکے سے مختلف ہے۔

۲۔ میرے ہم قدم:

قاسمی کے احباب و ہم عصر شخصیات کی یادوں پر مشتمل سوانحی خاکوں کا دوسرا مجموعہ "میرے ہم قدم" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ پیشِ نظر مجموعہ ادبی و غیر ادبی شخصیات کے اُنیس خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مندرجات کی تفصیل و ترتیب پیش کی جاتی ہے:

اختر شیرانی۔	احسان دانش۔	اختر حسین جعفری۔	ظہیر بابر۔
مرزا محمد ابراہیم۔	دادا امیر حیدر۔	ظہیر کاشمیری۔	کرشن چندر۔
شیخ خورشید احمد خاں۔	مختار صدیقی۔	میاں عبدالمجید۔	ڈاکٹر اقبال شیدائی۔
ظہور نظر۔	میر خلیل الرحمٰن۔	پروین شاکر۔	ریاض شاہد۔
اطہر نفیس۔	حسن عابدی۔	کاوش بٹ۔	

سوانحی خاکوں کا یہ مجموعہ تکمیلی مراحل طے کر رہا تھا کہ قاسمی کی وفات ہو گئی۔ چناں چہ ان کی رحلت کے بعد ان کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی نے شایع کرایا۔ اس کتاب کا انتساب قاسمی کے مشفق چچا اور مہربان چچی کے نام معنون ہے۔

"احمد ندیم قاسمی کے محترم چچا پیر حیدر شاہ صاحب
اور محترم چچی شرفاں بیوی صاحبہ کے نام
جنھوں نے ندیم کو زندگی اور فن کے پُر آزمائش
راستوں پر رواں دواں رہنے کا اعتماد بخشا۔" ؎۴۴

پیشِ نظر مجموعہ کا پیش لفظ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے لکھا۔ قاسمی کی ایک نظم بھی ان سوانحی خاکوں کی ابتدا میں شامل ہے۔ اس مجموعہ کی کتابت عمدہ قسم کے ایک سو صفحات پر کرائی گئی؛ قیمت ایک سو پچھتر روپے مندرج ہے۔ یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۶ء میں شایع کی۔ "میرے ہم قدم" کے سوانحی خاکوں میں خاکہ نگار کی کوشش ہے کہ اس انتخاب سے محولہ بالا شخصیات کے خدوخال اُجاگر ہو سکیں اور اردو ادب میں ادیب کے لہجے کی پہچان بھی ہو سکے۔ "ظہیر کاشمیری۔۔۔ایک قدآور شاعر" کے نام سے یہ خاکہ "گوشہ ظہیر کاشمیری" مجلّہ "فنون" لاہور سے شایع ہوا۔ تاہم کسی بھی تغیر و تبدل کے بغیر اسے "میرے ہم قدم" میں شامل کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں اخگر سرحدی کا ایک خاکہ سالنامہ "تحریریں" میں شامل ہے۔

ترتیب و تدوین

احمد ندیم قاسمی نے اپنی گوناگوں مصروفیت کے باوجود ترتیب و تدوین کے فرائض بھی احسن طریقے سے

سرانجام دیے۔ انھوں نے افسانے، شاعری اور خطوط مرتب و مدون کر کے ان اصناف سے دل چسپی کا منہ بولتا ثبوت پیش کیا اور دیگر اصنافِ سخن کی طرح ترتیب و تدوین میں بھی اپنا نام امر کر گئے۔ ان ترتیب و تدوین شدہ کتابوں کی ترتیب ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ا۔ غنچے:

''غنچے'' پندرہ افسانوں اور ایک ایکٹ کا ڈراما ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' پر مشتمل ہے۔ پیش نظر مجموعہ کے بیشتر افسانے رسالہ ''رومان'' میں شایع ہوتے رہے۔ یہ کتاب مصنف کی اولین کاوش ہے۔ اس کتاب میں قاسمی کے دو افسانے ''سوزِ ناتمام''، ''ابتدا اور انتہا'' اور ایک ایکٹ کا ڈراما ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' شامل ہیں۔ اس کتاب کے مندرجات کی تفصیل درج ذیل ہے:

سوزِ ناتمام۔	احمد ندیم قاسمی۔	ابتدا اور انتہا۔	احمد ندیم قاسمی۔
بخیا۔	اوپندر ناتھ اشک۔	منصور کی موت۔	لال چند۔
دو کانٹے۔	حسن عزیز جاوید۔	آخری رات۔	صادق الخیری۔
سینما میں ایک شام۔	عابد علی عابد۔	طوطا۔	غلام عباس۔
رئیس زادہ۔	خواجہ حسن عباس۔	حلیمہ۔	لالہ رام ناتھ۔
منزلِ مقصود۔	پیارے موہن لال سری واستو۔	خیال کا جادو۔	محمد عمر فاروق۔
اولین تصنیف۔	خلیل احمد۔	ریحانہ۔	سروری راجہ۔
پھٹی پھٹی آنکھیں۔	آغا ابو سعید۔	پھل کی طشتری۔	نسرین حسن۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ احمد ندیم قاسمی۔

معروف افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ ''امرت الیکٹرک پریس لاہور'' سے ۱۹۳۷ء میں شایع ہوا۔ یہ کتابچہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ انگڑائیاں:

''انگڑائیاں'' مرد افسانہ نگاروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تلاشِ بسیار کے باوجود دست یاب نہ ہو سکی۔ اس کتاب کا مسودہ یا جلد مرتب یا مرتب کے احباب کے پاس موجود نہیں ہے۔ قاسمی کے کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں دارالاشاعت اردو، حیدر آباد دکن سے شایع ہوا۔ یہ مرد افسانہ نگاروں کا عمدہ انتخاب تھا جو اشاعت پذیر ہوتے ہی گوشہ گم نامی کی نذر ہو گیا۔ اس کا بار دوم کسی ادارے سے

شایع نہیں ہوا۔

۳۔نقوش لطیف:

''نقوش لطیف'' چوبیس افسانہ نگار خواتین کے سوانحی حالات، نظریہ فن اور افسانوں کا احاطہ کرتا ہے۔ جب کہ تیسرے اور آخری حصہ میں ''میرے خیال'' کے عنوان سے سترہ افسانہ نگار خواتین کے ادبی و فنی نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں بیشتر وہی خواتین ہیں جن کی فنی بازگشت ادبی حلقوں میں سُنی جاتی تھی تاہم بعض افسانہ نگار خواتین ایسی بھی ہیں جو اس انتخاب کے ذریعے پہلی بار منظرعام پر آئیں۔ مرتب نے اس کتاب کو تین عنوانات کے تحت منقسم کیا ہے:

مضامین:

ایک بات۔	عصمت چغتائی۔	نیا ادب۔	سرلا دیوی
ترقی پسند ادب۔	ممتاز شیریں۔	میرے فنی نظریات۔	طاہرہ دیوی شیرازی۔

افسانے اور حالاتِ زندگی:

ٹوٹ گیا اِک تارہ۔	تسنیم نسیم چھتاری۔	موم کی مریم۔	جیلانی بانو۔
ناگن۔	حمیدہ سلطان۔	ہتھ۔	خدیجہ مستور۔
قانون اور انصاف۔	ڈاکٹر رشید جہاں۔	جب شام آتی ہے۔	زہرہ جبیں۔
آگ جل رہی ہے۔	سحاب قزلباش۔	کلنک۔	سرلا دیوی۔
مراجعت۔	سنجیدہ اشرف۔	سپنوں کے سائے۔	سیدہ اشرف
شانتی۔	شائستہ اختر سہروردی۔	فریبِ مسلسل۔	شفیق بانو۔
آنکھ مچولی۔	شکیلہ اختر۔	بنواری۔	شیریں۔
سنبھالا۔	صالحہ عابد حسین۔	اندھیارے کے سپنے۔	صدیقہ بیگم۔
دونوں سے۔	طاہرہ دیوی شیرازی۔	چوٹ۔	عائشہ درازی۔
ہیرو۔	عصمت چغتائی۔	رقصِ شرر۔	قرۃ العین حیدر۔
تھکان۔	کوشلیا اشک۔	کاسۂ سر۔	مسز عبدالقادر۔
انگڑائی۔	ممتاز شیریں۔	ایک بچی۔	ہاجرہ مسرور۔

''میرے خیال میں'' کے عنوان سے قاسمی نے سترہ خواتین کے ترتیب وار سوالات کے جوابات جامع اور

مجمل انداز میں شامل کیے ہیں۔ پُر مغز معلومات و خیالات سے مزین یہ حصہ اُردو کے تنقیدی ادب میں ایک دل چسپ اضافہ ہے۔ پیش نظر مجموعہ میں کوئی انتساب شامل نہیں۔ اس کا دیباچہ مرتب نے بعنوان ''ابتدائیہ'' ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو اپنے آبائی گاؤں انگہ میں تحریر کیا۔ جس میں ان مضامین و افسانوں تک رسائی کے لیے کٹھن مراحل کو پیش کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کے پیش نظر زیرِنظر مجموعہ کا طبع دوم ہے۔ چار سو بارہ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ایک سو پچاس روپے درج ہے۔ اس کے سرورق پر تنہا، مظلوم اور اُداس عورت کی تصویر ہے جس کی ویران آنکھیں معاشرے میں اپنا مقام تلاش کر رہی ہیں۔ صنفِ نازک کی تصویر کے ذیل میں یہ جملہ کندہ ہے:

عورت کی مجبور خاموشی ظلم کی بنیاد ہے

یہ مجموعہ Track and Tie Printers کے زیر اہتمام اثر پبلشرز لاہور، اساطیر پبلشرز لاہور سے شائع ہوا۔

۴۔ نذر حمید احمد خاں:

پروفیسر حمید احمد خاں پاکستان کی ایک جامع الحیثیات شخصیت تھے۔ ان کے پسندیدہ موضوعات پر اہلِ فکر کے مقالات کا مجموعہ اس کتاب میں شامل ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی وفات کے بعد ''مجلس یادگار حمید احمد خاں'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے صدر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان اور پروفیسر وقار عظیم اس کے معتمد تھے۔ اس مجلس میں حمید احمد خاں کے کارناموں اور افکار و خیالات کو زندہ رکھنے کے لیے ایک کتاب ترتیب دینے کا ارادہ کیا گیا جس کی ذمہ داری ناظم مجلس ترقی ادب، احمد ندیم قاسمی کو سونپی گئی۔ پروفیسر حمید احمد خاں کو اسلام، غالبؔ، اقبال، پاکستان اور غزل سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اس لیے ان کے پسندیدہ و مرغوب موضوعات کو اہلِ فکر سے لکھوا کر کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ مرتب نے اعلیٰ معیار کے اٹھارہ مقالات کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے جس کی اجمالی تفصیل پیش خدمت ہے:

اسلام اور پاکستان:

قرآن مجید کے صوری اور معنوی محاسن۔	سید ابوبکر غزنوی۔
قتلِ مرتد اور پاکستان۔	سید یعقوب شاہ۔
سلطان محمود بکھری کی زندگی کا ایک پہلو۔	سید حسام الدین راشدی۔
نظریہ پاکستان۔	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔

علامہ اقبال:

فلسفہ اقبال کے نفسیاتی منابع۔	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔
''زبورِ عجم'' پر ایک نظر۔	ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی۔
عطیہ بیگم کا المیہ۔	جسٹس۔ ایس۔ اے۔ رحمٰن۔
علامہ اقبال کا تعلیمی منشور۔	ڈاکٹر سید عبداللہ۔
Iqbal's Preface to the Lectures۔	پروفیسر قاضی محمد اسلم۔
علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت۔	ڈاکٹر وحید قریشی۔

مرزا غالب:

تنقیداتِ غالب پر ایک نظر۔	سید فیاض محمود۔
گل رعنا۔۔۔بخطِ غالب۔	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔
غالب کی آوارہ خرامی۔	ڈاکٹر وزیر آغا۔

اردو ادب:

اردو شاعری میں قومی و ملی عناصر۔	ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی۔
فارن لٹریچر کا پاکستانی ادب پر امپکٹ۔	پروفیسر جیلانی کامران۔
آتش لکھنوی اور مزاجِ غزل۔	پروفیسر مرزا محمد منور۔

قاسمی نے اس کتاب کا دیباچہ ۲۱/جون ۱۹۷۹ء کو سپردِ قلم کیا۔ مختلف تنقیدی افکار پر مشتمل یہ مجموعہ ''زریں آرٹ پریس'' لاہور سے پانچ سو اٹھائیس صفحات پر چھپوایا گیا۔ گیارہ ہزار کی تعداد میں شائع ہونے والے اس مجموعے کی قیمت مبلغ پچاس روپے ہے۔ یہ مجموعہ ''مجلس ترقی ادب'' لاہور کے زیرِاہتمام دسمبر ۱۹۸۰ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ اس مجموعے میں صرف ان مضامین کو شامل کیا گیا جو حمید احمد خاں کے ذوق اور دلچسپی کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

۵۔ منٹو کے خطوط، ندیم کے نام:

اردو ادب کے لازوال فنی حیثیت کے مالک؛ سعادت حسن منٹو نے قاسمی کے نام خطوط لکھے جسے منٹو کی رحلت کے بعد کتابی صورت عطا کی گئی۔ یہ خطوط جہاں منٹو کی شخصیت، مزاج اور افکار کو منکشف کرتے ہیں وہیں قاسمی سے منٹو کے روابط کو بھی منظرِ عام پر لاتے ہیں کہ بظاہر متضاد مزاج رکھنے کے باوجود یہ فن کار کس طرح ایک دوسرے

کے لیے عقیدت، خلوص اور محبت کے جذبات رکھتے تھے۔ اس کتاب کا بار اوّل ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پیشِ نظر اشاعت اس کتاب کا طبع دوم ہے۔ مرتب نے اس کتاب کا انتساب منٹو کے نام ذیل کی عبارت سے منسوب کیا ہے:

''منٹو کے اس نہایت پیارے غصّے کے نام
جس کا اظہار اس نے ان الفاظ میں کیا تھا
کہ اگر تم نے ایک رسالے میں میرے نام ''کھلی چٹھی''
لکھی ہے تو میں تمہارے نام کسی اور رسالے میں
''بند خط'' لکھوں گا۔'' ۴۵

کتاب کا دیباچہ قاسمی نے لکھا، جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے ''منٹو خطوط کے آئینے میں'' کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا۔ ایک سو نوے صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت پچاس روپے ہے۔ یہ کتاب ''طیب اقبال پرنٹرز'' نے چھپوا کر ''طاہر اسلم گورا'' کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۱ء میں شایع کی۔ زیرِ نظر مجموعہ اور انتخاب سے صایب الرائے ہے کہ اغلاط اور عدم ترتیب سے کام نہیں لیا گیا۔ کتابت کی اغلاط اور صحتِ متن کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ پیشِ نظر مجموعہ منٹو اور قاسمی کی شخصیت و فن کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

۶۔ تیرے جاں نثاروں کو سلام:

۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے مختلف نظموں، ترانوں پر مشتمل اس کتابچے کو قاسمی نے مرتب کیا۔ اس کی ادارت میں قاسمی کے ساتھ ا۔د۔اظہر، حامد علی خاں، سید وقار عظیم، عبدالمجید بھٹی، عشرت رحمانی، چوہدری محمد افضل، محمد طفیل اور ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ شامل تھے۔ قاسمی کی تخلیق اس میں شامل نہیں۔ یہ کتابچہ ''پاکستان رائٹرز گلڈ'' کے زیرِ اہتمام ۱۹۶۶ء میں شایع ہوا۔

ناول

قاسمی کا ناول ''پت جھڑ'' دیہاتی طرزِ زندگی کی کامیاب عکاسی کرتا ہے۔ شہر میں زندگی بسر کرنے کے باوجود دیہات قاسمی کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ ناول دو حصوں ''فیصلہ'' اور ''گیت'' اور چار کرداروں چراغ علی، زیتون، زینی اور آلی پر مشتمل ہے۔ یہ ناول محبت اور احساس کے جذبے سے بھرپور ہے۔ ''پت جھڑ'' جوان بیٹی کے گیت گانے، اس کے مغموم ہونے اور آنسوؤں کا سبب جاننے کی جستجو پر مشتمل ایک باپ کی کہانی ہے۔ قاسمی ابھی نو صفحات ہی لکھ پائے تھے کہ وفات پا گئے۔ اپنی بے پناہ مصروفیت کی بنا پر مکمل نہ کر سکے کیوں کہ بڑے آدمی کی مشکلات دفتر کی میز پر ہی ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ ذہن میں رہتی ہیں۔ لکھنے کے لیے جس آزاد، پُرسکون اور ذہنی ماحول

کی ضرورت ہوتی ہے ملازمت اُس میں مانع و مزاحم ہوتی ہے چناں چہ اس نامکمل ناول کو ''پت جھڑ'' افسانوی مجموعہ میں شامل کیا اور ناول کا نام بھی ''پت جھڑ'' ہی تجویز کیا۔ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شایع کیا۔ ناول کی ابتدائی سطور سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہ ناول پایہ تکمیل کو پہنچتا تو چوٹی کے ناولوں میں شمار ہوتا۔

ناولٹ

''ایک ریوڑ، ایک انبوہ'' کے نام سے قاسمی کا ایک ناولٹ بھی اُن کی وفات کے بعد اشاعت پذیر ہوا۔ یہ ناولٹ دوسری جنگ عظیم کے حالات و واقعات سے لے کر حصولِ پاکستان کے لیے کاوشوں اور قیامِ پاکستان کے حالات و واقعات کو منظرِ عام پر لاتا ہے۔ پیش نظر ناولٹ دوسری عالمی جنگ میں دیہات میں نوجوانوں کی فوج میں بھرتی اور ٹریننگ پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کے ہاتھوں ہانگ کانگ میں گرفتار افراد کی بے بسی کو دل پذیر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناولٹ پانچ ذیلی عنوانات پر محیط ہے:

سوری۔ سنگاپور سے دور۔ پاکستان زندہ باد۔ آؤ ایکا کریں۔ اطمینان۔

اس ناولٹ کے متعلق قاسمی لکھتے ہیں:

> ''اس ناولٹ کا ابتدائی دور دوسری عالمی جنگ کے دنوں سے متعلق ہے۔ جب ہٹلر اور مسولینی کے بعد جاپان کے ہیرو ہٹیو نے بھی اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔۔۔ یہ ناولٹ جنگ کے بعد تحریکِ پاکستان اور پھر قیامِ پاکستان تک رواں رہتا ہے۔'' ۴۶

اڑتیس صفحات پر مشتمل، اس ناولٹ کو ناہید قاسمی نے افسانوی مجموعے ''پت جھڑ'' میں شامل کیا جو قاسمی کی وفات کے بعد سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۰۷ء میں شایع ہوا۔

ترجمہ

۱۹۶۱ء میں اشرف صدیقی اور میریلین لرچ نے ایک کتاب "Toontoony Pie and other Tales from Pakistan" کے نام سے لکھی۔ قاسمی نے ان کہانیوں کو اردو میں منتقل کر کے ''پاکستان کی لوک کہانیاں'' کا عنوان دیا۔ یہ کہانیاں جہاں پاکستانی تہذیب و ثقافت سے متعارف کراتی ہیں وہیں بچوں کی دل چسپی کا ذریعہ بھی ہیں۔ ان کہانیوں کے مندرجات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

تونتونی کے سموسے۔ سودے باز چوہا۔ پالکی میں شیر۔

کوا اور چڑیا۔ شاعر کے بیٹے کی خوش قسمتی۔ گیدڑ اور مگرمچھن۔

کسان کا بوڑھا گھوڑا۔	نیک آدمی کا تحفہ۔	غریب جولاہا اور شہزادی۔
ایک آدمی جس کا قدم صرف تین انچ تھا۔	چالاک گیدڑ نے شیر کو کیسے چکرایا۔	بندر، شیر اور گیدڑ کا گھرانا۔
کوا اور اناج کا ایک دانہ۔	پھٹی ہوئی ناک والا گیدڑ۔	چار دوست۔
لعل شہزادہ۔	داستان گو۔	بوڑھی عورت اور چور۔
کاشی اور اس کے ظالم بھائی۔	دو کنجوس۔	تو نتونی اور نائی۔

ایک پاکستانی طوطے کی کہانی۔

بائیس سادہ اور آسان زبان پر مشتمل، ان کہانیوں کا دیباچہ قاسمی نے ''عرضِ مترجم'' کے نام سے لکھا ہے۔ ان کہانیوں کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے مترجم کی مسرت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ان پاکستانی کہانیوں کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے مجھے غیر معمولی مسرت محسوس ہوئی اس لیے ترجمے کے دوران پچاس کی عمر میں مجھے پانچ برس کے ایک بچے کی ذہنی کیفیتوں میں سے گزرنے کا تجربہ ہوا۔ اس کی گواہی اُن منظوم حصوں کے منظوم تراجم دیں گے جنھیں میں نے ایک بچے کی سی بے ساختگی کے ساتھ اپنی زبان کا جامہ پہنایا۔ ساتھ ہی اس مجموعے کی وہ کہانیاں جنھیں مشرقی پاکستان کی لوک کہانیاں کہنا چاہیے۔ میرے لیے ایک حد تک نئی بھی تھیں۔ کم سے کم اُن کی فضا اور اُن کے کردار قطعی نئے تھے اور کہانیاں لکھنے والے کو ایک نئی کہانی پڑھ کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے اُس کا اندازہ کہانی لکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔'' ۴۷

بچوں کی نفسیات کے مطابق مترجم نے یہ کہانیاں پیش کیں۔ مصنف نے ترپن برس کی عمر میں بچوں کی سطح پر آ کر نہایت سلیس اور عام فہم انداز میں دل چسپی سے بھرپور ترجمہ کیا۔ ترجمہ کے دوران انوکھی مسرت کا واشگاف اظہار کیا۔ ان کہانیوں کو پُرتاثیر بنانے کے لیے دل چسپ اشعار کا استعمال بھی ملتا ہے۔ اگرچہ انھیں پاکستان کی لوک کہانیاں اور لوک گیت جمع کرنے کا شوق عرصہ دراز سے تھا لیکن دیگر مصروفیات کی بنا پر اس شوق کی تکمیل نہ ہو سکی مگر اس ترجمہ سے ذہنی تشفی محسوس کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مجھے پاکستان کے لوک گیت اور لوک کہانیاں جمع کرنے کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ دوسرے ادبی مشاغل کی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔ مگر اب ان کہانیوں کو اُردو میں منتقل کرنے کا موقع ملا ہے تو سوچتا ہوں کہ میں نے اپنے برسوں کے شوق کو بالواسطہ طور پر سہی، کسی حد تک تو پورا کر لیا۔'' ۴۸

پیش نظر ترجمہ کی تمہید اشرف صدیقی نے کی جس میں اُنھوں نے قیامِ پاکستان سے لے کر؛ کہانی کی مقبولیت تک

کی داستان رقم کی ہے۔ ایک سو انسٹھ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت پانچ روپے درج ہے۔ یہ کتاب دو ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی۔ اِسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۶۸ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔

بچوں کا ادب

قاسمی نے بچوں کے لیے جو ادب تخلیق کیا اس میں کہانیاں اور ڈرامے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ قاسمی بچوں کے دل پسند اخبار ''پھول'' سے وابستہ رہے جس کی بنا پر بچوں کے ادب کی جانب ان کا رجحان ہوا۔ رسالہ ''پھول'' کی کہانیاں بچوں میں اخلاقی اوصاف پیدا کرتیں اور بچوں کی نفسیات کے مطابق ترغیب دیتیں۔ رسالہ ''پھول'' کی کہانیوں کے متعلق ڈاکٹر محمد سلیم ملک لکھتے ہیں:

> ''ان کہانیوں میں۔۔۔ بچوں کے تخیل کو تحریک ملتی، دل و دماغ کے دریچے کھلتے اور زمان و مکاں کی نئی رفعتوں سے آشنا ہوتے۔ اسی طرح یہ کہانیاں تجسس کا مادہ پیدا کرتیں اور تفریح کے ساتھ تہذیب و تعلیم کے مقاصد بھی پورے کرتیں۔ بچوں کو اچھا انسان بننے کی ترغیب دی جاتی اور بڑے کارنامے کرنے کا اعتماد بخشا جاتا۔۔۔'' ۴۹

رسالہ ''پھول'' بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کرتا۔ اس رسالے میں ایسی کہانیاں لکھی جاتی جن کی زبان ہموار اور سادہ ہو۔ یہ رسالہ ''پھول'' کا اثر تھا کہ قاسمی بچوں کے ادب کی جانب متوجہ ہوئے اور نہایت چابک دستی سے بچوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس سطح پر اُتر آئے ہیں جو ننھے بچوں کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔

۱۔ دوستوں کی کہانیاں:

قاسمی نے پیش نظر مجموعہ کے نام سے ایک کتابچہ لکھا۔ یہ کہانیاں ننھے قاری کی اصلاح کے لیے لکھی گئیں۔ پنجاب بک ایجنسی لاہور نے ۱۹۴۳ء میں قیامِ پاکستان سے قبل اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ یہ کتابچہ اب دست یاب نہیں ہے۔

۲۔ آسمان کے گوشے میں:

''دیال سنگھ لائبریری'' کے شعبہ اطفال کے کیٹلاگ میں اس کتاب کا اندراج ہے لیکن الماریوں میں موجود نہیں۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی کے خیال میں یہ ڈراما صرف ایک بار ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔

۳۔ تین ناٹک:

''دیال سنگھ لائبریری'' لاہور کے شعبہ اطفال کے کیٹلاگ میں اس کتاب کا اندراج ہے۔ کتاب کا نمبر ۸/۲ (۲۹۷ ت ہے۔ تلاشِ بسیار کے باوجود یہ کتاب دست یاب نہ ہو سکی۔ قاسمی کے سوانحی کوائف سے اندازہ

ہوتا ہے کہ یہ بچوں کے لیے لکھا جانے والا ڈراما تھا جسے ۱۹۴۴ء میں پنجاب بک ایجنسی لاہور نے شایع کیا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے راقم الحروف کو بتایا کہ یہ ایک کتابچہ ہے جو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

۴۔نئی نویلی کہانیاں:

قاسمی نے اپنے ننھے دوستوں کے لیے یہ کہانیاں لکھیں۔ یہ کہانیاں بچوں میں ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبات کو اُبھارتی ہیں۔ ان کہانیوں کو پنجاب بک ایجنسی لاہور نے ۱۹۴۴ء میں شایع کیا۔ اب یہ کتاب ناپید ہے۔

۵۔بہترین کہانیاں:

ننھے قارئین کی اصلاح کی خاطر لکھی جانے والی یہ کتاب ایک سو باون صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش نظر کتاب کو فیروز سنز لاہور نے ۱۹۷۲ء میں شایع کیا۔ دیال سنگھ لائبریری کے کیٹلاگ میں پیش نظر کتاب کا نمبر ا،۳(۸ (۲۹۷ب ہے۔ یہ کتاب بھی دیگر کتب کی مانند دستیاب نہ ہوسکی۔ صرف شعبہ اطفال کے کیٹلاگ میں اس کتاب کا نمبر درج ہے۔

۶۔سبز جھنڈا:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ سبز جھنڈا میں حصولِ پاکستان کے لیے سعی حاصل کا تذکرہ؛ قائد سے خصوصی لگاؤ، پاکستان کے جھنڈے سے اظہار محبت ملتا ہے۔ پیش نظر کتاب میں نوشہرہ (ضلع خوشاب کی وادی سون سکیسر کے مرکزی قصبہ) کا تذکرہ ہے۔ اس کہانی کی تخلیق کا مقصد یہی تھا کہ پاکستانیوں کے دلوں میں اپنے وطنِ عزیز کے لیے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ حصولِ پاکستان کے لیے قاسمی نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ یہ کہانی ان کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں تمام بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین نے بھرپور حصہ لیا۔ پیش نظر کہانی کا مرکزی کردار صادق جو تیسری جماعت کا طالب علم تھا وہ بھی نہایت شوق سے تقریریں سنتا اور جلسوں میں شرکت کرتا۔ اس کے والدین اسے جلسے جلوسوں میں شرکت سے منع کرتے لیکن اس کے دل میں نئے وطن پاکستان کے لیے بے پناہ محبت تھی۔ ایک روز تمام اہلِ علاقہ نے تہیہ کیا کہ ہر گھر کی چھت پر سبز جھنڈا لہرایا جائے۔ صادق نے بھی مصمم ارادہ کیا۔ یہ غریب والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے پاس سبز رنگ کا کپڑا دست یاب نہیں تھا۔ چناں چہ اس نے اپنی قمیص کو سبز رنگ میں رنگوا کر جھنڈے کی صورت دی۔ پھر اپنی چھت پر نصب کر دیا۔ یوں ننھے صادق نے اپنی محبت کا ثبوت دیا۔ جب باپ نے سوال کیا تو نہایت

معصومیت سے بولا:

''میں اگر ایسا نہ کرتا تو پتہ ہے کیا ہوتا؟

ہم سے اللہ خفا ہو جاتا۔'' ۵۰

بچوں کی نفسیات کے مطابق رنگا رنگ تصویروں سے کتاب کو آراستہ کیا گیا ہے تا کہ بچے شوق سے کتاب کا مطالعہ کریں۔ عمدہ کتابت پر مشتمل پیش نظر کتاب کے فلیپ پر پبلشر کی رائے درج ہے۔ سولہ صفحات پر مشتمل اس کتابچے کو نقوش اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔

۷۔ جلیبیاں:

''جلیبیاں'' میں قاسمی نے بچوں کی معصومانہ سوچ کی عمدہ طریقہ سے منظر کشی کی ہے۔ یہ کہانی بچوں کو اخلاقی درس سے نوازتی ہوئی تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔ رنگین تصاویر واقعات کی دیدہ زیبی اور دل کشی میں اضافہ کا موجب بنتی ہیں۔ ماہر نفسیات کی طرح قاسمی نے خوب صورت مناظر بھی پیش کیے ہیں۔ دس صفحات پر مشتمل اس کہانی کو بک گروپ کراچی نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا۔

۸۔ اور پریاں روٹھ گئیں:

زیر نظر کہانی میں قاسمی نے مافوق الفطرت عناصر کا تذکرہ دل کش انداز میں کیا ہے۔ مصنف نے اپنے ننھے قاری کو اپنے علاقے خوشاب کی سیر بھی کرائی ہے۔ بالخصوص خوشاب کے ''پتیسے'' کا ذکر دل فریب ہے۔ سولہ صفحات پر مشتمل یہ کہانی ''اخلاقی کہانیاں'' مرتب از رحمٰن ضیا کی کتاب میں شامل ہے جو ۱۹۹۲ء میں فرید پبلشرز کراچی کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوئی۔

قاسمی کی بچوں کے ادب پر تخلیق کی گئی کہانیاں دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کے ذوقِ مطالعہ کو بھی ہوا دیتی ہیں۔ ان کہانیوں کا مطالعہ بچوں کے مثبت جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ ان کہانیوں میں معلوماتی، تفریحی اور دل چسپی کے عناصر بدرجہ اُتم موجود ہیں۔

پنجابی ادب

اردو زبان میں افسانے، شاعری، کالم لکھتے ہوئے پنجابی زبان نے بھی قاسمی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

۱۔ وخوش:

قاسمی کا افسانہ ''وخوش'' عبدالمجید بھٹی کے ترتیب کردہ پنجابی مجموعہ ''دل دیاں یاریاں'' میں شامل ہے۔

یہ ''برگ حنا'' میں شمول افسانہ ''وحشی'' کا پنجابی زبان میں ترجمہ ہے۔ گیارہ صفحات پر مشتمل اس افسانے کو قاسمی نے نہایت سادہ، ٹھیٹھ اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی قیمت دو روپے اور پانچ پیسے درج ہے۔ اس مجموعے کو ہونہار بک ڈپو، راول پنڈی نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

۲۔گلاں خون خمیر دیاں:

یہ کتابچہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں؛ پاکستانی نوجوان افراد کی بہادری، اپنے مورچے سنبھالنے اور جواں مردی سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے پر مشتمل ہے۔ اس میں نظموں کے ذریعے نوجوانوں کے حوصلوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ قاسمی کی کوئی نظم اس میں شامل نہیں جب کہ ادارت میں قاسمی کے ساتھ ا۔د۔اظہر، حامد علی خاں، سید وقار عظیم، عبدالمجید بھٹی، عشرت رحمانی، افضل خاں، محمد طفیل اور ڈاکٹر وحید قریشی شریک تھے۔ رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہونے والے اس مجموعے میں سن درج نہیں۔ نظموں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابچہ ۱۹۷۱ء کے بعد منظرِ عام پر آیا۔

ریڈیائی کھیل — مصور

مصور میں بادشاہ کے ہاتھوں فن کار کی موت کو المیہ انداز سے بیان کیا ہے۔ تجسس کا عنصر سارے ڈرامے پر غالب ہے۔ قاری کی دل چسپی ہر سطر کے بعد بڑھتی جاتی ہے۔ دربار شاہی اور فنِ مصوری کی خوب صورت منظر کشی کی ہے۔ سینتیس صفحات پر مشتمل یہ ریڈیائی کھیل صوبہ ریاض اور طفران کے علاقوں پر مشتمل ہے جہاں بادشاہی نظام اپنے پر پھیلائے ہوئے ہے۔ یہ ریڈیائی کھیل افسانوی مجموعے ''در و دیوار'' میں شامل ہے۔

فلم

فلم نگاری قاسمی کا باقاعدہ میدان نہ تھا۔ فلم کی جانب دوستی اور معاشی مجبوریوں کے تحت متوجہ ہوئے مثلاً منٹو کے ایما پر، قتیل شفائی کے اصرار پر اور رابعہ ندیم (اہلیہ) کی ضد پر یا دو جوان بیٹیوں کے بیاہ کی تیاریاں کی وجہ سے فلمی گیت، کہانیاں اور اسکرپٹ لکھے۔ لہٰذا انھوں نے قتیل شفائی اور بشیر موجد کے مشورے سے معقول آمدنی کے پیش نظر فلمی گیت اور اسکرپٹ لکھے۔ انھوں نے جن فلموں کے لیے کہانیاں، گیت، مکالمے، اسکرپٹ اور منظرنامے لکھے؛ اُن فلموں کے نام، ریلیز ہونے کا سن، زمانی ترتیب کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ بقول پروفیسر سلیم الرحمٰن:

> ''قاسمی نے ''دھرم پتنی'' (۱۹۴۰ء)، ''بن جارہ'' (۱۹۴۱ء) کی کہانی اور مکالمے لکھے لیکن دونوں ہی فلمیں اپنے انتہائی ابتدائی مراحل میں ختم ہوگئیں۔'' ۵۱

قاسمی نے فلم ''آغوش'' کے مکالمے لکھے۔ یہ فلم بھی مقبول نہ ہوسکی۔ یاسین گریجہ نے ''پاکستان فلم ڈائریکٹری'' میں

لکھا ہے:

''فلم ''آغوش'' کے نصف مکالمے لکھے جس میں سنتوش، صبیحہ، گلشن آرا، اسماعیل، علاؤالدین، غلام محمد نے نمایاں کردار ادا کیے۔ یہ فلم ایج میں تیار ہو کر ۲۵/دسمبر ۱۹۵۳ء کو نمائش پذیر ہوئی۔'' ۵۲

قاسمی اگرچہ محولہ بالا معاشی مجبوریوں کے تحت فلم کی جانب متوجہ ہوئے لیکن اس صنف میں باقاعدہ مقام اور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ فلم ''دو راستے'' اور ''لوری'' کے متعلق پروفیسر سلیم الرحمٰن اپنے مضمون ''احمد ندیم قاسمی کا فلمی سفر'' میں رقم طراز ہیں:

''فلم ''دو راستے'' کے مکالمے لکھے۔ یہ فلم ۱۹۶۱ء کو نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ فلم ''لوری'' میں ان کا نام بطور مکالمہ نگار جلوہ افروز ہے۔ ۱۹۶۶ء میں یہ فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ اس فلم میں انھیں بہترین مکالمہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔'' ۵۳

قاسمی نے فلمی نغمات بھی لکھے۔ فلم ''درندہ'' میں قاسمی کے تین فلمی نغمے شامل ہیں۔ بقول پروفیسر سلیم الرحمٰن:

''۱۹۷۰ء میں جاموٹ فلمز کے زیر اہتمام ریلیز ہونے والی فلم ''درندہ'' کے فلم ساز، ہدایت کار اور موسیقار گل حیدر (ایس گل) کو ندیم نے اپنے تین عدد نغمات سے نوازا۔'' ۵۴

قاسمی نے فلم ''ہزار سال'' کے فلمی گیت لکھے لیکن یہ فلم بھی دیگر فلموں کی مانند ریلیز نہ ہو سکی۔ پیش نظر فلم کے ہدایت کار، موسیقار اور اداکاروں کے متعلق سلیم الرحمٰن لکھتے ہیں:

''قاسمی نے فلم ''ہزار سال'' کے گیت لکھے مگر یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی تھی۔ اس کے موسیقار بھی گل حیدر تھے۔ ہدایت کار شوکت ہاشمی اور کاسٹ میں یہ فن کار شامل تھے: نیر سلطانہ، سدھیر، طالش، رخسانہ، دل جیت مرزا، علی بابا ساون، حسن پہاڑی اور علاؤالدین۔'' ۵۵

دیباچہ

قاسمی نے گاہے بگاہے کئی نثری و شعری مجموعوں پر دیباچے لکھے۔ اُن کے دیباچے نوجوان نسل کو نیا عزم اور حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ ان کی مخفی صلاحیتوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ دورِ حاضر کے کئی ادبا و شعرا کا دیباچہ ان کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ نثری و شعری مجموعوں پر جو کتابیں دست یاب ہو سکی ہیں، وہ مصنف کے نام، کتاب کے سالِ اشاعت اور پبلشنگ ادارے کے نام کے ساتھ، زمانی ترتیب سے مندرج ہیں:

دست و داماں	الطاف پرویز	پیسہ اخبار لاہور	۱۹۶۱ء
جھوٹے روپ کے درشن	راجہ انور	آغا امیر حسین لاہور	۱۹۷۴ء

خندہ زیرِ لب	کرم الٰہی فاروقی	شہزاد پبلشرز لاہور	۱۹۷۸ء
موجِ فکر	صمد انصاری	تخلیق مرکز لاہور	۱۹۸۰ء
ریت کے پھول	عظیم مرتضیٰ	التحریر اردو بازار لاہور	۱۹۸۴ء
ہریالی	قتیل شفائی	ماورا پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۴ء
خواب، دریچہ	جلیل عالی	یوسف اختر لاہور	۱۹۸۵ء
مقتل میں چراغ	حسن اختر جلیل	نیرنگ خیال پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۶ء
متاعِ ہنر	خالد عباس اسراری	اساطیر پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۹ء
سرودِ نو	تصدق حسین خالد	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۰ء
چاند پکھراج کا	گلزار	اساطیر پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۲ء
جہاں دریا اُترتا ہے	اختر حسین جعفری	فروا پبلشنگ لاہور	۱۹۹۳ء
روشنی ہماری ہے	سعدیہ روشن صدیقی	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۳ء
لفظ گھر درے	تنویر سپرا	گندھارا راول پنڈی	۱۹۹۳ء
ایک مٹھی ہوا	خالد احمد	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۴ء
تہذیب کے زخم	ثاقبہ رحیم الدین	راول پنڈی	۱۹۹۴ء
وجود اِک واہمہ ہے	محمد افسر ساجد	بیکن بکس ملتان	۱۹۹۵ء
طلوع	منصورہ احمد	اساطیر پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۷ء
منجمد	فرحت پروین	//	۱۹۹۷ء
ابتدا	صابر ظفر	دانیال لاہور	۱۹۹۸ء
کہرام	محمد سلیم طاہر	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۹ء
اعتراف	یاسمین گل	اساطیر پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۰ء
ڈش اینٹینا	سرفراز شاہد	دوست پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۰ء
آئینہ دار	شاہ نواز زیدی	اساطیر پبلشرز لاہور	۲۰۰۱ء

تاخیر	حلیم قریشی	//	۲۰۰۱ء
سیپیوں کی قید میں	یعقوب طاہر	//	۲۰۰۱ء
رات پشمینے کی	گلزار	//	۲۰۰۲ء
آسیب کا جنگل	الفت رسول	//	۲۰۰۳ء
زرِ خاک	عابد ودود	حرف اکادمی راول پنڈی	۲۰۰۳ء
پذیرائی	سید غلام مجتبیٰ، پروفیسر محمد اشرف چوہدری	رضا پبلشرز گجرات	۲۰۰۵ء
کھلی کتاب	جاوید قمر	اساطیر پبلشرز لاہور	سن ندارد
برگِ آوارہ	حبیب جالب	آزاد بک ڈپو امرتسر	//
تیشۂ کرب	مرتضیٰ برلاس	نیرنگ خیال پبلی کیشنز لاہور	//
صداقت کی شاعری	تنویر سپرا		
تسلسل کا شاعر	غلام محمد قاصر		

فلیپ نویسی

قاسمی نے اردو کی متفرق اصنافِ ادب پر فلیپ لکھ کر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔ اُن میں سے چیدہ چیدہ کتابیں مصنف کے نام، کتاب کے سالِ اشاعت اور پبلشنگ ادارے کے نام کے ساتھ زمانی ترتیب سے پیشِ خدمت ہیں:

روحِ عصر	سید علی عباس جلال پوری	کتاب نما راول پنڈی	۱۹۶۹ء
عہد نامہ	انور محمود خالد	قرطاس پبلشرز لاہور	۱۹۷۰ء
برگِ ریز	عرفانہ عزیز	صلاح الدین مسعود لاہور	۱۹۷۱ء
روشنی کا پتھر	قیوم راہی	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۷۵ء
خالد: شخص و شاعر	مرتب حسین سحر	آئینہ ادب لاہور	۱۹۷۶ء
اقبال اور پاکستانی ادب	عزیز احمد	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۷۷ء
گوہر ہونے تک	مسرت انصاری	اساطیر پبلشرز لاہور	۱۹۸۷ء

سب آوازیں میری ہیں	احمد فراز	ماورا پبلشرز لاہور	۱۹۸۷ء
اندازِ زیاں اور	سلیمان عبداللہ	یونیورسل بکس لاہور	۱۹۸۸ء
کان کھلے ہونٹ سلے	حمید اکبر	جنگ پبلشرز لاہور	۱۹۸۸ء
حرف حوالے، سخن اُجالے	مہرین عارف	فنون پریس لاہور	۱۹۹۰ء
گلِ موسمِ خزاں	ایوب خاور	پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ	۱۹۹۱ء
آمد نامہ	ذکا صدیقی	عمران منظور لاہور	۱۹۹۲ء
نخلِ نوا	اشرف جاوید	پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ	۱۹۹۲ء
سفر واجب	اعجاز رضوی	طاہر اسلم گورا	۱۹۹۲ء
زماں اور مکاں دو جزیرے	حسنین بخاری	سعادت پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۳ء
کچی کرن شبنم	محمود علی محمود	طاہر اسلم گورا	۱۹۹۳ء
مراسم	فیصل عجمی	اساطیر پبلشرز لاہور	۱۹۹۳ء
سرسوں کی دھوپ	اسرار ایوب	فیروز سنز لاہور	۱۹۹۴ء
دست خط	گلزار	اساطیر پبلشرز لاہور	۱۹۹۵ء
پھر وصال کیسے ہوا	رخشندہ نوید	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۵ء
زرِ معتبر محمدؐ	ریاض حسین چوہدری	عمیر پبلشرز لاہور	۱۹۹۵ء
خزاں کا چراغ	خاقان خاور	گندھارا بکس راول پنڈی	۱۹۹۶ء
شام	فیصل عجمی	اساطیر پبلشرز لاہور	۱۹۹۶ء
سعد اللہ شاہ فکر و فن کے آئینے میں	محمد آصف شیخ	عمیر پبلشرز لاہور	۱۹۹۷ء
تحیر	شاہین عباس	کتب نما لاہور	۱۹۹۸ء
درد کا سورج	ڈاکٹر محمد خاں اشرف	الوقار پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۸ء
دید آید	اے جی جوش	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۸ء
ذرا جو تم ٹھہر جاتے	آصف شفیع	سعد پبلشرز لاہور	۱۹۹۸ء

ورق	زہرا نگار	اساطیر پبلشرز لاہور	۱۹۹۸ء
یادوں کے اُجالے	قمر یورش	یورش اکیڈمی لاہور	۱۹۹۹ء
کوئی آنکھ دل سے بھری رہی	خالد علیم	صدف پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۹ء
کہرام	محمد سلیم طاہر	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۹ء
انتخاب شرقی	شرقی بن شائق	اساطیر پبلشرز لاہور	۲۰۰۰ء
دو پھول کھلے ماہیا	ثروت محی الدین	دوست پبلشرز اسلام آباد	۲۰۰۰ء
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے	حبیب جالب	جالب پبلشرز لاہور	۲۰۰۰ء
آٹھواں سمندر	قیوم راہی	مکتبہ دانیال لاہور	۲۰۰۱ء
اک دشت کی کہانی	سید ابرار سالک	شرکت پریس لاہور	۲۰۰۱ء
سیپیوں کی قید میں	یعقوب تصور	اساطیر پبلشرز لاہور	۲۰۰۱ء
کشتِ جاں	اختر ضیائی	دارالکتاب لاہور	۲۰۰۱ء
ندیم تنہائی	انور ندیم علوی	آرٹ پریس لاہور	۲۰۰۱ء
ذرا سی بات	تسنیم منٹو	الفیرز پبلشرز لاہور	۲۰۰۲ء
جمیل ملک فن و شخصیت	ڈاکٹر اعجاز راہی	نوید پبلشرز اسلام آباد	۲۰۰۲ء
ریخت	طاہرہ اقبال	دوست پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۳ء
کڑی دھوپ کا سفر	عابد ودود	حرف اکادمی راول پنڈی	۲۰۰۳ء
سید امتیاز علی تاج زندگی اور فن	ڈاکٹر محمد سلیم ملک	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۲۰۰۳ء
صحرا ہماری آنکھ میں	لقا بلوچ	ادارہ فروغ تھیٹر ادبیات بلوچستان	۲۰۰۳ء
پہلی دستک	یعقوب نظر	اساطیر پبلشرز لاہور	۲۰۰۴ء
مرگ زار	محمد حمید شاہد	اکادمی بازیافت کراچی	۲۰۰۴ء
نیند کی نوٹ بک	منصور آفاق	اساطیر پبلشرز لاہور	۲۰۰۴ء
تجھے کیا معلوم	رفیق خیال	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۵ء
دھوپ اپنے حصے کی	عشرت آفریں	لاہور	۲۰۰۵ء
خوش بو کا سفر	طاہر مجید	اساطیر پبلشرز لاہور	۲۰۰۶ء

گل پونجی	بشیر منذر	اساطیر پبلشرز لاہور	۲۰۰۶ء
ورق	زہرا نگار	بزم فقیر پاکستان لاہور	۲۰۰۶ء
ڈاکٹر کیول دھیر ادبی سفر کے پچاس برس	مخمور سعیدی، پروفیسر محمد زمان	ایجوکیشنل پبلشنگ دہلی	۲۰۰۷ء
اندازِ بیاں اور	سلیمان عبداللہ		
بلد اشہر	رؤف شیخ		
رنگ پچکاری	ابدال بیلا		
روشنی کا پتھر	قیوم راہی		
زخم گلاب ہوئے	لطیف ساحل		
متاعِ ہنر	خالد عباس		
یادوں کا پیرہن	کرامت بخاری		

مضمون نگاری

قاسمی نے اردو ادب کی متفرق اصناف اور شخصیات پر وقتاً فوقتاً مضامین لکھے۔ یہ مضامین مصنف کے فکر وفن سے کماحقہ آگاہی کے ساتھ ساتھ؛ تنقید میں ان کا مقام و مرتبہ کے تعین میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ چیدہ چیدہ مضامین کتاب و رسائل کے نام، سالِ اشاعت کے ساتھ زمانی ترتیب سے درج کیے ہیں:

طفیل صاحب (چند تاثرات)	محمد نقوش	کاروان ادب لاہور	۱۹۸۳ء
خدیجہ کی زمین	فنون خدیجہ مستور نمبر	شمارہ ۲۰	۱۹۸۴ء
فیض کی شاعری کا طلسم	فنون	شمارہ ۲۲	۱۹۸۵ء
محمد طفیل کی یاد میں	فنون	شمارہ ۲۵	۱۹۸۶ء
فیض کا فن، فیض کی تخلیقی شخصیت	ڈاکٹر طاہر تونسوی (مرتبہ)	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۹ء
صاحب اسلوب غزل گو قتیل	ادب لطیف	شمارہ نمبر ۵، جلد ۵۶	۱۹۹۰ء
زندگی خوبصورت ہے	قومی زبان	شمارہ نمبر ۱، جلد ۶۳	۱۹۹۱ء
اختر حسین جعفری	قومی زبان	شمارہ ۹، جلد ۶۳	۱۹۹۲ء
ادیب اور آزادیِ اظہار	پاکستانی ادب ۱۹۹۳ء	اکادمی ادبیات اظہار سنز لاہور	۱۹۹۴ء

خود کلامی کی پروین	״	مرتبین ڈاکٹر سلیم اختر، رشید امجد	״
محمد عبداللہ قریشی	عالمی اردو ادب	جلد نمبر ۱۲	۱۹۹۵ء
پروین۔۔۔تمنا کی استقامت	فنون	شمارہ ۲۶	۱۹۹۶ء
صمد انصاری کی غزل	״	شمارہ ۴۶	۱۹۹۶ء
ظہیر کاشمیری ایک قدآور شاعر	״	شمارہ ۲۶	۱۹۹۶ء
محسن نقوی	״	شمارہ ۴۶	۱۹۹۶ء
عدیم کی مکالماتی غزلیں	״	شمارہ ۴۹	۱۹۹۷ء
جو رہی سو بے خبری رہی	ادا جعفری شخصیت وفن مرتبہ فرمان فتح پوری، امراؤ طارق	حلقہ نیاز و نگار کراچی	۱۹۹۸ء
ظہیر بابر کی یاد میں	فنون	شمارہ نمبر ۱۰۷، ۱۰۸	۱۹۹۸ء
افتخار عارف کا مجموعہ کلام حرف باریاب	جواز افتخار، مرتبہ شیما مجید	افتخار احمد	۲۰۰۰ء
خانوادہ شیرانی سے وابستہ یادیں	ماہنامہ قومی زبان کراچی	شمارہ ۱، جلد ۷۳	۲۰۰۱ء
نعت نگار حفیظ تائب کی غزل	نسیب	القمر انٹر پرائزز لاہور	۲۰۰۳ء
پاکستانی تہذیب کی صورت پذیری	کلچر، اشتیاق احمد (مرتبہ)	بیت الحکمت لاہور	۲۰۰۷ء
چند لمحے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ساتھ	گوپی چند نارنگ	جلد نمبر ۳۶	۲۰۰۸ء
منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط	نقوش منٹو نمبر	ادارہ فروغ اردو لاہور	
بشیر موجد	ماہِ نو		
ڈاکٹر اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات	اقبال نامہ مرتبہ چراغ حسن حسرت	تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی	
کرامت کی غزل	یادوں کا پیرہن		
ایک روداد، رفاقت ومحبت	نقوش محمد طفیل نمبر		
حفیظ کی غزل	فنون۔ شمارہ نمبر ۱۹		

تبصرے

قاسمی نے نوادر کتب پر اظہارِ خیال بھی کیا۔ ان کے تبصرے وقتاً فوقتاً فنون میں شائع ہوتے رہے۔

ان کے تبصرے اشاعتی ترتیب کے ساتھ یہاں درج کیے جاتے ہیں:

قتیل شفائی نمبر		فنون۔ شمارہ ۱۹	۱۹۸۳ء
خود کلامی	پروین شاکر	فنون۔ شمارہ ۲۲	۱۹۸۵ء
خالی آسماں	شہزاد احمد	فنون۔ شمارہ ۳۵	۱۹۸۶ء
زرد آسماں	انیس ناگی	فنون۔ شمارہ ۳۵	۱۹۸۶ء
شوخیِ تحریر	سید محمد جعفری	فنون۔ شمارہ ۳۵	//
غزل نما	ادا جعفری	فنون۔ شمارہ ۳۷	//
شعلہ مستعجل	اکرم رانا (مرتبہ)	فنون۔ شمارہ ۳۰	۱۹۸۸ء
ہیرا پھیری	سرفراز شاہد	فنون۔ شمارہ ۴۸	۱۹۹۰ء
آدمی غنیمت ہے	سید انیس شاہ جیلانی	فنون۔ شمارہ ۴۶	۱۹۹۴ء
نیرنگ اُندلس	منظور الٰہی	فنون۔ شمارہ ۴۶	۱۹۹۶ء
اچھے دنوں کی یاد میں	روحی کنجاہی	فنون۔ شمارہ ۵۰	//
شام	فیصل عجمی	فنون۔ شمارہ ۴۹	۱۹۹۷ء
دراز پلکوں کے سائے سائے	خالد احمد	فنون۔ شمارہ ۵۰	۱۹۹۷ء
ہم اپنی ذات کے کافر	سید مبارک شاہ	فنون۔ شمارہ ۵۰	//
سیک سنہرے	ثروت محی الدین	فنون۔ شمارہ ۱۰۸	۱۹۹۸ء
عکس فریادی	نصیر ترابی	فنون۔ شمارہ ۱۱۳	۲۰۰۰ء
ہوا کچھ اور کہتی ہے	زمان کنجاہی	فنون۔ شمارہ ۱۱۳	//
جنوں میں جتنی بھی گزری	حسن عابدی	فنون۔ شمارہ ۱۲۵	۲۰۰۵ء
راستا اور میں	مخمور سعیدی	فنون۔	
آسمان اور آنسو	فلک پیما	فنون۔	
اک دریچہ اک چراغ	انور مسعود	فنون۔	
اچھے دنوں کی یاد	روحی کنجاہی		

اجنبی اپنے دیس میں	سید شوکت علی شاہ
پاکستانی پنجابی شاعری	شریف کنجاہی
پیرس ۲۰۵ کلومیٹر	محمد اختر ممونکا
پیاس بھرا مشکیزہ	قمر رضا شہزاد
جنگل رات	خاقان خاور
درِ امکان	مقصود وفا
زمین پر ایک دن	افتخار بخاری
سعادت حسن منٹو	انیس ناگی
کھڑکی بھرا آسمان	اسد محمد خاں
قوس	مسعود عثمانی
گردشِ کوزہ	محشر بدایونی
ماڈرن اردو سٹوریز فرام پاکستان	انیس ناگی (مترجم)

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۱۱

۲۔ عبدالمجید سالک (دیباچہ)، مشمولہ چوپال از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۱، ص۱۷

۳۔ سید امتیاز علی تاج (دیباچہ)، مشمولہ چوپال از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۱، ص۱۸

۴۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا۱، ص۱۱

۵۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۷

۶۔ کرشن چندر (دیباچہ)، مشمولہ بگولے از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۵

۷۔ احتشام حسین (فلیپ)، مشمولہ بگولے از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۵

۸۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع و غروب، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۷

۹۔ ایضاً، ص۱۰

۱۰۔ عابد علی عابد (فلیپ)، مشمولہ طلوع و غروب از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۸

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی (دیباچہ)، سیلاب و گرداب، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۶۱ء، ص۹،۱۰

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، آنچل، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی (دیباچہ)، آنچل، محولہ بالا۱۲، ص

۱۴۔ گوپی چند نارنگ (فلیپ)، مشمولہ آنچل از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۱۲

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص

۱۶۔ محمد احسن فاروقی (فلیپ)، مشمولہ آبلے از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۱۵

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص

۱۸۔ اختر حسین رائے پوری (فلیپ)، مشمولہ آس پاس از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۱۷

۱۹۔ سجاد شیخ، احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، شمارہ ۱،۲، ۲۰۰۷ء، ص۱۱۸

۲۰۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۲۱۔ سید وقار عظیم (دیباچہ)، مشمولہ سناٹا از احمد ندیم قاسمی، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۲۲۔ سجاد شیخ، احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے، مشمولہ سہ ماہی موتاج، لاہور، محولہ بالا۱۹، ص ۱۳۱

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۲۵۔ اسلوب احمد انصاری (فلیپ)، مشمولہ بازارِ حیات از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۲۴

۲۶۔ اختر اورینوی (فلیپ)، برگِ حنا از احمد ندیم قاسمی، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۲۸۔ مجتبیٰ حسین (فلیپ)، گھر سے گھر تک از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۲۷

۲۹۔ شاہد احمد دہلوی (فلیپ)، مشمولہ کپاس کا پھول از احمد ندیم قاسمی، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۳۱۔ سید ضمیر جعفری (فلیپ)، مشمولہ نیلا پتھر از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۳۰

۳۲۔ احمد ندیم قاسمی، کوہ پیما، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۳۳۔ ڈاکٹر قمر رئیس (فلیپ)، مشمولہ کوہ پیما از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۳۲

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ کیسر کیاری، لاہور، شفیق پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی (دیباچہ)، تعلیم اور ادب و فن کے رشتے، لاہور، ادارہ التحریر، ۱۹۷۴ء

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ احمد ندیم قاسمی (تمہید)، تہذیب و فن، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، ۱۹۷۵ء

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ خالد احمد، جدید تر پاکستانی ادب، لاہور، بیاض، ۱۹۹۸ء، ص ۵۵

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۵

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱

۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۳

۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۵

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۴۵۔ احمد ندیم قاسمی (مرتبہ)، منٹو کے خطوط ندیم کے نام، لاہور، اسلم گورا، ۱۹۹۱ء

۴۶۔ ایک ریوڑ، ایک انبوہ مشمولہ پت جھڑ، احمد ندیم قاسمی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۴۷۔ احمد ندیم قاسمی (دیباچہ)، پاکستان کی لوک کہانیاں، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۸ء

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ ڈاکٹر محمد سلیم ملک، سید امتیاز علی تاج زندگی اور فن، لاہور، اردو اکیڈمی پاکستان، ص ۳۴۲

۵۰۔ احمد ندیم قاسمی، سبز جھنڈا، لاہور، نقوش پریس، س ن، ص ۱۵

۵۱۔ پروفیسر سلیم الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی کا فلمی سفر، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا ۱۹

۵۲۔ یاسین گریجہ (مرتبہ)، پاکستان فلم ڈائریکٹری، لاہور، ۱۰۔آصف بلڈنگ، لکشمی چوک، ۱۹۷۸ء، ص ۱۳۲

۵۳۔ پروفیسر سلیم الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی کا فلمی سفر، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا ۱۹، ص ۲۰۳

۵۴۔ ایضاً، ص ۲۰۴

۵۵۔ ایضاً

باب سوم

افسانہ نگاری

احمد ندیم قاسمی متنوع حیثیتوں کے مالک تھے۔ ان کے اظہارِ فن کے وسیلے مظلوم اور دُکھی انسانوں کی آواز ہے۔ قاسمی ان کی ہمت بندھاتے، ان کی آنکھوں کے آنسو پونچھتے اور ان کے زخمی دل کو مرہم فراہم کرتے ہیں۔ یہ سارا عمل قاسمی کے افسانوں میں اتنے خلوص، سلیقے اور محبت سے رونما ہوتا ہے کہ قاری کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔ ان کے افسانے متنوع موضوعات کے حامل ہیں۔ وہ اپنے اندر زندگی کا حسن بھی رکھتے ہیں اور انسانی زندگی میں موجود برائیوں کو بھی آشکار کرتے ہیں۔ انھوں نے دورِ حاضر کے انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سماجی، نفسیاتی، اقتصادی اور ترقی پسند نظریات کی روشنی میں پیش کیا۔ قاسمی کی کہانیاں قاری کو فرحت بخش طمانیت بخشتی ہیں۔ یہ مصنف کی انگلی تھامے، اپنے معاشرے کے ان دیکھے افراد سے ملواتی ہیں۔ افسانوں میں قاری کی دل چسپی اوّل تا آخر قائم رہتی ہے۔ قاری ایک ہی نشست میں افسانہ ختم کر لیتا ہے۔ یہ ان کے پُرتاثیر اسلوب کی مرہونِ منت ہے۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری، قاسمی گنے چنے موضوعات پر قناعت کرنے والے ادیب نہیں۔ انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری کو ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ محسوس نہیں کیا۔ لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔میری شاعری کو افسانہ نگاری اور افسانہ نگاری کو شاعری نے نکھارا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ میں صرف شاعر اور افسانہ نگار ہی کیوں ہوں۔ ساتھ ہی مصور اور مغنی اور مجسمہ ساز کیوں نہیں ہوں۔ میرے اندر تو تخلیقِ فن کا لاوا اُبل رہا ہے۔''[۱]

تہذیب کسی قوم یا معاشرے کا عکس ہوتی ہے۔ اس میں مذہب، عقائد، علوم، اخلاقیات، معاملات، معاشرت، فنون نیز رسم و رواج وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ قاسمی نے اپنے افسانوں میں شمال مغربی پنجاب کے دامن میں پھیلی، دیہی معاشرت کو موضوع بنایا۔ کیوں کہ بنیادی طور پر قاسمی بھی پنجابی اور دیہاتی تھے۔ ان کا اولین مشاہدہ دیہات سے ہی متعلق تھا۔ دیہاتی طرزِ معاشرت پر لکھنے کا محرک اوّل یہی سوچ تھی کہ ''دیہات میں رہنے والوں کا ہم پر بڑا حق ہے۔ ہمارے یہاں ۸۰ فیصد آبادی شہروں سے دُور دیہات میں بستی ہے اور پھر ہماری اقتصادیات میں وہ ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے کیوں کہ ہمارا معاشرہ زرعی ہے اور اگر زراعت پیشہ آبادی کو نظر انداز کر کے ہم علامتی یا تجریدی افسانے لکھنے لگیں اور سیڑھیاں لگا کر اپنے باطن میں اُتر جائیں تو یہ اچھی بات نہیں۔ اس سے افسانہ نگار کی تسکین تو شاید ہو جائے لیکن پڑھنے والے کو کچھ نہیں ملے گا۔''[۲]

ان کے افسانوی کردار غریب، سادہ لوح، خوش اخلاق، ملنسار، مہمان نواز اور معصوم ہیں۔ ''ننھا مانجھی'' جذباتیت اور خلوص و چاہت سے بھرپور افسانہ ہے۔ زیرِ نظر افسانے میں معصوم بچے کے کرب اور محرومی کو بیان کیا گیا ہے۔ مانجھی، بابو کو اپنے گھر مدعو کرتا ہے جب بابو رضامند ہو جاتا ہے تو مانجھی خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتا۔

افسانہ ''ہرجائی'' کی ایک اجنبی خاتون، نوجوان سے اس طرح مخاطب ہوتی ہے کہ اس کے لفظ لفظ سے سادہ محبت اور مہمان نوازی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''روزانہ چھاچھ پی جایا کرو بیٹا۔ تیرا اپنا گھر ہے۔'' [۳]

''طلوع و غروب'' میں شہری بابو دیہاتی سنبل کے ہاں چند روز قیام کرنے کی فرمائش کرتا ہے تو سنبل کے لفظ، لفظ سے اس کی معصوم اور سادہ محبت نمایاں ہے۔ وہ جواب دیتا ہے:

''آپ میری آنکھوں میں رہیے۔ میرا گھر آپ کا گھر ہے۔ آپ شوق سے تشریف لائیے۔'' [۴]

''غرور نفس'' کا مرکزی کردار ''بابا نور'' اور ''وہ جا چکی تھی'' کی ادھیڑ عمر خاتون کی گفتگو بے لوث محبت اور مہمان نوازی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے دیہاتیوں کی خوراک نہایت سادہ دکھائی ہے۔ ''بوڑھا سپاہی'' میں بوڑھا شخص جب بابو جی کو اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کرتا ہے تو کھانا روٹی اور بڑے پیاز پر مشتمل ہوتا ہے۔ دیہاتیوں کا لباس تہہ بند، کرتہ اور پگڑی پر مشتمل ہوتا ہے۔ لباس میں پگڑی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ پگڑی دیہی ثقافت کا نشان، عظمت و جلال کی پہچان، قابل فخر اور بزرگی کا نشان سمجھی جاتی ہے۔ دیہاتی لباس کی عکاسی افسانہ ''تبرّ'' میں کچھ اس انداز سے ہوتی ہے:

''دھاری دار بوسکی کُرتے میں سیپ کے بٹنوں کی بجائے چاندی کی زنجیر لٹکا رکھی تھی۔'' [۵]

''لارنس آف تھیلیبیا'' میں رنگی کا سراپا دیہاتی عورت کے حسن اور لباس کی نمائندگی کرتا ہے:

''سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے، وہ اس کے تہہ بند، کُرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔'' [۶]

قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں پنجاب کا دیہاتی ماحول غالب ہے۔ کسان، چوپال، فطری مناظر، پہاڑ، ندیاں، پودے، دریا، پگڈنڈیاں، کھیت کھلیان، سادہ لوح دیہاتی افراد، ان کے غم، محبت، بہادری، خودداری، خلوص، ایثار، مذہبیت، توہم پرستی، خوشیاں، محرومیاں، رسم و رواج، رومان اور مسائل غرض یہ تمام عناصر قاسمی نے شعوری کوشش سے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو دیہات کے ایسے چپے سے وابستہ کیا جس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ابتدائی دور کے افسانوں میں جذبات نگاری بھی ایک وصف بن گئی ہے۔ پریم چند کے فن سے متاثر ہونے والے قاسمی نے سدرشن، اعظم کریوی، بلونت سنگھ، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر کی طرح پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ایک عرصہ شہر میں گزارنے کے باوجود ذہنی لحاظ سے قاسمی گاؤں میں موجود رہے۔ پنجاب کے دیہاتوں کا رومان اور مانوس فضا ایک خوب صورت تاثر پیدا کرتی ہے۔ اس لیے ''خوش رہو''، ''شعلہ نم خوردہ''، ''جب بادل اُمڈے''، ''پیپل والا تالاب'' میں اس کا نقشہ ملتا ہے۔ قاسمی اپنے قاری کو ان پہاڑی صحت افزا مقامات کی

سیر کراتے ہیں اور دل فریب مناظر بھی پیش کرتے ہیں۔ جب کہ ''رئیس خانہ'' میں انگہ کے مناظر قدرت کو جان دار انداز سے قلم بند کیا ہے۔ وادی سون سکیسر سے قاسمی کا لگاؤ اس اقتباس سے عیاں ہوتا ہے جس کے لفظ لفظ سے صداقت ظاہر ہو رہی ہے:

''یہ رئیس خانہ کوہستانِ نمک کی سب سے اونچی چوٹی سکیسر پر تھا۔ سردیوں میں یہ پہاڑ بادلوں اور دھندلکوں میں لپٹا پڑا رہتا، دُور سے یوں نظر آتا ہے جیسے کوئی بڈھا مہینوں سے نہایا نہیں۔ یہاں کی چوٹیوں اور نشیبوں میں بکھرے ہوئے بنگلوں کی چمنیوں پر الو بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑتیں۔۔۔ جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دُور دُور تک لہلہا اُٹھتے تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی۔'' ؎

انھوں نے پنجاب کے حسین مناظر کو عمدگی سے صفحہ قرطاس پر اُتارا ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں دیہات کے دل فریب مناظر اور حسن کبھی منظر اور کبھی پس منظر کا کام کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہاتی افراد بے تکلفی سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں اُپلے تھوپنے والی، کہیں درانتی اُٹھائے چارا کاٹنے والی حسینائیں ہیں اور کہیں بھیڑ بکریاں چرانے والے نوجوان۔ جب قاسمی وادی سون سکیسر کی منظر کشی کرتے ہیں تو لفظ لفظ سے ادیب و شاعر کا احساس ٹپکتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں معاشرے کے تاریک اور کریہہ پہلوؤں، بے رحم حقیقت نگاری، معاشرے سے بغاوت اور زندگی کے طبقاتی تضاد کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''طلوع و غروب'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔میں نے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے آہوں کے دھوئیں اُٹھتے دیکھے ہیں۔ میں نے موت کی چڑیلوں کو تیرہ نصیب مریضوں کے سرہانے دانت کچکچاتے اور انگلیاں چٹخاتے دیکھا ہے۔ میں نے زندگی کی نعش کو گلتے سڑتے دیکھا ہے۔ میں نے۔۔۔ گرد آلود پلکوں میں اٹکے ہوئے دھندلے آنسوؤں کو۔۔۔ غریبوں کی اس روتی اور بلکتی ہوئی اولاد کو نہایت قریب سے دیکھا ہے جس کی دھجیوں سے بدبو آتی ہے۔'' ۸

پریم چند اردو افسانے کی روایت میں ایک اہم نام ہے۔ قاسمی نے بھی دیگر افسانہ نگاروں کی مانند ان کی تقلید کی لیکن انفرادیت بھی پیدا کی۔ اگرچہ دیہات نگاری میں دونوں کا نام اہم ہے لیکن قاسمی انفرادیت کے حامل ہیں:

''دیہاتی زندگی کے مسائل کو پریم چند نے پیش کیا۔ قاسمی نے اس روایت کو آگے بڑھایا لیکن اپنے اندازِ فکر اور فن کارانہ شعور میں انفرادیت پیدا کی۔ کیوں کہ ندیم کوئی حقیقت نگاری نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں رومان اور حقیقت کا امتزاج ہے۔ یوں ندیم پریم چند کی روایت سے منسلک بھی ہیں اور منفرد بھی۔'' ۹

قاسمی منشی پریم چند کے فن سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے گاؤں کی لائبریری سے ''پریم بتیسی'' اور ''پریم چالیسی'' پڑھی۔ ان کہانیوں نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ پنجاب کے دیہاتی افراد کی زندگیوں کی بھرپور ترجمانی کرنا ان کا مقصد حیات تھا۔ انھوں نے دیہاتی افراد کی محبت، بصیرت، مشاغل، توہم پرستی، رسم و رواج، کھیل، قتل و غارت، انتقام اور سماجی و تہذیبی انتشار غرض ہر پہلو کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ شہاب صفدر نے اپنے مضمون ''کوئی میر ہو کہ ندیم ہو'' میں بڑے منفرد انداز میں قاسمی کے افسانوی مجموعوں کے عنوانات کو پیش کیا ہے:

> ''پریم چند کے بعد ندیم کا افسانہ حقیقت نگاری اور دیہی پس منظر کے باعث بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ ان کے افسانوں میں گھر سے گھر تک کا ماحول بھی ہے اور گردوپیش کے سنگین حقائق بھی۔ دور دور تک کہیں کپاس کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور کہیں نیلے پتھر اپنے رنگ بکھیرے ہوئے ہیں۔'' ۱۰

پریم چند کی تقلید قاسمی نے کی۔ انھوں نے پنجاب کے دیہاتوں کے پرکشش مناظر میں صداقت کا حسن بھی پیدا کیا اور انھیں ابدی زندگی عطا کی۔ وقار عظیم کے خیال میں:

> ''پریم چند کے سینکڑوں افسانے پڑھنے کے بعد بھی احمد ندیم قاسمی کا ہر افسانہ ہمارے لیے ایک نئی زندگی اور نئے ماحول کا پیامی ہے۔'' ۱۱

ڈاکٹر انور سدید، پریم چند اور قاسمی کے افسانوں کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کے دیہات میں سادگی ہے۔ ندیم کے دیہات میں تخیلی مبالغے کا پرتو ہے۔ پریم چند کے کردار باتیں کرتے ہیں۔ ندیم کے کردار تقریریں کرتے ہیں۔ پریم چند کے فعال کردار محنت کش ہیں اور تقدیر کو بدلنے کے لیے قوت استعمال کرتے ہیں۔ ندیم کے کردار سستے طریقوں سے دولت حاصل کرنے کے طریقے سوچتے ہیں اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی قوت عمل میں کم لاتے ہیں۔ پریم چند کے کردار قاری کے داخل کو ہلا ڈالتے ہیں اور اسے اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔ ندیم کے کردار روتے ہیں، بلبلاتے ہیں اور رحم کے جذبوں کو خارجی وسیلوں سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند کے ہاں کفایت لفظی ہے، ندیم کے ہاں طوالت اور پھیلاؤ۔ مجموعی طور پر پریم چند کے افسانے شدتِ تاثر پیدا کرتے ہیں اور اس کی سادگی میں بھی پرکاری نظر آتی ہے مگر ندیم کے افسانے رقت پیدا کرتے ہیں اور اس کی آرائش میں بھی تصنع نظر آتا ہے۔'' ۱۲

ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کے معروف نقاد ہیں۔ ان کی رائے اپنی جگہ اہم ہے لیکن قاسمی کے افسانوں میں ایسے کردار بھی مل جاتے ہیں جن کے مکالمے حقیقت نگاری کے اصولوں پر پورے اُترتے ہیں۔ افسانہ ''چوپال'' کا کردار ''رحمان'' اپنے مکالموں میں تمام خصوصیات رکھتا ہے جو روزمرہ زندگی کے مطابق ہیں۔ اسی طرح ان کے افسانوں میں ایسے کرداروں کی بھی کمی نہیں جو متحرک اور فعال ہیں جو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار

لاتے ہوئے زندگی کی جنگ سے نبرد آزما ہے۔ جب کہ پریم چند کے کردار ''میدانِ عمل''، ''بازارِ حسن'' اور ''گئودان'' جیسے ناولوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ جب کہ قاسمی کے افسانوی کردار کچھ حد تک خود کلامیہ تقریریں کرتے ہیں۔ پریم چند بعض کہانیوں میں معلم دکھائی دیتے ہیں۔ یہ فنی سطح پر خامی ہے جب کہ قاسمی کے افسانوں میں اخلاقی سبق کہانی کی زیریں سطح پر موجود ہوتا ہے اور افسانے کے اختتام پر قاری کے ذوق جمال کو تسکین ملتی ہے۔ ''سناٹا''، ''گنڈاسا''، ''کپاس کا پھول''، ''رئیس خانہ'' اور ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' وغیرہ طویل افسانے ہوتے ہوئے بھی موضوع اور بیان کے لحاظ سے اپنی جگہ بناتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے سادگی کے پیرائے میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں جب کہ قاسمی کے ہاں شعری وسائل کا استعمال ملتا ہے۔ پریم چند کے کرداروں میں انقلاب محض ذہنی ہیولیٰ ہے جب کہ قاسمی کے کرداروں میں اس انقلاب کی تڑپ موجود ہے۔ پریم چند کے ہاں مقامی زبان ہے جب کہ قاسمی کا فن اردو زبان میں ڈھلکتا ہے۔ پریم چند کے افسانے یو۔پی (اُتر پردیش) کے علاقوں کو بیان کرتے ہیں۔ جب کہ قاسمی کے افسانے پنجاب کے دیہی ماحول کو بیان کرتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے مختصر ہیں کیوں کہ ان کے پاس ناول کا میدان موجود تھا جب کہ قاسمی نے افسانے سے ہی ناول کا کام لیا ہے۔ اس کی ایک مثال ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ قاسمی نے دیہاتی معاشرت کی پیش کش میں پریم چند سے اثر قبول کرنے کے باوجود نیا راستہ اختیار کیا۔ قاسمی لکھتے ہیں:

> ''میرے لیے یہی اطمینان کافی ہے کہ میں نے ان بے زبانوں کی نمائندگی کی ہے جن کی زندگیاں محبوس ہیں اور جن کے لبوں پر رواج اور قانون نے مہر لگا رکھی ہے۔'' [۱۳]

قاسمی نے خود پریم چند کی کہانیوں سے متاثر ہونے کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی کے اشعار سے متاثر ہو کر افسانے لکھنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> ''یہی وجہ ہے کہ ندیم ایک عرصے تک رومانی افسانے لکھتے رہے۔ حقیقی زندگی سے جیتے جاگتے کردار بھی ان کی مثالیت، جذباتیت اور شعریت کی دُھند میں پھنس کے رہ جاتے ہی نہیں بلکہ ان کے ابتدائی افسانوں کا انجام موت کو خوب صورت پناہ گاہ ثابت کرتا نظر آتا ہے۔'' [۱۴]

قاسمی کے افسانے دیہاتی زندگی کے ہر پہلو کو بے نقاب کرتے ہوئے اس کی بے لوث اور صداقت پر مبنی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف دیہاتی افراد کے اقتصادی، جذباتی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی عمدگی سے کی ہے بلکہ ان کے خوشی و غم کی عکاسی بھی دل پذیر انداز میں کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے نزدیک ''الحمد للہ'' کا مولوی اُبل نہ صرف یہ کہ ہمارے کسی بھی پس ماندہ گاؤں کی مسجد کا مولوی ہو سکتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یورپ کی کسی بھی Poor Parish کا غریب پادری بھی ہو سکتا ہے۔'' [۱۵] انھوں نے دیہاتی افراد کی سادہ لوحی اور دیہی ماحول کو اپنی

توجہ کا مرکز بنایا۔

قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کے تہذیبی و ثقافتی نظام کے پہلو کی ترجمانی ملتی ہے جہاں رسوم و رواج، طرزِ بود و باش، لباس، خوراک، ذریعہ ہائے روزگار، قدرتی مظاہر ہیں، وہیں عقائد، طرزِ فکر، توہمات، ترجیحات، محسوسات وغیرہ کی صورت میں اس تہذیب کے داخلی عناصر سے بھی آگاہ کراتے ہیں۔ پنجاب کی مقامی ثقافت اور طرزِ فکر کی عکاسی عمدگی سے کرتے ہیں۔ مہر افشاں فاروقی اپنی کتاب "The Oxford India Anthology of Modern Urdu Literature" میں قاسمی کے ابتدائی افسانوں کے متعلق اظہارِ خیال کرتی ہیں:

> "The early stories are emotional and tend to be repetitive depictions of life in rural settings. His nature work shows more restraint and polish." ۱۶

قاسمی کے افسانوں میں زندگی کی بنیادی صداقتوں کو اس طرح موضوع بنایا جاتا ہے کہ ان کی فنی لطافت برقرار رہتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں مشرقی تہذیب و تمدن کو خوب صورتی سے اُجاگر کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں مخصوص عہد اور ماحول کی خوش بو رچی بسی ہے۔ بالخصوص دیہاتی زندگی کے عمیق مشاہدے کو فنی تجربے سے ایک مصور کی طرح پیش کیا۔ قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کی عکاسی بارات کے منظر سے بھی احسن طریقے سے ہوتی ہے۔ خارجی پہلو کے حوالے سے قاسمی نے افسانہ ''چوری'' میں بارات کی آمد کی تصویر کشی کی ہے:

> ''دور سے اسے بے شمار مشعلیں نظر آئیں جن میں بار بار کالے کالے ہاتھ کالی کالی صراحیوں میں تیل ڈالتے، آگے آگے علاقے کے مشہور میراثی تھے۔ دو ڈھول جن سے ریشم اور موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ دو شہنائیاں جن کے بندوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ ایک بین باجا جس کی بے شمار توتیوں سے لٹکتے ہوئے سنہری پھندنے جھم جھم کر رہے تھے۔ میراثیوں کے پیچھے سوار تھے جن کے شملے موروں کی دموں سے بھی کچھ زیادہ پھیلے ہوئے تھے اور جن کی مونچھیں آسمان کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔۔۔ ان کے پیچھے چار اونٹ تھے جن کے ہاتھوں پر، گھٹنوں پر، گردنوں میں، سینوں پر، موٹے موٹے گھنگھروؤں کی مالائیں بندھی ہوئی اور جن پر لدے ہوئے کجاووں میں کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں جو اپنے آپ سے شرماتی اور لاج سے سکڑی جاتی تھیں۔'' ۱۷

قاسمی پنجاب میں موجود مشترک تہذیبی روح سے آگاہ تھے۔ غربت، بھوک، بیماری، توہم پرستی، بے روزگاری، ناخواندگی، طبقاتی کش مکش، نچلے طبقوں کا استحصال، باوسائل افراد کا جابرانہ رویہ۔ یہ تمام مسائل پنجاب کے بھی دیہاتی باشندوں کے ہیں۔ قاسمی نے انہی مسائل کی خوب صورت منظر کشی کی ہے۔ مفلس آدمی، امیروں کی عیاری کا شکار ہے چاہے وہ ''رئیس خانہ'' کا فضلو ہو، ''بے گناہ'' کا رحمان ہو یا ''سونے کا ہار'' کا احمد علی۔ عورت ہر

جگہ معاشرتی استحصال کا شکار ہے وہ ''بدنام'' کی نوراں ہو، ''ایک عورت تین کہانیاں'' کی نور خاتون ہو یا ''کھیل'' کی رانی ہو، سب الم ناک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ رشتوں اور شادی کے مسائل کے علاوہ وٹہ سٹہ کی شادی، انسانی رشتوں کی شعوری بے حرمتی کا شکار بھی مفلس انسان ہے چاہے وہ ''نصیب'' کا اکبر ہو، ''چرواہا'' کا دارا'' ہو یا ''بیٹے بیٹیاں'' کا ہادی کمہار ہو۔ صاحب اقتدار افراد معاشرے میں غربا کی دل آزاری کا باعث بنتے ہیں۔ انھوں نے دیہی افراد کی مظلومی کو دل کش و سادہ اسلوب میں پیش کیا۔ انھوں نے مفلس افراد کے مسائل اور ان کے المیہ کے لیے اپنا قلم وقف کر دیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں کی اساس دیہاتی افراد کے طرز بود و باش پر رکھی۔ انھوں نے ''گاؤں کے پس منظر میں انسانی زندگی کے ان المیوں کو اُجاگر کیا جن کا تعلق جذباتی نا آسودگیوں سے کم اور معاشی عدم مساوات سے زیادہ ہے۔''[۱۸] عباس طوروی لکھتے ہیں:

> ''ان کے افسانوں کے مطالعے سے مکمل پاکستانی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ پاکستان، قیامِ پاکستان، فسادات و ہجرت کے مسائل، آزادی کے بعد کے سیاسی مسائل، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ بھی کو ان کے افسانوں میں نمائندگی حاصل ہے۔''[۱۹]

قاسمی لڑکیوں کی بروقت شادی پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے مقامی معاشرت کے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ قاسمی کے افسانوی مطالعے سے کبھی تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے پنجاب کے ہر گھر اور اُس میں رہنے والے ہر مفلس شخص کی زندگی کا تجزیہ کیا اور یوں پنجابیوں کی عمومی سوچ کی عکاسی ''بیٹے بیٹیاں'' میں کرتے ہیں:

> ''لوگو! بیٹیوں کی آنکھوں میں چور بتیاں جلتی دیکھو تو انھیں فوراً کہیں چلتا کرو، چاہے انھیں گٹھڑی میں باندھ کر کسی کے دروازے پر ڈال آؤ، چور بتی جلتی رہے تو سالہ ختم ہو جاتا ہے اور دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ دنیا بھر کے ماں باپ کے لیے ہر بیٹی کی عمر چودہ نہیں تو زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہونی چاہیے۔ اس کے بعد بیٹی مر جاتی ہے اور عورت پیدا ہو جاتی ہے۔''[۲۰]

قاسمی کی کہانیاں حقیقی زندگی سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فطری عوامل سے آگے بڑھتی جاتی ہے۔ افسانہ ''گنڈاسا'' دیہاتی ماحول پر مشتمل افسانہ ہے جس میں روایتی رقابتیں نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔ اپنی انا اور عزت کے بچاؤ کے لیے قتل و غارت گری اور انتقام میں خون ریزی جیسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مولا بخش عرف مولا ایک سادہ لوح نوجوان تھا جو کبڈی کا ماہر تھا۔ اسے باپ کے قتل کی خبر سنائی جاتی ہے جسے رنگے نے قتل کیا تھا۔ مولا باپ کی لاش تھانے پہنچنے سے پہلے ہی نہایت پھرتی سے انتقاماً رنگے کو قتل کر دیتا ہے۔ کسی کو بھی گمان نہیں گزرتا۔ عینی شاہد اور ثبوت نہ ہونے کے باعث مولا سزا سے بچ جاتا ہے۔ اب مولا اہلِ گاؤں کے لیے

دہشت کی علامت بن جاتا ہے۔ وہ گنڈاسا ہاتھ میں لیے پھرتا رہتا ہے۔ اس کے پیچھے مولا کی ماں کا انتقامی جذبہ بھی کارفرما تھا جب مولا رہا ہو کر گھر آیا تو اس کی ماں نے ماتھے پر طویل بوسے کے بعد کہا: ''رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے تو جبھی بتیس دھاریں بخشوں گی۔ میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے اور تیرے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔''[۲۱] یہ عورت اپنی خاندانی آن کی حفالت کے لیے سنگین قدم بھی اٹھاتی ہے۔ قاسمی کی خوبی ہے کہ وہ منفی نوعیت کے کرداروں میں بھی مثبت پہلو تلاش کر لیتے ہیں جو انسانی ہمدردی محبت کے جذبوں سے متعلق ہیں یہی مولا جس کی ہیبت سے لوگ لرزہ بر اندام ہو جاتے، گلے کی منگیتر راجو کی کڑوی کسیلی باتیں بھی شربت کے میٹھے گھونٹ کی طرح پی جاتا۔ راجو کی محبت نے اس کے دل میں نرمی اور حلاوت پیدا کی۔ یہی وجہ تھی کہ رنگے کا تھپڑ کھانے کے بعد بھی وہ اسے کچھ نہیں کہتا۔ فطرتاً مولا کو حالات کے جبر نے سنگلاخ بننے پر اُکسایا۔ دیہاتی زندگی کا یہ نقشہ دراصل صدیوں پرانی روایت کا عکس ہے۔ افسانہ نگار نے انتقام کے سنگین جذبے کو آتش محبت سے بجھا دیا ہے۔ قاسمی نے پنجاب کے دیہی علاقوں کو حقیقت نگاری سے پیش کیا ہے۔ وہ اس کے حسن و قبح کو بنظر غائر دیکھتا اور شاعر کی مانند پیش کر دیتا ہے۔ انھوں نے دیہات کو جس خلوص و شوق سے پیش کیا وہ قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے مطابق:

> ''قاسمی دیہات کی زندگی کی عکاسی بڑی کامیابی سے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا دیہات سے وہ قلبی لگاؤ ہے جو ان کی زندگی میں مشاہدے کے ذریعہ داخل ہوا۔ قاسمی کے افسانوں میں دیہات کی نمائندگی، انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔'' [۲۲]

قاسمی کی تخلیقات میں دیہی ماحول، اپنی تمام رنگینیوں اور تاریکیوں سمیت جلوہ نما ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیہاتیوں کی حالتِ زار بھی مخفی نہیں رہتی۔ اردو ادب میں قاسمی کے افسانوں کی انفرادیت یہ ہے:

۱۔ قاسمی کے افسانے پنجاب کے مخصوص علاقے شمال مغربی پنجاب کے دیہات کی ترجمانی عمدگی سے کرتے ہیں۔

۲۔ قاسمی دیہات کو اپنے مشاہدات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

۳۔ قاسمی دیہات کی زندگی پر ملمع کاری کی بجائے حقیقی روپ میں پیش کرتے ہیں۔

۴۔ ترقی پسند فکر کے تحت طبقاتی کش مکش اور مسائلِ حیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۵۔ سماجی جبر، طبقاتی کش مکش اور نچلے طبقے کے الم ناک مسائل کی ترجمانی کے باوجود ان کے سماجی کردار مایوسی کا شکار نہیں ہوتے۔

۶۔ انھوں نے پنجاب کے خاندانی نظام اور اعتقادات و نظریات کو نزدیک سے دیکھا اور دیہاتی زندگی میں موجود توہمات اور تقدیر پرستی جیسے منفی اثرات اپنے افسانوں مثلاً ''قتل''، ''بین''، ''عاجز بندہ''، ''پیپل والا تالاب''،

''کوہ پیما''، ''چڑیل''، ''ایک رات چوپال پر'' میں دکھائے ہیں۔

۷۔ معاشرتی جبر کے باوجود بیشتر کردار تبدیلی کے خواہش مند نہیں۔ یہ ذیل داری کے ستم کا طوق گلے سے اُتار کر پھینکنے کے لیے تیار نہیں۔

۸۔ ۱۹۳۹ء سے لے کر ۲۰۰۶ء تک دیہات کے حوالے سے ان کی تخلیقات میں کوئی خاص تغیر رونما نہیں ہوا۔

ڈاکٹر انور سدید ان کے دیہاتی موضوعات پر مشتمل افسانوں کے متعلق رقم طراز ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات منفعل حیثیت رکھتا ہے اور مجبوری کی علامت ہے۔'' ۲۳

ڈاکٹر انور سدید کی رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن یہ قاسمی کی خوبی ہے کہ انھوں نے دیہاتی نظام کی روح کو سمجھ کر اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ وادی سون سکیسر کے دیہات کی خوب صورت منظر کشی اور دیہاتیوں کی حالت زار بیان کر کے دیہات کی ترجمانی کا حق احسن طریقے سے ادا کیا۔ بیسویں صدی کے وسط تک اس وادی میں معاشی آسودگی نہ تھی۔ سرکاری افسران تعطیلات گرما منانے کے لیے آتے اور تفریح کے ساتھ ساتھ دیہات کی خوب صورت دوشیزاؤں کو دیکھ کر ان کا دل مچلنے لگتا۔ قاسمی نے دیہات کے ان اصلی رنگوں کو خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر پروین اظہر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''احمد ندیم قاسمی پنجاب کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں لیکن صرف سرسوں کے کھیت کھلیانوں میں رواں دواں پرچھائیوں کے منظرنامے ہی نہیں ہیں بلکہ پنجاب کے دیہات اور قصبات میں تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی، قلب ماہیت کی تصویریں بھی ہیں۔''[۲۴] مثلاً ان کے افسانے ''نیم وا دریچے'' اور ''عبدالمتین ایم اے'' گاؤں کے رومانی تصور اور اصل گاؤں میں تفاوت کو عیاں کرتے ہوئے دیہی باشندوں کی حقیقی زندگی کو سامنے لاتے ہیں۔ دیہاتی زندگی دُور سے جتنی دل کش دکھائی دیتی ہے، قریب سے اُتنی ہی کرب ناک اور عبرت انگیز ہے۔ قاسمی کا افسانہ ''نیم وا دریچے'' دیہات کے طبقاتی ماحول کو رد کر کے حقیقی زندگی کو سامنے لاتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار محمود ایک وکیل ہے جو شہر کی پر تعفن فضا، بناوٹی چہروں اور مصنوعی مسکراہٹوں سے تنگ آ کر دیہات میں زندگی گزارنے کی تمنا رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس نے کتابوں میں پڑھ رکھا ہے کہ دیہات میں:

''۔۔۔زندگی ازلی اور ابدی شگفتگی کی جھلکیاں لیے ہوئے تھی۔ وہاں کے لالہ زاروں کے مالی کا کام خود فطرت نے سنبھال رکھا تھا۔ وہاں حسن سادہ اور معصوم تھا۔ وہاں کی معاشرت میں ریشم کا سا لوچ اور نرمی تھی۔ وہاں کی لڑکیاں بے لوث مسکراہٹیں بکھیرنے میں بخل سے کام نہیں لیتی تھیں۔'' ۲۵

اسی طرح رومانوی تصورات رکھتے ہوئے وہ ایک گاؤں مہندی پور آتا ہے مگر وہاں چند دن گزارنے کے بعد اُسے

دیہی زندگی اپنے اصلی روپ میں نظر آتی ہے تو وہ گھبرا کر شہر کا رُخ کرتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر گاؤں سے متعلق اس کے نظریات یکسر بدل جاتے ہیں چنانچہ گاؤں کے حوالے سے اسے لگتا ہے کہ:

"وسیع دنیا میں ایک بھورا سا حقیر دھبہ۔۔۔ کھلے میدان پر مری ہوئی چوہیا۔۔۔ کیڑوں سے بھری ہوئی۔۔۔ بدبو سے سڑی ہوئی، اُجڈ گنواروں کا وطن دکھائی دیا۔" ۲۶

اس طرح قاسمی اس خواب گوں طلسماتی فضا کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عباس طوروی اس افسانے کے حوالے سے لکھتے ہیں "اس افسانے کو پڑھ کر "ڈان کیخوتے" یاد آ جاتا ہے۔ ندیم بالکل اس طرز پر کتابوں میں پڑھی باتوں کا حقیقی زندگی پر اطلاق اور پھر دونوں میں پایا جانے والا خوف ناک تضاد سامنے لایا ہے۔" ۲۷

افسانہ "عبدالمتین ایم اے" کا مرکزی کردار "عبدالمتین" انقلابی اور رومانی ذہن کا مالک تھا۔ اُس نے دیہات کے متعلق کتابوں میں بہت پڑھا تھا۔ وہ دیہاتیوں کی زندگی سدھانے کا تمنائی تھا۔ چناں چہ ایم۔اے پاس کرنے کے بعد اپنے باپ کے سامنے مستقبل کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"میں نے اپنے مستقبل کا ایک ایسا پروگرام بنایا ہے جس پر عمل کر کے میں ہندوستان کی دیہاتی آبادی کو اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس دلاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ شہروں کے وہ ظالم اجارہ دار جس کے اجداد نے کسانوں کے خون پسینے سے اپنے باغ سینچے ہیں۔ قیامت تک ان باغوں کے پھولوں اور پھلوں سے فیض یاب ہوتے رہیں۔ میں ان دہقانوں کے نظریے بدل دوں گا۔ میں ان کی زندگیاں بدل دوں گا۔ میں ان کی نسلوں کے مستقبل بدل دوں گا۔" ۲۸

عبدالمتین آئیڈیلزم کا شکار نوجوان ہے جو تمام شہری سہولتیں چھوڑ کر دُور افتادہ گاؤں میں لوگوں کو مہذب بنانا چاہتا ہے۔ تعلیم نسواں کی افادیت، برتھ کنٹرول کے متعلق معلومات اور شاگردوں کو "بوسہ" دینے کا مطلب سمجھاتا ہے تو سارا گاؤں اس کے خلاف ہو جاتا ہے۔ آخر کار اسے رُسوا ہو کر وہاں سے نکلنا پڑتا ہے۔ وہ دیہاتی زندگی اور اس کی کلفتوں کا تیکھا تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہاں سے چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے بے انتہا محنت اور خلوص درکار ہے۔ اس امر میں سب سے بڑی رکاوٹ استحصالی طبقہ ہے جو سالہا سال سے کسانوں کی محنت پر عیش کر رہا ہے۔ قاسمی اس حوالے سے اہلِ قلم نوجوانوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اہلِ قلم گاؤں کو یوٹوپیا بنانے کی بجائے اصلی خدوخال میں دکھانا چاہیے۔ دونوں نوجوان کتابوں میں دیہی زندگی کو پڑھ کر دیہات میں زندگی گزارنے کا ارادہ کرتے ہیں۔" قاسمی لکھتے ہیں:

"۔۔۔ ہمارے دیہات اب تک قدیم قبائلی رسوم و رواج کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کسی زمانے میں اس نظام کی اپنی افادیتیں ہوں گی مگر اب اس کے پاس فتنہ و فساد اور قتل و غارت کے عناصر رہ گئے ہیں۔ ہمارے ادب میں دیہی زندگی کی سچائیوں کا اظہار کم کم ہی ہوا ہے اور اس کی وجہ۔۔۔ بے خبری ہے۔" ۲۹

قاسمی کے بیشتر افسانوں کا موضوع پرانے توہمات کی مذمت، کورانہ عقیدوں پر طنز اور حقیقت کو منظر عام پر لانا ہے۔ ''کوہ پیا'' میں ایک ایسے دیہات کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے باشندے جنات کے توہم میں مبتلا ہیں اور پہاڑ پر جا کر کبھی سچائی جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ قاسمی نے اس افسانے میں نہ صرف توہمات کا ذکر کیا ہے بلکہ توہمات کی حقیقت منکشف کر کے ان کو دُور کرنے کے لیے بھی کردار تخلیق کیے ہیں۔ ''کوہ پیا'' کا ایک کردار گکرالہ پہاڑ پر جا کر دوسری طرف آباد دیہی علاقے کے متعلق نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ پہاڑ کے حوالے سے جنات کے واہمے کو بھی سادہ لوح دیہاتیوں کے ذہنوں سے دُور کرتا ہے۔ چونکہ پنجاب کی اکثریت ناخواندہ اور جدید تعلیمی سہولیات سے کوسوں دُور ہے۔ اسی لیے توہمات اور جادو ٹونے میں گرفتار ہیں۔ ان کے اکثر افسانے مشرقی پنجاب کی دیہاتی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ گاؤں میں قدیم قبائلی رسوم، مذہبی جبر، ضعیف الاعتقادی اور جہالت ان کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات کی جزئیات چابک دستی سے بیان کی گئی ہیں۔ انھوں نے دیہاتی باشندوں کی ذہنی عکاسی دل پذیر انداز میں کی ہے۔ کریم بوڑھے باپ سے دل کی حالت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> ''کل مولبی جی کہہ رہے تھے میں نے بوڑھے نیم کے نیچے پیشاب کر دیا۔ اس لیے نیم کی پرانی ڈائن میرا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ کلیجے والی جگہ مجھے خالی جان پڑتی ہے۔'' [۳۰]

سادہ لوح دیہاتی چوں کہ کم زور عقیدے کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لیے پیروں، فقیروں کے دام میں بآسانی پھنس جاتے ہیں۔ افسانہ ''تھل'' میں نہر نکالے جانے، ریل کی پٹری بچھنے، نئی و پرانی نسل کے تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں عجیب توہمات پائی جاتی ہیں۔ دیہاتی ریل گاڑی میں سفر کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ مصری خان پیر صاحب سے تعویذ لینے کے باوجود اپنی ہی نالائقی کے باعث اپنا پاؤں کٹوا دیتا ہے۔ اس کی بیوی پیر کی شان میں گستاخی گردانتی ہے اور یہ بات مصری خان کے لیے بھی باعث شرمندگی ہے۔ یہ افسانہ انسان کی کم علمی، جہالت، بے اعتباری اور مافوق الفطرت اثرات کے سحر میں گرفتار جدید علوم سے ناآشنا شخص کی کہانی ہے۔ آغا سلمان باقر کے خیال میں ''گویا سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی سادہ لوح لوگ ہیں جن کی جہالت، کم علمی سے فائدہ اُٹھا کر پیر لوگ اپنا کاروبار چمکاتے ہیں اور ان لوگوں کو مستقل طور پر نام نہاد خوف سے منسلک کر کے علمیت سے دُور رکھتے ہیں کہ کہیں ان کا شعور بیدار ہو گیا تو کایا کلپ ہو جائے گی۔''[۳۱] ڈاکٹر آغا سلمان باقر افسانہ ''تھل'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''گویا تہذیبی جہالت کے نسل در نسل المیہ کا نام ''تھل'' ہے جو انسانی ذہن کی ناپختگی، کم علمی، اندر کے کمزور انسان کے خوف اور ضعیف الاعتقادی کا معاشرتی و سماجی مائل بہ زوال فکری المیہ ہے۔'' [۳۲]

قاسمی کے افسانوں میں ایسے ضعیف الاعتقاد لوگ بھی نظر آتے ہیں جو ہر قسم کی بیماری کا علاج تعویذ گنڈوں سے کرتے ہیں۔ رانی گاؤں کی الہڑ، معصوم لڑکی تعویذ گنڈوں پر اس قدر یقین رکھتی ہے کہ جب اس کے بابا کا

کھانسی سے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے تو رانی کہتی ہے:

''دوا دارو تو جی بہلاوے کے بہانے ہیں بابا۔ کہو تو کل پرسوں پیر جی سے تعویذ لے آؤں۔ کہتے ہیں ان کے تعویذ کی برکت سے مرنے والے بھی بنا کسی سہارے کے اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' ۳۳

دیہاتی افراد بھوت پریت کو زندگی کی حقیقت سمجھتے ہوئے ڈاکٹروں سے بیماری کا علاج کروانے کی بجائے مولویوں کی طرف دوڑتے ہیں اور ریاکار مولوی انھیں اپنے مضبوط شکنجے میں پھانس لیتے ہیں۔ افسانہ ''ہیرا'' کی زینو اپنے شوہر وریام کے بیمار ہونے پر اس کا علاج اس طرح کرتی ہے:

''بیس بیس کوس پیدل جا کر بڑے بڑے پیروں سے تعویذ لے کر آتی۔ اس نے سائیں سبز شاہ کے مزار پر سوجی کے حلوے کی کڑاہی چڑھائی اور روزانہ چٹکی چٹکی بھر خاک پاک لا کر وریام کو چٹاتی رہی۔'' ۳۴

دیہاتی شگون پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کی عکاسی افسانہ ''سرخ ٹوپی'' میں ملتی ہے۔ گاموں کی بیوی کو اس کی ہمسائی خاتون کہتی ہے:

''اے یہ کوؤں کی کائیں کائیں تو بہت اچھا شگون ہے۔ یاد رکھو تیرا سپاہی آج آیا کہ آیا۔'' ۳۵

جنسی گھٹن کا شکار ہونے والی لڑکیوں کو بھوت چمٹ جانے کا نام دیا جاتا ہے۔ ''جن وانس'' اور ''ماسی گل بانو'' اس پس منظر میں پیش کی گئی عمدہ کہانیاں ہیں۔ ماسی گل بانو کے اصرار پر تاجو کے ہاتھوں پر مہندی لگتے ہی اس کا جن رفو چکر ہو جاتا ہے۔ جنسی گھٹن کا شکار لڑکی اگر گھر سے بھاگ جاتی ہے تو گاؤں کے سادہ لوح اسے جن چمٹنے یا بھوت پریت کا نام دے کر نظر انداز کر دیتے ہیں:

''بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ کیکر کی خوشبو میں جن ہوتا ہے اور جن صرف کنواریوں کو ہی نظر آ سکتا ہے اور جسے نظر آ جاتا ہے اسے عشق ہو جاتا ہے اور ایک بھگا لے جاتا ہے دوسری بھاگ جاتی ہے۔'' ۳۶

قاسمی کے افسانوں میں مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ فکر و فن کی آمیزش نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان کے افسانے پنجاب کے دیہاتی افراد کی سادہ زندگی کی مصوری خوب صورت انداز سے کرتے ہیں۔ سیما صغیر کے نزدیک:

''اس زندگی کے پیچھے برسوں کی روایت، نظامِ معاشرت، عقائد اور توہمات کا سلسلہ ہے جس کی جڑیں مضبوط اور گہری ہیں۔'' ۳۷

قاسمی کی ادبی شخصیت پر دیہات کے اثرات ان مٹ ہیں۔ بقول حسن عسکری کاظمی ''احمد ندیم قاسمی کے افسانے پنجاب میں آباد غریب کسانوں، بے زمین کاشت کاروں اور دن بھر مزدوری کرنے والوں کی حالت زار کو

بیان کرنے کی خاطر تخلیق ہوئے۔" ۳۸ قاسمی نے اپنے افسانوں میں مقامی معاشرت کی عکاسی اتنے دل کش انداز سے کی ہے کہ مختلف ادبی نظریات سے تعلق رکھنے والے نقاد بھی ان کی توصیف کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ ڈاکٹر سہیل احمد لکھتے ہیں:

"قاسمی صاحب کی ابتدائی کہانیاں اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ہمارے شعور میں روشنیاں سی بکھیرتی ہیں۔ دیہات کی پگڈنڈیوں، ٹیلوں پر چاندنی کا غبار، ریت اور بگولے، اونٹ اور ساربان، اس ماحول میں انسانی معاشرت کے تضادات، جوانی کے جذبے، محبتوں کے کھیل، پھر ان رومانی فضاؤں پر اچانک مایوسیوں کی یلغار، جنگ اور طبقاتی تضاد کے یہ تمام عناصر جناب قاسمی کی جذباتی اور شاعرانہ نثر میں ڈھل کر جی کو لبھاتے تھے۔ قاسمی صاحب کے ہاں دیہات کا صرف رومانی روپ نہیں تھا، وہ اس فردوس میں جلتے ہوئے گھر دیکھتے تھے۔ ان کی واقعیت نگاری اور قوتِ مشاہدہ اثر انگیز تھی۔ انھوں نے پنجاب کے ایک خاص علاقائی ماحول کو زبان دی۔ اس علاقے کے کرداروں کو اردو ادب کا حصہ بنایا۔ پریم چند سے شروع ہونے والی دیہات نگاری کو نئی نہج پر ڈالا۔۔۔ ان کی اس حیثیت سے میرے جیسے لوگوں کو بھی جن کی ترجیحات مختلف ہیں، انکار نہیں۔" ۳۹

سید وقار عظیم ان کی دیہات نگاری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۔۔۔فطرت نے اُنھیں دیہاتی زندگی کا مصور اور ترجمان بنا کر بھیجا ہے اور اُنھیں فطرت کے سونپے ہوئے کام اور منصب پر قائم رہنا چاہیے۔ یہیں آ کر ان کا تخیل، اُن کا شاعرانہ طرز اپنی پوری رعنائی اختیار کرتا ہے۔ اسی فضا میں پلے ہوئے رومان تازہ اور شاداب ہیں۔ اسی ماحول میں چلتے پھرتے آدمی جیتے جاگتے اور اسی رنگ میں ڈوبا ہوا طرز جان دار اور توانا۔" ۴۰

قاسمی کا فطری میلان دیہات کی طرف تھا۔ انھوں نے دیہاتی حسن کو اپنی تحریروں میں بیان کر کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہاتوں کا فطری حسن اور زندگی کی خوب صورتی دونوں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کے تلخ حقائق بھی اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس مگر
میں نے دیہات میں اُجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

قاسمی نے اپنے افسانوں میں ان اجڑے گھروں اور ان کے باسیوں کی مفلوک الحالی، خستہ حالی اور خانہ ویرانی کو دل پذیر انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں دیہات وحدت کے ساتھ اُبھر کر نمایاں نظر آتے

ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں کا محلِ وقوع جنوبی پنجاب بالخصوص سون سکیسر ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہی زندگی کی تلخیاں بھی موجود ہیں۔ لیکن شہر میں رہتے ہوئے جن حالات و واقعات نے انھیں متاثر کیا ہے، اُن کا عکس افسانوں میں ملتا ہے۔ ''آنچل'' کے افسانوں میں بھی شہری فضا اپنے رنگ بکھیرتی دکھائی دیتی ہے۔ قاسمی کے بیشتر افسانوں میں شہر کی عورت بے وفا اور خلوص سے تہی دامن ہے۔ ان کے افسانوں میں شہری زندگی پر مشتمل افسانے غربت، اپنے مکر، فریب، ریاکاری، مکاری، جھوٹی شان و شوکت، بناوٹی زندگی اور نفسی نفسی سے بھرپور ہیں۔ قاسمی کے افسانوں میں شہروں کی مصنوعی زندگی تصنع، خودغرضی، بے وفائی، بے راہ روی غرض زندگی کے مختلف پہلو جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ''گرداب'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''معاً مجھے خیال آیا کہ دیہات کی معصوم فضاؤں سے نکل کر جدید تہذیب و تمدن کے ان گہواروں کو بھی دیکھوں جو گڑگڑاتی ہوئی مشینوں اور گاڑھے بدبودار دھوئیں میں لپٹے ہوئے اُبھرے اور پھیلے جا رہے ہیں۔۔۔ یہاں کے مسائل الگ ہیں۔ ماحول الگ تھا۔ لوگوں کی ذہنیت الگ تھی، یہاں پتلونوں کی جمی ہوئی لکیروں اور بالوں کی متناسب لہروں کے تذکرے تھے، تصنع تھا، تکلف تھا، ریاکاری تھی اور ان کے۔۔۔ مصفا چہروں کے پیچھے سماج کا پلیگ تعفن پھیلا رہا تھا اور لباس حریر کے نیچے زخمی روحیں بلک رہی تھیں۔۔۔'' [۴۱]

قاسمی نے جہاں دیہاتی افراد کی معصومیت، سادگی کو پیش کیا وہیں شہری افراد کی زندگیوں کے مصنوعی پن کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ قاسمی شہری کہانیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''شہری متوسط زندگی کے بارے میں بھی میں نے کہانیاں لکھیں اور بعض اونچے طبقے کے دوست تھے تو ان کے ساتھ دو تین باریوں کیسے کہ جو نام نہاد اعلیٰ سطح کی سوسائٹی تھی، اس میں بھی شرکت کی۔ اس کا عکس میرے افسانوں میں موجود ہے۔'' [۴۲]

قاسمی نے شہروں کے جدید تہذیب و تمدن کو بھی پیش کیا۔ قاسمی معاشرے پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بعض گھروں میں لڑکی اور لڑکے کی دوستی فیشن میں شمار ہوتی ہے مگر یہ محبت سب کے ہاں جائز نہیں۔ بعض امیر گھرانوں کی لڑکیاں خواہش کے باوجود اپنی پسند کے لڑکوں سے دوستی نہیں کر سکتیں۔ وہ اسے گویا نیکر پہن کر سڑک پر آنے کے مترادف سمجھتی ہیں۔ جمیل ملک، قاسمی کی تحریروں میں شہری زندگی کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''جوں جوں شاعر دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہوتا جاتا ہے، غیر محسوس طور پر اس کے احساسات و جذبات پر فطری مظاہر، گاؤں کے محاکات اور گرد و پیش کے نقوش و علامات کا پرتو مدہم پڑتا جاتا ہے اور اس کے احساس و شعور پر اسی اعتبار سے شہر کے تقاضوں، تحریکوں اور روشنیوں کی چھوٹ پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔'' [۴۳]

شہروں میں سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے۔ معاشرے میں طبقاتی کش مکش، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت، بربریت، خودغرضی، زرپرستی، سیاسی ہوس اور ذخیرہ اندوزی اسی سرمایہ دارانہ نظام کی دین ہے۔ اسی نظام نے شہریوں کو مفلسی، بے روزگاری اور عدم تحفظ کا تحفہ عطا کیا ہے۔ مجرم ہونے کے باوجود قانون ان کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ افسانہ ''چھلی'' کے کردار ولی محمد کی اکلوتی جوان بیٹی کو چند اوباش لڑکے تنگ کرتے ہیں تو ولی محمد، رضیہ کو سناتے ہوئے بولا:

> ''میں ان کا سر پھوڑ دیتا پر یہ سوچ کر میرا ہاتھ رُک گیا کہ پکڑا تو میں ہی جاؤں گا۔ پکڑے تو غریب ہی جاتے ہیں نا۔ پولیس کو غریبوں کو پکڑنے اور امیروں کو معاف کردینے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔'' ۴۴

قاسمی نے اپنے الفاظ میں نمود و نمائش، ریاکاری اور ہوس زر کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے جو معاشرے میں زہر کی طرح سرایت کرچکی ہیں۔ متوسط سفید پوش طبقہ کے افراد اونچے طبقے کی آن بان شان سے اتنے مرعوب ہوجاتے ہیں کہ اس طبقے میں شامل ہونے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ افسانہ ''گھر سے گھر تک'' میں متوسط طبقہ موجود ہے۔ عشرت خانم، نورالنساء بیگم کے گھر اپنے اکلوتے چشم و چراغ کا رشتہ لے کر آتی ہے کیوں کہ ان کے خیال میں اونچے گھر کی بیٹی دولت اور جہیز کا انبار ساتھ لاتی ہے۔ دونوں گھرانے کچھ وقت کے لیے پرتکلف اور تصنع کے خول میں بند ایک دوسرے کے رعب و داب سے متاثر تھے لیکن افسانے کے اختتام پر دونوں کی حقیقتیں کُھل جاتی ہیں۔ نورالنساء کے پڑوس سے لڑکا آکر ان کی جھوٹی شان کا پردہ چاک کردیتا ہے جب کہ عشرت خانم خود تکلف کا یہ بھیس اُتار کر پھینک دیتی ہے اور وہ اپنی بیٹی کو مانگے ہوئے کپڑے احتیاط سے رکھنے کی تلقین کرتی ہے۔ پھر وہ نورالنساء کی حیرت کو ہنسی میں تبدیل کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے:

> ''اے بہن نورالنساء، ذرا خدا کے لیے ہنسیے، کیا یہ ہنسی کی بات نہیں کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے، اور بہن، میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔ قسم قرآن مجید کی، پسینہ سرخی پوڈر بہالے جائے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔'' ۴۵

عشرت خانم اور نورالنساء کی ہنسی میں المیہ اور طربیہ عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ ''ہٰذا من فضل ربی'' میں قاسمی نے نودولتیوں کی کالونی ان کے کھوکھلے پن کو بیان کیا ہے۔ افسانہ ''بھرم'' میں دولت کے نشے اور شراب میں مست افراد کی کہانی بیان کی ہے۔ ان دورُخی شخصیات کے نزدیک محبت ایک کھیل ہے۔ قاسمی نے اس اونچی سوسائٹی کے داخلی انتشار، جنسی کج روی کے گھناؤنے پن کا عمدگی سے انکشاف کیا ہے۔ ان افسانوں میں قدروں کی پامالی کا منظر بھی قابلِ دید ہے:

> ''اب نشیمن نے اُن لوگوں کا نام، عہدے، سماجی مرتبے، پتے بلکہ ان کے بچوں کی

تعداد تک بتا دی جن سے اس نے محبت کی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ آخری آدمی سے محبت نبھاؤں گی مگر اس دوران ہماری ممی کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔ نیشمن اپنی ماں کی طرف دیکھے بغیر بولتی رہی۔ میں پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ابھی تک پرانے قبائلی لوگوں کی طرح اپنی ماں کی عزت کرتی ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی آخری محبت کی قربانی دے ڈالی ہے اور ممی کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔" ۴۶

ناجائز دولت کی فراوانی کی بنا پر لوگ عشق کے مفہوم سے ناآشنا تھے۔ ''سفید گھوڑا'' اور ''بندگی بے چارگی'' کے کردار اپنے معیار اور اقدار پر استقامت سے قائم ہیں۔ وہ شدید معاشرتی دباؤ کے تحت پسپائی اور تنزلی میں بدل جاتے ہیں۔

افسانہ ''پاگل'' ایک ایسے بے بس سربراہ کی کہانی ہے جو اپنے گھر میں میلاد کی محفلیں منعقد کرواتا ہے لیکن اپنی اولاد کو ناچ کی کلاسوں میں دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کو شرم و حجاب کا درس دیتا ہے۔ وہ اپنی بیگم کو بھی قول و فعل میں اولاد کا ہم نوا پا کر مغموم ہوتا ہے۔ حالات کی یہ تبدیلی ہماری تہذیبی زندگی پر مرتب ہوتی ہے۔ چوہدری صاحب جب اپنے بچوں کو آرکسٹرا پارٹی میں ناچتے ہوئے دیکھتے ہیں تو عارف کی ماں کو دُور سے پکار کر کہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ خود کلامی کر رہے ہیں:

''عارف کی اماں! سنتی ہو، تمہارے سامنے عارف ناچ رہا ہے۔ یہ وہ ہے جو تعریف اُس خدا کی گاتا تھا تو بے نمازی بھی تو بہ تائب ہو کر نماز پڑھنے لگتے تھے۔۔۔ عارف کی اماں!۔۔۔ یہ تمہارے سامنے تمہاری بیٹی ناچ رہی ہے۔ یہ وہ ہے جسے نرسری کلاس میں دس سورتیں ازبر تھیں۔ یاد ہے جب یہ ہاتھ بھر کی لونڈیا دوزانو ہو کر اور ماتھے تک دوپٹا کھینچ کر۔۔۔ کم سے کم دوپٹا تو اس کے کندھوں پر ضرور ہونا چاہیے تھا۔ دوپٹے تو اس کے پاس بہت سے ہیں۔" ۴۷

قاسمی نے اس افسانے میں نئی تہذیب، بدلتی اقدار اور تہذیب مغرب کی بے جا تقلید کی تصویر دکھائی ہے۔ افسانہ ''مخبر'' کا خادو ایسا کردار ہے جو اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے خودغرضی، لالچ، ہوس جیسے رذائل اخلاق میں ملوث نظر آتا ہے۔ خادو نے پیشہ ورانہ عزت کی بحالی کی خاطر اپنے بھائی میراں بخش کو بھنگ کے الزام میں گرفتار کرایا لیکن افسانے کے اختتام میں ایک جملے سے غم کی آواز آتی ہے۔ خادو انسپکٹر سے بچوں کی طرح بلک بلک کر کہتا ہے:

''یہ میراں بے شک میرا بڑا بھائی ہے نا۔ جرمانہ ہو جائے تو اس کو پکڑوانے کا مجھے جو انعام ملے گا۔ اسے میں جرمانے میں دے دوں گا۔" ۴۸

متوسط طبقے کے کھوکھلے پن کی کہانی ''نمونہ'' میں بیان کی گئی ہے کہ بظاہر تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آنے والے لوگ حقیقت میں اُجڈ، گنوار اور جاہل ہیں۔ اپنی عزت کا بھرم قائم رکھنے کے سوانگ بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

طارق سے مسز سکوڈا جارجٹ کا کپڑا لے کر جاتی ہے تا کہ ڈورا کو دکھا سکے لیکن طارق یہ دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے کہ:

''ڈورا نے جارجٹ کے اسی کپڑے کی ساڑھی پہن رکھی تھی جسے مسز سکوڈا نمونے کے طور پر مجھ سے مانگ کر لے گئی تھی۔'' ۴۹

افسانہ ''آسیب'' میں قاسمی نے نئی نسل کی قدیم روایات سے روگردانی اور قدیم نسل کی اپنی روایت سے پاس داری کے جذبے کو اُبھارا ہے۔ اس افسانے میں بڑ کا درخت اپنے اندر قدیم قدروں اور پرانی تہذیب کو سموئے ہوئے ہے جس کے سائے تلے زندگی کی حسین یادیں گزریں اور خوب صورت یادیں اس درخت سے وابستہ تھیں لیکن اس بزرگ کا بیٹا سقراط اور بہو نگینہ نسلِ نو کے نمائندے اس کو کٹوا کر اس کی جگہ امپورٹڈ پھولوں اور کیاریوں کو لگاتے ہیں تو امجد حسین ان پھولوں کو جڑ سے اُکھیڑ کر دُور پھینک دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بڑ کے درخت کو یہاں زندگی نصیب نہیں ہوئی تو امپورٹڈ کیاریاں اور پھول بھی یہاں پروان نہیں چڑھ سکتے۔

قاسمی کے افسانوں میں اعلیٰ طبقے کے ایسے افراد بھی ملتے ہیں جن کی صبح، شام اچھے ہوٹلوں اور شراب خانوں میں گزرتی ہے۔ وہ اپنے رومانوی قصے بیان کرتے ہوئے فخریہ انداز میں دھوکے بازی اور کھوکھلے پن کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ جنسی جذبہ بھی زیریں سطح رہتا ہے لیکن قاسمی ان افراد کے احساسات، واقعات و حالات اور معمولات کو بیان کرتے ہوئے حدِ اعتدال سے نہیں گزرتے۔ ان افراد کے دلوں میں محبت سے زیادہ ہوس موجود ہے۔ اس نوع کے افسانوں میں ''فیشن''، ''بارٹر''، ''عورت صاحبہ'' اور ''ہٰذا من فضل ربی'' شامل ہیں۔ ''عورت صاحبہ'' میں قاسمی نے سیٹھ صاحب کے کردار کی عکاسی یوں کی ہے:

''سیٹھ صاحب! اندر کسی کمرے میں شاید پی رہے تھے مگر سر پر یوں رومال باندھ رکھا تھا جیسے نماز پڑھ رہے ہوں۔'' ۵۰

شہری زندگی پر مشتمل افسانوں کے رومان میں فرسودگی نظر آتی ہے۔ امیر لڑکوں کے نزدیک محبت محض ایک مشغلہ ہے۔ ''ہٰذا من فضل ربی'' میں ایک امیر لڑکا اپنے معمولاتِ زندگی بڑے فخریہ انداز میں بیان کرتا ہے:

''روز کا پروگرام یہ ہے کہ صبح کے دو گھنٹے تمہاری پڑوسن تابندہ کے ساتھ گزرتے ہیں اور شام سے پہلے کے دو گھنٹے اپنی پڑوسن شگفتہ مجھے اپنی کار میں لے جاتی ہے۔'' ۵۱

امیر افراد اپنے ہم طبقہ افراد سے ہی شادیاں کرنا پسند کرتے ہیں۔ افسانہ ''دُوربین'' میں رؤف کا کردار اونچے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ اپنی دوست تابی کو بتاتا ہے:

''امی اور ابا دونوں سے ایک بار نہیں کئی بار کہہ دیکھا ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں مہتاب پڑھی لکھی سہی مگر اس کے ابا نے چھوٹے سے منیاری کی حیثیت سے ہی تو کاروبار شروع کیا تھا اور لوگ کہیں گے کہ رانا عرفان الٰہی کے اکلوتے بیٹے کے لیے ایک منیارن کو گھر میں ڈال لیا ہے۔'' ۵۲

مصنف نے شہروں میں بسنے والے افراد کی نا آسودگیوں کو، ان کی دردمند زندگی کے تضادات کو نہایت جرات مندی سے بیان کیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری شہری زندگی سے متعلق افسانوں کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''شہری زندگی سے متعلق ندیم قاسمی کے افسانے کم زور ہیں۔ ان میں فنی ربط کی کمی ہے۔ کردار نگاری پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط نہیں اور نہ ان میں وہ رچاؤ ہے جو مشاہدے اور نقطۂ نظر میں نکھار اور تیکھا پن پیدا کرتا ہے۔ ''ہذا من فضل ربی''، ''بھرم''، ''بندگی'' اور ''بے چارگی'' اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔'' ۵۳

قاسمی نے افراد کی بے حسی کی متعدد اشکال کو بھی بیان کیا ہے۔ اس بے حسی کی بدولت وہ محبت، خلوص، مروت، انسان دوستی اور اخوت کے جذبوں سے تہی ہو رہے ہیں۔ اس سے انسانی قدروں کو جو زوال آیا ہے اس کا ہنرمندی سے احاطہ کیا ہے۔ محولہ بالا افسانے انسانی بے حسی کے متعدد حوالوں کو سامنے لاتے ہیں۔ قاسمی کی افسانہ نگاری پر پروفیسر فتح محمد ملک، سجاد شیخ کی کتاب "Selected Poems of Ahmad Nadeem Qasmi" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "The depict an immense variety of themes, characters, forms and techniques. Their locale is very often rural areas of Pakistani Punjab, and yet there are several remarkable stories which present urban scenes and settings as well, and deal with sophisticated city people. Be their locale rural or urban, Qasmi's stories are concerned with some of the most fundamental human issues and the multiple problems encountered by mankind in general." ۵۴

قاسمی اگرچہ افسانوی ادب میں دیہی زندگی کے عمدہ نباض کے طور پر مشہور ہیں لیکن ان کی کہانیوں میں شہری زندگی کے تضادات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی عکاسی جتنے بھرپور اور جاندار انداز میں کرتے ہیں اتنے قوی انداز میں شہری زندگی کی عکاسی نہیں کر پاتے ہیں۔'' ۵۵

اگرچہ قاسمی کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ شہر میں بسر ہوا لیکن جس بھرپور انداز میں دیہاتی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ شہری زندگی کی عکاسی اتنی عمدگی سے نہیں کر پاتے۔ چنانچہ ڈاکٹر قاسم ظفر خاں کا خیال ہے:

> ''احمد ندیم قاسمی نے دیہاتوں کی برائیوں کے علاوہ شہروں میں رائج برائیوں کو اُجاگر کرنے اور ماحول کو صاف ستھرا بنانے کی کوشش میں بھی کوئی دقیقہ نہیں رکھ چھوڑا ہے۔'' ۵۶

جنگ ان کے افسانوں کا مستقل موضوع رہی۔ انھوں نے جنگ کے مناظر اور اثرات، مادی و روحانی بربادی اور ہلاکت خیز واقعات کو دل سوزی اور حقیقت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے جنگی مناظر اتنے تواتر اور الم ناک انداز سے بیان کیے ہیں کہ انسانی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسے اثرات دکھاتے ہیں کہ جنگ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ ندیم کے افسانوں میں عالم گیر جنگوں کے محرکات، تجزیہ اور نتائج کو بھی متنوع رنگوں اور نت نئے زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہات یہ تھیں کہ قاسمی کی پیدائش کے دو برس بعد جنگ عظیم اوّل شروع ہوئی لہٰذا جنگ کی ہولناکیوں سے ان کی شناسائی ہوش سنبھالتے ہی ہوگئی۔ چناں چہ ان کی ابتدائی تحریروں میں جنگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ پروفیسر غلام رسول تنویر رقم طراز ہیں:

> ''ندیم نے جب ہوش سنبھالا تو اس کی روح پر سب سے پہلے اسی علاقائی آسیب نے دستک دی۔۔۔ اس کے افسانوں کے پہلے دو مجموعے ''چوپال'' اور ''بگولے'' اس علاقائی آسیب کے عکاس ہیں۔'' ۵۷

عالمی سطح کے ان واقعات نے قاسمی کے ذہن پر ان مٹ نقوش ثبت کیے۔ کیوں کہ قاسمی کا علاقہ خوشاب فوجی بھرتی کا اہم مرکز تھا۔ ''سپاہی بیٹا'' کی ابتدا میں درج ہے کہ ''یہ علاقہ فوجی بھرتی کی سدابہار فصل تھا۔''

برطانوی استعمار نے برعظیم پاک و ہند کا معاشی نظام اپنی صنعتوں کے لیے خام مال فراہم کرنے والی کان اور ان صنعتوں کی بہترین پیداوار کی منڈی کے طور پر قائم کر رکھا۔ انہی مقاصد کی تکمیل کے لیے برطانوی استعمار نے طویل المیعاد منصوبہ بندی کے تحت نہ صرف ہندوستان پر اپنا جال بچھایا بلکہ اسے پسماندہ بھی رکھا۔ لیکن چند علاقوں پر فرنگیوں کی بالخصوص نگاہ تھی۔ ان میں پنجاب بھی شامل تھا جس کا کسان زرخیز زمین کے باعث آسودہ حال تھا۔ انگریز نے اس کی جسمانی طاقت، زمین کی زرخیزی اور آسودہ حالی کو اپنے مقاصد میں لانے کی منصوبہ بندی کی جس کے باعث ان علاقوں کے باشندوں کو صنعتی ترقی سے محروم کر دیا۔ محمد عباس طوروی لکھتے ہیں:

> ''انگریز نے۔۔۔ پنجاب کے زرخیز اور نہری نظام کے حامل علاقوں کی زرعی پیداوار اپنی فوجی رسد کے لیے استعمال کی اور پنجاب کے بنجر علاقوں (جہلم، میانوالی، خوشاب، اٹک، راول پنڈی، چکوال اور گجرات) کے نوجوانوں کو خالص عسکری مقاصد کے لیے استعمال کیا۔'' ۵۸

ان کم زرخیز علاقوں کے باشندوں پر لگان اور ٹیکس جبراً عائد کر دیے اور معاشی اعتبار سے کسان کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ وہ یا تو فاقوں مرے یا خودکشی کرے اور اگر زندہ رہنا ضروری ہے تو پھر فوج میں بھرتی ہو جائے۔ ان فاقہ زدہ کسانوں کے لیے فوج میں بھرتی ایک تحفہ خداوندی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تین بیٹوں میں سے دو بیٹوں کو والدین فوج میں بھرتی کروا دیتے۔ چناں چہ اقتصادی بحران اور کسانوں کی فوج میں بھرتی کی کشش کو اس طرح

بیان کیا گیا ہے:

> ''بھرتی میں اس قدر کشش تھی کہ وہ نوجوان جو اپنے کھیتوں کے تنہا رکھوالے تھے۔ تلائی کے بہانے گھروں سے نکلے اور ہلوں اور بیلوں کو کھیتوں میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہفتوں کے بعد سکندر آباد یا لکھنو سے ان کی چٹھیاں آئیں کہ وہ ماں باپ اور بہن بھائی کو فاقوں سے مرتا نہیں دیکھ سکتے، اس لیے فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں۔'' ۵۹

قاسمی نے اخلاقی وتعیناتی اور اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آنے والے ان افراد کی کہانی کو حقیقت نگاری سے بیان کیا ہے۔ انگریز سامراج کے کارندوں اور ان کے آلہ کار ذیل داروں نے ان عالم گیر جنگوں کے محاذ گرم اور تر و تازہ رکھنے کے لیے جبراً بھرتی شروع کر دی۔ اگر کسی نوجوان کے لیے فوجی بھرتی کوئی کشش نہ رکھتی تھی، تو اسے جبری بھرتی کے لیے مجبور کیا جاتا۔ پروفیسر فتح محمد ملک اس امر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''(انگریزوں نے) جبری بھرتی کی مہم کے دوران پنجاب کے دیہات پر جو ظلم توڑے، ان کا اندازہ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے ذمہ دار گورنر سر مائیکل اڈوائر کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے: پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ چاہئیں۔ اگر خوشی سے بھرتی نہیں ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کریں گے۔'' ۶۰ برطانوی استعمار نے اپنے عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر ممکن تشدد و جبر کیا۔ عاشق حسین بٹالوی اس جبری بھرتی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔پورے گاؤں کو سرکاری اہل کار نرغے میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا، جس نوجوان کی طرف سرکاری انگلی اُٹھ جاتی تھی، اسے پابجولاں ضلع کے صدر مقام بھیج دیا جاتا تھا اور وہ رضا کارانہ طور پر بھرتی کیا ہوا رنگروٹ تصور ہوتا تھا۔ حکومت کے اس جابرانہ طرزِ عمل سے پنجاب میں بے شمار فساد ہوئے۔'' ۶۱

ضلع شاہ پور میں جب اس ظالمانہ وجابرانہ طرزِ عمل پر فساد برپا ہوا تو عجیب امور کا انکشاف ہوا مثلاً پنجاب کے جسمانی طاقت سے بھرپور نوجوان جب بخوشی فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کرتے تو: ''گاؤں کے تمام باشندوں کو گھر سے باہر کھڑا کر کے مردوں کو عورتوں کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا۔ جس کنبے کے تین یا چار بھائی ہوتے، ان میں سے زبردستی دو بھائیوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ عورتوں کو خاوندوں سے جدا کر کے دُور کسی اور مقام پر بھیج دیا جاتا تھا اور جب تک ان کے خاوند بھرتی ہونے یا اپنے عزیزوں کو بھرتی کروانے پر رضامند نہیں ہوتے تھے عورتوں کو واپس گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔'' ۶۲ ضلع شاہ پور کے ایک گاؤں میں ڈیڑھ سو افراد پر جبری بھرتی کی مخالفت پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ جب یہ افراد ہر طرح کے جبری دباؤ کے باوجود بھرتی ہونے پر آمادہ نہ ہوئے تو حکومت نے قانونِ تحفظ ہند کے تحت چند آدمیوں کے گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔ اسی فوجی بھرتی

کے نتیجے کے طور پر پنجاب کے اس علاقے سے نوجوان نسل معدوم ہوگئی۔ پنجاب کے نوجوانوں کا خون فرانس اور بلجیم کے محاذوں پر ضائع ہونے لگا۔ نتیجتاً ان پہاڑی باشندوں کی دُلہنوں کی مانگ اُجڑ گئی۔ ان نوبیاہتا سہاگنوں کے لال جوڑے اپنی سرخی کھو بیٹھے۔ قاسمی نے اس بھرتی کے علاقے پر مرتب اثرات کا جائزہ اس طرح لیا:

> ''۔۔۔ان گنت گھروں میں مانگیں بگاڑی اور چوڑیاں توڑی جا چکی تھیں، بچوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں یتیمی کی ریت گھس گئی تھی اور اچھے خاصے سیدھے سیدھے چلنے والے بزرگوں کی کمریں جھک گئیں تھیں لیکن بھرتی بدستور زوروں پر تھی۔۔۔ بھرتی کی ہر کھیپ کے ساتھ ذیل دار کے گھر میں سندوں کا ایک انبار جمع ہوتا گیا۔'' ۶۳

وادی سون سکیسر میں انگریز سامراج کی یہ پالیسی جس شدت کے ساتھ عمل میں لائی گئی، اس کے اثرات دورِ حاضر میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ محمد سرور اعوان لکھتے ہیں:

> ''آج کل بھی ہر موضع کے تقریباً ہر دوسرے تیسرے گھر میں ایک فوجی ملازم ضرور ہے چناں چہ ہر گلی میں کم از کم ایک نائب صوبے دار سے میجر تک ضرور ہوں گے۔ علاوہ ازیں علاقہ بھر میں ۰ ۷ کرنل ہیں۔ اسی طرح بریگیڈیئر۔۔۔ ہیں۔'' ۶۴

قاسمی نے وادی سون سکیسر پر جنگ عظیم اوّل کے اثرات کے بالواسطہ مشاہدے کی بنیاد پر ایک افسانہ ''بوڑھا سپاہی'' لکھا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار جیسا کہ نام سے ہی عیاں ہے۔ ایک بوڑھا ہے جس نے جنگ عظیم اوّل میں نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنے دائیں بازو سے بھی محروم ہوا۔ جنگ میں شرکت سے قبل اسے ایک لڑکی سے محبت تھی لیکن جنگ سے واپسی پر اس لڑکی کی شادی ہوگئی۔ بوڑھا محبت کو عبادت سمجھتا تھا لہٰذا لڑکی کی وفات کے بعد اس نے بقیہ زندگی اس عورت کے بچوں کی پرورش اور پرداخت کے لیے وقف کر دی۔ جنگ عظیم اوّل کے متعلق ''بوڑھا سپاہی'' کا مرکزی کردار اپنی تلخ یادداشتیں بیان کرتا ہے جس میں میدانِ جنگ کی ہیبت ناک تصویر کشی کی گئی ہے:

> ''۔۔۔ایک دفعہ میں نے ایک جرمن سپاہی کے دل میں سنگین گھونپ دی۔ وہ بے تاب ہو کر گرا اور بڑی مشکل سے اپنی جیب میں سے بھرے بھرے گالوں اور سنہری گھنگھریالے بالوں والی ایک خوب صورت بھولی بھالی لڑکی کی تصویر نکال کر اسے چوما، ہچکی لی اور مر گیا۔ ملک جی میں نے اس سپاہی کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور دفن کرتے وقت تصویر اس کے زخمی دل پر رکھ دی۔۔۔ کسی کو جان سے مار دینا، ان دنوں ہمارا روز کا کھیل تھا۔ میں نے ان گنہگار ہاتھوں سے کئی سو آدمی جان سے مارے ہیں ملک جی! لیکن اس سپاہی کو ختم کر کے میں نے محسوس کیا کہ میرے زخم چھل گئے ہیں۔ میں دنیا کا سب سے بڑا گنہگار ہوں۔'' ۶۵

اقتباسِ بالا میں افسانے کی یہ سطریں انسانی ہمدردی سے بھر پور ہیں۔ قاسمی کی مہارت یہ ہے کہ انھوں نے نہایت فن کاری سے محبت کے وفور اور قلبی تعلق کے رویہ کو دل پذیر انداز سے بیان کیا ہے۔ بوڑھا احساسِ گناہ میں اس لیے مبتلا تھا کہ اس نے دشمن سپاہی کا خون محض چند سکوں کی خاطر کیا۔ جب جنگ عظیم اوّل اپنے عروج پر تھی، بوڑھا سپاہی جنگ کے سلسلے میں اپنے تجربات و مشاہدات کو بیان کرتا ہے:

''میں تین سال فرانس اور مصر میں رہا۔ بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں، بم پھٹتے تھے اور توپوں کے گولے ہمارے مورچوں کے پاس آ کر گرتے تھے۔ بندوقوں کی گولیاں ہمارے سر کے بالوں کو چھوتی نکل جاتی تھیں۔ کئی بار سنگینوں کی نوکوں نے ہمارے سینوں کو چھوا۔۔۔ میرا بازو بری طرح زخمی ہوا۔ درد کی شدت سے میں بے ہوش ہو گیا۔ ہم زخمیوں کو ولایت بھیج دیا گیا۔۔۔ آخر میرا بازو کاٹ دیا گیا اور مجھے پنشن دے دی۔'' ۲۶

یہ سپاہی جب گاؤں واپس پہنچتا ہے تو اس کا قریہ محبت تباہ ہو چکا ہوتا ہے چناں چہ یہ اپنی بقیہ زندگی محبوبہ کے بچوں کی دیکھ بھال میں گزار کر سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قاسمی نے جنگ کے متعلق اپنے تخلیقی شعور کو ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' میں بھی بیان کیا ہے۔ اگر چہ یہ افسانہ جنگ عظیم دوم کے موضوع پر لکھا گیا لیکن اس افسانے میں ایک کردار پہلی جنگ عظیم کے واقعات سناتا ہے۔ اس زمانے کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ ''بوڑھا سپاہی'' میں کسی کمی کے احساس کے پیشِ نظر قاسمی نے یہ واقعہ دہرایا۔ افسانے کا کردار دادا شہباز انتہائی کرب ناک لہجے میں بیان کرتا ہے:

''۔۔۔ پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارا اور سچ کہتا ہوں، دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا، اندھیری گرجتی دھاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں اور ٹھوکریں کھا کر گرا بھی لاشوں پر۔۔۔ میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی۔ جرمن سپاہی تھا۔ اتنا خوب صورت تھا کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں اور ایک مڑی تڑی تصویر ایک لڑکی کی جس کی آنکھیں اتنی گھمبیر تھیں کہ قرآن کی قسم! جہان ڈوب جائے اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں:
سچ مچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے؟
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔ میں نے یہ تینوں چیزیں اس کی جیب میں ڈال دیں۔ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر میری بات سننا، میں سچ کہتا ہوں میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں اور اس کے نیلے نیلے ہونٹوں اور ننھی مونچھوں پر بیٹھ کر پر سنوارنے لگیں۔ یہ نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بڑی خبر

سنانے کے لیے مرا اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی۔
یہ سات ٹھیکریاں۔۔۔ یہ سات لعنتیں۔۔۔ دادا شہباز کی آواز بھرا گئی۔" ۶۷

ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر جاپانیوں کو شکست دینا ایک شدید واقعہ تھا۔ قاسمی نے تمام جنگوں کے اثرات پنجاب کی دیہی زندگی پر دکھائے۔ پیش نظر افسانہ نسل انسانی کی بقا کا آئینہ دار ہے۔ وہ سماج میں روشن خیالی اور محبت کے نقیب تھے۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ قاسمی کے ذہن پر جنگ عظیم اوّل نے اس حد تک اثرات مرتب کیے کہ وہ جنگ کے محرکات اور اثرات و نتائج کو اپنے اندازِ فکر میں افسانوں کی صورت میں ڈھال سکے۔ ہندوستانی نوجوانوں نے محض چند سکوں کی خاطر خون کی ہولی کھیلی۔ اس سے اگرچہ برطانوی استعمار پسندوں کے عزائم کی تکمیل ہوئی لیکن عمر بھر کا پچھتاوا ان نوجوانوں کا مقدر بن گیا۔ غیر ملکی آقاؤں کے حکم پر بھرتی افراد کی کہانی کو "اسلام علیکم" میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ وقتی سہارے امیر خان کی بیوی کو وفا سے محروم کر دیتے ہیں۔

تحریکِ خلافت کے وقت قاسمی پانچ برس کے بچے تھے جو اس تحریک سے آگاہ نہ تھے۔ ان کے علاقے میں تحریکِ خلافت کے جلسے ہوتے۔ قاسمی اپنے دوستوں کے ساتھ معصومانہ جوش و جذبے کے تحت نعرے لگاتے۔ اس امر نے بچپن سے تحریکِ خلافت کے ساتھ لگاؤ پیدا کر دیا۔ ایک انٹرویو میں قاسمی بتاتے ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ میں پہلی جماعت میں تھا یا شاید ابھی اسکول جانا شروع کیا تھا بلکہ مسجد میں قرآن شریف پڑھتا تھا تو اس وقت تحریکِ خلافت زوروں پر تھی۔ تحریکِ خلافت میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی میں اشتراک تھا، وہ متحد ہو کر تحریک چلا رہے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے گاؤں میں بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ساتھ ہندو رہنماؤں نے بھی تقریریں کیں۔ بعد میں گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر کے درمیان کوئی اختلاف ہو گیا تو صورتِ حال بدل گئی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ہمارے گاؤں میں ہمارے لوگوں نے ستیہ گرہ کیا اور گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں کوئی کسان تھا، کوئی موچی تھا، کوئی درزی تھا، کوئی نائی تھا، ان لوگوں نے چھے چھے ماہ جیلیں بھگتیں۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس دور افتادہ گاؤں میں اس قدر مضبوط تحریک چل سکتی تھی، لیکن تحریک چلی، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں کوئی جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اسی لیے تو وہ جیلوں میں گئے۔" ۶۸

قاسمی اپنے علاقے کی سیاسی و سماجی حالات بیان کرنے کے بعد اپنے متعلق لکھتے ہیں:

"اچھا ہم جو بچے تھے، تو ہم اس تحریک کے سلسلے میں سروں پر رومی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ وہ رومی ٹوپیاں جسے ترکی ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ ٹوپیاں گاؤں کے درزی نے ہمیں بنا کر دی تھیں، گتے کو گولائی میں کاٹ کر سی دیتے تھے۔ اس پر سرخ رنگ کا کھدر چڑھا دیتے

تھے اور اس پر سفید کھدر کا چاند تارا اور ایک پھندنا ٹانک دیتے تھے۔ جدھر بھی جاتے
یہ رومی ٹوپیاں نظر آتیں، یہ بھی انگریز کے خلاف تحریک کا حصہ تھا۔'' ۶۹

علاوہ ازیں قاسمی کی تحریکِ خلافت سے لگاؤ کی ایک وجہ ان کے چچا پیر حیدر شاہ کی تربیت تھی۔ پیر حیدر شاہ پنجاب میں اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ وہ سیاسی بصیرت بھی رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں اور ان کے اغراض و مقاصد سے واقف تھے۔ ان کے مختلف سیاسی شخصیات سے بھی تعلقات تھے۔ اس لیے وہ قاسمی اور ان کے بھائی کو ہندوستان کے سیاسی حالات سے آگاہ کرتے۔ قاسمی ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

''میرے چچا سرکاری افسر تھے اور ان دنوں سرکاری افسر انگریزوں کے خلاف ذرا کم ہی بات کر سکتے تھے لیکن میرے چچا اس مزاج کے تھے کہ میرے ساتھ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے، اس گفتگو سے میرے اندر یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ یہ غیر ملکی جو ہم پر آ کر مسلط ہو گئے ہیں اور غیر ملکی بھی کوئی اڑوس پڑوس کے نہیں، سات سمندر پار کے، جب میرا بس چلا تو ان کے خلاف لکھوں گا۔'' ۷۰

بچپن میں تحریکِ خلافت کے جلسوں میں شرکت اور شفیق چچا کی تربیت نے قاسمی میں اس تحریک سے لگاؤ پیدا کیا، جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ قاسمی نے اپنی پہلی نظم مرثیے کی صورت میں مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر لکھی۔ قاسمی نے محمد علی جوہر کے متعلق اپنے جذبات و خیالات کا اظہار اپنے افسانے ''ارتقا'' میں ایک کردار کی زبانی کیا ہے جب چاند خاں کے باپ نے محمد علی جوہر کی وفات کی خبر سنی تو:

''۔۔۔اس بھوبھل پر ایک بگولا جھپٹا، چنگاریوں کا ایک مینار بلند ہوا، یہ مینار اس کے ذہن کی وسعتوں میں رقصاں و جولاں رہا۔ اس روز اسے کسی پہلو قرار نہیں ملتا تھا،
چاند کو دیکھ کر کہتا تھا:
میرے بچے! تیرا سپہ سالار مر گیا۔
اپنے اُداس خلافتی ساتھیوں کو دیکھ کر کہتا تھا:
میرے رفیقو! تمہارا سرپرست چل بسا۔
مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے کہا:
میاں جی! ہماری ملت کا سہاگ لُٹ گیا۔'' ۷۱

محمد علی جوہر سے قاسمی کی جذباتی وابستگی تھی۔ ان کا افسانہ ''ارتقا'' تحریکِ خلافت کو بیان کرتا ہے۔ چاند خاں کے باپ کے دو جوان بیٹے جنگ عظیم اوّل میں شہید ہو چکے تھے۔ تحریکِ خلافت کے دنوں میں وہ وفورِ جذبات سے کہنے لگے:

''۔۔۔آج میں ان عالی جنابوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم پہلے آنسوؤں کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اب دل کا غبار نکالنے کے لیے تمہارے سامنے تمہاری اجازت کے بغیر یہ

آنکھیں شرارے اُگلیں گی اور یہ شرارے تمہارے خس و خاشاک پر گریں گے اور
تمہارے خس و خاشاک میں گرتے ہوئے ان شراروں کو ہماری آہیں ہوا دیں گی اور جب
شعلے بھڑکیں گے تو ہم ان شعلوں کے اردگرد ناچیں گے۔'' ۲؎

افسانہ ''ارتقا'' قیدوبند کی صعوبتوں اور ہندوستانی سیاست کی کٹھن صورتِ حال کے باوجود ولولہ انگیز بوڑھے شخص پر مشتمل ہے۔ جب بوڑھے کا جوان بیٹا ''چاند'' اسلام اور آزادی کے لیے محاذِ جنگ پر دادِ شجاعت دینے گیا تو بوڑھے کو اپنی تمام خواہشات مکمل ہوتی نظر آئیں۔ اسی روز بغداد سے چاند خاں کی ایک چٹھی آئی جس میں لکھا تھا ''میں نے حضرت پیر دست گیر سبحانی کے روضہ مبارک کی زیارت کی۔۔۔ وہاں میں نے دُعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے اپنے رسولؐ پاک اور اپنے اس نیک بندے کی برکت سے اس راہ پر قربان ہو جانے کی توفیق عطا فرما جو مجھے میرے ابا بچپن سے دکھاتے چلے آئے اور اباجان جب میں یہ دعا مانگ چکا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے روضہ شریف میں مرحوم محمد علی تشریف لے آئے ہیں اور میری دعا میں شامل ہو گئے ہیں۔ خط پڑھتے پڑھتے بوڑھے کی آواز بھرا گئی اور وہ بھیگی آنکھوں سے بولا، جب وہ پورا چاند بن جائے گا تو اپنے آپ کو سورج کے حوالے کر دے گا۔ ہاں ہاں ہمارا اپنا محمد علی دنیا کا سورج ہی تو ہے۔'' ۳؎ پیش نظر افسانے کے متعلق پروفیسر فتح محمد ملک اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''یہ اپنے قوم کی اجتماعی تمناؤں سے ندیم کی جبلی وابستگی کا کرشمہ ہے کہ افسانے کے
تینوں کردار بوڑھا، بڑھیا اور چاند تحریکِ آزادی کے جاں فروش پرستار اور تحریکِ پاکستان
کے بے لوث سپاہی بن جاتے ہیں۔'' ۴؎

تحریکِ خلافت کے موضوع پر ایک اور افسانہ ''سرخ ٹوپی'' ہے۔ یہ افسانہ تحریکِ خلافت کو بطور تحریک پیش کرتا ہے کہ کس طرح اس تحریک سے لوگ وابستہ رہے اور اس وابستگی کی پاداش میں انھیں کن دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑا۔ مذکورہ کہانی پنجاب کے ایک دُور افتادہ اور پسماندہ گاؤں کی کہانی ہے۔ گاموں کا باپ تحریکِ خلافت کا سرگرم رکن تھا جسے اس سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں سزا ہوئی۔ گاموں نے اپنے باپ کی سرخ ٹوپی کو بطور نشانی سنبھال کر رکھا، جو کچی دیوار میں چھت کے قریب لوہے کی ایک زنگ آلود میخ سے لٹکی رہتی جس پر چاند تارے کا نشان بھی تھا۔ گاموں (افسانے کا مرکزی کردار) نے اسے حرزِ جاں بنا کر رکھا۔ وہ اس کی بدولت اپنے بچے کا تابناک مستقبل بنانے کا خواہش مند تھا۔ گاؤں کا عیار نمبردار سادہ لوح گاموں کے اس ارادے سے واقف تھا۔ جب اس کے معاشی حالات آسودہ ہونے لگے تو ایک روز اُسے برخاست کر کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ بیوی کے سوالات کا وہ دُکھ سے جواب دیتا ہے:

''میرا نام کٹ گیا۔۔۔ وہ بولا:
میں پکا ہونے والا تھا۔ اس لیے میرے افسروں نے چال چلن کے بارے میں نمبردار

> سے پوچھ بھیجا، نمبردار نے لکھ دیا کہ یہ خطرناک آدمی ہے اس کا والد ''انت الہادی،
> انت الحق'' پڑھا کرتا تھا اور اس کے گھر میں ابھی تک سرخ رنگ کی ٹوپی لٹک رہی ہے
> جس پر چاند ستارے کا نشان ہے۔ افسروں نے مجھے برخاست کر دیا۔'' ۵ے

قاسمی کے یہ افسانے تحریکِ خلافت کی روداد فطری اور حقیقی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں تحریک میں لوگوں کی شمولیت، تحریک کے متعلق لوگوں کے جذبات بیان کیے ہیں۔ افسانہ نگار نے علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے محمد علی جوہر کی جگہ محمد علی جناح اور خلافت کے چاند تارے کی جگہ پرچم ستارہ و ہلال کو استعمال کیا ہے۔ درحقیقت ان افسانوں کے ذریعے قاسمی یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تحریکِ خلافت نے وہ سیاسی بنیاد فراہم کی جس پر تحریکِ پاکستان کی عمارت کھڑی ہوئی۔ تحریکِ خلافت کے لیے جدوجہد کرنے والا بوڑھا افسانے کے دوسرے حصے میں قیامِ پاکستان کے لیے مجسم دعا ہے۔ مذکورہ بالا افسانوں کی بابت فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

> ''تحریکِ خلافت ندیم کے ہاں اس مقدس آگ کی صورت میں جلوہ گر ہے جو کبھی بجھائی نہ
> جا سکی۔ انگریز کے سیاسی و معاشی استبداد نے جب گلی و بازار اور کھیت کھلیان میں اس
> آگ کو ٹھنڈا کر دیا تو یہ جاں بازوں کے دلوں میں دہکنے لگی۔ افسانہ ''ارتقا'' میں یہ آگ
> نسل در نسل منتقل ہوتی نظر آتی ہے اور اس کے زیرِ اثر تحریکِ خلافت تحریکِ پاکستان بنتی
> دکھائی دیتی ہے۔'' ۶ے

تحریکِ خلافت سے لگاؤ نے ہی پاکستان سے محبت کی صورت اختیار کی۔ قاسمی کے یہ افسانے قومی طرزِ احساس کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> ''سرخ ٹوپی اگر تحریکِ خلافت کے سامراج دشمنوں کی معنی خیز علامت ہے تو ''ارتقا'' کی
> پوری فضا میں ہندی مسلمانوں کا جداگانہ تہذیبی وجود سانس لے رہا ہے اور چاند تارے کی
> علامت نے تحریکِ خلافت کو تحریکِ پاکستان سے آملایا ہے۔'' ۷ے

جنگِ عظیم دوم کی ابتدا ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ جب وائسرائے ہند نے برعظیم پاک و ہند کو بھی اس جنگ میں فریق قرار دیا۔ چناں چہ ہندوستان سے وسیع پیمانے پر فوجی بھرتی کے ذریعے نوجوانوں کو بیرونِ ملک بھیجا گیا۔ جنگِ عظیم کے دوران پنجاب کی عکاسی قاسمی نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں کی ہے لیکن افسانہ میں اس کا اظہار وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ ''سپاہی بیٹا'' کی ماں، فوجی بھرتی کی ٹیم کو اپنے گھر لاتی ہے لیکن گھر جا کر انھیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑھیا جس خوب رو، بہادر نوجوان کو بھرتی کرانے آئی ہے وہ تو ایک ماہ قبل رنگون میں مارا جا چکا ہے۔ افسانے کی آخری سطور میں ماں کی گفتگو، مرحوم بیٹے کا دل گداز مرثیہ بن جاتی ہے۔ یہ سطور المیہ کی شدت میں اضافہ کا موجب بنتی ہیں۔ غربت سے نجات کی خواہش میں ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو جنگ پر بھجوایا تھا لیکن مفلسی کی گرفت اس بوڑھی

عورت پر جوں کی توں قائم رہی۔ ''سپاہی بیٹا'' کی ماں بلیغ انداز میں کہتی ہے:

''اتنی غریب ہوں صاحب جی کہ آج مجھے گھن لگے چنے کھانے پڑے۔ تب سے جیسے پیٹ میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔ گھن لگے چنوں میں چنا تو ہوتا ہی نہیں، صرف چھلکا ہوتا ہے اور چھلکا بھی ایسا کڑوا جیسے کریلا۔'' ۷۸

ماں کے یہ دل گداز جملے ذیل دار اور انگریز حکمرانوں کے اس وعدے کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرتے ہیں جس کی رو سے فتح یاب ہو کر گاؤں واپس آنے والے فوجی تمغے اور سندیں حاصل کریں گے اور جو زندہ بچ کر نہ آ سکا۔ اس کے اہل و عیال پنشن پائیں گے۔ ''بابا نور'' سفید صاف ستھرے لباس اور بانکپن چال ڈھال کا مالک تھا جس کا بیٹا برما کے محاذ پر مر گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کا بلاناغہ معمول تھا کہ وہ ڈاک خانے آتا اور کہتا:

''ڈاک آ گئی منشی جی؟
آ گئی بابا۔ منشی نے جواب دیا۔
میرے بیٹے کی چٹھی تو نہیں آئی۔ بابا نے پوچھا۔
نہیں بابا۔ منشی بولا۔'' ۷۹

اور بابا نور چپ چاپ نامراد واپس لوٹ جاتا۔ بلاناغہ ایک لمبے عرصے سے اس کا یہی معمول تھا۔

''پھر منشی بولا: آج دس سال سے بابا نور اسی طرح آ رہا ہے۔ یہی سوال پوچھتا ہے اور یہی جواب لے کر چلا جاتا ہے۔ بے چارے کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ سرکار کی وہ چٹھی بھی تو میں نے ہی اسے پڑھ کر سنائی تھی جس میں خبر آئی تھی کہ اس کا بیٹا برما میں بم کے گولے کا شکار ہو گیا۔ جب سے پاگل سا ہو گیا۔ پر خدا کی قسم ہے دوستو! اگر آج کے بعد وہ پھر بھی میرے پاس پوچھنے آیا تو مجھے بھی پاگل کر جائے گا۔'' ۸۰

یہ کہانی قاری کو رقت انگیز کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بابا نور کا المیہ قاری کو اپنے کسی عزیز کا المیہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہی ایک ماہر افسانہ نگار کی فنی چابک دستی کا کمال ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اس کہانی کو قاسمی کی غیر فانی تخلیق قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کہانی میں ندیم نے بابا نور کی دیوانگی سے جو رقت اور نشتریت پیدا کی ہے وہ میرؔ کی یاد دلاتی ہے:

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ'' ۸۱

افسانہ ''ہیرا'' کا وریام اپنی آنکھوں سے محاذِ جنگ پر بربریت اور تشدد دیکھ آیا تھا۔ اس تخریب اور خوف و دہشت کی بنا پر اُس کے ذہن میں گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی۔ اس کو اپنا پُرسکون گھر میدانِ جنگ کا نقشہ نظر آتا۔ برطانوی سرکار نے اس ذہنی مریض کا علاج معالجہ کروانے کے بجائے اسے معذور سپاہی جان کر گاؤں پھینک دیا اور پنشن کا بھی وعدہ کھوکھلا ثابت ہوا۔ اس کی بیوی (زینو) گھر کا سامان بیچ کر اور محنت مشقت کر کے گھر کا

انتظام چلاتی رہی۔ جب وریام پر یہ حقیقت منکشف ہوئی تو اس نے غیرت کے مارے خودکشی کر لی۔ غافر شہزاد لکھتے ہیں:

> ''معاشی مسائل اور غربت سے تنگ آ کر محاذ جنگ پر جانے والا یہ کردار اپنے اندر انا اور خودداری کو زندہ رکھے ہوئے ہے جب انا اور خودداری چکنا چور ہوتی ہے۔ یہ کردار خودکشی کر لیتا ہے۔'' ۸۲

قاسمی نے جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نفسیاتی بحران کی کامیاب منظر کشی کی ہے۔ جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اخلاقی بحران کی مصوری ''السلام علیکم'' میں ملتی ہے۔ امیر خاں نے فرانس کے ایک گاؤں میں لیوسی سے تعلقات قائم رکھے تین برس کے بعد محاذ جنگ سے واپس اپنے گاؤں پہنچا تو صبح سویرے اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ ہم بستر پایا۔ اس کی بیوی اپنے آشنا سے کہہ رہی تھی:

> ''جاؤ، دن چڑھ آیا ہے۔ مرغ کب کے بانگیں دے چکے، جاؤ۔'' ۸۳

امیر خان کو لیوسی کے الوداعی کلمات یاد آتے ہیں:

> ''جاؤ جاؤ، دن چڑھ آیا ہے، بگل کب کا بج چکا، جاؤ۔'' ۸۴

امیر خان کو اُس لمحے پنجاب اور فرانس میں کوئی تفاوت دکھائی نہیں دیتا، اخلاقی بحران کا ایک دوسرا رُخ جنگ میں رحلت کر جانے والوں کے پس ماندگان میں، پنشن کے تنازعات سے پیدا ہونے والے تصادم پر مشتمل ہے۔ ''آتش گل'' میں رمضو برما کے محاذ پر مارا جاتا ہے۔ اس کا بوڑھا باپ ہوسِ زر میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی جوان بہو پر رکیک الزام عائد کر کے اپنے یتیم پوتوں کو پنشن سے محروم رکھتا ہے۔ ''گلابو'' اپنے سُسر کے متعلق کہتی ہے:

> ''پندرہ روپے بڈھے کے دماغ میں اس زور سے بجے ہیں کہ میں تو کہتی ہوں کہ اگر اب اُسے جیتا جاگتا رمضو مل جائے تو پنشن بند ہونے کے ڈر سے وہ اُسے اپنے ہاتھ سے مار ڈالے گا۔'' ۸۵

''راجے مہاراجے'' تمثیلی نوعیت کا افسانہ ہے جس میں جنگ کو سامراجی نظامِ سیاست و معیشت کا ناگزیر نتیجہ دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بوڑھی اُستانی ہے جو مادرِ انسانیت کا بلیغ استعارہ ہے۔ مکی (امریکہ)، دلی (برطانیہ) اور خلوف (روس) آپس کے اختلافات مٹانے کے لیے اُسے نیند سے بیدار کرتے ہیں مگر یہ تینوں ایک دوسرے پر الزام دھرتے ہیں جس کی بنا پر اختلافات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> ''تینوں اپنی اپنی ملوکانہ اغراض کی خاطر چاند کی سیاحت کے تمنائی ہیں۔ اُستانی انھیں چاند کی بجائے زمین کی الم ناک سرگزشت سناتی ہے۔ یہ کہانی کرۂ ارض کے وجود میں آنے اور پھر اُس پر انسانی زندگی کے آغاز سے لے کر ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔۔۔ اُستانی مشرق کے مقدر پر آنسو بہاتی ہے، جسے مغربی استعمار

نے محکوم و مجبور اور زار و زبوں بنا رکھا ہے۔ مشرق از سلطانی مغرب خراب اور آدمیت زاد نالید از فرنگ مغرب اشیا پرستی میں منہمک ہے تو مشرق تصور پرستی میں۔ مشرق میں طلسمی جاپ کی سرسراہٹ اور ہمہ اوست ۔کے نغموں کا شور ہے تو مغرب میں اسلحہ ساز کارخانوں کی گھن گرج ہے۔'' ۸۶

قاسمی نے معاشرے پر جنگ کے اثرات کو فن کارانہ صناعی کے ساتھ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' میں پیش کیا ہے۔ ممتاز شیریں نے اس افسانے کو ''ایک گاؤں، ایک دور اور ساری انسانیت کی کہانی قرار دیا ہے۔'' اسی افسانے کو ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے ''اردو ادب کا معنی خیز افسانہ بتایا ہے۔'' اس افسانے کے متعلق خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''دوسری جنگ عظیم پر شاید اتنا کامیاب افسانہ اردو میں کسی نے نہیں لکھا۔ اس افسانے میں بین الاقوامی شعور سے قطع نظر بے لاگ خارجیت اور وہ حقیقت نگاری ہے جو ان مسائل کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے اور افسانہ اپنے حدود سے نکل کر ایک وسیع مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔'' ۸۷

اس افسانے میں قاسمی نے پنجاب کے گاؤں کی تصویر دکھائی ہے مگر جس کے بیانیے سے پنجاب کے ہر دیہی علاقے کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے جس کے خوب رو نوجوانوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ افسانہ میں شمشیر خان اقتصادی بحران سے تنگ آ کر فوج میں بھرتی ہو کر محاذِ جنگ پر چلا جاتا ہے۔ اس کی بیوی (شاداں) جو وفا کی دیوی تھی بالآخر اپنے بچے کو یتیم خانے داخل کروا کر دھوبی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اس طرح امن و سکون، تقدیس اور وفا کی دنیا جنگ سے قبل آباد تھی۔ وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ افسانے کا پورا بیانیہ گاؤں کی مجموعی فضا پر جنگ کے اثرات کی ایسی جان دار تصویر کشی کرتا ہے جس سے ویرانی اور اجاڑ پن کے تاثرات نمایاں ہوتے ہیں۔

''زندگی جیسے پاؤں گھسیٹتی پھر رہی تھی۔ ماری ماری، خانماں برباد اور پریشان حال، گھومتی اور چکرائی ہوئی، اونچی نگروں پر رکتی اور گہری کھاڑیوں میں ٹھٹکتی ہوئی۔ لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سریلے گیتوں کی تلاش میں۔ مگر لال گالوں کو گدھ نوچ کر لے گئے تھے، چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھیں اور سریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا اور جنگ جاری تھی۔۔۔ عوام کی جنگ۔۔۔ جمہوریت کی جنگ۔۔۔ نوع انسان کی آزادی کی جنگ۔'' ۸۸

قاسمی جنگوں کے حوالے سے ان افراد کا تذکرہ کرتے ہیں جو پیٹ کے تقاضوں سے مجبور ہوئے۔ جو مادی ضروریات کو ترستے رہے اور انھی مجبوریوں کے تحت جنگ کا ایندھن بن گئے۔ جنگ کی ہولناکیوں کی تصویر کشی کے علاوہ قاسمی نے ماحول اور نفسیاتی فضا کی مصوری بھی عمدہ طریقے سے کی ہے۔ انھوں نے معاشی زوال سے لے کر

اخلاقی تباہ و برباد ی تک گاؤں کی کہانی سنائی ہے کہ قاری کے ذہن میں جنگ کی ہولنا کی کا نقشہ اُبھر آتا ہے۔
یہی ان کی فن کاری ہے کہ جب وہ جنگ کو موضوع بناتے ہیں تو پورے معاشرے کو لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

''آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا مگر اس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ۔
ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں۔ کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح
کنیلا تھا۔ مویشی تک اُداس نظر آتے تھے۔ ہر جمعرات کو چوپال سے پرے گاؤں کے
قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور
ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس ان کے سرہانے دیئے
رکھ کر دعائیں مانگتیں:
میرا بیٹا واپس آئے۔ میرا مالک واپس آئے۔ میرا بھیا واپس آئے۔'' ۸۹

گاؤں کی چوپال پر ہر رات کرہ ارض پر منتشر جنگی محاذوں کے تذکرے اور تبصرے ہوتے۔ نت نئی خبریں سنی جاتیں، ان خبروں پر حاشیہ آرائیاں ہوتیں اور سب کے ذہن اُن انجان دیسوں میں بھٹکنے لگتے جہاں اُن کے بیٹے، شوہر، بھائی، نواسے اور پوتے سپاہیوں کے فرائض سرانجام دینے میں مصروف تھے۔ ہر صبح سب گاؤں کے افراد یکے بعد دیگرے اپنے شوہروں، بیٹوں، نواسوں اور پوتوں کے خط وصول کرنے آتے اور مغموم چہروں اور اُداس آنکھوں سے واپس لوٹ جاتے۔ پھر ایک دن:

''اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر برآمد ہوا۔
ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اُسے سرکار نے اطلاع دی تھی کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی
ہو چکا ہے۔۔۔ خط کھلتے جاتے تھے اور آنکھیں بھیگتی جاتی تھیں۔ اچانک ایک طرف
سے ایک بوڑھے نے پٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا:
میں اُجڑ گیا۔
اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں۔۔۔ ڈاک خانہ ماتم کدہ بن گیا۔ کوئی جنگ میں
مارا گیا، کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا، کوئی جاپان کا قیدی تھا۔۔۔ آن کی آن میں گاؤں کے
بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا۔'' ۹۰

قاسمی نے اس افسانے میں معاشی زوال سے پیدا ہونے والی اخلاقی بربادی اور جذباتی و نفسیاتی سرگزشت کو کرب ناک کیفیت میں بیان کیا ہے۔ گاؤں جوانوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہر گاؤں کا، ہر فرد دکھوں کی گٹھڑیاں اُٹھائے پھر رہا ہے، ہر چہرہ اُداس ہے، ہر آنکھ نم ہے۔ قاسمی نے جنگ کی ہولناکیوں اور بربادیوں کو شدت سے محسوس کیا جن کا نشانہ مفلس اور حاجت مند افراد کو مادی ضروریات کے پیشِ نظر بننا پڑا۔ انھیں یہ تباہیاں اپنے دل میں اُترتی محسوس ہوتی تھیں۔ قاسمی جنگ کے مخالف تھے۔ یہ ہر اس امر کے مخالف تھے جو انسانیت سے خوشی، امن اور سکون چھین لے۔ یہ جنگ محض استعماری قوت تھی جو اپنے استعماری وسائل کے تحفظ کے لیے دوسری

اُبھرتی ہوئی استعماری قوت سے برسرپیکار تھی۔ ایسی جنگوں سے انسانیت بھلائی کی بجائے مزید شکنجوں میں جکڑی جاتی ہے۔ قاسمی جنگ کو انسانیت کا بدترین دشمن تصور کرتے تھے۔ یہ اس امر کے تمنائی تھے کہ کرہ ارض پر ایسی کوئی جنگ نہ ہو جو ماؤں سے اُن کے بیٹے، عورتوں سے اُن کا سہاگ، بہنوں سے اُن کے بھائی، بچوں سے اُن کا باپ چھین لے۔ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' کا ایک کردار جنگ پر گئے نوجوانوں کی واپسی کی دعائیں سن کر کہتا ہے:

''کوئی واپس نہیں آئے گا۔۔۔تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں۔ ان کے ذہن مر چکے ہیں۔ ان کے عقیدے مر چکے ہیں۔ ان کے جسم شاید واپس آ جائیں لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے اور اس لیے جب وہ واپس آئیں گے تو تمہارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے، وہ دھرتی کے بیٹے ہوں گے اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکن گولی چلائے گا تو درد کے مارے چلا اُٹھیں گے۔ جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا تو وہ بلبلا اُٹھیں گے۔ جب دلی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے بھیجے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اُٹھیں گے اور پکار اُٹھیں گے اور ان کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی۔ واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی۔'' ۹۱

جنگ کے موضوع پر قاسمی کی کہانیاں قاری کے دل میں کشت وخون سے نفرت اور پرامن زندگی سے لگاؤ کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ ''ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد'' اگرچہ آفاقی نوعیت کا افسانہ ہے۔

اس افسانے کے متعلق ڈاکٹر افشاں ملک رقم طراز ہیں:

''۔۔۔انھوں نے معاشرے پر جنگ کے گہرے اثرات، اس کی ماہیت کو تخلیقی غور و فکر کے بعد جو آفاقیت بخشی ہے اور جس ہمہ گیر انداز سے جنگ کی آگ میں جھلسنے والی انسانیت کو پیش کیا ہے۔ اس کی پرچھائیں بھی اردو کے بڑے افسانوں میں نظر نہیں آتی۔'' ۹۲

قاسمی نے عالمی جنگ کے اثرات کو الم ناک انداز سے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے جنگ کے ہول ناک مناظر اور وحشت و بربریت کو غیر جانب داری سے دکھایا ہے کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ انھوں نے پیٹ کے تقاضوں سے مجبور، مادی ضروریات سے ترستے افراد کو جنگ کا ایندھن بنتے دکھایا ہے۔ رابعہ اختر اپنے مقالہ میں لکھتی ہیں:

''انھوں نے جنگ سے متاثر خانگی اور ازدواجی نظام کی ایسی دردناک تصویر کشی کی ہے کہ قاری کے ذہن میں جنگ کی ہولناکی کا نقشہ اُبھر آتا ہے۔ یہی ان کا آرٹ ہے کہ جہاں وہ جنگ کو موضوع بناتے ہیں۔ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔'' ۹۳

قاسمی کی تمنا ہے کہ سب انسان مل کر ارادہ کریں کہ:

ہم اپنی دنیا کو ویران ہونے نہ دیں گے
ہم نئی جنگ عالم کا اعلان ہونے نہ دیں گے ۹۴

پنجاب پر یونینسٹ پارٹی حکمران تھی جس کا محور سرگودھا، خوشاب کے علاقے تھے۔ اس پارٹی کا مقصدِ اولیٰ برطانوی راج کا استحکام تھا۔ ان علاقوں پر انگریز راج کے استبداد کے سائے منڈلا رہے تھے۔ برطانوی سامراج کے خوشامدی سفاک جاگیردار اور متکبر حکمران بضد تھے کہ یہ گہرے سائے مستقل رہیں۔ تحریک کے کارکنوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ پاکستان کے حق میں نعرہ لگانے والوں کو پابند سلاسل کیا جاتا۔ مسلم لیگ کا جھنڈا پھاڑنے والوں کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا۔ قاسمی ان تمام افراد کی نظروں سے تاریکیوں کے سائے روشنیوں میں تبدیل کرنے کے خواہش مند تھے۔ پیرزادہ محمد بخش اس سلسلے میں قاسمی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قائداعظم کی رہنمائی میں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔۔۔ (شاہ نے) مسلم لیگ کا جھنڈا کاندھے پر رکھا اور اپنے گاؤں کے نوجوانوں کا جلوس لیے علاقہ سون سکیسر کے گاؤں گاؤں میں گھومنے لگا اور یوں وہ ضلع سرگودھا کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک ''خطرناک'' مہم کا لیڈر بن گیا۔ خطرناک اس لیے کہ اس وقت یونینسٹ وزارت برسرِ اقتدار تھی اور یہ علاقہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خاں کا حلقہ انتخاب تھا۔ یونینسٹ وزارت اس بات پر تُل گئی تھی کہ چاہے کتنے ہی بے گناہوں کو جیل میں ٹھونس دینا پڑے، وہ یونینسٹ امیدواروں کے مقابلے میں کسی مسلم لیگی کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے لیکن شاہ کو نہ تو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی ہر طرف سے اُٹھتی جھنکار خوف زدہ کر سکی اور نہ اپنے خاندان کے بزرگوں کی شدید ناراضی اس کے قدموں کو جکڑ سکی۔ وہ بے دھڑک اس میدان میں کودا، اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔'' ۹۵

ان دنوں مسلم لیگ پنجاب میں مقبول ہو رہی تھی۔ ہر شخص کے لبوں پر پاکستان زندہ باد کا نعرہ تھا۔ ایسے ہنگامہ خیز ماحول میں قاسمی نے مسلم لیگ کی عملی سیاست میں حصہ لیا۔ ان کی جذباتی وابستگی پاکستان اور آزادی کے ساتھ تھی۔ یہی وابستگی ان کی ادبی شخصیت میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۵ء کی بات ہے۔۔۔ ظہیر بابر بھی گاؤں میں تھے۔۔۔ ہم نے تحریکِ پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا، خود کو منظم کیا اور تحریک کا آغاز کر دیا۔ ظاہر ہے کہ علاقے کے دوسرے لوگوں کا تعاون بھی ہم نے حاصل کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ سون سکیسر کا پورا علاقہ تحریکِ پاکستان کا گڑھ بن گیا ہو۔'' ۹۶

قاسمی کی جذباتی وابستگی تحریکِ پاکستان سے بہت گہری تھی۔ ان کی تخلیقات اس امر کی شاہد ہیں۔ ''آس پاس'' میں

شامل افسانہ ''افق'' میں قاسمی چند کرداروں کے ذریعے پوری قوم کے افراد تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں:

''چلتے رہو۔ میرے تھکے ماندے ساتھیو! تمھیں ستاروں کا ساتھ دینا ہے۔ اندھیرے کی شکایت نہ کرو۔ راتیں اکثر اندھیری ہی ہوتی ہیں۔۔۔ چاند نکلتا ہے تو اندھیرے کو غاروں اور گپھاؤں کے سوا اور کہیں جائے پناہ نہیں ملتی۔ سو چلتے رہو۔ میرے تھکے ماندے مسافرو اور سفر کی درازی کی باتیں نہ کرو۔'' ۹۷

مندرجہ بالا افسانے میں اندھیرے سے اُجالے کی جانب کٹھن اور صبر آزما سفر ایک موسیقار، شاعر، مصور اور فلسفی طے کرتے ہیں جو کسی تہذیب کو فکری بنیادیں اور جمالیاتی حسن عطا کرنے کے خواہش مند ہیں بلکہ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کردار قاسمی کی تخلیقی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ تحریکِ پاکستان کے تمام رہنماؤں سے بہت متاثر تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان رہنماؤں کی سرکردگی میں پاکستان سماجی مساوات کی مثال قائم کرے گا۔ قاسمی ان کے ہمراہ چلے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد بالخصوص رحلتِ قائد کے بعد کی سیاسی، سماجی، اقتصادی صورتِ حال نے انھیں بہت مغموم کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ پاکستان میں ایسا سیاسی و معاشی نظام قائم ہو جو غریبوں اور کمزوروں کی حق تلفی نہ کرے۔ وہ ایسا معتدل معاشرہ چاہتے تھے جہاں نوجوان نسل کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل سکے۔ لیکن جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سرکاری اہل کاروں نے استحصالی ہتھکنڈوں کو اپنایا۔ وہ سب قابلِ برداشت نہ تھا۔ اس کا اظہار قاسمی ''جب بادل اُمڈے'' کے جاگیردار ''تسکین'' کے کردار کی صورت میں کرتے ہیں۔ قاسمی نے ایک کردار کی زبانی ان ذیل داروں اور جاگیرداروں کو ملک کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے والے بدنما پھوڑے کہا ہے:

''۔۔۔اور جب جاگیردار تھوک نگلنے کے بعد رُکا تو وہ بولا:

مجھے معلوم نہ تھا کہ پاکستان بھی اپنے اندر آپ ایسے پھوڑے چھپائے بیٹھا ہے اور جاگیردار جی اگر پاکستان کو زندہ رہنا ہے تو اسے یہ پھوڑے کاٹ پھینکنا پڑیں گے۔'' ۹۸

شومئی قسمت کہ ایسے پھوڑے جڑ سے کاٹ پھینکنے کی بجائے ملکی سیاست کے ماتھے پر جھومر کی مانند سجا دیے گئے اور اس طرح سینکڑوں افراد اپنے خوابوں کو آنکھوں میں دفن کر بیٹھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے یہ لوگ انگریز کے خیر خواہ تھے۔ اب پاکستان کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ ملک کی باگ ڈور انھیں افراد کے ہاتھوں میں تھی۔ افسانہ ''ووٹ'' میں قاسمی نے آزادی کے بعد کی سیاسی صورتِ حال کی بھرپور عکاسی کی ہے کہ وہی افراد صاحب اقتدار ہوئے جنھوں نے خضر حیات کے دور میں پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے مسلم لیگ کے کارکنوں پر جھوٹے مقدمے چلوا کر انھیں پابند سلاسل کیا۔ اگر کوئی ''جناح'' کا نام لیتا اسے چوپال کے ستونوں سے باندھ کر لہولہان کر دیا جاتا۔ اس پر مزید تشدد کے لیے مرچوں کا دھواں دیا جاتا لیکن جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو:

''۔۔۔ملک صاحب کے بنگلے پر اتنا اونچا جھنڈا نصب کیا گیا کہ کوؤں، چیلوں اور چڑیوں

> نے کچھ دن کے لیے ادھر آنا تک چھوڑ دیا تھا اور آج ملک صاحب پاکستان کے بہت بڑے خیرخواہوں میں گنے جاتے ہیں۔۔۔صوبے کی لیگ کے جلسوں میں ہوا کا رُخ دیکھنا ہو تو ملک صاحب کو دیکھو جدھر وہ ہوں گے ادھر ایک دنیا ہوگی۔" ۹۹

قیامِ پاکستان سے قبل حکومت استبدادی گروہ کے ہاتھوں میں تھی اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی انہی کے ہاتھوں میں رہی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب انگریز کو وطن چھوڑ کر جانا پڑا لیکن برطانوی سامراج کا طبقہ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ عدم اطمینانی اور شکست اس دور کا غالب رجحان تھا جس سے نہ صرف ترقی پسند مصنفین متاثر تھے بلکہ ہر ادیب انہی تاثرات کا شکار تھا۔

قیامِ پاکستان کی نوید، قاسمی کے لیے ایک نئے جہان کی تخلیق تھی جہاں امن، سکون، محبت، پیار اور معاشی مساوات کا در وا ہوگا۔ ۱۳ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب ریڈیو پشاور سے قیامِ پاکستان کے اعلان کے ساتھ قاسمی کا لکھا ہوا پاکستانی ترانہ نشر ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ کئی روز تک اسی مسرت میں سرشار رہے۔ تقسیم ہند کے وقت خون ریزی، بربریت اور فرقہ ورانہ فسادات کا ایسا سیلاب اُمڈ آیا جس نے حیاتِ انسانی کی اعلیٰ قدروں کو خاکستر کر دیا۔ معروف ماہر قانون اور سیاسی مبصر اے جی نورانی کے خیال میں تقسیم ہند کا واقعہ دنیا کے دس سب سے زیادہ الم ناک حادثوں میں سے ایک تھا۔ تقسیم ہند ایسا واقعہ تھا کہ ہر آنکھ نم اور ہر دل پاش پاش تھا۔ ان حالات کی عکاسی ادب کی بیشتر اصناف میں ہوئی لیکن اس بربریت و وحشت کو جزئیات کے ساتھ اردو افسانے میں کامیابی سے پیش کیا۔ اردو افسانہ نگاروں کے ہاں جذباتی رویہ پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنے اندازِ تحریر کو بھی جذباتی ہیجان عطا کیا اور دل کش ادب پارے تخلیق کر کے اس موضوع کو منظرعام پر لائے مثلاً کرشن چندر کا "پشاور ایکسپریس"، بیدی کا "لاجونتی"، عزیز احمد کا "کالی رات"، احمد عباس کا "سردار جی"، حیات اللہ انصاری کا "شکرگزار آنکھیں"، ممتاز مفتی کا "ثمینہ"، ہاجرہ مسرور کا "بڑے انسان بنے بیٹھے ہو"، کرشن چندر کا "ان داتا"، قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا"، منٹو کا "کھول دو" اور احمد ندیم قاسمی کا "پرمیشر سنگھ"، "کفن دفن"، "فساد"، "نیا فرہاد"، "کپاس کا پھول"، "بڑی سرکار کے نام"، "میں انسان ہوں" میں انفرادی و اجتماعی المیے کو فسادات کی ہولناکیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ "در و دیوار" کے بیشتر افسانوں کا موضوع فسادات اور ہجرت کی سیاسی و سماجی صورتِ حال پر مشتمل ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات میں بہت سے لوگ وحشی درندوں کی مانند ہو گئے تھے۔ افراد کے دلوں سے انسانیت کی رمق ختم ہو گئی تھی۔ افسانہ "نیا فرہاد" مشمولہ "در و دیوار" میں جعفر کا کردار فرقہ وارانہ فسادات کی نمائندگی کرتا ہے۔ تقسیم ہند کے پرآشوب دور میں پرسکون جگہوں پر افواہوں نے ہنگامے برپا کیے۔ لاہور کا انتقام امرت سر سے اور دلی کا انتقام لاہور سے لیا جانا روز کا معمول بن گیا تھا۔ گاؤں میں زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی، ہندو اور مسلمان اتحاد و محبت کی بدولت

زندگی کی شاہراہوں پر کامیابی سے گامزن تھے۔ جب ایک اجنبی مسافر نے بتایا:

''لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر مسلمانوں کی لاشیں بچھا دی گئی ہیں اور ان پر سے سکھوں اور
ہندوؤں کی موٹریں اور لاریاں گزر رہی ہیں اور ان پر کودا اور ناچا جا رہا ہے اور
لارنس باغ میں ایک بہت بڑی دیگ گاڑ دی گئی ہے جس میں تیل کڑکڑا رہا ہے اور
شیرخوار مسلمان بچے تلے جا رہے ہیں۔'' ۱۰۰؎

مسافر تو ماہیا گاتا ہوا رخصت ہوا لیکن اہلِ گاؤں کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں آ گئیں۔ جعفر تن کر کھڑا ہوا اور بجلی کی طرح گرج کر اپنے بھائیوں کے خون اور بہنوں کی بے عزتی کے بدلے کا حکم دیا۔ جعفر کی آواز کے ساتھ ہی نوجوان دیواریں پھاند پھاند کر، دروازے توڑ توڑ کر گھروں میں داخل ہو گئے اور ہندوؤں اور سکھوں کا مال چرانے، چھرے گھونپنے اور گھروں کو آگ لگانے لگے۔ شانتی (جعفر کی محبوبہ) نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور جعفر کو بھی احساس ہوا کہ ذیلدار اور نمبردار تو حقے کے کش لے رہے اور پنڈلیاں دبوا رہے ہیں جب کہ مسلمان، ہندو اور سکھ ایک دوسرے کو قتل کر کے اپنے مذہب کا نام روشن کر رہے ہیں۔ پھر گلیوں میں دوڑتا جعفر نوجوانوں سے چلا چلا کر کہتا رہا:

''گلی گلی میں بکھر جاؤ اور سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے سینوں سے لگاؤ۔ انھیں دلا سے دو۔
ان سے پیار کرو اور اس گاؤں کو، اس پنجاب کو، اس دنیا کو اُجڑنے سے بچا لو۔ آگ
بجھاؤ، زخمیوں کے پٹیاں باندھو۔'' ۱۰۱؎

شیخ محمد غیاث الدین ''جعفر'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''نیا فرہاد بھی ویسے ہی شکست کھا گیا جیسا پرانے فرہاد کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا دشمن
بادشاہِ وقت تھا اور اُس کا فرقہ پرست افراد۔'' ۱۰۲؎

فساد کی ہولنا کی کا مظہر افسانہ ''کپاس کا پھول'' بھی ہے۔ قاسمی نے ان تمام کشت وخوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسے اپنی تحریروں میں پیش کیا۔

تقسیم ہند کے موضوع پر تخلیق کیے گئے افسانوں میں ''پرمیشر سنگھ'' کی حیثیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہجرت کے دوران اختر اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہے۔ اسی طرح پرمیشر سنگھ بھی اپنے بیٹے اختر سے اچانک جدا ہو جاتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے اختر ایک انسان دوست سکھ پرمیشر سنگھ کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ وہ اختر میں اپنے بیٹے کرتار کا روپ دیکھتا ہے۔ اُس نے اگرچہ اختر کو نہایت ناز ونعم میں رکھا لیکن اختر اپنی ماں کو نہ بھلا سکا۔ اختر اپنی ماں کی سکھائی ہوئی تہذیبی روایات کو فراموش نہ کر سکا۔ اختر اپنی ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتا جو پانچ وقت کی نماز پڑھتی تھی اور بسم اللہ کہہ کر پانی پیتی تھی۔ ایک رات پرمیشر سنگھ کو کچھ پڑھنے کی آواز آئی تو اختر نے

فخریہ انداز سے اعتراف کیا کہ وہ کیا پڑھ رہا تھا۔ قاسمی نے اس صورت حال کو عمدگی سے بیان کیا ہے:

''کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟ پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

پڑھوں؟ اختر نے پوچھا۔

ہاں ہاں۔ پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قُل ھُوَ اللّٰہُ اَحد پڑھنے لگا۔ کُفُواً اَحد میں پہنچ کر اُس نے اپنے گریبان میں

چھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔

ہاں ہاں۔ پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔'' ۱۰۳؎

پرمیشر سنگھ زندگی کو حقیقت کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ اختر کئی مہینے پرمیشر سنگھ کے گھر میں رہا۔ وہ اکثر اپنی ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے۔ ایک دن پرمیشر سنگھ اسے سرحد پار کروانے کے لیے آیا۔ مذہبی تعصب کی بنا پر ایک پاکستانی سپاہی نے رائفل داغ کر پرمیشر کو نشانہ بنایا۔ وہ چلا اُٹھا:

''مجھے کیوں مارا ہے تم نے۔۔۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا۔'' ۱۰۴؎

''کپاس کے پھول'' کا کردار مائی تاجو جو ایک محنت کش بڑھیا ہے جو تمام عمر چکی پیس پیس کر اپنا پیٹ پالتی رہی۔ گاؤں بھر میں مائی تاجو کی ہمدرد ایک دیہاتی دوشیزہ راحتاں ہے جو بھارتی فوجیوں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ مائی تاجو اس کی عصمت بچانے کی بہت کوشش کرتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ مائی تاجو نے محنت کی کمائی سے جو کفن خریدا تھا وہی کفن راحتاں کے تن ڈھانپنے کے کام آیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

''کپاس کا پھول ایک خوب صورت استعارہ کے طور پر اس افسانہ کی روح میں جلوہ گر ہے۔ کپاس کے پھول سے لٹھا بنتا ہے اور اس لٹھے سے کفن، اور یہی کفن مائی تاجو نے اپنے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ چناں چہ گاؤں سے نکلتے وقت اس کے پاس صرف اپنا کفن ہی ہے اور یہ کفن اس کے کام نہیں آتا بلکہ راحتاں کی عریانی ڈھانپنے کے کام آتا ہے۔ کفن میں لپٹا انسان زندگی کا آخری سفر ختم کرنے کے بعد قبر میں آسودہ خواب ہوتا ہے یعنی یہاں ایک نوجوان لڑکی جس کی عصمت دشمن سپاہیوں نے لوٹی۔ وہ اپنی عزت گنوانے کے بعد مائی تاجو کا کفن لپیٹ کر نئے عزم سے نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔'' ۱۰۵؎

اسی طرح ''کفن دفن'' میں فسادات اور پناہ گزینوں کی زندگیوں کو بیان کیا ہے۔ اس میں موجود نفسیاتی پہلو بہت سی حقیقتوں کو منکشف کرتا ہے۔ تقسیم کے بعد خون ریز فسادات ہوئے۔ انسانوں کو تعصب اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا اور بوئے خون سے لوگ اتنے وحشی ہو گئے کہ بزرگوں کا احترام، معصوم بچوں کی شفقت اور صنفِ نازک کا احترام دل سے جاتا رہا۔

تقسیم ہند کے بعد جو لوگ ہجرت کے بعد اپنے ملک پہنچے ان کی زندگی کے الم ناک واقعات کو قاسمی نے

دردناک انداز سے قرطاس کے کینوس پر اُبھارا ہے۔ قاسمی نے بھی ہجرت کے دردناک مناظر، تقسیمِ ہند کے نتیجے میں خاندانوں کی بربادی، قتل و غارت، عصمت دری، مذہبی تعصبات اور مذہبی فرقہ واریت کے الم ناک مناظر پیش کیے ہیں۔ ہندوستان سے ہجرت کرنے والے ایک کسان کی کہانی ''جب بادل اُمڈے'' میں پیش کی ہے جہاں ایک طرف طبقاتی کش مکش کو پیش کیا ہے تو دوسری جانب پناہ گزینوں کو درپیش مسائل کا بھی تفصیلاً تذکرہ کیا ہے۔ اپنی زمین، مکان، بیٹی، دو معصوم بچے چھوڑ کر پاکستان پہنچنے والے افراد سے جب دہقان ہمدردانہ لہجے میں کہتا ہے کہ تمہیں یہ سودا بہت مہنگا پڑا لیکن مہاجر فخر سے تن کر بولا:

''نہیں نہیں۔ ان سب کے بدلے میں مجھے ایک وطن ملا اور یہ زمین ملی۔ یہ گاؤں اور یہ پہاڑیاں اور یہ چپ چاپ شام اور تم جیسے ساتھی۔ ان کی محبتیں، ان کی ہمدردیاں، ان کا پیار، ان کے تپاک میں، میں لٹا نہیں۔ میں تو ایسا آباد ہوا ہوں کہ اب کبھی اُجڑنے کا خوف ہی نہیں۔'' ۱۰۶؎

مندرجہ بالا سطور میں قاسمی نے مہاجرین کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ مہاجر کو لٹنے کا دُکھ نہیں۔ اس مٹی سے جڑ کر وہ فخر محسوس کرتا ہے لیکن یہ خوشی، غم اور پچھتاوے میں اُس وقت تبدیل ہوتی ہے جب جاگیردار اس سے ہتک آمیز رویہ اپناتے ہوئے اسے چوپال سے بھگا دیتا ہے تو مہاجر کی شکست خوردگی یوں لب گویا ہوتی ہے:

''سکھوں سے بچ کر آیا ہوں۔ اب اپنے مسلمان بھائیوں سے کھوپڑی ادھڑوانے کا ارادہ نہیں ہے میرا۔'' ۱۰۷؎

قاسمی نے پناہ گزینوں اور کم زور طبقے کے دہقانوں کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے جاگیرداروں کے ناروا سلوک کو بھی بڑے فن کارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ جاگیردار جب مہاجر سے یہ سنتا ہے کہ اس کے پاس تحصیل دار کا کاغذ ہے جس میں مہاجر کو اپنی زمین دکھانے کا کہا گیا ہے تو جاگیردار کے غصہ کی منظرنگاری قاسمی اس انداز سے کرتے ہیں:

''بھئی یہ بات مجھے قطعی پسند نہیں کہ جو بھی مہاجر آتا ہے وہ پاکستان کو خالہ جان کا گھر سمجھتا ہے اور حکم چلاتا ہے۔ گز بھر کی زبان ہوتی ہے سب کی اور حالت یہ ہے کہ اللہ اور رسول کا نام تک نہیں آتا۔'' ۱۰۸؎

مہاجر، جاگیردار کو صاحب کہہ کر پکارتا ہے تو جاگیردار کا خون کھولنے لگتا ہے۔ وہ مہاجر سے کہتا ہے:

''صاحب کی ماں کا۔۔۔ صاحب جاچکا جہاں سے آیا تھا۔ اب یہ صاحب واب یہاں نہیں چلے گا۔ اب ہم پاکستان میں ہیں۔ اپنا ملک، اپنا راج، اپنا سکہ۔ یہاں اب صاحب کی جگہ ملک اور چوہدری اور میاں کا حکم چلتا ہے۔'' ۱۰۹؎

جاگیردار کا غصہ جب آسمان کو چھونے لگتا ہے تو مہاجر کو بھی غصہ آتا ہے۔ قاسمی نے مہاجر کی کیفیات و جذبات کا

تذکرہ عمدہ انداز سے کیا ہے:

''دیکھو جاگیردار جی! وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اگر آپ نے گالی دی تو میں گالی دوں گا۔ ہم جلے بھنے آئے ہیں۔ اب اگر چاہیں تو جلا بھون بھی سکتے ہیں۔۔۔ ہاں۔'' ۱۱۰

وہ اپنی آزادی اور حقوق کو حاصل کرنے کا احساس رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جاگیرداری ایک فرسودہ معاشرے کی علامت ہے۔ اس نئے ملک میں قانونی حقوق کا استعمال کر سکتے ہیں۔ قاسمی کو جاگیردارانہ نظام ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ جب قیامِ پاکستان کے بعد جاگیرداری نظام کے آثار نمایاں ہونے لگے تو وہ اپنے وطن عزیز کے جوش میں اس نظام کے خلاف نبرد آزما ہو گئے مثلاً ''جب بادل اُمڈے'' میں ایک کردار کی زبانی اپنی بات کہلواتے ہیں:

''ہم نے لہو کے سیلاب میں کشتیاں چلائی ہیں بھئی ہم اس جاگیردار کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے اور اب سب جاگیریں ہم لوگوں میں بٹ جانے والی ہیں۔'' ۱۱۱

جاگیردار تک جب یہ بات پہنچتی ہے تو اسے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ اس کی متروکہ زمین پر قبضہ نہ کر لے، اس لیے وہ اسے گالیاں دیتا اور تحقیر آمیز جملے بولتا ہے۔ مہاجر دہقان ثابت قدم رہتا ہے۔ گاؤں کے مفلس مزارع اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ حق و باطل کے مابین تصادم پر ختم ہو جاتا ہے۔

''خیر و شر کے درمیان اس کش مکش میں ندیم خیر کی قوتوں کا دم بھرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت تحریکِ پاکستان سے اُن کی عملی وابستگی اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتی۔'' ۱۱۲

افسانہ ''تسکین'' کا موضوع وحشت اور بربریت کے شعلوں سے گزر کر آنے والے مہاجرین کی آباد کاری اور اس سلسلے میں اربابِ اختیار کی بے حسی پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں قاسمی نے اجمالی انداز میں اپنے موضوع کو احسن طریقے سے ادا کیا ہے۔ انسانی ذہن مدتوں تک ان الم ناک حادثات و واقعات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک بوڑھا بچوں کی طرح بلکتے ہوئے سرکاری کارندوں کو اپنے بیٹے کی حالت کے متعلق بتاتا ہے تو اس کے جسم کا سارا لہو اس کے چہرے پر آ جاتا ہے۔ کہتا ہے:

''یہ کُرتے پر نشان دیکھ رہے ہیں آپ؟
یہ اور یہ، یہ مجھے میرے بیٹے کی انتڑیوں کا ہار پہنایا گیا ہے۔'' ۱۱۳

ایسے دل خراش واقعات پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جہاں نہتے انسانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کیا گیا۔ ان کے جسمانی اعضا کاٹ دیے گئے۔ خون ریزی، وحشیانہ پن اور زندگی کی گھناؤنی تصویریں بیان کی گئی ہیں۔ فسادات اور ہجرت سے پیدا ہونے والے روح فرسا مصائب پر مبنی ان افسانوں میں قاسمی نے جاگیردار، ذیل دار، نمبردار اور کرسی نشین کی شیطانیت کو بے نقاب کیا ہے۔ افسانہ ''تسکین'' کے راؤ صاحب اور چوہدری صاحب سامراجی ذہن کے حامل

بے حس افراد ہیں جو پاکستان کے ایک مہاجر کیمپ میں دل دوز انسانی مصائب سے لاتعلق بیٹھے سگار پی رہے ہیں اور نہایت اطمینان سے غیرضروری گفتگو کر رہے ہیں۔ جب ایک عام پاکستانی رضاکارانہ طور پر مہاجرین کی فوری ضرورت کی فہرست تیار کر کے عملی کارروائی کا مطالبہ کرتا ہے تو افسر اعلیٰ کہتے ہیں:

''یہ سب کچھ بے چاروں کی تسلی ہی کے لیے ہو رہا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں
ان حالات میں۔۔۔ خیر اب آپ بقیہ لوگوں کے عزیزوں کے بارے میں پوچھیے گا۔
تسلی ہوتی رہے گی بے چاروں کی۔'' ۱۱۴

شیخ غیاث الدین اس افسانے میں مہاجر کیمپوں میں موجود سرکاری کارکنوں کے متعلق بتاتے ہیں:

''تسکین میں مہاجر کیمپوں میں سرکاری کارندوں کی وہ جھوٹی تسلیاں دکھائی گئی ہیں جو
مصیبت زدہ لوگوں کو جھوٹے بہلاوے کی صورت میں دی جاتی ہیں۔'' ۱۱۵

''تسکین'' میں اگرچہ پناہ گزینوں کے مسائل اور ہجرت کی کربناکی بیان کی ہے اس کے ساتھ ساتھ قاسمی نے بورژوا طبقے کے کرداروں کی بھی منظرکشی کی ہے لیکن اس افسانے میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

''تسکین میں بورژوا طبقے کے کرداروں پر احمد ندیم قاسمی کی طنز بڑی مصنوعی ہے۔
اس مقصد کے لیے دو تین مصنوعی کردار لائے گئے ہیں اور ان سے بار بار برٹرینڈ رسل
کی باتیں کرائی گئی ہیں۔'' ۱۱۶

''نیا فرہاد'' قاسمی کے ذاتی تجربہ پر تعمیر کیا گیا افسانہ ہے جس میں پاکستانی مسلمان ہندوؤں کو بہ حفاظت سرحد پار کراتے ہیں۔ قاسمی اس ذاتی تجربے کا تذکرہ اپنے انٹرویو میں اس طرح کرتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں جب فسادات ہر طرف پھیل گئے تو ہمارے گاؤں میں ایک سکھ تھا ارجن سنگھ۔
وہ گاؤں سے باہر کسی جھوک سے پیسے وصول کرنے گیا۔ واپسی پر کسی نے اسے مار دیا تو
جناب پورا گاؤں جمع ہو گیا۔ میں ان دنوں گاؤں میں نہیں تھا۔ بڑے بھائی تھے۔ انھوں نے
کہا کہ ہم یہ بدنامی مول نہیں لیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے گاؤں کے ہندو سکھ ہمارے
ساتھ بھائیوں کی طرح رہے ہیں۔ اب یہ یہاں نہیں رہنا چاہتے اور جانا چاہتے ہیں تو
انھیں پرامن طریقے سے بہ حفاظت یہاں سے رخصت کرنا چاہیے۔'' ۱۱۷

سکھوں اور ہندوؤں کو ان کے اثاثہ سمیت پناہ گزینوں کے کیمپوں میں پہنچا دیا۔ ''نیا فرہاد'' کا ہیرو بھی مسلمان ساتھیوں کو جبر و تشدد سے منع کرتا ہے اور اپنے ہندو اور سکھ دوستوں کو بہ حفاظت کیمپوں تک پہنچاتا ہے۔ قاسمی نے مذکورہ بالا افسانوں میں فسادات اور ہجرت سے پیدا ہونے والے مصائب، پناہ گزینوں کی پریشانیاں، ذیل داروں اور جاگیرداروں کے ناروا سلوک اور تحقیر آمیز لہجے کو نہایت دیانت داری اور فنی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

سقوط مشرقی پاکستان ایک المیہ ہے جس پر حساس فن کاروں نے نہایت دردمندی سے لکھا۔ اس سلسلے میں

انتظار حسین کا ''نیند''، ''ہندوستان سے ایک خط''، مسعود اشعر کا ''دُکھ جو مٹی نہ دے''، اے حمید کا ''اب جاگتے رہنا''، انور عنایت اللہ کا ''صلہ شہید''، منیر احمد شیخ کا ''زرد مٹی کی خوشبو''، رشیدہ رضویہ کا ''شہر سلگتا ہے''، غلام الثقلین نقوی کا ''کالی ماتا کی پجارن'' مشرقی پاکستان کے نوحے کو دل گداز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ قاسمی کے افسانہ ''اند مال'' میں بھی سقوط کے بعد پاکستان پہنچنے والے پناہ گزینوں کے ایک خاندان کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ پاکستان میں جہاں جلال الدین جیسے ہمدرد انسان ان کا استقبال کرتے ہیں وہیں کوئی شخص ان کے گھر چوری کر کے تمام قیمتی اشیا لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں ایک بزرگ نے انھیں پر خلوص دعاؤں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ ان کے زخم مندمل کرنے کی دعا دی اور دیگر افراد سے مخاطب ہو کر کہا:

> ''مشرقی پاکستان سے آنے والے ہمارے بھائی، ہم سب کی محبتوں کے مستحق ہیں۔ یہ ایک بھٹی میں سے تپ کر کندن بن کر نکلنے والے پاکستانی ہیں۔'' ۱۱۸

پیش نظر افسانے میں نزہت کا شوہر اشرف اس رشتے کی علامت ہے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین قائم تھا۔ اس کی تصویر کا غائب ہونا اس رشتے کے انقطاع کو عیاں کرتا ہے۔ افسانے کی آخری سطور میں نزہت کی نفسیاتی کش مکش کو المیہ انداز میں بیان کیا ہے:

> ''آپ کو پتہ نہیں اباجی، نزہت بہت پر اسرار انداز میں جیسے راز کی کوئی بات بتاتی ہوئی بولی:
> ہم ابھی تک ڈھاکا میں ہیں اور اشرف سچ مچ مر گیا ہے اور مارنے والے اس کی لاش بھی اُٹھا کر لے گئے ہیں۔'' ۱۱۹

قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں دیہی افراد اور لاچار عوام زمین داروں کے استحصال کا شکار ہے۔ ''سناٹا'' کے بعد وہ متحرک کرداروں کا نفسیاتی جائزہ کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔ کسانوں اور مزارعوں کو ان زمین داروں سے نفرت ہے۔ قاسمی نے بڑے موثر انداز میں ان کی زندگیوں کو پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر طبقاتی تفاوت اور استحصال کو حقیقی انداز سے بیان کیا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک قیامِ پاکستان کے بعد استحصال کی صورت حال واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قائداعظم کی آنکھیں بند ہوتے ہی مسلم لیگ کی جاگیردار قیادت نے تحریکِ پاکستان کے دوران کیے گئے معاشی انصاف اور معاشرتی مساوات کے وعدوں سے روگردانی کر کے زمین داری اور جاگیرداری کو نئے تحفظات دینے کی روش اپنا لی۔ اس صورتِ حال نے کسانوں اور مزارعین میں بے چینی کی ایک زبردست لہر دوڑا دی۔ چوں کہ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں میں سلطانی جمہور کے خواب سجا کر قیامِ پاکستان کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کی تھی، اس لیے پنجاب کسان سبھا، سندھ ہاری کمیٹی اور سرحد کسان جرگہ نے

زخمی شیر کے سے ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ جاگیردار قیادت نے اس بے چینی کو دبانے کی خاطر جبر و استبداد کا وہی پرانا سامراجی سکہ رائج کر دیا۔ سن اڑتالیس ۴۸ سے پچاس ۵۰ تک مزارعین کو جبری طور پر بے دخل کر کے جاگیردار اپنی جاگیروں میں توسیع کرنے میں مصروف رہا۔“ ۱۲۰

اس جبراً بے دخلی کے باعث کئی کسان فاقہ کشی کی بنا پر موت کی دہلیز پر جا پہنچے۔ اس ظلم کے خلاف کسان تحریک نے احتجاج شروع کیا۔ سب سے پہلے صوبہ سرحد میں کسان جرگہ نے ۱۹۴۸ء میں اس جاگیردارانہ نظام کے خلاف عوامی مہم کی ابتدا کی لیکن اسے خلاف قانون قرار دے کر ہزاروں کسانوں کو پابند سلاسل کیا گیا۔ تحریک پاکستان کے زیراثر کسانوں کی بیداری اور قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام کے خلاف اجتماعی مزاحمتی عمل کے نتیجے میں قاسمی نے دو افسانے ”ووٹ“ اور ”کہانی لکھی جا رہی تھی“ لکھے۔ افسانہ ”ووٹ“ میں جاگیردار کہتا ہے:

”وہ بھی کیا کسان عورتیں تھیں۔ بے چاریاں، بالکل بھیڑیں، سیدھی سادی، ڈری ڈری، بات بات پر جی جی کی رٹ اور یہ نئی کسان لڑکی دیکھو۔ ایسی دلیر اور بہادر شہزادیاں ضرور گزری ہوں گی مگر کسان ماؤں نے ایسی بیٹیاں کہاں جنی تھیں۔“ ۱۲۱

کسان عورت اب اپنے خاوند کو جاگیردار کے جور و ستم پر سر تسلیم خم نہیں کرنے دیتی بلکہ بغاوت کی راہ اپنانے میں کوشاں دکھائی دیتی ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں ”در و دیوار“ کے افسانے اور شاعری میں ”شعلہ گل“ ان کی حقیقی معنویت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ذیل دار اور مہاجن ایک کردار کے طور پر بہت کم نمودار ہوتے ہیں۔ ان کا وجود غریب کسانوں کے لیے آسیب یا اژدھے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسا آسیب جو پوری فضا پر مسلط ہے۔ ایک ایسا اژدھا جو غربا کو نگلنے کے لیے بے تاب ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

”ذیل دار اور مہاجن، فرنگ کی جنگی مشینری کے دو نہایت فعال پُرزے ہیں۔ ذیل دار۔۔۔ اور۔۔۔ استبداد کا گرم جوش حلیف اور زیرک وکیل ہے تو مہاجن سود کے استحصالی کاروبار سے جذبہ آزادی کو کچلنے اور یوں انسانوں کو ڈھور ڈنگروں کی سطح پر لا پھینکنے میں مصروف ہے۔“ ۱۲۲

جاگیرداروں، مہاجنوں، ذیل داروں کی شیطانیت سے سادہ لوح دیہاتیوں کے دلوں پر جو بیت رہی ہے اُس کی صداقت آفریں تصویریں قاسمی اپنے افسانوں میں عمدہ منظر کشی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ قاسمی نے ان افسانوں میں اپنے انقلابی اندازِ نظر کو مختلف کرداروں کی زبانی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ طبقاتی استحصال اور نسلی استبداد کے زندہ و جاوید مرقعے بھی پیش کیے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

”اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ”چوپال“ کے افسانہ ”بے چارہ“ سے لے کر ”اصول کی بات“ اور ”لارنس آف تھیلیبیا“ کے سے حالیہ افسانوں تک ندیم نے نمرود کی اُس خدائی کو

بے نقاب کیا ہے جس میں بندگی بے چارگی کی انتہا میں بھی کسانوں اور محنت کشوں کی
بھلائی کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔" ۱۲۳؎

افسانہ "کفارہ" کا پیرو اپنا آبائی مکان فروخت کر کے سفید بیلوں کی ایک جوڑی اور ایک رنگین ہل خریدتا ہے اور اپنی بے آباد اراضی کو زیرکاشت لانے کا شوق پورا کرتا ہے۔ پیرو کو اپنی زمین میں ہل چلانے کی پاداش میں پولیس نے لہولہان کر دیا اور دونوں سفید بیل ضبط کر لیے گئے۔ اسی طرح افسانہ "اصول کی بات" کا عبداللہ کسی بات کی پاداش میں کھیت اور گھر سے بے دخل کر دیا جاتا ہے تو وہ اپنی اہلیہ اور جوان بیٹی کے ہمراہ گاؤں کے زمین دار کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ جب عبداللہ کو بطور مزارع رکھنے کی امید کی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ ابھی خدا کا شکر ہی ادا کرتا ہے تو زمین دار کا دلال دروازے پر آ کر دستک دیتا ہے:

"وہ بنگلی والی زمین سرکار نے تمہارے نام کر دی تھی۔ منشی سے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی انتظام کر دیا تھا کہ صبح کو تم بیلوں کی ایک جوڑی بھی پسند کر لو مگر اب معاملہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو کر لو۔۔۔ میں تمھیں لے چلتا ہوں ڈیوڑھی میں۔ یوں کرو کہ تمھاری بیٹی ہے نا ماکھاں، اس کو سمجھا دو۔
کیا سمجھا دوں؟ وہ کیا کرے گی؟ عبداللہ نے پوچھا اور سائیں بولا:
ارے چاچا! اس کو سمجھا دو نا۔ اس سے کہہ دو نا کہ مان جائے۔ آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور وہ اب تک نہیں مانی ہے۔ نہ وہ مانتی ہے نہ اُس کی ماں اُسے مناتی ہے۔
اب اگر تم بھی نہ منا سکو تو سرکار کہتے ہیں کہ اپنی راہ لو۔ اصول کی بات ہے۔" ۱۲۴؎

اس افسانہ میں جاگیردار ایک مفلس انسان کی عزت نفس کو مجروح کرتا ہے۔ پیش نظر افسانے میں فرد کی بے دخلی، محکومی اور عیاریوں کے جال بچھانے کے باوجود عبداللہ اپنی بیوی اور بیٹی کی عزت جاگیرداروں کی دست برد سے بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ایک بڑا افسانہ نگار سماج کی ہر برائی کو منظرعام پر لاتا ہے۔ پیش نظر افسانوں میں بھی معاشرے میں پھیلی برائیاں، ظلم و ستم اور ناانصافی وغیرہ ملتی ہے۔ جاگیردار اور زمین دار عنفوانِ شباب کے سادہ حسن کو تاراج کرنے کی تمنا رکھتے ہیں بلکہ اپنا حق سمجھتے ہیں اور حق نہ ملنے کی سزا کھیت کھلیان کی تباہی یا علاقے سے بے دخل کرنے کی صورت میں ملتی ہے۔ زمین دار کی شیطانیت کا یہی اصول "لارنس آف تھیلبیا" افسانے کی فضا پر آسیب کی مانند منڈلاتا ہے۔ افسانے کا واحد متکلم شہری بابو چوپال پر دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے:

"دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کر بڑے ملک صاحب کے سامنے جھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اُس کی پیٹھ پر مکوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر

کہتے جاتے تھے۔ بھری مجلس میں کہتا ہے ملک جی تہ بند سنبھالو، ننگے ہو رہے ہو۔ اس حرام زادے سے کوئی پوچھے کہ تمھیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی ننگا ہو رہا تھا۔ تمھاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی۔'' ۱۲۵

چوپال پر موجود تمام افراد خاموشی سے یہ دل خراش منظر دیکھ رہے تھے اور چھے فٹ کا یہ وجیہہ جوان بھی راضی برضا ہو کر اپنی توہین برداشت کر رہا تھا جیسے اُس نے ارادتاً یہ گناہ سرزد کیا ہو۔ واحد متکلم کہتا ہے:

''میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں اُس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ لکڑی کے نکلے۔ حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا:
لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟
میں نے کہا:
میں سمجھا یہ پائے نہیں بلکہ پلنگ کے ہر کونے کے نیچے ایک ایک مسکین کھڑا ہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر یہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ زمین پر آ رہے۔۔۔'' ۱۲۶

واحد متکلم کی یہ گستاخ سوچ بھی جاگیرداری نظام کے چنگل میں گرفتار افراد کے دل و دماغ کو بھی نہ چھو سکی۔ ملک صاحب چوپال میں موجود افراد پر اپنا رعب و داب قائم کرنے کے لیے ایام ماضی کو یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھوں نے ''ایک بار۔۔۔ اپنے ایک دشمن کو ایک گلی میں زبردستی گرا دیا۔ اُس کی ناف میں دہکتا ہوا انگارہ رکھوا دیا۔'' ۱۲۷

افسانہ ''بین'' کی رانو اور ''لارنس آف تھیلیبیا'' کی رنگی بغاوت کا راستہ اپناتے ہوئے اپنے شکاری پر جھپٹ پڑتی ہیں۔ قاسمی کے افسانوں میں موجود وہ معاشرتی ناہمواریاں ہیں جن کا شکار مفلس افراد ہیں۔ مصنف ان اذیت ناک حقیقتوں کو کہانی کی صورت عطا کرتے ہیں تو دل چسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ افسانہ ''کنگلے'' میں معاشرے کے عام آدمی کا کرب افسانہ نویس کا کرب بن گیا ہے۔ اسی طرح ''جب بادل اُمڈے'' میں طبقاتی کش مکش کسانوں کی مفلسی اور جاگیرداروں کے جبر پر مشتمل ہے۔

قاسمی نے خانقاہی نظام کے خلاف بغاوت کا اظہار اپنے افسانوں کے ذریعہ کیا ہے۔ افسانہ ''بین'' کی رانو کا حُسنِ قدس ایک پیرزادے کی ہوس کا نشانہ بنتا ہے۔ سترہ برس کی فرشتہ سیرت خوب صورت لڑکی کی آواز میں سائیں حضرت شاہ جی کو فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی تو ضعیف الاعتقاد والدین نے اسے مزار پر چھوڑ دیا جہاں وہ پیرزادے کی شیطانیت کی بھینٹ چڑھی۔ جب وہ اس بھیانک تجربے پر ردعمل ظاہر کرتی ہے تو

پیرزادہ اپنی عیارانہ سوچ سے اس صورتِ حال پر بھی قابو پا لیتا ہے:

''مزار شریف پر گول گول پتھر اُٹھا کر جھولی میں بھر لیے اور چیخ چیخ کر کہا کہ سائیں! مزار شریف سے دستِ مبارک تو جب نکلے گا، نکلے گا۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں دولھے شاہ جی کے دیئے ہوئے ان پتھروں سے تمہارا ناس کر دوں گی۔ خادم رانو کو پکڑ کر مارنے پیٹنے کے لیے آگے بڑھے تو سائیں جی نے اُنھیں روک کر کہا کہ نادانو! یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے اس کے اندر کا کافر جن بول رہا ہے جب تک یہ مزار شریف پر قابض ہے ہمیں اور ہمارے خاندان کے کسی مرد عورت کو ادھر نہیں آنا چاہیے ورنہ کیا خبر یہ جن کیا کر بیٹھے؟'' ۱۲۸

اس خانقاہی نظام میں جہاں درویشی اور سلطانی دونوں عیاری پر مبنی ہوں وہاں خدا کے سادہ و معصوم بندوں کو ظلم سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ قاسمی نے اپنے دماغ میں موجود ان سوالات پر افسانوں کی بنیاد رکھی۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''یہ صورتِ حال جبر و استبداد کے مروجہ نظام نے پیدا کر رکھی ہے۔ جب تک یہ نظام باقی ہے خدا بخش اور سائیں جی رنگی اور رانو کی سی فاختاؤں پر عقاب بن کر جھپٹتے رہیں گے۔ حسن تاراج ہوتا رہے گا اور آدمیت کی تذلیل ہوتی رہے گی۔'' ۱۲۹

یہ بین رانو کی والدہ کا بین ہے جو اپنی کم عمر بچی کی زندہ لاش پر نوحہ کناں ہے۔ اس میں قارئین کی کراہیں اور آہ و فغاں بھی شامل ہے۔ اس طرح یہ کہانی المیے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک مفلس انسان پر بٹوا چوری ہونے کا الزام دھرا جاتا ہے۔ وہ بے قصور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اُسے دردناک سزاؤں کی دھمکی دی جاتی ہے:

''۔۔۔ تیری مشکیں کس کر اور اُلٹا لٹکا کر مرچوں کا دھواں دوں گا۔ تیری ہتھیلیوں پر گرم گرم انگارے دھرے جائیں گے۔ تیرے سینے پر پتھر کوٹیں جائیں گے۔ تجھے ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا پیاسا حوالات میں بند رکھا جائے گا۔'' ۱۳۰

قاسمی کی کہانیوں میں ہلکی سی چبھن کا احساس بھی ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف: ''یہ چبھن عموماً ایک طنزیہ طرزِ اظہار پیدا کرتی ہے۔ یہ طنز کہیں ہلکا اور کہیں شدید ہے اور اس کا نشانہ۔۔۔ استحصالی طاقتیں ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی روپ میں نظر آئیں۔۔۔ کہیں کہیں ان کے طنز میں ذاتی احساس کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔''۱۳۱ افلاس کے شکنجے میں گرفتار رہنے کے باوجود قاسمی کے افسانوی کردار محنت و مشقت پر یقین رکھتے ہیں لیکن باوسائل طبقہ ان کمزور افراد کو مزدوری کا پورا پیسہ بھی نہیں دیتا۔ یہ طبقہ زیادہ محنت پر کم پیسے دیتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میری ماں کے بالوں پر آٹے کی تہہ ہمیشہ جمی رہی اور ہمارا چولہا اکثر ٹھنڈا ہی رہا۔ اگر کام کے مطابق دام ملا کرتے تو مزدوری کو کون برا کہتا۔'' ۱۳۲

شدید محنت اور مشقت کے باوجود بھی جب پیسے کم ملتے ہیں تو حالات کی سنگینی اور شدت میں کمی نہیں آتی اور معاشی

حالات سدھر نہیں پاتے۔ ایک روز زمین دار نے غیرت مند بیٹے کو ہل چلانے کی پیش کش کی جو اس نے منظور کر لی لیکن تیسرے ہفتے کے بعد ہی اس کی جھڑپ ہوگئی تو قاسمی نے جاگیردار اور نوجوان کے مابین مکالمے کو اس طرح بیان کیا ہے:

''جا بے جا گھر میں کھانے کو جو کا آٹا نہیں اور دماغ دیکھو تو جیسے گاؤں بھر کا رلجہ یہی ہے۔
میں نے کاندھے پر سے ہل اُتار کر اس کی چوکھٹ پر دے مارا اور کہا:
گھر میں کھانے کو نہیں تو کیا دل میں غیرت بھی نہیں؟ تیری دو کوڑیوں کے بھروسے پر نہیں جی رہے۔ ہاتھ پیر ہیں تو بھوکوں نہیں مریں گے، تو آنکھیں نہ دکھا۔'' ۱۳۳؎

سماجی حقیقت نگاری، احساسِ ذلت، احتجاج کی جرات، دو وقت کی روٹی کے مسائل، بے روزگاری کے مسائل، عزتِ نفس کو مجروح کرنا اور باوسائل طبقے کا جبر وغیرہ متعدد افسانوں میں موجود ہے۔ قاسمی نے طبقاتی تضاد کو حقیقی رنگ میں اُبھارا ہے جہاں زمین دار کا اقبال بلند ہے وہیں مزارع کو کیڑوں مکوڑوں اور جانوروں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ بقول انور سدید:

''زمین دار جب ظلم کرتا ہے تو اس کی غصیلی آواز ہفت آسمان تک جاتی ہے اور مزارع جب ظلم سہتا ہے تو اس کی صدائے درد سے بھی آسمان پھٹنے لگتا ہے۔'' ۱۳۴؎

قاسمی کی زندگی کا ابتدائی حصہ دیہات میں گزرا۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ انھوں نے پنجاب کے دیہات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہوئے اپنے نظریات کا پرچار نہایت عمدگی سے کیا۔ انھوں نے استحصالی زندگی کا بہ خوبی مشاہدہ کیا۔ چناں چہ دیہاتی زندگی، اس کے تلخ حقائق اُن کے قلم کا مستقل حصہ بنے رہے۔ قاسمی استحصال کے دشمن تھے۔ چناں چہ ترقی پسند تحریک کے تحت جب انھیں اپنے نظریات اور مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر آئی تو وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ ان کے افسانوں میں دیہاتوں کی سماجی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ طاہرہ اقبال ''احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات نگاری'' کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتی ہیں:

''یہاں چھوٹے سے چھوٹے گاؤں بھی ایک آمری ریاست معلوم ہوتا ہے۔ جس کی سیاست، عدالت، معیشت، تعلیم، فلاح و بہبود، انہی رجواڑوں کے حکم پر استوار ہوتی ہے۔ ایک زمین دار جس کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق کہیں نہیں ہوتا ہے جس کی زمینوں پر بٹائی کے بدلے میں بھوک بٹتی ہیں۔'' ۱۳۵؎

اس لیے قاسمی ناانصافیوں اور استحصال کی تمام صورتوں کو منظرعام پر لاتے ہیں۔ غریبوں کے مسائل و مشکلات پر لکھتے ہوئے قاسمی کا قلم جان دار مرقع پیش کرتا ہے۔ اس استحصالی نظام کے نمائندہ کرداروں چوہدری، ذیل دار، جاگیردار، زمین دار، مولوی، تھانے دار کی قلعی کھول کر رکھتے ہیں۔ انھوں نے معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی برائیوں

ظلم، ناانصافی، استحصال کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا۔ ''طلوع و غروب'' میں شامل کہانی ''میرا دیس'' میں مفلس کسان کی جوان بیٹی کی مصیبتوں کا تذکرہ ہے۔ اس غریب کسان کی ساری زمین قرق ہو چکی ہے۔ اس کی بیٹی زرخرید کنیز کی طرح گاؤں کے زمین دار کی نہ صرف خدمت کرتی ہے بلکہ اسے ہر شام اپنا وجود سُرخ انگارے کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ وہ سوچتی ہے:

''یہ انگارہ کب پھوٹے گا۔ کب پھوٹے گا یہ انگارہ کہ میں چنگاریاں بن کر ان زمین داروں، ان مولویوں اور پیروں کے ریشمی ملبوس میں کالے کالے سوراخ ڈال دوں۔ ان کے دیدوں میں گھس جاؤں۔ ان کی کنپٹیوں سے چمٹ جاؤں۔'' ۱۳۶؎

افسانہ ''کفارہ'' کا ہیرو اپنے باپ کی وفات کے بعد آبائی گھر بیچ کر بیلوں کی جوڑی خریدتا ہے تاکہ اپنی بنجر زمینوں پر ہل چلا سکے لیکن جلد ہی اس سے بیل چھین لیے جاتے ہیں۔ پولیس کی مار پیٹ کے بعد وہ اپنے کھیتوں کی طرف دیوانہ وار دوڑتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

''آج بھی پاکستان کے بہت سے کھیتوں پر اس کی روح منڈلاتی رہتی ہے۔'' ۱۳۷؎

افسانہ ''بے گناہ'' کا رحمان ایک یتیم اور مسکین بے روزگار نوجوان تھا۔ جوں ہی والدین کے سایہ شفقت سے محروم ہوا، ذیل دار کے ظلم و ستم نے اس کا مرتے دم تک پیچھا نہ چھوڑا۔ غریب رحمو جو دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھا سکتا تھا، وہ زمین کا لگان کیسے ادا کرتا۔ چناں چہ ذیل دار، رحمو کے گھر آ کر اس سے یوں مخاطب ہوا:

''میں تم جیسے بھکاریوں کے کان کھینچ لیا کرتا ہوں۔ پانچ روپے ابھی ابھی پیدا کرو ورنہ میں گاؤں کے سارے چوکیداروں کو بلوا کر تمہارا بھرکس نکلوا دوں گا۔'' ۱۳۸؎

چند دن کی مہلت مانگنے کی پاداش میں اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اُس کے کھلیان کو خاکستر کر دیا۔ اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ جیل میں ہی زندگی کے دن گزارتے گزارتے رحمو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ جب تک زندہ رہا، ذیل دار کا ستم قہر بن کر برستا رہا۔ ذیل دار کے اپنے دشمنوں کے متعلق جذبات ایسے ہولناک ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے کردار معاشرے کے غیر ہموار رویے کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر قاسمی نے محبوس زندگیوں اور حالات کی ستم ظریفی کے شکار افراد کو کہانیوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے معاشی جبر، طبقاتی، ظلم و ستم پر مبنی نظام کو حقیقت نگاری سے پیش کیا۔ بقول ڈاکٹر شفیق انجم:

''احمد ندیم قاسمی کے موضوعات ترقی پسندوں کی اس بنیادی فکر سے ماخوذ ہیں جس کے مطابق معاشی ناانصافی اور طبقاتی جبر پر مبنی نظام تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ چناں چہ اسے بدل دینے ہی میں مسائل کا حل مضمر ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس فکر کو بسا اوقات جذباتی رومانی لہجے اور اکثر اوقات تلخ حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا۔ وادی سون سکیسر

کے جغرافیائی حدود اربع میں کھڑے ہو کر انھوں نے اردگرد کی زندگی کا تجزیہ مخصوص نظریاتی اُپج کے ساتھ کیا اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک سرگرم رکن ہونے کی حیثیت سے انھوں نے معاش، سیاست، مذہب، تہذیب و معاشرت غرض ہر حوالے سے مارکسی سوچ اور نظریے کو اپنایا اور اپنی کہانیوں میں اس کی ترجمانی کی۔'' ۱۳۹

قاسمی کے افسانوں میں ایسے استحصال پسند افراد نظر آتے ہیں جو انسانوں سے ہتک آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر کسی مفلس دیہاتی کی عزتِ نفس بیدار ہو جائے یا اگر اسے اپنے حقوق سے آگاہی ہو جائے تو علاقے کا بااثر فرد اپنے کارندوں کے ساتھ مل کر اس خوددار فرد کو کچل دیتا ہے اور ایسی عبرت ناک سزا دیتا ہے کہ باقی افراد کو حریتِ فکر کی جرات نہیں ہوتی۔ کسی انسان میں ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ظلم کے خلاف آواز اُٹھا سکے کیوں کہ یہ جاگیردار غریب عوام کے مویشی چوری کرا دیتے، اس کے گھروں اور کھیتوں کو نذرِ آتش کر دیتے۔ ان کی بہو بیٹیوں کو اغوا کیا جاتا۔ انتظامیہ کو اپنے ساتھ ملا کر جھوٹے مقدمات میں پھنسوا دیا جاتا۔ تھانے دار بھی زمین دار کے ساتھ مل کر عوام کو لوٹنے میں اہم کردار ادا کرتا۔ ''پکا مکان'' میں ایسا زمین دار منظرِ عام پر آتا ہے جو غریب یارو کو چوری کے الزام میں گرفتار کروا دیتا ہے۔ اس کی دو خطائیں تھیں: ایک تو یہ کہ وہ زمین دار کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ بولا اور دوسری یہ کہ اُس نے پکی اینٹوں کا مکان تعمیر کرایا۔ ایسا مکان گاؤں بھر میں صرف زمین دار کا تھا۔ زمین دار کی سفاکی کا ایک اور انداز ملاحظہ ہو:

''کیا بات ہے؟ وہ چیخا۔
پولیس کا ایک افسر بولا:
تم نے زمین دار کا سریا چرایا ہے اور حوالات کی سلاخوں میں بند ہو کر تمھیں سب باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔'' ۱۴۰

گاؤں کا ایک مفلس بے کس آدمی جب ذیل دار کے پاس مزدوری کی تلاش میں آتا ہے تو اس کے کارندے گالیوں سے اس کا استقبال کرتے ہیں اور زمین دار کی سفاکی کے متعلق بتاتے ہیں:

''وہ سو رہے تھے۔ اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو خدا کی قسم بوٹیاں نچوا لیتا اُن کی کتوں سے۔'' ۱۴۱

قاسمی سماجی قوانین اور سرمایہ دارانہ استحصال اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی لو کو بجھنے نہیں دیتے۔ وہ ظلم کے خلاف سینہ سپر رہتے ہیں۔ قاسمی اولادِ آدم میں سماجی امتیازات کو انسانیت کی توہین متصور کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ دنیا امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے۔ یہی تعبیر آشنا خواب ان کی تحریروں میں

جلوہ سامانیاں دکھا رہا ہے۔ ان کے متعلق حمایت علی شاعر ''نذرِ ندیم'' میں لکھتے ہیں:

''افسانہ ہو کہ شعر و سخن ، ایک رنگ ہے
احمد ندیم قاسمی مصروفِ جنگ ہے ''[۱۴۲]

انھوں نے جہاں معاشی عوامل اور جاگیردار کے سلبی کردار کو پیش کیا وہیں اس غریب کسان کی خودی کو بیدار ہوتے بھی دکھایا ہے کہ مفلس آدمی ایک طرف اپنی غربت اور دوسری جانب جاگیردار کی چکی میں پس رہا ہے۔ مسلسل ظلم و جبر برداشت کرنے کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ افسانہ ''جوتا''، ''جب بادل اُمڈے''، ''ووٹ'' اور ''کہانی لکھی جا رہی تھی'' کے کرداروں کو جب گویائی ملتی ہے تو پھر نہایت جرات مندی و بے باکی سے اپنے ظلم کا حساب لیتے ہیں۔

مذہب کے نام پر استحصال کرنے والوں کی عمدہ کہانی ''چبھن'' میں بیان کی گئی ہے۔ شمشاد علی کی جوانی میں ہی خدا سے لو لگ گئی۔ وہ یادِ الٰہی میں مشغول رہنے کی وجہ سے فنا فی للہ ہو گئے۔ ان کے بڑے بھائی امجد علی انھیں مزار پر بٹھا دیتے ہیں جہاں مریدوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ نذرانے بھی وصول کیے جاتے ہیں جنھیں شمشاد علی پسند نہیں کرتا لیکن امجد علی بخوشی قبول کرتا ہے۔ ماہرفن کار نے ہنرمندی سے شمشاد علی کی چبھن کو قاری کی چبھن بنا دیا ہے۔ قاسمی ظلم کی چکی میں پستے ہوئے مظلوم عوام کی آہ و بکا کو سن کر چپ نہیں رہتے۔ بقول محمد الیاس میراں پوری:

''بلکہ ان کے خلاف ان کا قلم ننگا نیزہ بن جاتا ہے۔ وہ آہن صفت قلم سے ان معاشرتی برائیوں کو کچھ اس طرح جھنجھوڑتے ہیں کہ طرزِ احساس لطیف پیرائے میں محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ ندامت اور پشیمانی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔''[۱۴۳]

قاسمی نہایت ہنرمندی سے مقصد اور فن کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ ایک ایسا نظام زندگی چاہتے ہیں جہاں ہر طرف:

''امن و آشتی کا پہرہ ہو۔ کوئی جاگیردار کسی مزارع کا حق نہ لوٹے۔ کوئی اعلیٰ طبقے کا فرد کسی ادنیٰ طبقے کے فرد کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچلنے کی کوشش نہ کرے۔''[۱۴۴]

خوشامد پسندی کا زہر ہمارے معاشرے میں بُری طرح سرایت کر چکا ہے۔ اس سے دامن بچانا نہایت کٹھن ہے۔ اعلیٰ عہدوں کا حصول اُن اشخاص کی قسمت میں ہوتا ہے جو افسروں کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ ان کے ناموں کے جھنڈے نصب کرتے ہیں۔ افسانہ ''عبدالمتین ایم اے'' میں عبدالمتین کا بزرگ اُسے بتاتا ہے:

''میں نے ایک مرتبہ ایک بڑے افسر کی آمد پر گاؤں سے ایک میل پرے ایک سنہری دروازہ کھڑا کیا۔ ایک دفعہ گلیوں میں بناسپتی گھی کے چراغ جلائے، ایک بار اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر پولیس والوں کا ساتھ دیا اور ڈاکوؤں کا ایک گروہ پکڑا۔۔۔ ایک کنواں کھدوا کر اس میں دو بڑے بڑے افسروں کے ناموں کے پتھر جڑوا دیے۔ مدرسے

کی عمارت کے ساتھ ایک کمرہ ڈپٹی کمشنر کے نام سے بنوا دیا۔ تالاب کو گہرا کھدوا کر فرش
کو سیمنٹ سے مضبوط کر دیا۔ تب کہیں جا کر مجھے آنریری مجسٹریٹی ملی۔'' ۱۴۵

آنریری مجسٹریٹ بننے کے لیے اس بزرگ نے نہ صرف انگریزوں یا اعلیٰ افسران کی خوشامدیں کیں بلکہ دولت کی بوچھاڑ بھی کی جس کے انعام کے طور پر اسے خان صاحبی ملی۔

قاسمی نے عہدِ طفلی میں جن حالات میں آنکھ کھولی، انھوں نے ان کے ننھے ذہن کو معاشرتی ناہمواری کی جانب موڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی طبیعت کا رجحان ابتدا سے ہی معاشرتی حقائق کی جانب تھا۔ انھیں شمالی پنجاب کے ضلع سرگودھا (سون سکیسر) کی پسماندگی و کسانوں کی مفلوک الحالی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ خود بھی مفلسی کی آگ میں جھلستے رہے۔ قاسمی نے اگرچہ ترقی پسند تحریک کے نظریات سے متاثر ہو کر اپنی ادبی ترجیحات میں تبدیلی پیدا کی لیکن سماجی حالات کا تجزیہ اس تحریک کی عطا نہ تھی بلکہ ان کی شخصیت میں پہلے سے ہی موجود تھا۔ لکھتے ہیں:

''میں نے جب پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیے تو مناظر فطرت کے حسن اور
اسلامی روایات کے طنطنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس معاشرتی اور معیشتی تفاوت نے بھی
متاثر کیا اور میں رومانی اور خوابوں سے اٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کر سکا
جس میں سے آنکھوں دیکھی سفاک حقیقتیں اندر سرک آتی تھیں۔'' ۱۴۶

قاسمی کے افسانوی مجموعوں میں شامل افسانے ''ہیر رانجھا''، ''قلی''، ''کھیل''، ''خوش رہو''، ''بے گناہ''، ''غیرت مند بیٹا''، ''ننھا مانجھی''، ''کریا کرم''، ''ننھے نے سلیٹ خریدی''، ''توبہ میری''، ''طلائی مہر''، ''آرام'' اور ''بے چارہ'' وغیرہ معاشرتی حقائق پر ان کی بھرپور گرفت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مفلسی، باوسائل طبقہ کی استحصالی ذہنیت اور معاشی تنگ دستی ان افسانوں کا موضوع ہے۔

قاسمی دیہاتی افراد کے دُکھ درد، خوشی غم میں شریک ہوتے اور طبقاتی سماج کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مندرجہ بالا افسانوں کے منفعل کرداروں کی ڈور ذیل دار، پولیس، نمبردار، جاگیردار، زمین دار کے ہاتھوں میں ہے۔ بے چارگی، بے بسی، شکستگی ان افراد کا مقدر ہے۔ اگرچہ قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں بے بسی اور بے چارگی نمایاں دکھائی دیتی ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ رکن بننے سے ان کے افسانوں میں اُمید کی کرن دکھائی دینے لگی۔ ''ارتقا''، ''افق''، ''پرچھائیاں''، ''جلسے'' کے افسانوں کے کردار اس انفعالی صورتِ حال میں ہی کروٹ لیتے ہیں۔ سماجی شعور کی عکاسی قاسمی کے افسانوں ''کوہ پیما''، ''چرواہا''، ''چھلی''، ''یک لباس آدمی''، ''ٹریکٹر''، ''آسیب''، ''پاگل''، ''قرض''، ''جوتا''، ''اندمال''، ''نیلا پتھر''، ''بارٹر''، ''بچے''، ''گھر سے گھر تک''، ''موج خوں''، ''فالتو''، ''بیٹے بیٹیاں''، ''نصیب''، ''امانت''، ''زلیخا''، اور ''کفن دفن'' میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ معاشرے کو ایک حساس فن کار کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اپنے محسوسات کو افسانوں میں قلم زد کرتے ہیں۔ گاؤں میں

پہلی بار ٹریکٹر کی آمد کے متعلق سادہ لوح دیہاتی حیرت سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ یہ دیہاتی سائنسی ترقی سے بے خبر، اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ چوپال پر بیٹھے ایک شخص نے کہا:

''کوئی مشین ادھر ولایت سے آئی ہے جسے کھیت میں موٹر کی طرح گھماتے ہیں تو وہ آن کی آن میں وہاں ہل چلا دیتی ہے۔''

''جس کھیت میں ہم دن بھر ہل چلائیں اور پھر بھی مرلہ آدھ مرلہ رہ جائے وہاں یہ مشین اتنی دیر میں پورے کھیت کو ادھیڑ ڈالتی ہے۔ جتنی دیر میں جھیوان بھٹی میں مٹھی بھر دانوں کے پھول کھلاتی ہے۔''

''۔۔۔چہروں پر تشویش کے سائے چھا جاتے۔ پھر کوئی پوچھتا:
اگر ایسی مشین سچ مچ آ گئی ہے تو ہم کسانوں سے کیا کام لیا جائے گا؟
تاؤدار سفید مونچھوں والا چاچا مراد، جو الیہ میں طربیہ گھولنے کا بادشاہ تھا کہتا:
تمہارا تیل نکال کر اس کے انجن میں ڈالا جائے گا۔'' ۱۴۷

قاسمی ان سماجی ناہمواریوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان کا دل کڑھتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں نہ صرف محکوم، محنت کش افراد کی موثر تصاویر دکھائی دیتی ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تبدیلی کے خواہاں بھی ہیں۔ قاسمی چاہتے ہیں کہ:

''انسانی طبقوں کا یہ تفاوت ختم ہو جائے۔۔۔ کوئی انسان کسی انسان کا محتاج نہ رہے۔ ہر انسان محض اپنے لیے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے اچھے اچھے کام کرے اور آدمی اپنی انفرادیت کی اس ڈھب پر پرورش کرے کہ اس کے مدنظر ہمیشہ اجتماعی مفاد ہو تو جینے کا لطف آ جائے۔'' ۱۴۸

قاسمی نے اپنے گرد و پیش میں پھیلی، دھڑکتی اور سانس لیتی زندگی کی کامیاب ترجمانی کی ہے جس کا تعلق ''انسان اور ''انسانی زندگی'' کے گوناگوں مسائل سے ہے۔ انھوں نے زندگی کو اپنی اصل صورت میں پیش کیا۔ قاسمی کے تصور میں انسان معصوم ہے کیوں کہ وہ اس دنیا میں فطرت کی تمام آلائشوں سے پاک اور منزہ صورت میں آتا ہے۔ وہ پیدائشی طور پر لالچ، خودغرض، منافقت، انتقام اور نفس پرستی جیسے حیوانی جذبوں کا حامل نہیں بلکہ سماج اور تہذیب کی جبریت اسے ان آلودگیوں کا شکار کرتی ہے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی روایت کو استحکام بخشا اور دیہاتی معاشرے کے حوالے سے زمین داروں اور کمی کمین کی جان دار تصویریں پیش کیں۔ انھوں نے امیر افراد پر توجہ دینے کی بجائے مفلس افراد کے غم و اندوہ کو اہمیت دی۔ صلاح الدین حیدر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ''اُنھوں نے عوام کی زندگی کے مشاہدے، مطالعے کو علم کی اساس بنایا اور محض ردعمل کی بجائے متحرک زندگی کو طبقاتی شعور کی اساس مہیا کی۔'' ۱۴۹

قاسمی نے اگرچہ طبقاتی شعور اور حقیقت نگاری سے کام لیا لیکن بے لاگ حقیقت نگاری سے افسانوں کو دُور رکھا۔ وہ ''پاکستان کی سماجی اور دیہاتی زندگی سے محبت کرنے والا اپنے خاص رنگ میں منفرد اور دقیقہ رس افسانہ نگار ہیں جو ہمیں بھڑکاتے نہیں ہمارے سامنے زندگی کی بصیرت افروز تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ نوع انسانی کو خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے نزدیک انسان کی ''یہ نوع صرف شہر کے فیشن ایبل علاقوں تک محدود نہیں، اس میں کروڑوں دیہاتی اور دوسری پامال مخلوق بھی شامل ہے جسے لوگ دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔'' ۱۵۰

قاسمی کے افسانوں کے ہیرو نیک، معصوم، وفا شعار اور مخلص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاسمی انسان پر کامل ایقان رکھتے ہیں۔ وہ جوہر انسانیت کو ہر بُرے انسان میں تلاش کر لیتے ہیں۔ قاسمی کی اس انسان پرستی اور حقیقت پرستی کو سمجھے بغیر ان کے فن کو سمجھنا مشکل ہے۔ ان کے افسانے ''زلیخا''، ''اصول کی بات''، ''قرض''، ''بے چارہ''، ''میرا دیس''، ''مہنگائی الاؤنس''، ''سپاہی بیٹا''، ''شکنیں''، ''آتش گل'' وغیرہ میں تلخ حقائق کے تیز نشتر انسانی احساسات کو چھلنی کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانہ ''سناٹا'' میں معاشرتی مسائل اور تلخ حقائق کی تصویر کشی ملتی ہے۔ گاؤں کی ایک خاتون یتیم و مسکین ''عالاں'' کے متعلق مصنف کو بتاتی ہے تو گویا انسانی نفسیات اور کائنات کے اہم نکتہ کو واشگاف کرتی ہے:

''جن لوگوں کو ہنسنے کی عادت ہوتی ہے نا، انھیں رونا بھی ہوتا ہے تو ہنسنے لگتے ہیں۔ تب وہ ہنستے ہیں تو اندر سے رو رہے ہوتے ہیں۔'' ۱۵۱

ہمارے معاشرے کی بیٹیاں صبر و شکر کی دلیل ہیں۔ گو عورت کی گھٹی میں ہی ایثار، صبر، قناعت کا جذبہ مشیت ایزدی نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ایک ماں اپنے میاں کو بیٹیوں کے صبر کے متعلق بتاتی ہے:

بیٹیاں بے چاری تو بڑی صابر ہوتی ہیں، روتے تو بیٹے ہیں۔'' ۱۵۲

قاسمی شاعر ہونے کے باوجود حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کی نگاہ زندگی کی بنیادی صداقتوں اور لطافتوں پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ قاری کو تخیلات کی دنیا میں گم کرنے کی بجائے اسی دنیا اور اسی ماحول کے گوناگوں معاشرتی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے حقیقی تصویر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری میں توازن و ٹھہراؤ موجود ہے۔ بقول فرمان فتح پوری:

''وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کی نظر بالعموم زندگی کی بنیادی صداقتوں اور لطافتوں پر رہتی ہے۔ انھی صداقتوں اور لطافتوں کو تخلیقی انداز سے پیش کرتے ہیں۔'' ۱۵۳

قاسمی حقیقت پسند افسانہ نویس ہیں۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھتے ہیں اور پھر ان حقائق کو کبھی دھیمے لہجے اور کبھی شیریں الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔ انیس ناگی لکھتے ہیں:

''وہ بنیادی طور پر ریلسٹ افسانہ نویس ہیں۔ اسی لیے وہ معاشرتی حقائق کی ترجمانی کو افسانے کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ وہ انسان کے اندر نیکی پر یقین رکھتے ہیں۔'' ۱۵۴

قاسمی نے اپنے افسانوں میں دیہی زندگی کے حالات و واقعات، عورتوں کے مسائل، مرد کی نفسیات، معاشرتی ناہمواریاں، طبقاتی کش مکش، جنسی گھٹن، لڑکے اور لڑکیوں کے معاشقے، متوسط طبقہ کی سفید پوشی، مفلسی، تنگ و تاریک گلی کوچوں میں بسنے والوں کے روز و شب، تعصبات، باوسائل طبقہ کی زیادتیاں، اوہام پرستی، دیہاتیوں کی سادہ لوحی، پیٹ کی پکار، نفرت و محبت کی آگ اور ہوسِ زر غرض بے شمار تلخ حقائق پیش کیے ہیں۔ کرشن چندر لکھتے ہیں:

''اپنے افسانوں میں احمد ندیم قاسمی زندگی سے گریز کرتا نظر نہیں آتا بلکہ اسے چھو لینے کے لیے بے قرار دکھائی دیتا ہے۔'' ۱۵۵

قاسمی نے زندگی کے سنگین و پیچیدہ مسائل اور کسانوں کی زخمی زندگی کو نہایت نڈر انداز میں بیان کیا ہے۔ قاسمی اپنے افسانوں میں غریب طبقے سے ہمدردی رکھتے، متوسط طبقے کی سفید پوشی کو منظرِ عام پر لاتے اور امیر طبقے کی منافقت اور مظالم کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے افسانوں میں مرکزی کردار دیہاتوں کے وہ مفلس افراد ہیں جن کو شدید مشقت کے باوجود دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔ ان کی ڈھارس بندھانا اور زخموں پر پھاہا رکھنا قاسمی اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ کرشن چندر لکھتے ہیں:

''اُسے کسانوں سے محبت ہے۔ وہ اس ''طلائی دیوار'' کو جو زندگی اور اس کی خوشیوں کے درمیان کھنچی ہوئی ہے، اپنے زخمی سینے کی اُبلتی ہوئی طاقت سے شکستہ اور چکنا چور کر سکتا ہے۔'' ۱۵۶

انھوں نے ''چوپال'' سے لے کر ''پت جھڑ'' تک دیہی اور شہری زندگی کے مسائل کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے راقم الحروف کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ ''قاسمی کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد لوگ پکار اُٹھتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے محسوس کیا ہے۔ وہ قاسمی نے دیکھا بھی ہے پھر کہانیوں میں پیش بھی کیا ہے۔''[۱۵۷] قاسمی انسانی زندگی کی بنیادی سچائیوں کو اس طرح اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں کہ ان کا نظریہ حیات بھی واضح ہو جاتا ہے اور فنی لطافت بھی قائم رہتی ہے۔ بالخصوص دیہی زندگی کو بڑے عمیق مشاہدے سے پیش کیا ہے جس سے زندگی کا حسن بھی قائم رہتا ہے اور موضوعات کی رنگینی بھی قاری کو متوجہ کرتی ہے۔

افلاس کا وجود انسانی معاشرے کے لیے ناسور کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس بھیانک صورتِ حال میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ریاض احمد شیخ، غربت کے متعلق لکھتے ہیں:

''غربت کسی بھی معاشرے میں اس سماجی تقسیم کا نام ہے جس میں چند افراد معاشرے کے وسائل پر قابض ہو جائیں جب کہ دوسری طرف معاشرے کا بڑا گروہ، اس کے برعکس اپنی بنیادی ضروریات کے حصول سے بھی محروم رہے۔'' ۱۵۸

قاسمی نے ''مفلسی'' کے موضوع پر افسانے تخلیق کر کے اسی معاشرتی المیے کو پیش کیا ہے۔ افسانہ ''غیرت مند بیٹا'' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''وہ بھوک سے مرا تھا بیٹا، تیرا باپ بھوک سے مرا تھا۔'' ۱۵۹

اس غیرت مند بیٹے نے ساری زندگی مرحوم غریب باپ کی مردانگی، انا وخودداری کے قصے سننے اور ماں کی نصیحتوں کے مطابق باپ کے نقشِ قدم پر گامزن رہنے میں گزار دی۔ اس کی ماں دوسروں کا آٹا پیستی رہتی۔ اس کے بالوں میں آٹے کی تہہ جمی رہتی لیکن اپنے گھر کا چولہا ٹھنڈا رہتا۔ اس کی ماں کی انگلیوں کی گانٹھیں بھی فاقوں کی کہانی سنا رہی ہوتی، اس کا دل بہت کڑھتا جب ماں کے ماتھے پر بھوک کی شکنیں اور آنکھوں میں مفلسی کا دور دورہ دیکھتا تو نوجوان بیٹے کا دل خون کے آنسو روتا۔ اس غیرت مند بیٹے کی عزتِ نفس کو ایک ٹھیکے دار اس قدر مجروح کرتا ہے کہ وہ نوکری چھوڑ دیتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی قریب المرگ ماں دوا کے پیسے نہ ہونے کے باعث موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ ''بنیادی طور پر اس افسانے کا موضوع غریب لوگوں کی زندگی ہے کہ جس میں غیرت اور عزت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور جب کوئی غیرت کو کلیجے سے لگا کر زندہ رہنا چاہے تو اسے ہر قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے''۔ ۱۶۰ یوں غربت کے باعث، مسلسل بھوک اور فاقوں کی وجہ سے ایک بچہ نہ صرف مسکین ویتیم ہوا بلکہ اس دنیا میں تنہا رہ گیا۔ ہر خوشی اور شادمانی نے اس سے منہ موڑ لیا اور اگر کسی نے اس کا ساتھ مرتے دم تک نبھایا تو وہ بھوک تھی، مفلسی تھی۔ اسی طرح ''بگولے'' کا افسانہ ''طلائی مہر'' کی بوڑھی بیوہ لوگوں کا اناج پیسا کرتی لیکن اتنی مشقت کے باوجود پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔ بالآخر یہی بڑھیا لوگوں کا غلہ پیستی پیستی چکی کے پاٹوں پر سر رکھ کر مر گئی۔ یہ افسانہ انسانی نفسیات اور معاشرتی رجحان کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ یہ روح کو کپکپانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کسی سطح پر چونکاتا ہے اور پیش نظر کردار کے لیے دل میں ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے کہ جہاں قاری رُک کر، ٹھٹک کر، کچھ دیکھنے، کچھ محسوس کرنے اور کچھ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ قاسمی جب اپنے گاؤں سون سکیسر جاتے اُنہیں وہاں ایسے افراد دکھائی دیتے جنہیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ آتی۔ ٹھٹھرتی سردی میں جن کے گریبان چاک ہوتے۔ قاسمی اپنے احساسات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اور جب سردی میں ان کے گریبان چاک ہوتے ہیں اور جب سرد ہوا کے یخ بستہ جھونکے ان کے جسم سے ٹکراتے ہیں تو میں اس کے تصور سے کانپ اُٹھتا ہوں۔'' ۱۶۱

ان کا مقصد یہی تھا کہ شاید ان کی کہانیوں سے امیر اور ذہین طبقہ کے افراد ان کی زندگیوں کے متعلق کچھ سوچیں۔

ہمارے معاشرے میں ذیل دار کا کردار ایسی بیل کی مانند ہے جو مفلس افراد کا خون چوستی ہے۔ ذیل دار، زمین دار، جاگیردار؛ یہ سب زندگی کے اندھیرے میں عمل کرنے والے بھوت ہیں۔ ذیل دار کو مصاحبوں

میں کھڑے ہو کر ذہنی سکون ملتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب جونک ہیں لیکن مسکراتے ہوئے حقہ پیتا ہے۔ اُسے ذہنی سکون ملتا ہے۔ افسانہ ''جلسہ'' میں بوڑھا غریب آدمی ذیل دار رئیس خاں کا مزارع تھا۔ اس کی زمین پر ہل چلاتا۔ مولوی صاحب جب بھی گاؤں میں آتے تو ان کی خاطر مدارت کے لیے ذیل دار ہر گھر سے چندہ اکٹھا کرتا۔ غریب بوڑھا چندہ ادا نہ کر سکا۔ ذیل دار نے گھرکتے ہوئے کہا کہ وہ چندہ لیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھے گا چناں چہ اس نے بوڑھے سے چندہ اس طرح لیا: ''رات کو کسی وقت جب بوڑھے کی آنکھ کھلی تو اس کی اکلوتی جوان لڑکی کا بستر خالی پڑا تھا۔ وہ ذیل دار کے گھر کی طرف بھاگا اور وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ذیل دار ایک کمرے کے باہر خود ہی ایک لٹھ تھامے بیٹھا ہے۔۔۔ ذیل دار سے جا کر پوچھا کہ میری لڑکی کہاں ہے اور ذیل دار نے بتایا کہ وہ اندر مولوی جی کے پاس کنوار پن لٹا کر تیرا چندہ ادا کر رہی ہے۔ بوڑھے نے چیخنا چاہا مگر ذیل دار کی لٹھ سیدھی اس کے دماغ پر پڑی۔ چوکیدار اسے اُٹھا کر باہر گلی میں لے آئے۔'' ۱۶۲

یہ کہانی ماحول کی وحشیانہ کارکردگی کو منظر عام پر لاتی ہے۔ قاسمی نے نہایت ایمان داری سے ماحول کی برائی کو اُجاگر کیا ہے۔ معاشی ناہمواریاں ہماری زندگی کا حصہ ہیں جس کی وجہ سے ظلم و جبر سامنے آتا ہے۔ قاسمی اپنے افسانوں میں ہمیں افلاس زدہ بستیوں، گھرانوں اور ان کے مکینوں سے متعارف کراتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے کردار تخلیق کیے جو انتہائی بے کسی کے عالم میں سسک سسک کر زندگی گزارتے ہیں۔ بھوک اور غربت ان کی تمناؤں اور جذبوں کو کچل دیتی ہے۔ وہ بھلے دنوں کی آس میں زندگی گزارتے ہیں لیکن محرومی نسل در نسل ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ فیض کا کردار مفلس زدہ بستیوں کے مکینوں اور ان کے تمدن کی عمدہ ترجمانی کرتا ہے۔ قاسمی نے اپنے بعض کرداروں کے ذریعے ان قوتوں کو بے نقاب کیا ہے جن کے استبداد اور آمرانہ طرزِ عمل کی بدولت ان افراد کی زندگی اجیرن بن گئی ہے۔ یہ قوتیں ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں جس کی وجہ سے سماجی اور تہذیبی زندگی میں نت نئے بحران اور المیے جنم لیتے ہیں۔ ''شیرو'' اور ''رحمان'' کا کردار ان آمرانہ قوتوں کے جبر کو بے نقاب کرتا ہے۔ افسانہ ''آتش گل'' کی گلابو مہنگائی کا رونا روتی ہے وہاں وہ افسانے کے کردار کی زبانی یہ بھی کہلواتے ہیں:

> ''نیا نیا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دینے والا اذان نہیں پڑھتا۔ اس روپے کو یاد کرتا ہے جو اذان کے بدلے اُسے ملے گا۔'' ۱۶۳

گلابو کو حالات اور جبر کی کوکھ نے جنس فروشی پر مجبور کیا۔ اس کے سامنے پیٹ کی آگ بجھانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر گلابو جنسی تجارت شروع کر دیتی ہے۔ حالات کے سامنے سپر ڈالتے ہوئے وہ کہتی ہے:

> ''میری پنشن بندھ گئی ہے۔ ہفتے میں دو ایک چھوکرے ضرور پھانس لیتی ہوں اور ہر چھوکرے سے دو روپے بھی لوں تو مہینے میں پندرہ بیس تو ملتے رہیں گے۔'' ۱۶۴

زندگی اپنے اندر بہت سے دکھ سمیٹے ہوئے ہے۔ چند الفاظ ان دکھوں اور پریشانیوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ دکھوں میں اگرچہ بڑا دکھ غربت کا ہے جس کے ہاتھوں بے بس اور مجبور افراد اپنی عزت کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں:

''ایک بوڑھا اپنی کنواری بیٹی کا رات بھر غائب رہنا صرف اس لیے برداشت کر لیتا کہ صبح سویرے اس کی ڈبڈبائی آنکھوں والی لڑکی اس کی ہتھیلی پر چونی یا اٹھنی رکھ دیتی ہے۔'' ۱۶۵

کئی ذیل دار و زمین دار مصیبت زدہ کسان کی کنواری بیٹی کو ہوس کا نشانہ بناتے۔ قاسمی نے ظلم، بربریت اور جنسی شقاوتوں کو سچائی سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے پورے معاشرتی نظام میں زمین داری کے ماحول کو جزئیات سے پیش کیا ہے۔ بھوک کئی باریش چہروں کو داغ دار کر دیتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں غربت کے ہاتھوں کئی جوان بیٹیوں کو موت کی نیند سونا پڑتا:

''ایک بیٹی تھی۔ چودھویں رات کے چاند کی طرح من موہنی، صورت والی، پچھلے مہینے اسپتال میں مرگئی۔ نیا ڈاڈر آیا ہے۔ پانچ روپے مانگتا تھا۔ میرے پاس ایک چھلڑ (روپیہ) تھا۔ سو اس نے خبر نہ لی۔ روتی، بلکتی، تڑپتی ختم ہو گئی۔'' ۱۶۶

انسانی مسائل میں اقتصادی مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور بھوک زندگی کی تلخ اور اٹل سچائی ہے جسے نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔ ان کا قلم غریب افراد کے لیے وقف تھا۔ یہ فرد کہیں کاشت کار اور کہیں مزارع کا روپ اختیار کرتا ہے۔ عمر بھر سخت محنت کرتا ہے اور صلہ میں زمین دار کی گالیاں سنتا اور کمی کمین کے القابات سے نوازا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''ندیم کو ان ہی کرداروں سے پیار ہے جس کے نہ مٹکے میں اناج ہے نہ صندوق میں کپڑا اور نہ جیب میں پیسہ ہے۔ اگر کچھ ہے، جن کے آنکھوں میں آنسوؤں کی چنگاریاں ہیں اور دل میں جیسے کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے کہ اور ہونٹوں کی اکڑی ہوئی پپڑیوں پر یہ دعا اٹکی ہوئی ہے: ''الٰہی! تو جو ایک کو لاکھوں دے ڈالتا ہے۔ لاکھوں کو ایک تو عطا کر دیا کر ہم بڑے شاکر اور صابر لوگ ہیں۔ ہم خون کے گھونٹ پی کر بھی جی سکتے ہیں مگر رگوں میں خون بھی تو ہو۔ ہم مٹی چاٹ کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم سانپ نہیں ہیں۔ ہم تو اشرف المخلوق ہیں۔ ہم تو زمین پر تیرے خلیفے ہیں۔'' ۱۶۷

افسانہ ''شکنیں'' کا غفورہ ایسا انسان ہے جس کا چہرہ مفلسی کے باعث شکنوں سے پُر ہے جسے صرف خوش حالی کی استری سے مٹایا جا سکتا ہے۔ غفورے کی بیوی غربت کی وجہ سے کرایہ نہ ہونے کے باعث اپنی ماں کی تیمارداری کے لیے بھی نہیں جا سکی۔

افسانہ ''رئیس خانہ'' کی کہانی فضلو اور مریاں کے کرداروں کے گرد گردش کرتی ہے۔ صحت افزا پہاڑی مقام

کے مسافر خانے میں فضلو ملازم ہے اور مریاں اس مسافر خانے کی صفائی کرتی ہے۔ دونوں کی زندگی افلاس زدہ ہونے کے باوجود مسرت سے گزر رہی تھی۔ ''مریاں'' قاسمی کا ایک جان دار کردار ہے جو باوفا اور محبّ بیوی کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ جب فضلو، یوسف کی باتوں میں آ کر ہر روز دس روپے کے عوض ایک عورت کا انتظام کرتا اور یوسف اپنی جنسی پیاس بجھانے کی بجائے صرف اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا تو فضلو نے اپنی حسین بیوی مریاں کو اس مقصد کے لیے بہت اصرار کے بعد تیار کر لیا۔ وہ عیاش شہری رات بھر مریاں کے جسم سے کھیلتا رہا کیوں کہ یہ مکار شہری مریاں سے اپنی جنسی بھوک مٹانا چاہتا تھا۔ جب مریاں نے فضلو کو گزشتہ رات کی سرگزشت سنائی تو فضلو پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اُس کی غربت ہی اُسے فریب دینے کا باعث بنی اور جب مریاں اور فضلو اپنے زخموں کی رفوگری میں مشغول ہوتے ہیں تو فضلو آہستگی سے کہتا ہے: ''میری غریبی مجھے دھوکا دے گئی مریاں۔''[۱۷۶] یہ جواب قاری کے دل پر کرب کے نشتر چلاتا ہے۔ اس افسانہ میں قاسمی کی حقیقت نگاری، فنی پختگی اور دیہاتی پس منظر کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون ''رئیس خانہ'' میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''رئیس خانہ'' ہمارے سماج کا آئینہ ہے، جس میں سماج کا چہرہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے۔ اس کے کردار ہمارے سماج کے کردار ہیں۔ یہ کردار نہ صرف آزادی سے قبل کے سماج کے کردار ہیں بلکہ ہر عہد کے، ہر ملک کے کردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ عصری حیثیت سے بھی معمور نظر آتا ہے اور اپنے اثرات اور دائرہ اثر کی بنا پر آفاقی حیثیت کا حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک ''رئیس خانہ'' ہی لکھا ہوتا تو بھی اردو ادب میں زندہ رہتے لیکن قاسمی نے ایسے کئی معرکتہ الآرا افسانے اُردو کو دیے ہیں۔'' [۱۶۸]

ہمارے معاشرے میں ہزاروں مریاں روز مجبوری اور مفلسی کی بھینٹ چڑھتی ہیں اور ہزاروں فضلو امیر مکار لوگوں کے چنگل میں پھنس کر اپنی عزت گنوا بیٹھتے ہیں۔ یہ افسانہ رومانیت و تلخ حقیقت کا امتزاج ہے۔ اس کی فضابندی میں سون سکیسر کی حسین وادی کی محاکاتی عکس بندی ہے کیوں کہ یہی علاقہ مصنف کا دیکھا بھالا تھا۔ مصنف کا مقصد قاری کو چونکانا نہیں بلکہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر مفلسی اور سادگی کے ساتھ لالچ بھی شامل ہو جائے تو حالات بھیانک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد شیخ لکھتے ہیں:

> ''دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو چاہے وہ ترقی یافتہ ممالک ہو یا ترقی پذیر۔ عورت کے استحصال کے پیچھے غربت کارفرما ہے اور عورت کے استحصال کا ذمہ دار وہ سرمایہ دار ہے جس کے پاس بے تحاشا دولت ہے اور اس کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر جس طرح چاہے عورت کا استحصال کرے۔'' [۱۶۹]

جہیز کی قبیح رسم معاشرے میں بُری طرح سرایت کر چکی ہے۔ ایک بیوہ اپنی جوان بیٹی کی شادی کی

خواہش مند ہے لیکن لڑکے والے زیور، کپڑے اور بیس ہزار کے جہیز کی بات کرتے ہیں جب کہ بیوہ کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا بھی مشکل سے میسر ہے۔ لہٰذا اس کی جوان بیٹی اپنے خوابوں کو سینوں میں ہی دفن کیے ماں باپ کی دہلیز پر بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ افسانہ ''ماسی گل بانو'' اسی مفلس گھر کی کہانی ہے۔ جہیز کی کمی کے باعث اس کی بارات دروازے سے واپس چلی جاتی ہے۔ اس کا باپ مر جاتا ہے اور ماسی گل بانو بے ہوش ہو جاتی ہے۔

افسر ساجد اپنی کتاب "Profiles and Dialogues" میں رقم طراز ہیں:

> "In his verse he seeks to synthesis his sense perceptions with the harsh realities of life with an extra ordinary aesthetic eclat---" ۱۷۰ے

انسان دوستی انسانی جبلت میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کا حصہ بھی ہے۔ ادب انسان دوستی کا پیام بر ہے۔ اس کا تعلق خواہ کسی بھی صنفِ ادب سے ہو۔ صلاح الدین درویش انسانی دوستی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> ''انسان دوستی شعور کی ایک ایسی موج ہوتی ہے کہ جس سے وہ آرٹ جنم لیتا ہے جو انسان کو احساسِ شکست، زوال اور بے بسی سے باہر نکالتا ہے۔ اسے انسانی حقوق کا شعور بخشتا ہے اور سیاسی، سماجی اور معاشی آزادیوں کی راہ دکھاتا ہے۔'' ۱۷۱ے

قاسمی کے افسانے انسان اور انسانیت کی داستان پر مشتمل ہیں۔ وہ بنی نوع انسان اور انسانی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ انسان ہی زندگی کو سنوارتا ہے۔ اُس کی کوششوں سے ہی زندگی ارتقا کی راہ پر چلتی ہے۔ سیکولر انسان دوستی کا نظریہ ایک واضح مقصد کے تحت موجود ہے۔ انھوں نے ایسے کرداروں کو اُبھارا ہے جو ناخواندہ ہونے کے باوجود انسان دوستی کے روادار ہیں مثلاً پرمیشر سنگھ کا کردار جو مذہبی تعصب سے بالاتر ہے۔ اختر کو کرتارا (اپنے بیٹے) کے روپ میں دیکھنے، بے پناہ محبت اور شفقت کے باوجود اسے اپنا دھرم واپس دلاتا ہے۔ قاسمی نے بہت محنت سے یہ کردار تخلیق کیا۔ یہ کردار محبت اور شفقت سے بھرپور، انسان دوستی کا حامل اور زندہ و جاوید رہنے والا کردار ہے جو انسانی ذہن پر ان مٹ نقوش ثبت کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ ''کفن دفن'' کا سیف الحق انسانی ہمدردی کے تحت غفورے کی بیوی کے لیے کفن دفن کا انتظام کرتا ہے۔ اسی طرح بابا نور، دہقانی بزرگ، چھوٹی بچی سے محبت اور انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت شہر سے پھلجھڑیاں لینے جاتا ہے اور سردی کے موسم میں، شدید بارش میں بھیگنے کے باعث اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ''عبدالمتین ایم اے'' دیہاتی زندگی کو دیکھنے کا دلدادہ ہے وہ سادہ لوح دیہاتیوں کی غربت اور کس مپرسی کو دیکھ کر اصلاح کا بیڑا اُٹھاتا ہے۔ گھر سے رخصت ہوتے ہوئے اپنی والدہ سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> ''آپ۔۔۔ میری پیٹھ ٹھونکیے کہ وہ کام کرنے نکلا ہوں جس کے بغیر نہ ہندوستان آزاد ہو سکتا ہے اور نہ عدل و انصاف کی روح اطمینان کا سانس لے سکتی ہے۔'' ۱۷۲ے

قاسمی کے اکثر کردار اچانک تاریکی سے باہر آتے ہیں۔ اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے زندگی کو منور کرتے ہیں۔ ان کرداروں میں اپنی مٹی اور تہذیب کی خوش بو شامل ہوتی ہے۔ قاسمی کے مشاہدے اور وجدان نے ایسی نادر بصیرت عطا کی کہ وہ کردار کے اندرونی حسن اور جوہر تک پہنچ جاتے ہیں؛ زندگی کے گہرے اور رنگارنگ تجربات کے اندر اُتر جاتے ہیں اور ہمیں تجربوں میں شریک بنا لیتے ہیں۔ قاسمی کے کئی کردار انسان دوستی کا نغمہ بن کر اُبھرتے ہیں۔ قاسمی زندگی کی روح اور اس روح کی خوش بو کو سمجھتے ہیں۔

انسانی فطرت ہر قسم کے غیر فطری اور غیر انسانی دباؤ کے خلاف ہے۔ جاگیردار مہاجرین کو گالی گلوچ کرتا ہے جب کہ دوسری طرف غریب دہقان شیرا انصار مدینہ کے سے جذبے سے بھرپور محبت اور رفاقت سے اس کا استقبال کرتا ہے۔ قاسمی روشن خیالی، انسان دوستی اور اعتدال پسندی کو کسی بھی ریاست میں موثر تبدیلی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ''کپاس کا پھول'' کی مائی تاجو کی تنہائی کی وجہ سے راحتاں کو اس سے بہت انسیت ہے۔ محنت و مشقت سے زندگی بسر کرنے والی مائی تاجو مضمحل جسمانی اعضا ہونے کے باوجود چکی پیستی ہے۔ لہٰذا راحتاں کا معمول بن گیا۔ وہ ہر شام کو ایک روٹی اور سالن لے کر آتی اور جب تک مائی تاجو کھانے سے فارغ نہ ہوتی وہ دل چسپی سے اس کی باتیں سنتی رہتی۔

قاسمی نے جب بھی انسانی زندگی کو موضوع بنایا ہے تو کائنات اور معاشرے میں عظمتِ انسانی اور اس کے وقار کے احیا کی چٹان میں دراڑیں ڈالنے والے عناصر کا جائزہ بھی لیا۔ قاسمی تلخ حالات و واقعات؛ سماجی، معاشی اور سیاسی ابتری؛ انسان کی تذلیل اور بے بسی کے سامنے خاموش تماشائی بن کر نہیں رہے بلکہ انھوں نے انسانی عظمت اور وقار کو اہمیت دی۔ جنگ، نفرت اور تعصب کی ہوا میں جب بھی کبھی انسانی حقوق کی پامالی کے شعلے بھڑکے، قاسمی نے ان پر نہ صرف احتجاج کیا بلکہ انسانی حقوق کی اہمیت اور شعور کو اُجاگر کرنے میں اپنا موثر کردار بھی ادا کیا۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن انسان دوستی کے گہرے جذبے کو سراہتے ہوئے اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''فن کار نے اپنی کہانیوں میں ''ہیومنزم'' کا رس نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس ''رس'' نے کہانیوں میں بڑی شگفتگی اور رعنائی پیدا کر دی ہے۔ انسان اور انسان کے رشتے کو غیر معمولی حیثیت دیتے ہوئے احمد ندیم قاسمی کبھی کبھی سماج کے زندہ اور متحرک کرداروں کو پراسرار پرچھائیوں کی صورت دے دیتے ہیں جو قاری کے جذبے اور احساس میں جذب ہو جاتے ہیں۔ سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔ اپنے درد کو قاری کا درد بنا دیتے ہیں، کبھی کبھی اس طرح کہ کلیجہ پھٹتا محسوس ہوتا ہے۔'' [۴۳]

مارکسزم کے مطالعے اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے احترامِ آدمیت کے جذبے کو مستحکم کیا۔ ان کی خواہش ہے کہ انسان بلند مقام پر پہنچے جہاں وہ اپنے حقوق کو پہچان سکے۔ ان کی خاطر لڑ سکے۔ افسانہ ''کنگلے'' ایک

ایسے علاقے کی کہانی ہے جہاں مدت سے بارش نہیں ہوئی اور کرسی نشین صاحب نے کنویں پر پہرے دار بٹھا رکھے ہیں جہاں سے کسی غریب کو پانی لینے کی اجازت نہیں۔ اس علاقے کے لوگ سروں پر گاگریں رکھے گاؤں سے بیسیوں میل کے فاصلے پر کڑوے اور کھارے پانی کی جھیل سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ویرانی جھانکتی اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔ یہ گاؤں زندگی کے ظاہری حسن سے دُور ہے۔ اس کہانی میں معاشرے کا کرب ہے جس نے آہستہ آہستہ فن کار کے کرب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ گاؤں کے باشندوں کی بے بسی کے بعد بھی ان کے ضمیر زندہ ہیں۔ جب گاؤں میں دو ڈاکو گھس گئے اور لوٹ مار کرنے لگے۔ حیات کو اچانک ترکیب سوجھی اور وہ اپنے دوست پھلہ سے کہنے لگا:

> ''بھئی میرا خیال ہے کہ ہم بھی کسی گھاٹی میں چھپ بیٹھیں۔ کوئی کھاتا پیتا گزرے تو دبوچ لیں اسے۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے نا۔ مانگنے پر نہیں دیتے تو نہ سہی، کوئی سبیل تو چاہیے نا آخر۔
>
> پھلہ بولا: رہنے بھی دے حیات، کیا گندی تجویز سوچی تو نے۔ کسی کا پیٹ چاک کر کے اپنا پیٹ بھر لینا اس سے تو بہتر ہے کہ انسان طاعون سے مری ہوئی چوہیا کھالے۔'' ۴۷ا

قاسمی انسان دوست فن کار ہیں لیکن ان کی دوستی اعلیٰ طبقے کے افراد سے راہ و رسم اور آشنائی پیدا نہیں کرتی بلکہ وہ غریب انسانوں سے لگاؤ رکھتے ہیں جو گندگی میں رہ کر ماحول کو حسن و رعنائی عطا کرتے ہیں۔ قاسمی احترامِ آدمیت کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہی دردمندی، خلوص اور انسان دوستی کے جذبات ان کے افسانوں کو نہ صرف لازوال حسن بخشتے ہیں بلکہ عام موضوعات کو تنوع اور رنگا رنگی کی خصوصیات سے بھی مزین کرتے ہیں۔ رواداری، محبت، ایثار اور دردمندی کے عناصر نے قاسمی کے افسانوں کو ابدیت عطا کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے نزدیک:

> ''انسان دوستی اس کا فنی آدرش ہی نہیں، مقصد حیات بھی ہے۔ چناں چہ احمد ندیم قاسمی نے بدل بدل کر یہی نغمہ بار بار گایا ہے۔ اس لیے جب وہ انسان کو غیر انسانی حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کے اندر کا حساس فن کار تخلیقی سطح پر احتجاج کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' ۵۷ا

انھوں نے اپنے ماحول اور مٹی سے محبت کو مشرقی رنگ میں پیش کیا۔

افسانہ ''میں انسان ہوں'' میں انسان کو تمام تعصبات سے بالاتر رکھ کر بحیثیت انسان پیش کیا گیا ہے۔ وہ انسان کو ایک ازلی معصوم قرار دیتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے زندگی ارتقا پذیر ہوئی ہے۔ یہ زندگی کو سنوارتا اور اس میں رنگ آمیزی کرتا ہے۔ یہ افسانہ خارجی سطح پر فریقین کے جبر سے پسی ہوئی انسانیت کا مرثیہ ہے۔ داخلی سطح پر

قاسمی نے ہندو اور مسلمانوں کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے غیر جانب داری سے ہر فریق کو مظلوم ٹھہرایا ہے۔

> ''میں انسان ہوں کلائی پر کھدے ہوئے اوم ٹوپی پر ٹکے ہوئے چاند ستارے اور پہلو میں لٹکتی ہوئی کرپان کے باوجود میں انسان ہوں۔ میں ساری دھرتی کا باشندہ ہوں اور میں ایک ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں جو ستاروں اور پھولوں اور پانیوں میں بسا ہوا ہے لیکن جس سے آج تک میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔'' ۱۷۶

قاسمی اس افسانے میں ظلم کو ایسے رُخ سے پیش کرتے ہیں کہ کسی ایک فریق کی شقاوت کی بجائے پوری انسانیت کا چہرہ داغ دار دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح انھوں نے پوری نسل انسانی کی نمائندگی کی ہے۔ افسانے کے زیریں سطح پر چلنے والی جذباتیت کے باوجود، قاسمی بطور ادیب مثبت انداز میں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ وہ کہیں انسانوں کی بربریت اور ظلم وتشدد کو واضح کرتے ہیں اور کہیں انسانوں کی ہمدردی، محبت اور ایثار کو پیش کرتے ہیں۔

قاسمی کی منظر کشی عمدہ ہے۔ وہ انسانوں کی درندگی اور خون ریزی کو حیرت زدہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہ وہی انسان ہے جو حصولِ آزادی کی خاطر پابند سلاسل رہا۔ ملک کے لیے جان کی بازی لگانے سے گریز نہ کیا۔ جب آزادی ملی تو اپنوں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

> ''میں نے بہو کے جسم پر سے آدمیت اور نسوانیت کے منصبوں کو اُکھڑتے دیکھا جن سے بڑے بڑے اوتاروں، بزرگوں اور گروؤں نے زندگی کا رس چوسا تھا۔ جن سے پھوٹتی ہوئی دودھ کی دھاروں میں ماتا اور طہارت تھی اور زندگی تھی ۔۔۔ اور انسانیت کی یہ تخلیق گاہیں جب نسوانیت کے مقبرے بن کر میرے معصوم پوتے پر گریں تو انھوں نے دودھ کے پیاسے ہونٹوں پر لہو نچوڑ دیا اور میرے اندر انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی اور جھکا ہوا آزاد جھنڈا میرے سر پر برابر تالیاں سی بجاتا رہا اور دھواں گہرا ہوتا رہا اور نعروں کے شور میں شدت آتی گئی۔'' ۱۷۷

قاسمی نے درندگی کے ایک منظر کو فکری وفنی حوالے سے اظہار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہ ایسی کرب ناک حقیقت ہے جو انسان کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ ان کے کرداروں میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کردار زندہ انسانوں کی مانند حرکت کرتے اور زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ زندگی سے مایوس اور بددل بھی ہوتے ہیں لیکن راہِ فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک امید ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتی ہے۔ رجائیت کا یہی پہلو انھیں زندگی کی جانب گامزن کرتا ہے۔

تحسینِ حُسن سرشتِ انسانی کا بنیادی تقاضا ہے۔ مشاہدہ فطرت ہو یا زندگی کا ستم، غم اور خوشی ہو یا

انقلابِ زمانہ، تلاشِ حسن قاسمی کے فکر و احساس کو بالیدگی و تازگی بخشتا ہے:

''بحیثیت شاعر میرا ایک ذاتی مسئلہ یہ ہے کہ اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال میں بھی حسن میرے احساسات و جذبات میں وہی قیامت برپا کر دیتا ہے جس کا تجربہ آج سے اٹھائیس تیس سال پہلے ہوا تھا۔ اس صورت میں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ذاتی حیثیت سے ابھی تک وہیں کھڑا ہوں جہاں اس وقت کھڑا تھا جب میری مسیں بھیگ رہی تھیں۔'' ۱۷۸

ایک تقریب میں کسی صاحب نے فنونِ حرب میں پسماندگی کو ظاہر کیا۔ اسی بحث کے دوران اس نے جمالیاتی اقدار کو ہدفِ ملامت بنایا تو قاسمی بے قرار ہو گئے۔ اپنے اس اضطراب کو قاسمی نے ''حسن و جمال کا مفہوم محدود نہیں'' کے عنوان سے ایک فکر انگیز مضمون میں منتقل کیا ہے۔ قاسمی جمالیاتی احساس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آرائش جمال صرف آرائش زلف و رخ تک محدود نہیں۔ یہ زندگی کے ہر شعبے اور اس شعبے کی ہر تفصیل اور اس تفصیل کے ہر جزو میں حسن و تناسب پیدا کرنے کا نام ہے۔ جب آرائشِ جمال کی اصطلاح قومی کلچر کے حوالے سے استعمال ہوتی ہے تو اس میں عورت کے حسن کے علاوہ اخلاق کا، رسم و رواج کا، حتیٰ کہ مزاج پرسی تک کا حسن، نیز شہر کا، باغ کا، سڑک کا، گلی کا بلکہ کسی دکان کے سائن بورڈ تک کا حسن بھی شامل ہوتا ہے۔۔۔ جس معاشرے میں حسن کا نام لینا ہی جرم ٹھہرے وہاں توازن و تناسب کی تلاش بے سود ثابت ہوتی ہے اور جو معاشرہ ان صفات سے محروم ہو اُسے زندہ قوم کا معاشرہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سو احساسِ جمال تو کسی قوم کے تہذیبی ارتقا کی واحد کسوٹی ہے۔'' ۱۷۹

قاسمی کے افسانوں میں بھی حسن و جمال کا یہی انداز جھلکتا ہے۔ قاسمی اقتصادی استبداد کی بیخ کنی کو بھی حسن کا ایک تقاضا سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''۔۔۔ ندیم حسن کا دلدادہ ہے۔ زندگی کا جلال و جمال اسے مرعوب بھی کرتا ہے اور مسحور بھی کرتا ہے مگر زندگی کا حسن اس کے قلب پر کچھ اس طرح ضوفگن ہے کہ اس کی شخصیت کے تار و پود اس سے منور دکھائی دیتے ہیں۔'' ۱۸۰

قاسمی کی کہانیوں میں حسن کی تصویر کشی، عمدہ جذباتیت اور محبت کی اہمیت اسلوب بیان کی رنگینی کے ساتھ سامنے آتی ہے بالخصوص حسن کی سراپا نگاری میں ان کا رومانی انداز واضح دکھائی دیتا ہے۔ قاسمی کی حسن نگاری کے متعلق سید وقار عظیم اپنے تاثرات درج ذیل الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:

''ندیم حسن کا شیدائی، حسن کا فدائی اور حسن کا پرستار ہے اور اس حسن نے جو جو روپ دھارا ندیم کی نظروں نے اس کا پیچھا کیا ہے اور اس کی اصلیت میں ڈوب کر بڑی معصومیت اور عبادت گزاری کے انداز میں اس کی تعریف و توصیف بھی کی ہے اور

دوسری کو حسن کی پرستش اور عبادت کا شعار بھی سکھایا ہے۔ انسان، اللہ کی بہترین مخلوق ہے اور اللہ کی اس سب سے حسین مخلوق کا سارا حسن سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گیا ہے۔ وہ سب افسانے جو حقیقت ہیں اور حسن پرست ندیم کے رومانی مزاج کے ترجمان ہیں۔ انھیں پڑھ کر آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ حسن دنیا کی سب سے بڑی، سب سے دل کش، سب سے دل نواز اور سب سے مقدس حقیقت ہے۔۔۔'' ۱۸۱

قاسمی کے افسانوں میں شاعرانہ حسن و جمال کہیں کرداروں کی صورت میں تو کہیں ماحول کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ قاسمی کی شاعرانہ جمال پسندی ہے۔ ان کے افسانوں میں دیومالائی قسم کے کردار نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسان ملتے ہیں۔ وہ حسن کو قلب و نظر کی گہرائیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ گرد و پیش کی دنیا سے حسن کو پامال ہونے سے بچانا چاہتے ہیں۔ ان کے نظریہ حسن کے متعلق فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''ندیم کے نزدیک حسن فرد کے جذباتی و روحانی زخموں کے لیے مرہم اندمال ہے تو معاشرتی اور تہذیبی روگوں کے لیے زبردست قوتِ شفا ہے۔'' ۱۸۲

قاسمی کی نگارشات میں حسن زندگی کی اعلیٰ قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ حسن سے مراد صرف نسوانی حسن نہیں، تاہم جو نسوانی حسن پاکیزہ فن کے وسیلے سے پیدا ہوتا ہے تو وہ جنسی جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتا بلکہ انسانی کھردرے جذبات کی تہذیب کرتا ہے اور انسانی جذبات کو توانائی عطا کرتا ہے۔ قاسمی کا تصورِ حسن خدوخال کے دائرے سے بلند ہو کر ذہن کی وسیع بالیدگی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ افسانہ ''گنڈاسا'' کا کردار مولا اپنے باپ کے قتل کا بدلہ چکانے کے بعد گلے کے پورے خاندان کو قتل کرنے کا خواہش مند ہے وہ قبائلی انتقام کی آگ میں جل بھن رہا ہے۔ اُسے گلے کی منگیتر راجو کے معصوم چہرے اور بے پروا حسن نے اپنا تسخیر کر لیا ہے۔ ایک روز جب خوب صورت راجو کا منگیتر گلا اپنے دشمن مولا کے چہرے پر پتھر مارتا ہے تو جواب میں مولا گلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اُٹھاتے ہوئے کہتا ہے:

''رسید تم ہی کو دے دیتا پر تمہیں تو دولہا بننا ہے ابھی، اس لیے جاؤ اپنا کام کرو۔'' ۱۸۳

وہ راجو کے حسن سے متاثر ہو کر محبت کو محسوس کرتا ہے اور قتل کی وارداتوں کا مرتکب ہونے والا مولا بچے کی طرح رو بھی پڑتا ہے۔ فتح محمد ملک اس افسانوی کردار پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ ہے حسن کا اعجاز کہ ایک قاتل کی آنکھوں میں اُترا ہوا خون آنسوؤں کے سیلاب میں دُھل دُھلا کر غائب ہو گیا۔ وحشی آنکھوں میں محبت کی چمک جاگ اُٹھی اور آدمی دورِ وحشت و بربریت کی تاریکی سے نکل کر امن و انسانیت کی روشنی میں سانس لینے لگا۔'' ۱۸۴

قاسمی حسن کی ٹھوس حقیقت کو پرتاثیر انداز میں پیش کرتے ہیں:

''تمھیں یقین دلانے کے لیے میرا قسموں پر قسمیں کھانے کو جی چاہ رہا ہے کہ شیرازہ دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے۔'' ۱۸۵

''میں نے ایسا حسن پچاس سال کی عمر میں اور کہیں دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔'' ۱۸۶

''راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تو اسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ اجنتا کے غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں۔'' ۱۸۷

قاسمی نے حسن کے تقدس اور پاکیزگی کو گہرائی سے دیکھا اور احساس کی شدت اور بیان کے جوش کو اثرانگیز انداز سے بیان کیا ہے۔ وقار عظیم اپنے مضمون ''ندیم کے افسانے؛ سناٹا کے بعد'' میں اظہارِ رائے کرتے ہیں:

''حسن کے حسین اور مقدس ہونے اور اس کے قرب کی ساعتوں کی سب سے خوب صورت اور سب سے پاکیزہ ساعتیں سمجھنے کا احساس اور ادراک ندیم کی رومانیت ہے۔۔۔ منشائے الٰہی نے اسے دو روپ دے کر پیدا کیا تھا۔ آنکھوں والا روپ اور دل والا روپ۔'' ۱۸۸

قاسمی چوں کہ شاعر بھی تھے اس لیے ان کے یہاں حسن بلاخیز اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ انھوں نے افسانوں کے وسیلے سے حسن کے جو پیکر تراشے ہیں ان کی حیثیت جاودانی ہے کیوں کہ اس سے حسنِ ذوقِ نظر کی تربیت اور قاری کے جذبۂ دل کی ایک ان مول رفعت کا سراغ ملتا ہے۔ حسن کے نظارے ماحول اور کرداروں میں بھی ملتے ہیں۔ قاسمی چوں کہ حسن کے دیوانے ہیں اس لیے اس شاعرانہ افتادِ طبع کے زیرِاثر افسانوں میں شاعرانہ رنگ بھی جھلکتا ہے:

''چاند ہمارے بالکل سامنے تھا، گول مول اور تندرست جیسے ابھی ابھی کسی نورانی جھیل میں ڈبکی لگا کر اُچھلا ہو۔'' ۱۸۹

''مٹیالا دیا، مخروطی لو جیسے جل پری تالاب کے کنارے کھڑی بال سُکھا رہی ہو۔'' ۱۹۰

''دھوپ نشہ آور تھی۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس وقت آسمان اتنا نیلا ہو رہا تھا جیسے اسے چھولو تو پوریں نیلی پڑ جائیں۔'' ۱۹۱

مناظرِ فطرت کی حسن کاری سے قاسمی کے افسانوں کی دل کشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ قاسمی فطری مناظر میں چاند، تارے، سورج، آسمان، بادل، پھول، جھرنے، تالاب، پگڈنڈیاں اور ندیوں کی منظرکشی ایسے انداز سے کرتے

ہیں کہ قاری نہ صرف اس حسن سے مسحور ہوتا ہے بلکہ وہ خود ان مناظر میں شریک ہو کر حسن کا متلاشی بن جاتا ہے۔ انھوں نے دیہاتی افراد کے حسن اور دیہی مناظر کو تخلیقی سطح پر بیان کر کے زندگی کی خوب صورتی کو بیان کیا ہے۔ قاسمی اپنے افسانوں میں مناظر قدرت کی مصوری کے ساتھ ساتھ کرداروں کے حسن، معصومیت اور سادگی کی کرشمہ سازیوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ کرداروں کی خوب صورتی اور دل کشی کا بیان اتنی شدت اور دل پذیر انداز سے کرتے ہیں کہ قاری اس کے تاثر سے بچ نہیں سکتا:

''اس کی آستین کہنی تک ہٹ جاتی تھی اور میلے ہاتھوں کے پیچھے اس کی کلائی کا صندل چمک چمک جاتا تھا۔'' ۱۹۲

''اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا۔'' ۱۹۳

''مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو اس انتہا کا حسن کار ہے۔'' ۱۹۴

افسانہ ''پہاڑوں کی برف'' کی خوب صورت بھکارن میں حسن کا دل کش احساس موجود ہے۔ بھکارن کی پتلی بھنوؤں، موٹی سیاہ آنکھوں، لمبی پلکوں، ستواں ناک، سرخ ہونٹ اور سفید گال کی خوب صورت تصویر کشی ملتی ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں جسم کی قوسِ قزح، روپ کی دل کشی اور بدن کی چھب نمایاں ہے۔ یہ ایسا حسن ہے جس کے انگ انگ میں چاندنی ہے۔ جس کے حسن و جسم کی گدلاہٹ مصنف کے تجربے میں شامل ہے جس کی جمالیاتی نزاکت سے مصنف نے اپنے اسلوب کی رعنائی حاصل کی۔ اگر چہ یہ ارضی محبوبہ کے نقوش ہیں جس کا گورا گورا چہرہ مہ تاب کی مانند ہے جس کے تیکھے نقوش سے ایک واضح انسانی صورت سامنے آتی ہے لیکن اگر باریک دوربین نگاہوں سے دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا تخلیقی پیکر ہے جسے قاسمی کے ذہن رسا نے تخلیق کیا ہے۔ چناں چہ وہ حسن کو الفاظ کے ذریعے تخلیقی پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ انسانی آنکھیں شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔ انسانی حسن کی تصویر کشی کرتے ہوئے قاسمی انسانی چہرے پر آنکھوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ عورت کی آنکھوں کو زندہ تاثر کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

''تابندہ کی آنکھیں، یہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پھیلیں اور مجھے نگل گئیں۔۔۔ ان آنکھوں پر دنیا کے ساتوں سمندر قربان۔'' ۱۹۵

''نوراں کی آنکھیں، میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنے ہی چاندوں کے عکس تھے۔'' ۱۹۶

افسانہ ''بھاڑا'' میں ملکاں جھیورن کی آنکھوں کا ذکر بہت خوب صورتی سے کیا ہے:

''میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دونوں جہان نظر آ گئے۔'' ۱۹۷

''اور بھاڑا میں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔۔۔ صرف ملکاں کی آنکھیں بولتی رہیں۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی، کالی، سوچتی ہوئی آنکھیں، جو کسی ملکہ کے چہرے پر ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں۔'' ۱۹۸

''میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو کسی گلابی دوا کے حلقے میں تنی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ چمک جو انتہائی پیار یا انتہائی غصے یا انتہائی درد کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔'' ۱۹۹

محولہ بالا اقتباسات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ یہی آنکھیں مصنف کو شعلہ نظر آتی ہیں تو کبھی ان سیاہ آنکھوں سے چراغ کی روشنی نظر آتی ہے اور یہ دل موہ لیتی ہیں۔ حسن دنیا کی دل نواز اور دل کش حقیقت ہے۔ مصنف کو ہر جگہ خوب صورت آنکھیں نظر آتی ہیں اور وہ اس حسن کا احاطہ کرنے کی کوشش میں مگن ہے۔ انسانی آنکھوں کے متعلق قاسمی کا واضح نقطہ نظر ہے۔ واشگاف انداز میں بتاتے ہیں:

''انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اس کی آنکھیں ہیں۔ زبان سے جذبات کا اظہار ادھورا ہی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔۔۔ لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں اس کی آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مجھے سمندر نظر آتے ہیں اور کہیں صحرا۔۔۔ کہیں ان میں تارے چمکتے ہیں اور کہیں چراغ بجھتے ہیں۔۔۔ ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں کہ غور سے نہ دیکھو تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔'' ۲۰۰

قاسمی کے افسانوی کردار کی آنکھیں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ چوں کہ وہ حسن پسند اور رومانی ذہن کے مالک فن کار تھے۔ اس لیے وہ حسن کے تقدس، معصومیت اور پاکیزگی کو نایاب شے سمجھتے ہیں۔ قاسمی کے افسانوں میں موجود حسن کی ترجمانی کرتے ہوئے محترمہ شہلا کشور رقم طراز ہیں:

''ندیم جذبات کی کش مکش کو نمایاں کرنے یا معتدل بنانے کے لیے فطرت کی شادابی اور حسن کا سہارا لیتے ہیں۔ اس لیے فطرت کا حسن انسان کے فن کی تکمیل بھی کرتا ہے اور اس کی قوتِ متخیلہ بھی عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فطرت انسان کے فطری اور انسانی جذبات کو نکھارتی ہے۔ فطرت اور ماحول کی یہ شاعرانہ عکاسی افسانے میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔'' ۲۰۱

قاسمی کے متعدد افسانے جذبۂ عشق کی ماہیت پر بھی بنی ہیں مثلاً ''بے نام چہرے''، ''سکوت وصدا''، ''جن وانس''، ''پہاڑوں کی برف'' اور ''ایک احمقانہ محبت کی کہانی'' کے کردار محبت میں تڑپتے ہیں۔ کچھ عشق میں محرومی کی آگ میں تڑپتے ہیں۔ قاسمی حسن پرست تھے۔ وہ نہایت سلیقے سے عمر کے آخری حصے تک حسن کی تحسین میں رطب اللسان رہے۔ قاسمی کے افسانوں میں انسانی جبلت، محبت اور عشقیہ واردات بھی موجود ہیں۔ ان کے افسانوں میں اگر آرزومندی، تلاشِ حسن، شان وشکوہ، خیالی دنیاؤں کی سیر، عشق کی جولانیاں، تخیل وتصور کی نادرکاریوں کا غلبہ ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ہمارے سماج کے گرد و پیش کی دھڑکتی زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کی تصویرکشی بھی ان کے فن کو آب و تاب اور رنگینی و رعنائی عطا کرتی ہے۔ یہ بظاہر متضاد لیکن توام خصوصیات ان کے فن کا امتیازی نشان بن گئیں جس کو انھوں نے بطریقِ احسن نبھایا۔ افسانہ ''بھری دنیا میں'' میں لکھتے ہیں:

> ''حقیقت پرست ہمیشہ رومان کی تخلیق کرتے ہیں اور رومانی ہمیشہ انتہا درجے کے حقیقت پرست ہوتے ہیں۔'' ۲۰۲

قاسمی اگرچہ مزاجاً رومانی تھے۔ اسی لیے حقیقت پسند ہونے کے باوجود رومان پسندی کو ترک نہ کر سکے۔ ان کی رومانویت دیہات نگاری میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ دیہات کے دل کش مناظر اور اس دل فریب فضا کے باسی جفاکش ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبے سے بھی بھرپور ہیں۔ انور سدید کے خیال میں:

> ''قاسمی کی افسانہ نگاری نے بے کار نوجوانوں کے رومانی خوابوں سے جنم لیا ہے۔ یہ نوجوان بے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبے سے بھرپور ہیں۔'' ۲۰۳

مہرو کی اکلوتی بہن قریب المرگ ہے۔ مہرو، نور کے ساتھ فردوسی لمحے بِتانے کے ساتھ ساتھ اپنی بہن کو دیکھ دیکھ کر آنسو بھی بہاتا ہے۔ گویا قاسمی کے افسانوی کرداروں میں رومان کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق سے نبردآزما ہونے کا حوصلہ بھی موجود ہے۔

> ''اب مہرو اور نور کا اُنس ایک ایسے تعلق میں تبدیل ہو چکا تھا جس کا محبت اور عشق سے بھی کچھ اونچا درجہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے پجاری بن چکے تھے۔ دونوں کی روحیں تحلیل ہو کر ایک ہو گئیں تھیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کے جذبات کو آنکھوں کے راستے جذب کر لیا تھا۔'' ۲۰۴

قاسمی کے ہاں محبت، روشنی کی علامت ہے۔ ان کی بیشتر نگارشات کی تبلیغ محبت اور احترام آدمیت سے عبارت ہیں۔ اس کی نمایاں مثال افسانہ ''جوانی کا جنازہ'' میں ملتی ہے۔ غونث اپنی بہادری، طاقت، غصہ کی بدولت سارے علاقے میں مشہور ہے۔ یہی غونث جب مہتاب کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اسے زندگی کی معنویت اور دل کشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب عطا اس کی پٹائی کر دیتا ہے اسے لہولہان کر دیتا ہے تو غونث اس سے انتقام بھی

نہیں لیتا اور معاف بھی کر دیتا ہے۔

قاسمی ہنگامہ خیز زندگی سے دُور، سکوں کی فضا کے آرزو مند ہیں۔ جب انھیں کوئی محرم راز نہیں ملتا تو وہ اپنی متخیلہ کے پُرزور پروں پر سوار ہو کر اپنی من پسند دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ حسن کو خلاصہ کائنات اور عشق کو اصل حقیقت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت عیاشی کا مظہر نہیں بلکہ زندگی کے صحت مند تصور کی علامت ہے۔ عورت اس کائنات میں حسن کا منبع ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے کیف، بے رنگ اور بے روح ہے۔

> ''میرے تصور میں جن بڑی بڑی آنکھوں نے چراغ جلائے تھے وہ کہاں تھیں۔ وہ گال کہاں تھے جن کی مرمریں جھلک نے میری خزاؤں تک کو نکھار دیا تھا۔ وہ ہونٹ کہاں تھے جن کے رس نے میری تنہا راتوں میں خمار گھول دیے تھے۔ وہ بوٹا سا قد، وہ چھریرا بدن، وہ لانبے بال۔'' ۲۰۵

افسانہ ''عالاں'' کا مرکزی کردار ''عالاں'' ایک چنچل لڑکی ہے۔ وہ جس گھر میں کام کرتی ہے۔ اس گھر کے بیٹے عارف میاں کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ وہ گھر کے سارے کام کرتی، مرچیں اور آٹا پیستی، کنویں سے پانی بھرتی، کڑھائی کرتی۔ عارف میاں کے پوچھنے پر پہلی جماعت کے بچے کی مانند نہایت رازداری سے بتاتی ہے ''میں پیار بھی کر سکتی ہوں عارف میاں!'' اس دل چسپ کہانی کے کردار کو قاسمی نے نہایت توجہ اور محنت سے اُبھارا ہے۔

قاسمی کے ہیرو چوپال میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر محبت کے نغمے الاپتے، اپنی محبوبہ کو پکارتے ہیں۔ ان کی یہ ادا کسی طور بھی رانجھے، فرہاد، پنوں سے کم نہیں۔ محبوبہ بھی محبوب کا بھرپور ساتھ دیتی ہے۔ محبوبہ اپنے محبوب کی حالتِ زار کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتی ہے:

> ''میں جانتی ہوں کہ تو نے کئی بار چوپال کے بھرے مجمعوں میں میرا نام لے لے کر آہیں بھری ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تو خوابوں میں بھی میرا نام بڑبڑاتا ہے۔'' ۲۰۶

یہ رومانی کردار کبھی صحرائی ٹیلوں پر اکٹھے بیٹھ کر محبت کی حسین وادیوں میں پناہ لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ظالم سماج کا خیال آتے ہی ایک اُداسی چھا جاتی ہے اور لڑکی اپنے عاشق سے کہتی ہے: ''میرے باپ کا کلہاڑا بہت سخت ہے وہ جس شدت سے میرے سر پر پڑے گا اسی تیزی سے تمہاری گردن پر بھی لپکے گا۔''[۲۰۷] یوں دو محبت کرنے والے اپنی حسرتوں کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر ان حسین دنوں کی یاد کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے دن گزار دیتے ہیں۔ قاسمی کے رومانوی کردار کہیں معصوم فرشتے ہیں جو خلد میں اپنے نورانی پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور کہیں وہ رومانویت کی تلاش میں زندگی کی کٹھن راہوں پر ایک مسافر کی طرح سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ کردار ایک ایسی دنیا کی آرزو دل میں بساتے ہیں: ''جہاں رنگ ہوتے، راگ ہوتے، حسن ہوتا، عشق ہوتا۔۔۔ شاد کام عشق۔''[۲۰۸]

ان کے افسانوں میں محبت کے رومان کے ساتھ ہی معاشرتی محرومیاں بھی ہیں۔ وہ موجودہ نظام کو بدلنے کے خواہش مند ہیں۔

قاسمی کے کردار اُداسی، کرب کو اپنی شخصیت کا جزو نہیں بناتے۔ یہ نہ موت کی آرزو دل میں رکھتے ہیں نہ ہی جواں مرگی کو پسند کرتے ہیں اگرچہ وہ اپنی محبوبہ کے فراق میں گیت گاتے ہیں لیکن اس درد و الم سے بھی لذت کشید کرتے ہیں:

> ''میں نے دُعا مانگی کہ الٰہی یہ آنسو میرے رخساروں پر ہمیشہ بہتے رہیں۔ میری آنکھیں ہمیشہ اشک بار رہیں، میرا سینہ سدا جلتا رہے۔ مجھے کبھی نیند نہ آئے۔ میں مرتے دم تک جاگتا رہوں۔'' ۲۰۹ے

قاسمی کے افسانے دل چسپ موضوعات کے ساتھ ساتھ زندگی اور اس کے مظاہر سے بھی گہرا ربط رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے محبت، عورت اور معاشرہ کے مسائل کو حقیقی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے معاشرتی پابندیوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور عشق و محبت سے مملو افسانوں میں زندگی کی سچائیوں کو پس پشت نہیں ڈالا۔ افسانہ ''ہرجائی''، ''وہ جا چکی تھی'' اور ''یہ دیا کون جلائے'' میں محبت کے فطری رشتے کو دل خراش حزن کی مکمل تصویر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانہ ''وہ جا چکی تھی'' کے رومانی کردار ظالم سماج کے نوکیلے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے ایک ایسی دنیا میں جانے کے آرزومند ہیں جہاں محبت کی حکمرانی ہو۔ مہرو، نور کو کہتی ہے:

> ''تم آج شام کو بکریاں گھر پہنچا کر سیدھے ادھر آ جانا۔ میں اپنے مکان کے پچھواڑے تمہاری منتظر رہوں گی۔ پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔ کسی ایسی بستی میں جہاں ہماری محبت پر کوئی نکتہ چینی کرنے والا نہ ہو۔ جہاں ہم ان لغتی بندشوں سے آزاد رہیں۔'' ۲۱۰ے

معاشرے کے قانون دو محبت کرنے والوں کے مابین رکاوٹ بنتے ہیں تو یہ محبت حزن، غم اور مرگ پر ختم ہوتی ہے۔ اکثر کردار محبوب کی قبر کے مجاور بن جاتے ہیں لیکن حالات سے تنگ آ کر خودکشی نہیں کرتے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر حقیقت نگاری کو اپنے فن میں جگہ دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ رومانیت سے بھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ انھوں نے رومانیت سے حقیقت اور حقیقت سے رومانیت کی طرف کامیابی سے سفر کیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انھیں حسن سے بھی اتنی ہی رغبت ہے جتنا اُنس زندگی سے ہے۔ افروز اسماعیل ''ترقی پسند افسانہ نگاروں میں رومانوی جمالیات کے عناصر'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اس شدید قسم کے افسانہ نگار نے رومان سے حقیقت کی طرف تخیل اور تصور سے مشاہدہ کی طرف اور شاعرانہ جذباتی انداز بیان سے ایجاز و ایمائیت کی طرف اور

جذبات سے فکر کی وسعت اور گہرائی کی طرف جس خلوص اور شوق سے قدم بڑھایا
اس سے فن کی عظمت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔'' ۲۱۱

ان کے نزدیک رومان اور حقیقت زندگی کی دو خوب صورت حقیقتوں کے نام ہیں۔ قاسمی ان دو متضاد حقیقتوں کو وحدت کی لڑی میں نہایت کامیابی سے پروتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ''آج کا اردو ادب'' میں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔ان کے افسانوں میں رومان بھی ہے اور زندگی کے تلخ حقائق بھی۔ ترقی پسند تحریک
سے وابستگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مقصد اور فن کے توازن کو کبھی نظرانداز
نہیں کیا۔'' ۲۱۲

قاسمی کے فن میں رومانیت کا صحت مند اور متوازن تصور ملتا ہے۔ ان کی رومانیت میں فطرت کی دل کشی، معصومیت، تخیل کا وجدانی تاثر، خوابوں کی دل کشی، یہ تمام عناصر اس قدر نمایاں ہیں کہ قاری ان کہانیوں کے مطالعے سے مسرور ہوتا ہے۔ یہ افسانے قاری کو ایک تازگی اور توانائی کے احساس کے ساتھ ساتھ تاریکی میں بھی حوصلہ بخشتے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق اور تجربات سے روشنی اور اُمید کی لکیر تلاش کرنا قاسمی کے فن کا خاصا ہے۔ وہ ایک رومانی جذبے اور احساس پر بہت زور دیتا ہے۔ ''طلائی مہر'' میں فیض، سونی سے کہتا ہے:

''تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟ میں لے آؤں گا تمہارے لیے سونے کی مہر۔ میں اب کے
گو بھی کی رقم اکٹھی کرتا رہوں گا اور تمہاری سہیلی کے بیاہ سے دو چار دن پہلے
کورے سونے کی ایک چمکتی دمکتی مہر تمہارے اس چاند سے ماتھے پر جھم جھم کرتی
نظر آئے گی اور سونی شاید تم نہیں جانتی کہ میں ایک قسم کی کتنی مہریں تمہارے قدموں پر
نچھاور کر سکتا ہوں۔'' ۲۱۳

رومانی مناظر پیش کرتے ہوئے قاسمی کے فقروں میں بھی رومانیت در آتی ہے:

''اور جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مہر اس کی حنائی انگلیوں میں تھما دی تو
اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے اور جھینگر چیخ اُٹھے اور ملائم دہکتے ہوئے بھیگے ہوئے
گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے۔'' ۲۱۴

صد افسوس فیض اور سونی کی محبت پروان نہیں چڑھ سکی اور یہ محبت زمیندارانہ نظام کی تلخ حقیقت کو سامنے لاتی ہے۔ انھوں نے جذبات اور تخیل کو اپنے افسانوں میں جگہ دینے کے ساتھ ساتھ رومان پسندی کے شوق اور ترقی پسندی کے جوش میں حقیقتوں سے منہ نہیں موڑا۔ وہ بیک وقت رومان پسند اور ترقی پسند تخلیق کار تھے جو اس حقیقت سے کماحقہ آگاہ تھے کہ رومانیت کو حقیقت سے ہم آہنگ کر دینے میں ہی فن کار کی جیت ہے۔ سید وقار عظیم ''نیا افسانہ'' میں قاسمی کے دیہاتی افسانوں پر مبنی رومان کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان دیہاتی افسانوں کا رومان جوشیلا، جوانی سے پُر، معصوم اور رسیلا ہے جو کسی خود رَو
پودے کی طرح، کسی رومان انگیز جگہ پر خود بخود پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ دیہاتی زندگی کی

> فطری فضا اسے پیدا کرتی ہے۔۔۔اور رومان کی جو کہانی آہستہ آہستہ نسیم کے جھونکوں کی طرح نرم و سرد رفتار سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ زندگی کی کوئی حقیقت راستہ میں آ کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی ہے۔'' ۲۱۵

قاسمی اگرچہ فن میں تازگی کے حامل ہیں۔ یہ سچے اور کھرے ادیب تھے جو سچائی کو حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ یہ اپنے کرداروں کے احساسات، جذبات اور نفسیاتی عوامل سے بخوبی واقف ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

> ''احمد ندیم قاسمی زندگی کے ایک زیرک ناظر ہیں اور ان کا فن زندگی کے ارضی پہلوؤں کا ایک خوب صورت عکس پیش کرتا ہے لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ ان کے یہاں تخیل کی لطافت، رفعت اور ملائمت بھی ہمہ وقت موجود ہے۔'' ۲۱۶

۱۹۳۶ء میں قاسمی محبت کے الوہی جذبے سے آشنا ہوئے۔ اس محبت کے متعلق انھوں نے کبھی کچھ نہیں بتایا لیکن ان کی تخلیقات خصوصاً ابتدائی تحریریں اس امر کی شاہد ہیں کہ انھوں نے کسی سے محبت کی لیکن شومئی قسمت اُسے پا نہ سکے۔ البتہ محمد طفیل، مدیر ''نقوش'' نے قاسمی کی پہلی محبت کے متعلق تفصیل سے بتایا ہے جس پر گزشتہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے۔ محبت کا یہ حادثہ اگرچہ ابتدا میں پیش آیا اس لیے قاسمی کے ابتدائی چار افسانوی مجموعوں میں اس جذبے کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ افسانوی مجموعہ ''بے گناہ''، ''ہرجائی''، ''بوڑھا سپاہی''، ''مسافر''، ''حق بجانب''، ''وہ جا چکی تھی''، ''انتقام''، ''غرور نفس'' اور ''یہ دیا کون جلائے'' کے افسانوں میں ابدی جدائی نظر آتی ہے۔ ''بگولے'' میں شامل افسانے ''طلائی مہر''، ''بھوت''، ''بچپنا''، ''کریا کرم''، ''میرا رانجھا''، ''ان بن''، ''سپنوں کا محل''، ''سیلاب و گرداب''، ''من کی ڈالی''، ''ادھورا گیت''، ''حیوان اور انسان'' اور ''غریب کا تحفہ'' محبت کے موضوع پر حامل افسانے ہیں۔ بعد کے افسانوں میں محبت کے پس پردہ سماجی و اقتصادی مجبوریاں سامنے آتی ہیں۔ افسانہ ''من کی ڈالی'' میں قاسمی کی داستان محبت کی یکسانیت ملتی ہے۔ ''برہان'' نوجوان شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت سے مستعفی ہو کر گاؤں واپس آتا ہے۔ گاؤں میں راجو نامی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن بے روزگار ہونے کی بنا پر راجو کا رشتہ نہیں مانگ سکتا۔ یہ قاسمی کے اُنھی حالات کی عکاسی کرتے ہیں جو محمد طفیل نے بیان کیے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عالم، قاسمی کے افسانوں میں محبت کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''ندیم کے افسانوں میں محبت کے کئی روپ سامنے آتے ہیں۔ عورت اور مرد کی روایتی محبت، کسی کو حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں ناکام محبت، اپنی محبت کو قربان کر دینے کا جذبہ، کسی کی بہترین خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی محبت اور کسی کی آبرو کے تحفظ کے لیے خاموشی سے محبت کرنا، الغرض محبت کے کئی رنگ ان کے افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔'' ۲۱۷

قاسمی نے محبت کرنے والوں کی نفسی کیفیات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ وہیں عشق کی پراسرار کیفیت اور احساسات و جذبات کا بھی اظہار کیا ہے۔ کہیں محبت کے بادل سے زمین کو جل تھل کرنے کی تمنا لیے عالاں کے باطنی احساس کا بھی بیان ملتا ہے جہاں وہ کہتی ہے: ''میں پیار بھی کر سکتی ہوں۔۔۔'' اور کہیں وفورِ محبت سے بے بس مولا گنڈاسے والا کہتا ہے: ''تو کیا اب رووٴں بھی نہیں۔' قاسمی کے عشقیہ افسانوں کے حوالے سے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کا کوئی افسانہ محض عشقیہ افسانہ نہیں کہلایا جا سکتا کیوں کہ عشق و محبت کے جذبات کی عکاسی ان کے یہاں ہمیشہ سماجی محرکات کے تانے بانے سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں نہ اس رومانویت کے لیے کوئی گنجائش ہے جو خواہشات کو بے لگام چھوڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور نہ لذتیت کے لیے جو ذہنی اور اخلاقی عدم توازن تک لے جائے۔ ان کے یہاں صرف محبت کا سامان ہی نہیں، اس کی محرومیاں اور مجبوریاں بھی ہیں۔'' ۲۱۸

قاسمی کی بعض تخلیقات میں اُداسی کی کیفیات، احساسِ ویرانی اور آسیبی ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ''بے گناہ'' کے دو کردار رحمان اور جواہر، جواہر کے ذیل دار باپ کے ستم کی بنا پر ایک ہی دن موت سے دوچار ہوئے اور دونوں کو قبرستان میں ساتھ ساتھ دفنایا گیا۔ قاسمی اس کی منظرکشی اس طرح کرتے ہیں:

''دونوں کی قبروں سے دو جھاڑیاں اُگ کر ایک دوسرے سے مل گئی ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی ٹہنیاں ایک دوسرے میں یوں پیوست ہو گئی ہیں جیسے یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی جھاڑی ہے۔'' ۲۱۹

قاسمی کے افسانوں میں انقلاب یا معاشرتی ناہمواری پائی جاتی ہے۔ وہ رومانیت کی اوٹ میں متوازن حقیقت نگاری کو نظرانداز نہیں کرتے اور نہ ہی شدت پسندی سے کام لیتے ہیں بلکہ ان کے افسانوں ''کہانی لکھی جا رہی ہے''، ''جب بادل اُمڈے''، ''کفارہ''، ''عبدالمتین ایم اے'' اور ''کپاس کا پھول'' میں ان کی فطری رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں رومانی اور افلاطونی عشق، خالص عشق کی تمام کیفیات ملتی ہیں۔ قاسمی ایک طرف کرداروں کے ذریعے انسان کے بنیادی اور آفاقی جذبات کو پیش کرتے ہیں تو دوسری جانب جذبہ عشق کو معاشرتی پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ محبت کے موضوع پر افسانوں میں ''بے نام چہرے''، ''سکوت و صدا''، ''ایک احمقانہ محبت کی کہانی''، ''جن و انس'' اور ''پہاڑوں کی برف'' شامل ہیں۔ ان افسانوں میں قاسمی اسرار اور محبت کی کھوج میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ وہ ان کہانیوں میں عشق بلاخیز کی گرفت میں پڑے ہیں۔ ''ایک احمقانہ محبت کی کہانی'' کا واحد متکلم اپنی وارداتِ محبت کا اظہار اپنے دوست کی

نوجوان بیٹی سے یوں کرتا ہے:

''تم کہتی ہو گی صدیق انکل کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ تم کبھی نہیں سوچو گی کہ تم نے صدیق انکل کا کیا کر دیا ہے۔ تم اپنے آپ کو اکیس بائیس برس کے فاصلے پر پاتی ہو اور میں تمھیں نبض کی ایک دھمک کے فاصلے پر دیکھتا ہوں۔ قرب کا یہ تصور ان لوگوں کے لیے بے معنی ہو سکتا ہے جنھوں نے کبھی محبت نہ کی ہو۔۔۔ محبت تو دراصل محبت کرنا سکھاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب میں تمھیں افضل سے محبت نبھانے میں مدد دے رہا ہوں تو دراصل تم سے محبت کر رہا ہوں۔۔۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ تم میری ہوتیں۔ میں ایسا سوچتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ میں تم سے محبت نہیں کر رہا ہوں، دشمنی کر رہا ہوں۔ سو افضل کے ساتھ تمہارے چلے جانے کے بعد مجھے محرومی کا احساس قطعی نہیں ستائے گا۔ جب میں تمہارے ساتھ محبت کیے جاؤں گا تو محرومی کیسی۔۔۔'' ۲۲۰

عاشق کے دل کی یہ تمنا شائستگی عشق کو تہمت نہیں لگنے دیتی۔ اس عاشقانہ طرز کو اپنانے کے لیے جگر کو خون کرنا پڑتا ہے۔ یوں تو قاسمی کے افسانوں کے تقریباً سبھی کردار عشق کی گرفت میں ہی راحت محسوس کرتے ہیں مگر ''جن وانس'' میں تحیر عشق کی عجیب طلسماتی فضا ملتی ہے جو قاری کو مبہوت کر دیتی ہے مثلاً اللہ یار، بانو کی محبت کا دم بھرتا ہے تو بانو، یونس کے عشق میں مبتلا ہے جب کہ یونس بیگماں پر فدا ہے اور بیگماں راجہ کے عشق میں بے چین رہتی ہے۔ تمام کردار آتشِ محرومی میں سلگ رہے ہیں اور تمام کردار معاشرتی احتساب کی زد میں ہیں۔ افسانہ ''غریب کا تحفہ'' ایک مفلس لڑکی اور ہمدرد بالائی طبقے کے نوجوان کی کمزور محبت پر مشتمل ایسی کہانی ہے جس میں یاسیت نہیں بلکہ دبی دبی محرومی موجود ہے۔ لڑکے کی شادی کے موقع پر مفلس لڑکی اُپلے پیش کرتی ہے تاکہ ولیمہ کی دعوت کے لیے دیگیں پکائی جا سکیں۔ افسانہ ''طلائی مہر'' میں زمین دارانہ نظام کی حقیقت سے نقاب کشائی ملتی ہے، وہیں فیض اور سونی کی محبت بھی بیان کی ہے جو پروان چڑھنے سے پہلے ہی سماج کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔

قاسمی کے افسانوں میں ہم جنس سے والہانہ محبت بھی ملتی ہے۔ افسانہ ''گڑیا'' بانو اور مہراں کی اٹوٹ محبت کی کہانی ہے۔ بانو کی ماں اسے مہراں سے دور کرنے کے لیے بہت جتن کرتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ کہتی ہے کہ جن لڑکیوں کا چہرہ سفید اور آنکھیں نیلی ہوں ان پر آسیب عاشق ہوتے ہیں لیکن بانو مہراں سے دُور نہیں ہوتی۔ ان کے افسانوں میں قوت تخیل کو بھرپور دخل ہے۔ محبت کے متفرق رنگ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ محبت کا ایک انداز یوں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ نرگس، سنبل سے کہتی ہے:

''میرے دل میں آپ کا پیار بس رہا ہے۔ مجھے ان صحراؤں سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے آپ سے اور آپ کے وطن سے محبت ہے لیکن آپ پردیسی ہیں۔ آپ آج کل

یہاں سے چلے جائیں گے اور میں راتوں کو سمن کی کھجوروں کے جھنڈوں میں بیٹھ کر
آپ کی پرچھائیوں سے باتیں کروں گی! آپ کب جائیں گے؟۔۔۔" ۲۲۱

زیر نظر افسانے میں دو انسانوں کی محبت اور جدائی کے داخلی کرب کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ سنبل، نرگس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ جب نرگس شہری بابو غضنفر سے محبت کرنے لگتی ہے تو وہ نرگس کو خوش دیکھنے کی خاطر اپنی محبت کی قربانی دے دیتا ہے۔ وہ غضنفر کو کہتا ہے:

"نرگس کے دل میں اب میری کوئی جگہ نہیں رہی لیکن اتنا یاد رکھئے کہ آپ پردیسی
ہیں، مسافر ہیں، آپ نرگس کا دل نہ توڑیئے گا۔ اگر نرگس کا دل آپ کے ہاتھوں ٹوٹا تو
یاد رکھیے گا۔۔۔۔۔" ۲۲۲

معلمینِ اخلاق اور مذہبی رہنماؤں نے خودکشی کو ناپسندیدہ فعل قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ ایسا شخص قانون کی نظر میں مجرم اور سماج کی نگاہ میں بزدل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خودکشی کرنے والا فطری قوانین کو توڑتا ہوا تلخ حقائق سے فرار کا خواہش مند ہوتا ہے۔ خودکشی کرنے والے افراد شدتِ احساس کے مالک ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات بھی اس کے دل کے تاروں میں جنبش پیدا کرتی ہے۔ ہلکی سی رنجش بھی اس کے دل میں گھاؤ پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ افسانہ "چھاگل" کا ہیرو شریف حسین فکر معاش کی تلاش میں لاہور کا رُخ کرتا ہے۔ اس کی محبوبہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اپنے باپ کی افیون کھا کر قبر میں جا سوئی۔ شریف کو جب اس کی خودکشی کا علم ہوا تو بولا: "محبت اُٹھائے پھرتی ہے۔ لطف تو تب تھا کہ تو میرے پیچھے پیچھے لاہور چلی آتی۔ یہاں افیون کھا کر مرگئی تو کون سا تیر مارا۔" ۲۲۳ یہ وہی شریف تھا جس نے بقول قاسمی ماضی میں فاطمہ کی امیدوں کی پکی کھیتی کو راکھ کیا۔ جس نے حسین فاطمہ کے نوخیر پھول مسلے۔ جس نے میٹھی باتیں کر کے فاطمہ کی روح میں شہد کی بوندیں ٹپکائیں۔ ایک رانجھے کی طرح گلی گلی فاطمہ کا نام پکارا لیکن فاطمہ کی موت کے بعد کسی دوسری دوشیزہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ یہ اگرچہ بے وفا اور ہوس پرست شخص کی داستان ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"کیا اس پر منٹو کے "چغد" کا سایہ ہے؟ کیا وہ تھک چکا ہے اور جنسی بے توفیقی کو
وسیلہ نجات بنانا چاہتا ہے یا یہ اس کا اضطراری فعل ہے۔" ۲۲۴

قاسمی کے کردار جہاں محبوب سے بے پناہ محبت کا دم بھرتے ہیں وہاں اس کی بے وفائی کو برداشت نہیں کر سکتے مثلاً افسانہ "سائے" کی آشی اپنے محبوب، نازو کی بے وفائی کو برداشت نہ کرتے ہوئے اندھیری گھاٹی میں کود کر جان دے دیتی ہے۔ محبوب کی بے وفائی کے غم میں موت کو سینے سے لگا لینے والی آشی کی خودکشی پر قاسمی نے مناظر فطرت کو بھی غم ناک دکھایا ہے:

"دھپ کی آواز کے ساتھ دو چار پتھر نیچے لڑھک کر ایک خاموش جھرنے میں جا گرے اور
جھرنے کی سطح پر سویا ہوا چاند کا سایہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہت دیر تک تڑپتا رہا۔" ۲۲۵

افسانہ ''ہیرا'' کا وریام مفلسی کے ہاتھوں خودکشی کرتا ہے کہ وہ بیوی اور اکلوتے بیٹے کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا۔ وریام یہ بات بھول جاتا ہے کہ دوسروں کی ہمدردیاں ان کے لیے غذا کا کام کرتی ہیں۔ اسی تیل سے ان کی زندگی کا چراغ روشن ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''ایسے لوگ اس لیے زندگی سے مفاہمت نہیں کر سکتے کہ وہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے گرد ریشم کے دھاگوں سے ایک خول بنا کر خود کو اس میں مقید کر کے اپنی موت کا خود ہی سامان بہم پہنچاتے ہیں۔'' ۲۲۶

انتہائی پریشانی کے عالم میں وریام کے قوائے ذہنی مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اور شعور و دانش سے عاری وریام کے ذہن میں اذیت پسندی گھر کر چکی تھی۔ وہ جاگیردار کے گھر سے آئے چاولوں کو خیرات سمجھ کر اپنی بیوی سے جھگڑتا ہے۔ وہ لوگوں کی ہمدردیوں کو خیرات سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اس قسم کے لوگ نامساعد حالات کا کبھی بہادری سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دنیا کا وہ خوف، جو مسلسل گریز اور پیہم فرار کی بنا پر ان کی فطرت کا ایک بنیادی جزو بن چکا ہوتا ہے جگ ہنسائی اور بدنامی وغیرہ کو ایک خوف ناک بھوت بنا کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں فرار، خواہ موت کی انجانی آغوش کی طرف ہی کیوں نہ ہو، انھیں اپنا آخری سہارا نظر آتا ہے۔'' ۲۲۷

خودکشی کا ایک بڑا محرک ''بے روزگاری'' بھی ہے۔ تلاشِ روزگار میں خواندہ نوجوان در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں۔ افسانہ ''اخبار نویس'' میں ایک نوجوان دوسرے سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اتنے دنوں سے بے کار پڑے ہو۔ بے کار آدمی تو اکیلا بھی ہو تو خودکشی کی سوچنے لگتا ہے اور تم تو بال بچوں والے ہو۔'' ۲۲۸

محبوب کی بے وفائی بھی دوشیزہ کو خودکشی پر مجبور کرتی ہے۔ افسانہ ''فیشن'' کی نجمہ نہایت ناز و نعم میں پلنے کے باوجود اپنے محبوب کی بے وفائی کے متعلق اپنی نوکرانی حلیمہ کو بتاتی ہے:

''اگر وہ ایسا ویسا نکلا تو یوں کریں گے کہ تم اباجی کے لیے کشتے کے بہانے ذرا سی سنکھیا لے آنا، وہ میں چپکے سے کھا لوں گی اور میرے ساتھ میری محبت بھی ختم ہو جائے گی۔'' ۲۲۹

اس کے خیال میں محبوب کی بے وفائی کو سینے سے لگا کر زندگی کی سانسیں پوری کرنا بدچلنی کے زمرے میں آتا ہے لہٰذا ایسے جینے پر وہ موت کو ترجیح دیتی ہے۔

عورت زندگی کا حسین عطیہ ہے۔ زندگی کی تمام دل کشیوں، رعنائیوں اور شگفتگیوں کا محور اس کی ذات ہے لیکن یہ ہر روپ میں قابلِ احترام ہے۔ عورت ماں کے روپ میں خدا کا انمول تحفہ ہے۔ بیٹی کی صورت میں والدین کی

عزت اور اسلاف کی عظمت اور وقار کا باعث بنتی ہے۔ بیوی کے کردار میں اپنے سرتاج کی عزت اور ناموس کی نگہبان بنتی ہے اور ماں بنتی ہے تو تمام محبتوں اور چاہتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کی عورت ملتی ہے جو اپنی زندگی کو قربانیوں کی نذر کرتی ہے لیکن جواباً اسے وہ پذیرائی نہیں ملتی جس کی وہ حق دار ہے۔

پروفیسر وارث میر اپنی کتاب ''کیا عورت آدھی ہے'' میں پنجاب کی عورت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''پنجاب کی عورت جفاکش، محنتی، ہمدرد، غیرت مند اور بہادر ہے۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے روپ میں پنجاب کی عورت زندگی بھر قربانی دیتی رہتی ہے۔ وہ ایک گھر میں متعدد انسانی رشتوں سے نہ صرف نباہ کرنا جانتی ہے بلکہ ان کی خدمت بھی کرتی ہے۔'' ۲۳۰

قاسمی نے اپنے افسانوں میں عورت کی مذکورہ بالا تمام حیثیتیں متعارف کروائی ہیں۔ جنس لطیف کا تذکرہ ہر فن کار کی تخلیق میں ملتا ہے۔ ہر ادیب نے جنس لطیف کے تذکرے کو اپنی صلاحیت، سوچ، تخیل کی بنا پر پیش کیا۔ میر تقی میر نے اس کے شگفتہ لب کو گلاب کی پنکھڑی کہا۔ قاسمی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے:

> ''۔۔۔عورت ایک سپنا ہے، رنگین اور اچھوتا، ایک پھول ہے خوب صورت اور معطر، ایک چاند ہے بلند اور روشن، ایک آسمان وسیع اور باوقار۔'' ۲۳۱

مندرجہ بالا اقتباس میں قاسمی نے عورت کی توصیف کی ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''عورت فطرت کی نہایت خوب صورت تخلیق ہے مگر حسنِ تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ نوشگفتہ پھول کو دیکھ کر ہمارے احساسات کو ایک انگڑائی سی آتی ہے اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔۔۔ میں نے خوب صورت عورت کو ہمیشہ اس قرینے سے دیکھا ہے جس کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجیے تو پھر کسی اور طرف ذرا مشکل سے ہی توجہ ہو سکے گی۔'' ۲۳۲

قاسمی کہیں عورت کو دنیا کی حسین ترین مخلوق سمجھتے ہیں اور کہیں اپنے کردار کی زبانی نوجوان نسل کو عورت کی خوب صورتی سے دُور رہنے کی صلاح دیتے ہیں۔ نوجوان شعرا صنفِ نازک سے زیادہ ہی متاثر ہیں:

> ''اے نوجوانو، شاعرو! بھول جاؤ کہ عورت کے گالوں میں گلاب ہیں۔ اس کے ہونٹوں میں شفق ہے، اس کی ہنسی میں چاندی ہے لیکن یہ پرانے زمانے کے عرب شعرا جنھوں نے ''بنت عم'' کی ایسی گردان چھیڑی کہ اب تک مشرقی شاعری سینکڑوں ''بناتِ عم'' کے ناموں کے علاوہ ان کے گالوں، ہونٹوں، آنکھوں اور سینوں کے مرمریں جسموں کی گداہٹ سے لب ریز ہے۔'' ۲۳۳

مشرقی بیٹی خدمت گزار اور ایثار کا مجسمہ ہے۔ وہ دن بھر گھریلو امور کی انجام دہی کے بعد والدین کے لیے بھی متفکر رہتی ہے۔ قاسمی کے افسانہ ''کنجری'' میں ایک پیشہ ور خاندان کی لڑکی باپ اور دادی سے بغاوت کر کے جسم فروشی کے

پیشے سے انکار کرتی ہے لیکن جب اس کا باپ بیمار ہوتا ہے اور اخراجات کی کوئی صورت نہیں نکلتی تو وہ اپنا جسم بیچ کر مجوراً اپنے محبوب سے کچھ پیسوں کا تقاضا کرتی ہے۔ جواباً وہ کہتا ہے: ''رہی نہ کنجری کی کنجری۔''

بہن کے روپ میں عورت احساس محبت وقربت اور خلوص وصداقت کے جذبہ سے لب ریز ہوتی ہے۔ اپنے بھائی کی نہ صرف دل جوئی کرتی ہے بلکہ ہر دُکھ کو محسوس کرتی اور کڑھتی ہے۔ خانی اور جمو دو ایسے مسکین و یتیم بچے ہیں جن کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ یہ دونوں ہی ایک دوسرے کا آسرا ہیں۔ چھوٹا بھائی اگر روتا ہے تو بہن اس کے آنسو پونچھتی ہے۔ اسے سینے سے لگاتی۔ اس کی دل جوئی کرتی ہے۔

> ''خانی دیوانوں کی طرح چھت پر سے اُتری۔ روتے بلبلاتے جمو کو سینے سے لگا لیا اور بولی:
>
> نہ رو میرے بھیا! نہ رو میرے جمو! روئیں تیرے دشمن۔۔۔ میرے جمو کا اپنا گھر ہے، اپنا صحن ہے، اپنی بہن ہے۔'' ۲۳۴

خانی جب اکیلے پن سے گھبرا کر رونے لگتی ہے اور ننھا جمو بھی اسے دیکھ کر رونے لگتا ہے تو پھر اسے خاموش کروانے میں لگ جاتی ہے اور یہ بھول جاتی ہے کہ اس کی آنکھوں سے بھی برسات کی جھڑی رواں ہے۔ افسانہ ''وہ جا چکی تھی'' کا مہرو اپنی بہن کی بیماری کی فکر میں گھلتا جاتا ہے۔ قریب المرگ بہن کو جب بھی دیکھتا ہے غربت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں کہ بہن کا علاج کرا سکے۔ قاسمی کے افسانوں میں محبت قربانی دینے کا نام ہے۔ اسی مقام پر محبت شہادت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں عورت ہر پہلو سے قابلِ احترام ہے۔ یہ محبوبہ کے ظاہری حسن و جمال سے بھی مرعوب ہوتے ہیں اور باطنی حسن سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ قاسمی کے افسانوں کی بیوی وفا شعار اور شکر گزار ہے۔ جب ولی محمد اپنی بیوی گلابو کو اپنی مفلسی اور بے بسی کے متعلق بتاتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے:

> ''میں تمہاری لونڈی ہوں۔ کیا میں دیکھ نہیں رہی کہ تمہارے جوتے کو بھی جگہ جگہ پیوند لگے ہیں۔ مجبوری ہے تو پھر گلہ کیسا؟ خدا جس حال میں رکھے، اس کا شکر ہے۔ اس سے بدتر نہ کرے۔'' ۲۳۵

تلاشِ روزگار کے لیے جب ولی محمد گلابو کو چھوڑ کر گھر سے اسٹیشن چلا جاتا ہے تو گلابو کو یوں محسوس ہوتا ہے:

> ''ولی محمد کو گاؤں سے گئے صرف آٹھ دن گزرے تھے مگر گلابو سمجھ رہی تھی جیسے آٹھ سال بلکہ آٹھ صدیاں گزر گئی ہیں۔'' ۲۳۶

افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' کی شاداں کا شوہر شمشیر جب جنگ کے لیے چلا جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ شاداں کی مسکراہٹیں، خوشیاں، گیت بھی ساتھ لے گیا ہے۔ شمشیر کے جانے کے بعد

شاداں مغموم رہنے لگی۔ اس کا سُسر اسے مسکرانے کی تلقین کرتا ہے تو وہ دل ہی دل میں جواب دیتی:

''ٹھیک ہے ہنسا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں مگر کس سے ہنسوں؟ کس سے کھیلوں؟
بوڑھے چچا تم کیا جانو۔ تم کیا جانو؟'' ۲۳۷

بوڑھے سُسر کی لفظی تسلیوں سے، مفارقت کی آگ میں جلتی شاداں کا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ عورت کی ایک اور صورت بیوہ کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بیوہ کی زندگی کے حالات و واقعات ناگفتہ بہ ہیں۔ اس پر لوگ ایسی ایسی الزام تراشی کرتے ہیں جسے سن کر انسان لرز جاتا ہے:

''حوالدار انور بیگ کی بیوہ کے متعلق تو یہ تک کہہ دیا گیا تھا کہ رات کو اپنے صحن میں
ننگی لیٹ جاتی ہے اور یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کرتی کہ کون آیا؟ کون گیا؟'' ۲۳۸

جس کی جتنی معاشی حالت کمزور ہو گی، اُس پر الزام تراشی بھی اتنی ہی کی جاتی ہے۔ بیٹے کی زندگی میں بہو کو آنکھوں کی ٹھنڈک، راج دُلاری کہا جاتا ہے مثلاً ایک ساس اپنی بہو کے متعلق کہتی ہے:

''۔۔۔ جہاں میری رانو ایک بار قدم رکھتی ہے وہاں سے سات دن تک خوشبوئیں
اُٹھتی رہتی ہیں اور جہاں بیٹھتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جاگیردار جی کی بجلی کی
لالٹین پڑی لس لس کر رہی ہے۔ میں تو اپنے بھاگ پر ناز کرتی ہوں کہ آخری عمر
میں میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔'' ۲۳۹

لیکن جب رانو بیوہ ہو جاتی ہے تو اس پر مصائب کا پہاڑ توڑ دیا جاتا ہے۔ ماتم کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ گھر کے ایک کونے میں سمٹی اپنے خاوند کی یادوں کو سینے سے لگائے آنسو بہا رہی ہوتی ہے۔ اسی اثنا میں رانو کی ساس کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ وہ بجلی کی طرح گرج کر اس سے یوں مخاطب ہوتی ہے:

''میرے لال کو نگل کر اب تو اس گھر کی رانی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اُٹھ کر چکی پیس اور
برتن مانجھ اور کپڑے دھو۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی تو آج ہی سن لے کہ
دھکے دے کر میکے پہنچا دوں گی تجھے۔'' ۲۴۰

معاشرے کے لوگ اس پاک دامن بیوہ کو جسم فروشی کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک بوڑھی کٹنی رانو کے دل میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ کانٹوں کے بستر پر کب تک اپنے ارمانوں کی آگ میں سلگتی رہے گی۔

''اری پھولوں سے کھیل کہ پھولوں میں حسن بھی ہے اور خوشبو بھی۔ تجھے کانٹوں میں
پڑے پڑے کیا مزا ملتا ہے۔ ادھر آ میرے ساتھ تجھے اس دوزخ سے اُٹھا کر جنت میں
بٹھا دوں۔'' ۲۴۱

قاسمی نے بیوہ کی حالت زار کا نقشہ کھینچنے کے ساتھ ساتھ بیوہ کی زندگی کو خصوصی توجہ اور محنت سے افسانوں کا موضوع بنایا۔ یہ عورت ایک خاص طرح کی احساس تنہائی اور اس تنہائی سے جنم لینے والی اعصابی تھکن کی

مریضہ ہے۔ قاسمی عورت کے احترام کے قائل تھے۔ ان کے افسانوں میں عورت خوددار، باحیا دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کی طوائف بھی معاشرتی و معاشی جبر کی بنا پر گناہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ ''کنجری'' کی کمالاں ہو یا ''آتشِ گل'' کی گلابو، ''نامرد'' کی چنوں یا ''بدنام'' کی نوراں، معاشی مجبوری کے تحت پیشہ کرنے پر مجبور ہیں اور قاری بھی نفرت کی بجائے ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے مثلاً ''بدنام'' کی نوراں فاقوں اور قرضوں سے تنگ آ کر اپنے گاؤں میں ہی جسم فروشی کا کاروبار شروع کرتی ہے۔ افسانے کا راوی روزانہ ایک روپیہ دینے لگتا ہے تاکہ اس گھناؤنے پیشے سے باز آ جائے۔ افسانے کے آخر میں جب راوی اس کے لیے پیسے بھجواتا ہے تو نوراں پیسے واپس کرتے ہوئے کہتی ہے: ''اب اس کی ضرورت نہیں۔ اب میرا گھر والا نوکر ہو گیا ہے اور مجھے تمہارا قرضہ نہیں بھولا۔''[۲۴۲] مرد ہونے کے باوجود قاسمی کو عورتوں کے اجتماعی مسائل کی سنگینی کا بخوبی احساس تھا۔ ان کی تحریروں میں عورتوں کی بے بسی، تحقیر اور مظلومیت کی دردنا کی موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں عام عورت کے دل کی دھڑکنیں بھی محسوس کی جا سکتی ہیں جو گھر اور سسرال غرض ہر جگہ اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگی جینے پر مجبور ہیں۔

قاسمی معاشرتی برائیوں پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔ افسانہ ''سفید گھوڑا'' میں کچھ لوگ شراب پی کر فساد پر اُتر آتے ہیں حتیٰ کہ عصمت دری سے بھی باز نہیں آتے۔ پیش نظر افسانے میں ایک ایسی بیوہ کی کہانی بیان کی گئی ہے جو معاشی بحران کے باعث اس میدان میں قدم رکھتی ہے۔ اس عورت نے واحد متکلم کو دیکھتے ہی لپک کر چٹخنی چڑھا دی اور پلٹ کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ وہ اپنے بھیگے ہوئے گال اس کے پاؤں سے رگڑنے لگی اور فریاد کرنے لگی: ''میرا پردہ رکھ لیجیے صاحب۔ میرا اور میری بیٹی کا پردہ خدا کے اور آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں کیا کروں صاحب۔ میری ایک ہی بیٹی ہے مگر سب نئی بیٹی مانگتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو کیسے بدلوں صاحب؟ خدا کے لیے میرا اور میری بیٹی کا پردہ رکھ لیجیے ورنہ کوئی ہمیں دو پیسے کو بھی نہیں پوچھے گا۔''[۲۴۳] انھوں نے شرابی افراد کی بُری خصلتوں کو اصلی رنگ میں پیش کیا ہے کہ غریب و مجبور خواتین کن کن مظالم کو برداشت کرتی ہیں۔

قاسمی کے افسانوں میں غیور و مفلس ماؤں کے کردار بھی اُبھرتے ہیں جنھیں استحصال کی حدوں سے آگے نکلنے والی ہوس میں مبتلا نظام معیشت نے مفلسی اور بے بسی کی آگ میں دھکیل دیا تھا۔ قاسمی اپنے بچپن کی یادیں درج ذیل الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:

> ''مدرسے جانے سے پہلے میرے آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دُکھ پر بہہ نکلتے تھے لیکن میرے لباس کی صفائی، میرے بستے کا ٹھاٹ اور میری کتابوں کی ''گٹ اپ'' کسی سے کم نہ ہوتی تھی۔ گھر سے باہر احساس برتری طاری رہتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے

چُور ہو جاتے تھے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے۔ پیاز یا سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت زندگی بڑی سفاک معلوم ہوتی تھی۔۔۔ خاندان کے باقی سب گھرانے کھاتے پیتے تھے۔ زندگی پر ملمع چڑھائے رکھنے کا تکلف صرف ہمارے نصیب میں تھا۔'' ۲۴۴

حالات کی شدید تلخی کے باوجود ان کے دل میں مایوسی اور احساسِ کمتری جنم نہ لے سکی۔ ان کی والدہ نے انھیں ہر حال میں گزر بسر کرنا سکھایا۔ یہ ماں کی محبت اور عمدہ تربیت تھی کہ قاسمی ان شدید مصائب کے باوجود منفی اثرات کی جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ قاسمی کی والدہ ایک نہایت صابر و شاکر خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے حسن تربیت سے یہی صفات بچوں میں منتقل کیں۔ قاسمی لکھتے ہیں:

''اگر بچپن میں مجھے ماں کی محبت نہ ملتی تو ممکن ہے آج میں نہایت خطرناک کلبی اور قنوطی ہوتا۔'' ۲۴۵

کہانی کار کی کہانیوں میں ممتا کے وجود کی خوشبو پھیلی ہے۔ یہ غیر معمولی نوعیت کی ہے اس خوشبو کو خود بھی محسوس کرتے ہیں اور قاری کو بھی محسوس کراتے ہیں۔ قاسمی کے اولین افسانوی مجموعہ ''چوپال'' سے لے کر ''پت جھڑ'' تک اکثر افسانوں میں ستم زدہ مائیں نظر آتی ہیں۔ ان سب کے کردار پر قاسمی کے اپنے بچپن کی معصومیت کی پرچھائیاں ہیں اور ماں کے کردار میں قاسمی کی اپنی والدہ کا خلوص، محبت، تقدس سے بھرپور شخصیت کا عکس موجود ہے۔ افسانہ ''نیلا پتھر'' کی ابتدا میں قاسمی کے بچپن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ قاسمی کیمبل پور میں زیرِ تعلیم رہے جس کی جھلکیاں ہمیں ان کے افسانوی کردار اطہر میں نظر آتی ہیں۔ گرمیوں کی تعطیلات گزارنے کے بعد اطہر کی کیمبل پور روانگی کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اماں نے ہمیں آدھی رات ہی کو جگا دیا۔ اُٹھو بیٹو۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ کپڑے بدل لو۔ شیرو میراثی اور نُورا ساربان بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ بھائی جان نے پوچھا:
اور اماں ___ ہمارے چلے جانے کے بعد آپ روئیں گی تو نہیں نا؟
نہیں تو ___ اماں بولیں اور پھر رونے لگیں۔
ہم چارپائیوں پر سے کود کر اماں سے لپٹ گئے اور اماں ہم دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روتی رہیں اور کہتی رہیں:
میں کیوں روؤں؟ میں زندگی بھر کیا کم روئی ہوں کہ اب بھی روؤں، جب میرے بچے میرا سہارا بننے والے ہیں۔ پھر جب تم دونوں نوکر ہو جاؤ گے نا، تو میں اپنی گزری ہوئی زندگی سے جی بھر کر بدلے لوں گی۔ میں نواڑ کے پلنگ پر سوؤں گی۔ میں ریشم کی چادر اوڑھوں گی۔ میں طِلّہ گچ جوتے پہنوں گی اور تمہاری بیویوں سے اپنے پاؤں دبواؤں گی۔'' ۲۴۶

محولہ بالا اقتباس میں قاسمی کا سوانحی رنگ بہت نمایاں ہے۔ بقول فتح محمد ملک:

''ایثار و محبت کا یہ سخت کوش پیکر جس حوصلہ مندی اور روحانی استقامت کے ساتھ اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنی زندگی کے ستم کو کرم بناتا ہے اُس کی یاد ندیم کے دل میں ہمیشہ تازہ رہی۔'' ۲۴۷

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔اور جب قاسمی ہر مہینے اپنی ماں کی ہتھیلی پر کچھ رقم رکھتے تو خوشی کے مارے ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور فرماتی ہیں کہ میں روتی تو جب بھی تھی مگر وہ آنسو میرے اپنے آنسو تھے، اب جو رو رہی ہوں تو وہ آنسو ہیں جنھیں میں تم دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں قتل کر دیتی تھی کہ گھرانے کی عزت پر پانی نہ پھر جائے۔'' ۲۴۸

قاسمی کے افسانوں میں تلخ زندگی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ سسکتی زندگی افراد کی بے بسی کے پس منظر میں نفسیاتی سطح پر، قاسمی کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ بول رہا ہوتا ہے۔ افسانہ ''ننھے نے سلیٹ خریدی'' میں قاسمی نے اپنے بچپن کے مفلسی کے حالات کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ ابتر حالات قاسمی نے دیکھے اور اس طرز کے افسانے لکھ کر اپنے درد کی ترجمانی کی۔ ''جلال و جمال'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''آس پاس کے تمام رشتہ دار لڑکے امیر اور خوش لباس تھے۔ ان کی کتابیں نئی تھیں، ان کی سلیٹوں کے ساتھ موٹے موٹے سنہری اسفنج لٹکتے تھے اور ان کی تختیوں پر ہتھیلیاں تھرک جاتی تھیں اور یہاں توے کی کالک سے روشنائی تیار ہوتی تھی، ان گنت کناروں والے سلیٹوں کے ٹکڑوں پر سوالات حل ہوتے تھے۔'' ۲۴۹

اس کے ساتھ ہی ''ننھے نے سلیٹ خریدی'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ماسٹر جی سوال لکھانے لگے تو پہلے تو اس نے سلیٹ کی طرف دیکھا جس کے بے شمار کنارے چاقو کی دھار کی طرح تیز تھے۔ پھر پیچھے مڑ کر قطار کے آخری سرے پر اصغر کی سلیٹ کی طرف دیکھا۔ نئی سلیٹ کے ساتھ ایک مٹھی بھر اسفنج لٹک رہا تھا۔'' ۲۵۰

قاسمی نے اپنے بچپن کے تجربات و مشاہدات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے ہاں متوسط و نچلے طبقے کے مسائل کی تصویر کشی ملتی ہے۔ یہ سب ان کے بچپن کے تجربات نے انھیں عطا کی۔ معاشی حقائق اور پست طبقے سے ہمدردی؛ قاسمی کے انہی حالات کا نتیجہ ہے۔ دُکھ کے سناٹے میں ماں کی یاد ہی بچوں کی نفسیات کا بڑا آسرا بنتی ہے۔ افسانہ ''پاؤں کا کانٹا'' کا کریم سوتیلی ماں کے ظلم اور باپ کی بے رُخی کے زخموں کو اپنی حقیقی ماں کی محبت سے بھرپور یادوں سے ہی سہلاتا ہے:

''کریم اندر جا کر سوئی لے آیا۔ دیئے کی مدہم روشنی میں ایڑی اُٹھائی اور سوئی سے کانٹے کے اردگرد کا گوشت کریدنے لگا۔ رہ رہ کر اُسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی جو

اُسے ہاتھوں پر اُٹھائے رکھتی تھی۔ جو اس کے لیے قسم قسم کی چیزیں خرید لاتی تھی۔۔۔
جس نے اپنی پڑوسن کو جو ایک دن کریم کے پاؤں کا کانٹا نکال رہی تھی، کہا تھا:
اری ذرا دھیرے سے سوئی پھیر، بس یہ سمجھ تو میرے کلیجے پر سوئی پھیر رہی ہے۔ کریم کو
یہ بات یاد آئی تو اس کی چیخ نکل گئی۔'' ۲۵۱

افسانہ ''چور'' کا رحمان والدین کی وفات کے بعد پھوپھا پھوپھی کے پاس رہتا ہے لیکن چوری کے جھوٹے الزام میں وہاں سے بھی اپنے آبائی گاؤں چلا جاتا ہے جہاں راجہ اللہ نواز اسے اپنے گھر ملازم رکھ لیتا ہے۔ راجہ اللہ نواز کے گھر نعمتوں کی فراوانی دیکھ کر اس کے دل میں اخلاقیات اور احتیاجات کے مابین کش مکش کی ابتدا ہوئی۔ خربوزے کے چھلکے دیکھ کر خربوزہ کھانے کی خواہش نے جنم لیا اور وہ راجہ اللہ نواز کے گھر چوری کرنے پر تُل گیا لیکن چوری کا خربوزہ کھانے کے تصور پر اسے اپنی ماں یاد آ گئی اور رحمان کو:''۔۔۔ کچھ ایسے محسوس ہوا جیسے کوٹھے کے کھنڈر میں سے اس کی ماں پیٹ کے درد میں کراہتی اور روتی ہوئی نکلی ہے اور اس کے قریب آ کر اس نے رحمان کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ مار دیا ہے۔'' ۲۵۲ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ تخلیق کرتے وقت مصنف اپنی والدہ کی یاد میں محو تھا۔ وہ سارے احساسات اور جذبات افسانے کے بہاؤ میں منطقی انداز سے اپنی ہموار جگہ بناتے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مصنف کی تحریروں کے غائر مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ وہ جب بھی ماں کا کردار پیش کرتے ہیں وہاں احساسات و جذبات اور الفاظ زندہ اور دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''ایک رحمان پہ ہی کیا موقوف، ندیم کے کتنے ہی ننھے کرداروں کو ماں کی یاد اخلاق
اور شرافت اور نیکی اور پاکیزگی کی ایک خاص سطح سے نیچے نہیں گرنے دیتی۔ شدید ترین
مادی مصائب میں گھرے ہوئے ان کرداروں کی شخصیتیں ماں کے دودھ کے ساتھ
رگ و پے میں رچی ہوئی دینی و روحانی اقدار کی بدولت شکست و ریخت سے محفوظ
رہتی ہیں اور وہ صبر آزما مشکلات کا مقابلہ، اعلیٰ انسانی اقدار پر ثابت قدمی سے
کرتے ہیں۔'' ۲۵۳

قاسمی نے ماں کی قدرتی محبت کے آفاقی جذبے کو ''مائیں''، ''مامتا''، ''ماں''، ''ننھا مانجھی''، ''کوہ پیا''، ''خربوزے''، ''ارتقا''، ''نیلا پتھر''، ''کہانی لکھی جا رہی ہے'' اور ''سپاہی بیٹا'' میں پیش کیا ہے۔ قاسمی کے زیرِ نظر افسانوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ مامتا کے جذبے کو ابدیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ زندگی کے کٹھن حالات اور انتہائی بحرانی دور میں بھی ماں کی محبت زندہ رہتی ہے۔ اس کی نمایاں مثال ''سپاہی بیٹا'' میں پیش کی گئی ہے جو جنگ میں اکلوتے بیٹے کے مر جانے کے باوجود اس کے خیالوں میں گم ہے۔ ماں کی محبت کی ایک زندہ مثال افسانہ ''مامتا'' میں پیش کی گئی ہے جہاں ایم۔ خالد۔ فیاض کے خیال میں مامتا کا جذبہ زمان و مکان کی حدود پھلانگ کر اپنا اظہار کرتا ہے۔ ان کا دل ماں کی محبت سے لب ریز تھا۔ وہ ماں کی محبت کو اٹل اور پائندہ قرار دیتے ہوئے اپنے

قارئین کو بتاتے ہیں:

''ناکوں، آنکھوں، بالوں اور اوڑھنوں کے گورکھ دھندے میں گھری ہوئی یہ بیویاں اور یہ بہنیں مصر کی ریتوں اور برما کی پتاور میں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں۔ صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی۔ یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے۔'' ۲۵۴

قاسمی نے ماں کی لافانی محبت کو افسانہ ''مامتا'' میں پیش کیا ہے۔ بشریٰ شیرازی اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

''اس میں ماں اور بچہ کے درمیان لافانی ماورانہ محبت کے علاوہ بین الاقوامی لسانی تعلقات اور جنگ کی ہولناکیوں کے بارے میں بتایا ہے۔'' ۲۵۵

اگر چہ والد کی محبت وشفقت قاسمی کے کردار پر خاص اثر انداز نہ ہوئی۔ اس کا جواب دیتے ہوئے بتاتے ہیں:

''۔۔۔انھوں نے ہم سے کبھی گفتگو ہی نہیں کی تھی۔ کبھی کیا تو اتنا کہ سر پر پیار سے ہاتھ پھیر دیا۔ وہ تو بس بیٹھے نماز پڑھتے رہتے یا وظائف۔ اس لیے ہماری طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے تھے۔۔۔ میں کوئی سات یا آٹھ برس کا تھا جب ان کا انتقال ہوگیا۔'' ۲۵۶

دوافسانوں ''عاجز بندہ'' اور ''چھبن'' میں قاسمی کے والد محترم کے کردار کی ترجمانی ملتی ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''پچھلے چند برس کی تخلیقات کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ندیم کو اپنا بچپن بہت یاد آنے لگا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک رومانی کرب کے ساتھ اپنے بچپن کی سادگی، معصومیت، حیرت اور بے ساختگی کی بازیافت میں مصروف ہوں۔'' ۲۵۷

قاسمی نے افسانوں میں بیوہ، مفلس ماؤں اور یتیم بچوں کے جذبات اور احساسات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے نظمیں بھی لکھیں۔ قاسمی کے افسانوں میں ماں ایک ایسا کردار ہے جو بے پناہ غربت کے شکنجے میں پھنس کر اپنے بچوں سے بہت محبت کرتی ہے۔ ان کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال افسانہ ''ماں'' کی گلابو ہے۔ مامتا کے جذبے سے بھرپور ''گلابو'' اپنے قریب المرگ شوہر کی بھی پروا نہیں کرتی اور اپنے شوہر پر بچے کو ترجیح دیتی ہے۔ ماں کی محبت اگر چہ بچے کے دل میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ بلاجواز اس کہ بچہ ماں کے سینے کی ٹھنڈک یا اس کی دعاؤں سے محروم ہی کیوں نہ ہو۔ ''ننھا مانجھی'' کی ماں اگر چہ مانجھی کے شعور سنبھالنے سے پہلے ہی خدا کو پیاری ہوگئی لیکن مانجھی، بابو سے اپنی ان دیکھی ماں کے متعلق اس انداز سے بات کرتا ہے:

''بابو! کہتا ہے کہ وہ بہت اچھی تھی۔ دریا کنارے اس کی قبر ہے۔ میں اکثر وہاں جا کر اس پر اُگی ہوئی گھاس توڑ توڑ کر کھایا کرتا ہوں اور بابو جی اس گھاس میں سرخ سرخ بیروں اور سفید سفید توتوں سے زیادہ مٹھاس ہوتی ہے۔'' ۲۵۸

قاسمی کے افسانوں ''بچے نے سلیٹ خریدی'' اور ''خربوزے'' وغیرہ میں ان کا سوانحی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں فقر و فاقہ میں مبتلا ماؤں اور مفلسی کے کچوکے برداشت کرتے بچوں کے جذبات و احساسات کو

قاسمی نے دردمندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ افسانہ ''ننھے نے سلیٹ خریدی'' کا عزیز معاشی عدم مساوات کا شکار بچہ ہے۔ اسکول جاتے ہوئے ٹھوکر لگنے سے اس کی نئی سلیٹ ٹوٹ جاتی ہے تو وہ اپنے زخمی پاؤں کو بھول کر سلیٹ ٹوٹ جانے کے غم میں پریشان ہے۔ اُس کی ماں بھی پریشان ہے اور باپ سلیٹ ٹوٹنے کا سن کر طیش میں آ جاتا ہے۔ اس طرح افسانہ ''خربوزے'' کے مرکزی کردار کے بچے کا بڑا خواب خربوزہ کھانے کی خواہش ہے۔ یہ نادار بچہ سوتے جاگتے خربوزہ کھانے کے خواب دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ آسمان کے تارے اسے خربوزے نظر آتے ہیں مگر اس یتیم بچے کے لیے بیوہ ماں خربوزہ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ اس بچے کو ذیل دار کا بھوسہ لتاڑنے کی مزدوری میں دو پیسے ملتے ہیں۔ وہ خوشی خوشی خربوزہ خرید کر ماں کے پاس لاتا ہے مگر بیوہ ماں مغموم انداز میں کہتی ہے:

''پیسے گھر لے آتا تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلتا مگر خیر، تجھے شوق تھا۔ شکر ہے تیرے من کی آگ ٹھنڈی ہوئی۔ لے ذرا چُھری اُٹھالا۔ چُولھے کے پاس پڑی ہوگی۔ ماں نے تین بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر خربوزے پر چھری چلائی تو دونوں ٹکڑے الگ ہو گئے اور پانی کی ایک ندی فرش پر بہنے لگی۔ بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا سارا گودا پانی بن چکا تھا اور بیج کالے رنگ کے ہو گئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔'' ۲۵۹

قاسمی کے افسانوں میں بیوہ ماں اور یتیم بچوں کی محرومیوں کو اندوہناکی سے بیان کیا گیا ہے۔

قاسمی نے ازدواجی زندگی کے دل فریب واقعات سے اپنی کہانیوں کو مزین کیا۔ یہ کہانیاں آپ بیتی کا لطف عطا کرتی ہیں۔ قاسمی کے افسانوی کرداروں کی ازدواجی زندگی مسرت وطمانیت سے بھرپور ہیں۔ یہ زندگی کی تلخیوں کو ہنس کر برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ شکوہ و شکایت بھی زبان پر نہیں لاتے۔ یہ کردار اپنے شریک حیات کے ساتھ ہی راحت محسوس کرتے ہیں۔ اس نوع کا افسانہ ''یہ دیا کون جلائے'' ہے جس میں نواز اور کرموں کی بچپن کی محبت ہے جسے بعدازاں مشیت ایزدی رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیتی ہے۔ افسانہ ''ہرجائی'' کے میاں بیوی کی محبت کو دل پذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بیوی فاقے کی حالت میں بھی خاوند کے لبوں پر مسکراہٹ لا کر اپنی محبت کا ثبوت فراہم کرتی۔ یہ کردار ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر بھی نوبیاہتا جوڑے کی مانند ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ان کی مسرتیں، اور ذہنی راحت اور سکون ایک دوسرے کی ذات سے ہی وابستہ تھا۔

''دن مزے سے گزرتے گئے۔ بھوکے بھی سوتے تو پروا نہیں ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر سیر ہو جاتے تھے۔ نہ گلہ نہ شکوہ، وہ مجھ سے خوش اور میں اس سے خوش۔'' ۲۶۰

معاشی بدحالی میں بھی دنیا ان کو حسین دکھائی دیتی ہے۔ مظاہر قدرت مسکرا مسکرا کر انھیں خوش آمدید کہتے۔ ہر وقت حسین یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کرداروں کے نزدیک ان کی دنیا ہی جنت تھی۔ قاسمی کے افسانوں میں کبھی

ستر سالہ بوڑھا بیس سالہ نوجوان بن جاتا اور کبھی پینسٹھ سالہ بیوی سولہ سالہ دوشیزہ کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ بوڑھے میاں بیوی کی محبت اور اٹھکیلیوں کو افسانہ ''ماتم'' میں ایجاز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میاں جب بھی سالن میں تیز نمک کی شکایت کرتے تو بیوی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگتی۔ میاں کو اعتراف کرنا پڑتا کہ مغلوں کے شاہی باورچیوں کو بھی اس مزے کا سالن تیار کرنے کا نسخہ معلوم نہ ہوگا۔ اولاد نہ ہونے کے باعث دونوں خود ہی بچے بن جاتے جب آدھی رات کو بیوی کی آنکھ کھلتی تو دیکھتی:

> ''اس کا سر میاں جی کے زانو پر رکھا ہوا ہے اور میاں جی اس کے ہونٹوں کے خطوط پر
> اپنی انگلی کی پور پھیر رہے ہیں۔'' ۲۶۱

ان کی تمام عمر اسی طرح کے ناز نخرے کرتے گزر گئی اور کبھی حرفِ شکایت لب پر نہ لائے۔ قاسمی کے یہ کردار ہیر رانجھے، سسی پنوں اور شیریں فرہاد کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ کردار زندگی سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں کشید کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ افسانہ ''بھری دنیا میں'' کا میاں اپنی بیوی سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> ''اپنی صحت کا خیال رکھو میری جان!
> تمہارے بغیر میری زندگی اُجڑ جائے گی۔'' ۲۶۲

بیوی کی زندگی میں رنگینی و رعنائی خاوند کے وجود سے ہے۔ جب خاوند نظروں کے سامنے ہو تو بیوی کو کائنات میں چارسُو حسن کے جلوے بکھرے نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' کا دلیر خاں جب فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے تو اس کی جدائی میں شاداں اُداس رہنے لگی۔ گھر کے کسی کام میں اس کا من نہ لگتا۔ مصنف اس کی حالتِ زار کو ذیل کے اقتباس میں بیان کرتا ہے:

> ''ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے۔ برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں۔ آنگن میں
> کوؤں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا۔ زیور اترنے لگے۔
> ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہو گیا۔ آنکھوں میں سرمہ پڑتا بھی تو
> دن ڈھلے تک بہہ جاتا۔'' ۲۶۳

قاسمی کے افسانوں کے کردار غربت کے باوجود ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی مکمل ہوتی ہے۔ افسانہ ''شکنتیں'' کا غفورہ اپنی زندگی کے متعلق دوست کو بتاتا ہے:

> ''میری جنسی، گھریلو، معاشی اور معاشرتی زندگی سب ایسی تصویریں ہیں جو اتنی مکمل ہیں
> کہ اگر خود مصور بھی چاہے تو ان میں ایک ذرا سا خم، ایک ننھے سے نقطے کا بھی اضافہ
> نہ کر سکے۔'' ۲۶۴

غریب آدمی نہایت محنت اور مشقت سے خون پسینہ ایک کر کے، اپنی ہڈیوں کا گودا خشک کر کے اپنے بال بچوں کے لیے روٹی کماتا ہے۔ افسانہ ''نیلا پتھر'' کا زمان نیلی ڈھیری کے پاس زخمی ہو جاتا ہے۔ بے ہوشی کے

عالم میں بھی اس کی زبان یہ جملے ادا کرتی ہے:

''میرے بچوں کا کیا بنے گا۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا! کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟
کیا بنے گا!'' ۲۶۵ے

ماں باپ اپنا کل اثاثہ اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ افسانہ ''امانت'' کی گامی تمام عمر اپنے جہیز کے صندوق کو بہو بیٹے سے چھپا کر رکھتی ہے۔ جب وہ قریب المرگ ہوئی تو ایک خاتون نے صندوق کے متعلق پوچھا تو بولی:

''ہائے بی بی مر جاؤں، تو بھی کیسی بھولی بادشاہ ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ
اپنا صندوق کسے دوں گی۔ اسے اپنے بیٹے کو دوں گی اور کسے دوں گی۔'' ۲۶۶ے

ماں باپ اپنی متاعِ حیات اپنی اولاد کے لیے بے پناہ محبت اور شفقت رکھتے ہیں۔ افسانہ ''ارتقا'' کا بڈھا اپنے چاند خان سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کے درج ذیل اقتباس کے لفظ لفظ سے محبت کا ایسا دریا روانی سے بہتا ہے جو شاذ ہی دیکھنے کو ملتا ہے:

''میں تمہاری گردن اور آنکھوں اور ٹھوڑی پر بوسوں کا پہرہ بٹھا رہا ہوں تاکہ جب میرا یا تیری
ماں کا یا کسی اور کا ہاتھ طمانچے کے لیے اُٹھے تو یہ بوسے اُس ہاتھ کو روک لیں۔'' ۲۶۷ے

والدین اپنے ننھے بچوں کو بہلانے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں جو ان کے لیے بے پناہ محبت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بچے کی آنکھوں سے آنسو نکلنے سے پہلے ہی اس کا دل بہل جائے۔ ایک کردار کی زبانی درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''ابا میرے سامنے ریچھ بن کر ناچتے، مینڈک بن کر کودتے، طوطی بن کر بولتے،
شیر بن کر غراتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے۔'' ۲۶۸ے

ناجائز اولاد ہمارے معاشرے کی ایسی بھیانک اور دردناک تصویر کا ایک روپ ہے جو معاشرے کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ افسانہ ''میرا رانجھا'' میں امامی اور دوست محمد ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ دوست محمد، امامی کا رشتہ مانگتا ہے تو یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ امامی ناجائز اولاد ہے۔ یہ بات سنتے ہی امامی کا دل چاہا کہ: ''کھاٹ کے پائے سے اپنا سر پھوڑ ڈالے۔ ناجائز اولاد! امامی کو محسوس ہوا جیسے وہ اس حقیر چوہیا سے بھی کم تر ہے جو گلی میں کبھی پتھر سے پچک کر کوڑے سے مل گئی ہو۔''[۲۶۹] ناجائز اولاد ہونے کے سبب دوست محمد ہمیشہ کے لیے پردیس چلا گیا۔ ایک تلخ حقیقت کا انکشاف ہوتے ہی امامی کی محبت جو ازدواجی زندگی کا روپ دھارنے والی تھی، ہمیشہ کے لیے اس سے خفا ہوگئی۔

یتیم بچے ہمارے معاشرے میں قابلِ قدر مقام حاصل نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی زندگی ادنیٰ خواہشات اور دلی ارمان کی تکمیل میں گزار دیتے ہیں لیکن پھر بھی وہ تمنائیں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کی عمدہ مثال

افسانہ ''خربوزہ'' میں پیش کی گئی ہے۔ یہ بچہ ایسے معاشرے میں ایام زندگی گزارتا ہے جہاں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ ایک مدت سے اس کے دل میں خربوزہ کھانے کی خواہش پنپتی ہے لیکن جب وہ بہت کٹھن مراحل طے کر کے خربوزہ لے کر عالمِ شادمانی میں گھر آتا ہے۔ اس کی ماں نے بسم اللہ پڑھ کر خربوزہ کاٹا تو اُس میں لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔ ماں نے بچے کے منہ پر طمانچہ مارا۔ وہ روتے روتے سو گیا۔ یہ ننھا اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے تمام اذیتیں برداشت کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> ''احمد ندیم قاسمی کا افسانہ خربوزے اس ماحول کی سنگینی کا نقشہ پیش کرتا ہے جہاں دولت کی نامنصفانہ تقسیم اور وسائل پیداوار کی یک طرفہ اجارہ داری نے کئی معصوم بچوں کے خوابوں کو محض ایک خربوزے کی تعبیر سے بھی محروم کر رکھا ہے۔'' ۲۷۰

مشتاق احمد بیگ ''اردو افسانے میں بچوں کے کردار کا سماجی ونفسیاتی مطالعہ'' میں اس افسانے کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس افسانے میں قاسمی کی ترقی پسندانہ سوچ اور اشتراکیب سے اُن کی گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔'' ۲۷۱

افسانہ ''سلطان'' میں مفلس سلطان دیگر بچوں کی طرح جذبات اور ارمان رکھتا ہے۔ دادا کی رحلت کے بعد سلطان خود کو بے سہارا اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہ ظالم سماج سے صرف ایک درخواست کرتا ہے کہ کوئی اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ دے۔ ایک لمحے کے لیے، لیکن صد افسوس اسے یہ نصیب نہیں ہو پاتا۔ دادا کی قربت اور محبت کے احساس نے سلطان کے وجود کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا لیکن دادا کی موت کے بعد خود غرض اور مادیت پرست سماج کے افراد اس کی ادنیٰ سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔ محبت، اخوت کے جذبوں سے ناآشنا بے حس افراد حیرت سے سلطان کا منہ دیکھتے اور اُس کا تمسخر اُڑاتے ہیں۔ بچپن سے یتیم ہونے کا صدمہ ننھے رحمان کے دل میں بسا ہوا ہے۔ جب معاشرے میں اسے صحیح مقام نہیں ملتا۔ معاشرے کے افراد اُسے دھتکارتے ہیں تو اس کے معصوم ذہن میں بیک وقت کئی سوالات گردش کرنے لگتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے: ''اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو کل رحیم میاں مجھے آنکھیں نہ دِکھاتے۔ میری جیب کھانڈ کے لڈوؤں سے بھری ہوتی۔ مجھے بھی چوپال پر زمین دار اپنے پاس بٹھاتے۔'' ۲۷۲ قاسمی بھی بچپن ہی میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ یہ کہانی قاسمی کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

''پاؤں کا کانٹا'' جذباتی افسانہ ہے جس میں سوتیلی ماں کا ناروا سلوک، بچے کی بیماری، باپ کی پریشانی اور بڑھتے زخم کو موثر قصہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ قاسمی نے جہاں خود غرضی، نفرت اور سوتیلے رشتوں کے فرق کو واضح کیا ہے۔ وہیں بے رحم معاشرے میں پرورش پانے والے بچے کی اٹوٹ محبت، معصومانہ اندازِ فکر اور

طفلانہ معصومیت کو بھی بیان کیا ہے۔

قاسمی کے ابتدائی دور کی کہانیوں میں نادار اور معصوم بچے بھی شامل ہیں مثلاً ''چوپال'' میں شامل افسانہ ''ننھا مانجھی'' میں ایک معصوم بچے کے کرب کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے مسکین بچے کی کہانی ہے جس کی ماں اسے داغِ مفارقت دے گئی اور باپ بوڑھا ہے۔ یہ بچہ کشتی رانی کرتا اور باپ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ بے رحم موت کی حقیقت سے واقف ہے۔ اس کا معصوم ذہن ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہتا ہے کہ اگر اس کا باپ مر گیا تو وہ دنیا میں تنہا رہ جائے گا۔ ''بابو جی'' کہانی کا ایک کردار ہے جو روز اس کی کشتی میں سفر کرتا ہے۔ اسے مانجھی سے ہمدردی ہے۔ ننھا مانجھی اس سے اتنا مانوس ہے کہ اپنے دل کی تمام باتیں اس سے کہہ دیتا ہے۔ کہتا ہے:

> ''بابو جی! کسی دن اگر میرا باپ بھی مر گیا تو میں کیا کروں گا؟ پھر مجھے چپو چلانے اور ماہیا گانے میں کچھ لطف نہ آئے گا۔'' ۴۷۳؎

ننھا بچہ اپنے تحفظ کے لیے مختلف خدشات میں مبتلا ہے۔ قاسمی نے اس کی نفسیات کو مہارت سے کہانی کی صورت عطا کی ہے۔ اس افسانے میں قاسمی اپنا درد بیان کرتے ہیں کیوں کہ بچپن میں ہی سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ یتیمی کا احساس تمام عمر ہم رکاب رہا۔ ڈاکٹر افشاں ملک لکھتی ہیں:

> ''ننھے مانجھی سے یہ لگاؤ اور انسیت افسانہ نگار کی دردمندی کا وہ احساس ہے جو انھیں ہر اس بچے سے ہے جو یتیمی کے دُکھ سے دوچار ہوا ہے۔'' ۴۷۴؎

جنس اور جنسی نفسیات کے حوالے سے ہمارے ادیبوں نے گل ہائے رنگ و بو کے متنوع میلے سجائے ہیں اور انسانی شخصیت کے تاریک گوشوں کو منور کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اگرچہ ان پر فحاشی اور عریانی کے الزام لگائے گئے لیکن اس کے باوجود اردو افسانہ میں جنس نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ قاسمی نے بھی جنس کے موضوع پر اپنے افسانوں کی بنیاد کھڑی کی۔ انھوں نے لذت کا رنگ غالب نہیں آنے دیا اور نہ ہی کھل کھیلنے کا انداز ہے نہ ہی جذباتیت میں بہے ہیں نہ ہی حسن و جسم کی تصویر کشی میں بے قابو ہوئے ہیں بلکہ رومانی ذہن کے مالک ہونے کے باوجود انھوں نے احتیاط اور توازن کا دامن اختیار کیا۔ قاسمی کے افسانوی کردار جنسی محرومی، جنسی گھٹن، جنسی مسائل کا اظہار دبے الفاظ میں کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی صفت یہ ہے کہ یہ کردار سچائیوں کے بے باکانہ اظہار کے باوجود عریانی کی سطح پر نہیں آتے۔ قاسمی انسانی نفسیات کے نبض شناس ہیں۔ ''حق بجانب'' کی گم نام دوشیزہ جب شدید محبت کرنے کے باوجود بے وفائی کی مرتکب ہوتی ہے تو انتہائی قدم اُٹھانے سے دریغ نہیں کرتی۔ جب اس کا محبوب بے وفائی کر کے ملک بدر ہو جاتا ہے۔ یہ اپنی زندگی کی روداد مصنف کو سناتے ہوئے کہتی ہے:

> ''طنبورے کے تار ٹوٹ جائیں تو اس کی لکڑی کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ آپ

جانتے ہیں نا؟ گنا چوس لیا جائے تو بیلوں کے آگے پھینک دیا جاتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں نا؟ گاگر سے پانی پی لیا جائے تو پھر کوئی پیاسا اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔'' ۵ے؎

افسانے کی فضا آفرینی میں غنایت بھی ہے اور جذبات کو مختلف رنگ میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ ماحول کی سحرانگیزی بھی ہے جس کی بدولت مرکزی کردار کے رویوں کی شناخت ہونے لگتی ہے۔ انھوں نے یادوں، مشاہدوں اور تاثرات سے افسانہ کی فضا آفرینی کی۔ ان کے افسانوں میں انسانی رویوں کا مشاہدہ توجہ طلب ہے۔ قاسمی نے ذہنی کرب اور جذباتی تصادم کی خوب صورت تصویریں پیش کی ہیں۔ المیہ کردار کی کمزوری اور مجبوری کو بھی نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے احساسِ شکست کے نقوش بھی اُجاگر کیے ہیں۔ علامتوں اور استعاروں سے کام لیا ہے اور طنز کے تیکھے پن سے بھی۔ المیہ کردار کی خلش، ذہنی کرب اور ذہنی تصادم کی ایک تصویر یوں اُبھرتی ہے۔ مثلاً چنوں کی زندگی ذہنی و جسمانی خلا سے بھرپور ہے۔ چنوں کا خاوند مسلسل دو برس سے جیل میں قید ہے۔ چنوں اس سے ملاقات کے لیے شہر کا رُخ کرتی ہے تو سلیم اسٹیشن تک جانے کے لیے اونٹ کا انتظام کرتا ہے۔ وہ کجاوے میں چنوں اور اس کے چھوٹے بچے کو سوار کر لیتا ہے۔ راستے میں شدید بارش کے باعث، وہ ایک کوارٹر میں رات بسر کرنے کے لیے قیام کرتے ہیں تو چنوں جنسی پیاس کا اظہار کرتی ہے۔ نوجوان سلیم پر بھی جذباتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ قاسمی نے چنوں اور سلیم کی حالت کو ایک اقتباس کے ذریعہ ملاحظہ کیا ہے:

''پھر ہم نے ایک دوسرے کی باہوں کو جکڑ لیا۔ شہد کی مکھیاں چھتے کے اردگرد سرسرانے لگیں۔ میرے کانوں کی گونج بادل کی گڑگڑاہٹوں سے ٹکر لے رہی تھی۔ میں نے پھر اپنی فطری جلد بازی سے کام لیا۔ کلائیوں کو چھوڑ کر اس کو شانوں سے پکڑ لیا وہ شاید اسی انتظار میں تھی۔ اپنی باہوں کو اتنی مضبوطی سے میرے اردگرد لپیٹ لیا کہ میری پسلیاں کڑمڑ بج اُٹھیں اور میں نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹوں کو اس کے چہرے کے نہ جانے کس مقام پر پیوست کرتے ہوئے بستر کو ٹھوکر لگا دی اور پھر معاً باہر ننھا بلبلا اُٹھا۔'' ۶ے؎

ننھے کے رونے اور چنوں کی بیٹے سے غفلت، سلیم کو کراہت اور ندامت سے دوچار کرتی ہے جسے چنوں نامردی پر محمول کرتی ہے۔ یہ افسانہ منٹو کے افسانوں کی طرز پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ جنسی حظ کی کشش کا تصور ان کے افسانوں میں بھی موجود ہے۔ ان کے افسانے صحت مند عشق اور جمالیاتی حس کے ساتھ ساتھ توازن اور سنجیدگی کو بھی پیش کرتے ہیں۔ متذکرہ افسانے میں چنوں کی تشنگی قائم رہتی ہے۔ چنوں ایسی تھکن کی خواہش مند ہے جو اسے جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ ایسی پرسکون نیند چاہتی ہے جو تھکن سے چُور چُور ہونے کے بعد آئے۔ وہ محبت کرسکتی ہے، اسے نباہنا بھی جانتی ہے۔ اس افسانے کے پورے ماحول میں شیریں الوہی نغمے کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔ یہ انسانی جبلت کا

خاصہ ہے کہ جنس مخالف کی طرف رغبت اس کی سرشت میں موجود ہے۔ قاسمی ایک کردار کی زبانی جنس کے متعلق گفتگو اس طرح کرتے ہیں:

> ''یہ لالچ کم بخت ہر چیز سے لگا ہوا ہے۔ مرغا مرغی کے پیچھے دوڑا پھر رہا ہے۔ کبوتری کبوتر کو بلا رہی ہے۔ گدھا گدھی کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے گاؤں کی چھوکری ___ بیاہی چھوکری ایک پردیسی لفنگے کے ساتھ بھاگ گئی۔ قدرت کے کھیل ہیں۔'' ۲۷۷

مندرجہ بالا اقتباس میں قاسمی پر منٹو کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ قاسمی کے افسانے بھی جنس، جنسی تعلقات، جنسی الجھنوں، جنسی نفسیات اور جنسی محرومیوں پر مشتمل ہیں لیکن ان کا مقصد جنسی بے راہ روی کو پیش کرنا نہیں۔ قاسمی جنس پر لکھتے وقت قلم کو قابو میں رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مرد اور عورت کے تعلق میں حیا اور مثالی رویہ ملتا ہے۔ ان پر منٹو کی طرح نہ تو فحش نگاری کا مقدمہ چلا اور نہ ہی ان کی تحریروں پر عریانیت کا بورڈ چسپاں ہوا۔ ترقی پسند ادب کے اثرات کی بدولت قاسمی کے افسانوں میں جنسی موضوعات، معاشی مسائل کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنسی موضوعات کو قاسمی نے جنسی گھٹن اور جنسی ناآسودگی کی صورت میں ہنرمندی سے پیش کیا۔ ''ماسی گل بانو'' کی ماسی پر نہ جنات کا اثر ہے اور نہ ہی وہ پاگل کردار ہے بلکہ جنسی ناآسودگی کی بنا پر اس صورتِ حال کا شکار ہے۔ جنسی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں میں ''کنجری'' عمدہ افسانہ ہے۔ سرور اور اس کی ماں جنس فروشی کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ اس پیشے میں اتنے غرق تھے کہ اُن کے دل سے ہلکی سی قوت امتیاز بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ کمالاں کو اس دلدل میں دھکیلنے کی مکمل کوشش کرتے ہیں لیکن نماز روزے کی پابند کمالاں ان باتوں سے نفرت کرتی ہے۔ قاسمی نے حقیقت پسندانہ انداز سے ان کرداروں کو پیش کیا ہے بالآخر مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کمالاں اس راہ کا انتخاب کرتی ہے جسے وہ حقارت سے دیکھتی تھی۔ یہ کہانی عبرت انگیز بھی ہے اور حقیقت پر مبنی بھی ہے۔ اگرچہ قاسمی، منٹو سے بہت متاثر تھے۔ ''بچے''، ''السلام علیکم''، ''روشن دانوں کے شیشے'' ان افسانوں میں منٹو سے مشورے لیتے رہے بالخصوص ''آنچل'' کے افسانوں پر منٹو کے گہرے اثرات ہیں۔ ''آنچل'' کے سات افسانوں کا موضوع ہی جنس ہے لیکن اتنے گہرے اثر کے باوجود قاسمی کے افسانوں میں بے باکی نہیں بلکہ ایک جھجک ہے۔ یہ جنس کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ کہیں واضح انداز میں اور کہیں دبے دبے انداز میں۔ مثلاً:

> ''راتوں کی سنسناتی ہوئی تنہائیوں میں، میں نے اس کمرے میں ثریا کی زلفوں کے خم گنے، اس کے ماتھے کے نور اور اس کے ہونٹوں کا رس اور اس کی بانہوں کے گداز کی باتیں کیں۔ کائنات میرے لیے وسیع ہو گئی اور میرے دل و دماغ میں بھوک اور غم کی سڑاند یکسر ناپید ہو گئی۔'' ۲۷۸

قاسمی نے جنسی جذبہ برہنہ صورت میں پیش نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مشرقی اخلاق کے امین ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں واشگاف جذبے بھی پردے میں رہتے ہیں۔ جوانی کا جنازہ میں یہ طرز اختیار کرتے ہیں:

''مہتاب روز وہاں آنے لگی۔ دن ڈھلے تک جھرنوں کے آئینے میں دونوں کے عکس کانپتے رہتے۔ دیر تک وہی باتیں ہوتی رہتیں جو حضرت وارث شاہ، ہیر کے قصے میں لکھ گئے ہیں اور پھر ایک روز عہد و پیماں بھی ہوئے۔ چھلے بھی بدلے گئے۔ کپ کپاتے ہونٹ بھی ایک دوسرے کو چھو گئے۔ زلفیں بانہوں پر بکھر گئیں اور گال سے گال بھی ملے۔'' ۷۹؎

اسی طرح ''چھاگل''، ''حدِ فاصل''، ''مہنگائی الاؤنس''، ''کنجری'' جنسی موضوعات پر لکھے گئے افسانے ہیں لیکن کہیں بھی جنسی لذت کو بے باکی سے پیش نہیں کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر قاسمی کے مندرجہ بالا اقتباس کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ان کے ہاں جوانوں والی بے صبری ملتی ہے اور نہ سرد بڈھوں ایسا ندیدہ پن، بلکہ عنفوانِ شباب والی جنسی جھجک پائی جاتی ہے۔'' ۸۰؎

قاسمی اگرچہ منٹو سے بہت متاثر تھے۔ ان کے افسانے بھی اس امر کے شاہد ہیں لیکن خاندانی روایات کی بنا پر وہ سنبھل کر بات کرتے ہیں۔ اس لیے جنس کے حوالے سے ان کے افسانوں میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ کرداروں کی جذبات نگاری کی بجائے محض یہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ''وہی کچھ ہوا جو ایک لڑکے لڑکی کے دوران ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔'' منٹو سے متاثر ہونے کی بنا پر جنسی موضوعات کو اپنے افسانے میں جگہ دی لیکن اپنے مزاج کی بنا پر منٹو کی سی بے باکی پیدا نہ کر سکے۔ قاسمی کے دو افسانے ''چھاگل'' اور ''سائے'' منٹو کے افسانے ''چغد'' کی یاد دلاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ''چغد'' میں منٹو نے عورت کی بے وفائی ثابت کی ہے اور ''سائے'' میں قاسمی لڑکے کی بے وفائی کو منظرعام پر لائے ہیں۔ علاوہ بریں قاسمی نے اپنے افسانوں میں چونکانے کے عنصر کو بھی اپنایا۔ افسانہ ''سانولا'' اور ''مہنگائی الاؤنس'' میں چونکانے کی کوشش کرتے ہیں اور قاری اُلجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح قاسمی، منٹو کی اس صفتِ فن کو اپنانے میں ناکام رہے۔ دل میں گہری محبت، انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کا چراغ روشن کیے رہتے۔ یہ اس کی فطرت ہے، دکھاوا نہیں۔ اس سے جنسی خواہشیں انگڑائیاں نہیں لیتیں۔ قاسمی نے جنس نگاری کے سلسلے میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اس کا اطلاق فکر و فن کی اسی نہج پر ہوتا ہے جسے انھوں نے ہمہ گیر اور وسیع تناظر میں پیش کیا ہے۔

جنس کو اگرچہ فطری عمل اور زندگی کا لازمی جز کہا جاتا ہے۔ یہ وہ پل صراط ہے جس پر چلتے ہوئے عاقل اور جاہل کی پہچان ہو جاتی ہے۔ قاسمی بھی اس دشت کی سیاحی میں اپنی ہنرمندی اور جمالیاتی حس کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس موضوع کو کس طرح چھوا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ جنس کے

متعلق قاسمی کا نظریہ ارضی ہے۔ ان کے افسانوی کردار جنسی جذبات سے کماحقہ آگہی رکھتے ہیں اور قاسمی مرد اور عورت کی نفسیات کو حالات کے مطابق منظرعام پر لانے میں کامران رہے ہیں۔ عصمت فروش عورت اگر چہ بعض معاشی مجبوریوں کے تحت اپنا جسم غیر مرد کے حوالے کرنے پر مجبور ہوتی ہے لیکن اس کا جسم اس وقت روح سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ ایسی عورت اگر چہ دولت اور محبت کی بھوکی ہوتی ہے لیکن قاسمی اپنے افسانوں کے ذریعے یہ حقیقت منکشف کرتے ہیں کہ ہر عورت، عصمت فروش نہیں ہوتی لیکن ہر عصمت فروش، عورت ضرور ہوتی ہے جس کے دل میں سچی محبت اور چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو موجود ہے۔

اگر چہ قاسمی نے جنسی موضوعات کو ذریعہ اظہار کے طور پر اپنایا۔ ان کے افسانوں کے موضوعات تو اقتصادی اُلجھنیں ہیں جو اکثر چولہوں کو ٹھنڈا ہی کیے رکھتی ہیں اور ان گھروں کی بہو بیٹیاں عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہیں مثلاً افسانہ ''کنجری'' وغیرہ۔

قاسمی نے دیہات کی مظلوم اور مفلس لڑکیوں کو افسانوں میں جگہ دی جن کا استحصال جاگیردار اور زمین دار کرتے ہیں مثلاً ''رانی''، ''میرا دیس''، ''اصول کی بات''، ''سانولا'' میں اس عورت کو موضوع بنایا جس کی عزت طاقت ور طبقے کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ بقول ڈاکٹر عصمت جمیل:

> ''عورت کے حوالے سے طوائف کے بارے میں ندیم کا رویہ ترقی پسندوں کے منشور کے مطابق ہے۔ وہ بھٹکے ہوئے نسوانی کرداروں میں بھی اچھی خصوصیات تلاش کر لیتے ہیں۔'' ۲۸۱

اگر چہ قاسمی سماجی مسائل اور اقتصادی بدحالی کو ''جنس'' کے آئینہ میں دیکھتے ہیں لیکن ان کے افسانوں میں جنس مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد تو وہ روح فرسا برہنہ حقیقتیں ہیں جو تمام اخلاقی اقدار کو گھائل کر رہی ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں علامت نگاری کی ابتدا ہوئی۔ ادب کی تقریباً ہر قابلِ ذکر صنف نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قاسمی بھی علامت نگاری کو قابل قبول سمجھتے تھے لیکن اس حد تک نہیں کہ علامت نگاری کا آسیب اردو ادب سے اس کے قاری کو ہی چھین لے۔ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''قاری کو کہانی چاہیے، شاعری چاہیے۔ اس میں اگر علامت کا استعمال ہو جائے تو اسے کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر علامت نگاری کے شوق میں کہانی اور شاعری کے بنیادی تقاضوں سے منہ موڑ لیا جائے اور اظہار کی بجائے اخفا کو وطیرہ بنا لیا جائے تو خود اپنی اہمیت کھونے لگتا ہے۔'' ۲۸۲

قاسمی کو علامتی یا استعاراتی افسانے سے کد نہیں۔ وہ ابلاغ کو اہمیت دیتے ہیں۔ ابلاغ کی موجودگی میں وہ علامت کے

استعمال کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ علامت ہو یا تجرید، اس کی مذمت نہیں کرنی چاہیے۔۔۔لیکن اگر کوئی افسانہ نگار علامتی افسانہ لکھتا ہے تو پڑھنے والے کو وہ علامت سمجھ میں آنا چاہیے۔ علامت کی مثال تو اس کلی کی سی ہے جو آہستہ آہستہ چٹکتی ہے، غنچہ بنتی ہے اور پھر پھول بنتی ہے۔'' ۲۸۳؎

علامتی افسانے کی ذیل میں ''سلطان''، ''وحشی''، ''کوہ پیا''، ''خربوزے'' اور ''اندمال'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی وسعت نظر کا نتیجہ تھا کہ وہ افسانے کی جدید تکنیک کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کے دو افسانے ''وحشی عورت'' اور ''سلطان'' علامتی افسانہ نگاری کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ افسانہ ''سلطان'' پرانی قدروں سے بغاوت اور نئی قدروں سے آویزش کی داستان سناتا ہے جب کہ ''وحشی عورت'' میں تشخص، عزت نفس اور غیرت ملی کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

> ''سلطان، دوسری جنگ عظیم کے بعد رونما ہونے والے آشوب کا ترجمان اور قدیم و جدید کی آویزش کی علامت ہے جہاں دادا قدامت پرستی اور پرانی، تہذیبی زندگی کی علامت ہے اور پوتا نئی باغی نسل اور بے فکری و لاأبالی کی تہذیب کی۔ اگر ان کے بیان کردہ استعاروں کو بڑھائیں تو آخر پر سلطان کی کس مپرسی ظاہر کرتی ہے کہ پرانی تہذیبی زندگی سے ہماری نئی نسل اپنا ناتا توڑ کر کس بے کسی سے مغرب کی تہذیب سے امان طلب کرتی ہے۔ اسی طرح ''وحشی'' کی بڑھیا استعارہ ہے اس ملی تشخص کا جو اپنی نارسائی اور مجبوری کے باوجود غیرت کو زندہ رکھتا ہے، جو عزت نفس اور غیرت ملی کی قیمت پر ازراہ ترحم ملنے والی خیرات کو قبول نہیں کر سکتا۔'' ۲۸۴؎

افسانہ ''آسیب'' اس بوڑھے شخص کی کہانی ہے جس کے نزدیک بڑ کا پرانا درخت ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ درخشندہ ماضی کی خوب صورت علامت ہے۔ شادی کے بعد جب اس کا بیٹا اور بہو اسے کٹوا دیتے ہیں تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے وجود سے منقطع ہو گیا ہے۔ چناں چہ وہ اس بڑ کے درخت کا بدلہ اس طرح لیتا ہے کہ اپنے بیٹے اور بہو کے لگائے ہوئے پھولوں کی کیاریاں ویران کر دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''درخت ہمیشہ سے شادابی، نمو، افزائش اور تخلیقی قوتوں کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ندیم نے اسے ایک خاندان کی علامت بنا کر جذباتی رشتہ استوار کیا ہے۔'' ۲۸۵؎

''خربوزہ'' ایک علامتی کہانی ہے۔ خربوزہ کھانے کے لیے معصوم بچہ ذیل دار کے گھر مزدوری کر کے خربوزہ خرید کر لاتا ہے لیکن خربوزہ کاٹتے ہی اندر سے خراب نکلتا ہے جسے دیکھ کر بچہ چیخ مار کر رونے لگتا ہے۔ مشکل

مراحل سے خربوزہ خریدنا، پھر کھانے سے محرومی اس بات کی علامت ہے کہ مفلس بچوں کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ قاسمی نے اپنے بچپن کی ناتمام اور نامکمل خواہشات کا ذکر اپنے افسانوں میں بار بار کیا ہے جو قاسمی کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ قاسمی ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> ''میں نے علامتی افسانہ کبھی نہیں لکھا البتہ میں یہ دعویٰ ضرور کرتا ہوں کہ میرے جو کردار ہوتے ہیں وہ صرف ایک فرد نہیں ہوتے بلکہ ایک بہت بڑے سوشل سرکل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لیے وہ کردار ایک علامت بن جاتے ہیں۔'' ۲۸۶

افسانہ ''وحشی عورت'' کا مرکزی کردار دراصل خوددار اور محنت کش خاتون ہے جسے اپنی مفلسی پر فخر ہے۔ افسانہ ''وحشی'' کی بڑھیا نے ساری عمر محنت و مشقت کرتے خودداری سے گزاری۔ یہ امر اس کے لیے قابلِ برداشت نہیں کہ کوئی شخص اسے ازراہِ ترحم پیسے دے۔ یہ عورت اپنی عزت نفس اور غیرت پر دی جانے والی خیرات گوارا نہیں کرتی اور شدید ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے اُسی باریش بزرگ پر حملہ آور ہوتی ہے جس نے اُس پر ترس کھایا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیدل ہی اپنی منزل کی جانب گامزن ہو جاتی ہے۔ یہ بڑھیا خودداری اور حمیت کی علامت ہے جو ہمارے ملک اور قومی کردار کی ترجمانی عمدہ طریقے سے کرتی ہے۔ بقول فرمان فتح پوری:

> ''دراصل قاسمی صاحب نے اپنے اس افسانے میں غیر ملکی امداد کی طرف اشارہ کیا ہے جو ملکی سالمیت ملی سیاسی آزادی کی قیمتوں پر فارن ایڈ کے نام سے ہمیں گاہے بگاہے ملتی رہتی ہے۔'' ۲۸۷

منشا یاد نے اپنے مضمون ''احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں اس افسانے کے مرکزی کردار ''بڑھیا'' کو بے حد سراہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میں نے پورے اردو اور پنجابی ادب میں ایسا دل چسپ، خوددار اور یونیک کردار اور کسی کے ہاں نہیں دیکھا۔'' ۲۸۸

افسانہ ''گنڈاسا'' کا مولا خوف اور دہشت کی علامت دکھائی دیتا ہے۔ وہ کبڈی کا ماہر ہے۔ راجو کو دیکھنے کے بعد اس کے اندر تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ وہ اپنے دشمن کی منگیتر راجو کو زبردستی حاصل کرنے کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ وہ گلّے کو زیر کرنے کے بعد صرف اس لیے معاف کر دیتا ہے کہ اس نے ابھی دولھا بننا ہے۔ اسی طرح گاؤں کی الہڑ دوشیزہ ''ماسی گل بانو'' بھی خوف و دہشت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اہلِ گاؤں اس سے جن نکلواتے ہیں لیکن اس کی نفسیاتی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

قاسمی ایک حب الوطن پاکستانی تھے۔ انھیں اپنے وطن کے چپے چپے سے محبت تھی۔ اپنی مٹی سے محبت ان کے ضمیر میں شامل تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وطن سے محبت ان کے ایمان کا حصہ تھی تو غلط نہ ہوگا۔ پاکستانی ہونے

پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے ''تہذیب وفن'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔ہم پاکستانی، پاکستان سے محبت کو کسی طرح بھی مشروط نہیں کر سکتے۔ اگر ہمیں خودداری کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو ہمیں غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرنا ہو گا کہ ہم پاکستانی ہیں اور ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔'' ؀۸۹

قاسمی کی تحریروں میں پرخلوص حب الوطنی کا متاثر کن اظہار نمایاں ہے۔ ان کا ذہن چوں کہ مشرقی تہذیب کا تربیت یافتہ تھا۔ اسی وجہ سے اپنی تہذیب، زمین اور ماحول کی مہک ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کو مشرقی تہذیب وتمدن کی نمائندگی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''۔۔۔میں جب اہل قلم اور اہل دانش کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ وطن سے پاک و صاف، غیر مبہم اور غیر مشروط محبت کیجیے تو اس کا یقیناً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسروں سے نفرت کیجیے۔ دوسروں سے نفرت کیے بغیر بھی وطن سے محبت کی جا سکتی ہے بلکہ وطن سے محبت کا مطلب ہی یہی ہے کہ آپ کو اس خطۂ ارض کی ترقی وتعمیر سے اور اس کے امن سے محبت ہے اور امن دوسروں سے نفرت کرنے سے حاصل نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی آپ کے وطن کے امن پر ضرب لگائے تو اس وقت وطن کا تقاضا یہ ہے کہ ضرب لگانے والے کے اس ہاتھ کو کاٹ دیا جائے۔'' ؀۹۰

قاسمی ایک سچے محبِ الوطن تھے۔ انھیں مادرِ وطن کا ہر دُکھ اپنا دُکھ معلوم ہوتا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ پر ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ ناہید قاسمی نے کتاب ''احمد ندیم قاسمی شخصیت وفن'' میں قاسمی کو ''شاعر انسانیت'' کے ساتھ ساتھ ''شاعر پاکستان'' اور ''شاعر وطن'' بھی قرار دیا ہے۔ ان کے افسانے، کالم اور مضامین اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ قاسمی کی پرخلوص اور باشعور حب الوطنی تاثیر کی شدت سے بھرپور ہے۔ ان کی نظمیں ''دردِ وطن''، ''اے ارض وطن میں روتا ہوں''، ''وطن کے لیے ایک دعا'' میں پاکستان سے محبت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ عالمگیریت کا نقطہ نظر رکھنے کے باوجود وہ پاکستانی ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔مجھ پر اس سرزمین کے خاص حقوق ہیں اور میں امن و آشتی کا پرستار ہونے کے باوجود اس کے ناموس اور تحفظ کے لیے لڑ بھی سکتا ہوں اور اس کی آن پر مر بھی سکتا ہوں۔ حد سے بڑھی ہوئی عالمگیریت والے مجھ پر تنگ خیالی کا الزام بھی دھر سکتے ہیں مگر میں اس ماں کو کیسے بھولوں جس نے مجھے جنم دیا اور جس کے قدموں میں میری جنت ہے۔'' ؀۹۱

قاسمی کی کہانیوں میں معاشی جبر برداشت کرتے ہوئے اور مسلسل تنگ دستی کی چکی میں پستے افراد کی داستان بھی موجود ہے۔ افسانہ ''الحمد للہ'' کا بنیادی کردار مولوی اُبل ہے جس کے نو بیٹے بیٹیاں ہیں جو کثرت اولاد کو خدا کا فضل اور رحمت مانتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے معاشی حالات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ یہی معاشی بحران مولوی ابل

کے فرائض کی ادائیگی میں رخنہ ڈالتا ہے۔ نماز کی امامت میں طویل سجدے، تلاوت قرآن میں غلطی کرنے اور دورانِ تراویح سہو ہونے پر مقتدی چوہدری فتح داد نے جب انھیں ٹوکا تو ابل کے ذہن میں آیا کہ وہ پکار اُٹھے کہ ''آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا، چوہدری صاحب! آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہوگئی ہوتی تو میں سمجھاتا کہ ایک سورہ کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے۔'' ماہر افسانہ نویس نے اپنے کرداروں کا مطالعہ گہرائی سے کیا ہے۔ وہ اعلیٰ نفسیاتی تجزیہ کامیابی سے کرتے ہیں۔ بڑی بیٹی کی شادی کے بعد مولوی ابل کو نوزائیدہ نواسے کے لیے کپڑوں کا انتظام کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ چوہدری فتح داد اس کا مخلص اور مددگار تھا۔ اس کی وفات پر مولوی ابل خوش تھا کہ بیس روپے نمازِ جنازہ کا معاوضہ لے کر وہ اپنے نواسے کے لیے نئے کپڑوں کا انتظام کر سکے گا۔

> ''اس طرح افسانہ ''الحمد للہ'' نفسیاتی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے اور مولوی ابل کی مجبوری کا مسئلہ چوہدری فتح داد کی موت سے بظاہر حل ہوتا ہوا نظر تو آتا ہے لیکن نفسیاتی گرہ کے کھلنے سے افسانہ کا حسن بڑھ جاتا ہے کیوں کہ خاتمہ میں آخرکار وہی تاثر قائم ہوتا ہے جو فن کار کا اصل مقصد ہے اور یہی اس افسانہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔'' ۲۹۲

عہد طفلی معصومیت اور سن بلوغت کے مسائل کا دور کہلاتا ہے۔ اس عمر میں فرد کے جنسی احساسات بیدار ہوتے ہیں اور زندگی میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔ عنفوانِ شباب کی ابتدا کے ساتھ ہی دل حسین خوابوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ خواب رشک، حسد اور رقابت کے جذبے میں بھی مبتلا کرتے ہیں۔ افسانہ ''تبر'' کا شہباز نوجوان چھوٹے قد کی بنا پر احساسِ کم تری میں مبتلا ہے۔ وہ جنت کی مسکراہٹ کو محبت کا نام دے کر جنت کے خاوند اللہ دین کا قتل کر دیتا ہے۔ اس کا دوست دلیر خان، شہباز کے حوصلہ کو اس طرح بلند کرتا ہے:

> ''تم نے ایسا نیک کام کیا ہے شہباز خاں! کہ قسم پیر دست گیر کی، سیدھے بہشت میں جاؤ گے۔ تم نے ایک دُکھی عورت کا دُکھ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔'' ۲۹۳

شہباز کی آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی ہے۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا لہٰذا وہ لااُبالی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلیر خان سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> ''یہ میرا پہلا خون ہے۔ پر دلیر خان! میرا ظرف اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ میں تو تمھیں بھی قتل کر دوں تو سیٹی بجاتا پھروں۔'' ۲۹۴

نوجوان عالم شباب میں شدید جذباتیت کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دشمنوں کو کڑی سے کڑی سزا دینے کے قائل ہیں۔ افسانہ ''انتقام'' کے مرکزی کردار اکبر کا فتو اور سرخو سے جھگڑا ہو جاتا ہے تو وہ خواہش مند ہے کہ اس کے دشمنوں کو ایسی سزا ملے جو سب کے لیے باعثِ عبرت ہو لہٰذا اس نے اپنے باپ سے اجازت طلب کی کہ:

> ''اپنے تمام مزارعین کو اکٹھا کر کے فتو اور سرخو کے گھروں میں آگ لگا دیں۔ ان کے

> بچوں کو ذبح کر دے، ان کی عورتوں کو گلیوں میں ننگا کھینچتا پھرے۔ خود ان دونوں کو گیلے نکلوں میں باندھ کر پھینک دے اور نکلوں کو دیا سلائی دِکھا دے۔'' ۲۹۵ؔ

قاسمی نے رشتے، شادی کے مسائل اور ذات پات کے نظام پر بھی افسانے تخلیق کیے۔ ''نصیب'' اور ''ہم بیگ'' میں بیٹیوں کے رشتوں کی کمی کی دردناک صورتِ حال بتائی گئی ہے مگر افسانہ ''بیٹے بیٹیاں'' پیچیدہ اور موثر افسانہ ہے۔ سارا المیہ اس ذات پات کی جبریت سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان صرف اپنی ذات میں ہی شادی کر سکتا ہے چناں چہ ہادی کمہار کو اپنی بیٹی بیاہنے کے لیے اپنے ہونے والے داماد کی بہن سے خود شادی کرنا پڑی۔ پھر چند برس بعد اپنے بیٹے کی شادی کے بدلے اپنی بیوی کو طلاق دے کر ہونے والی بہو کے باپ کے نکاح میں دینا پڑا۔ اور ذات پات کے عقائد نے انسان کو درجہ انسانیت سے گرا دیا ہے اور غریب آدمی کو جاگیردار انسان نہیں سمجھتے۔ مثلاً موچی کا نادر، زری جوتے بنانے میں مہارت رکھتا تھا لیکن خود اپنے بیاہ پر زری کا جوتا تیار کرنے سے محروم رہا۔ ایک دن اس نے جھجکتے ہوئے راجہ شیر خاں سے صرف ایک دن کے لیے جوتا مستعار لینے کی التجا کی تو راجہ شیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ آگ بگولا ہو کر کہنے لگا:

> ''یعنی تم میرا یہ نیا جوتا پہنو گے؟ راجہ گرجتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر دروازے پر جا کر جیسے ہجوم کے سامنے تقریر کرنے لگا:
> یہ موچی چھوکرا میرا جوتا اپنے پاؤں میں پہننا چاہتا ہے یارو۔ کہتا ہے میری شادی ہو رہی ہے، ذرا سا پہن لینے دو کہ ٹھاٹھ رہ جائے۔ میرا جوتا میرے پاؤں اور ان کمینوں کے سروں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ پلنگ پر جا کر پھیل گیا۔ جی چاہتا ہے اسی جوتے سے چمڑی اُدھیڑ ڈالوں اس کی، کتا، کمینہ۔'' ۲۹۶ؔ

المیہ یہ ہے کہ استحصالی طبقے نے مظلوموں کو مقدر پرستی کی افیون پلا دی ہے اور انھیں اس حد تک مدہوش کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک عزت و ذلت میں کوئی فرق نہیں۔ ہر جبر پر صبر کی عادت ان کی راسخ ہو چکی ہے۔ آزادی اور جمہوریت کی ابتدا کے ساتھ جب عوام میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے تو جاگیردار، چودھری اور زمین دار کو یہ بیداری ایک آنکھ نہ بھاتی تھی چناں چہ وہ اس بیداری کو دوبارہ نیند میں بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ افسانہ ''جوتا'' کے کرموں نے اپنے تینوں بچوں کو اسکول میں داخل کرایا۔ چودھری نے اُسے بلایا اور خوب ڈانٹا۔ کرموں پر چودھری کی باتوں کا رتی بھر اثر نہ ہوا چناں چہ جب یہ لڑکے لاہور، کالا شاہ کاکو اور فیصل آباد کے کارخانوں میں ملازم ہو گئے تو کرموں کی اقتصادی حالت کچھ سدھرنے لگی۔ چودھری کو کرموں کی خود کفالت سے پھوٹتی ہوئی عزت نفس کسی طرح نہ بھاتی تھی۔ کرموں نے جب زکوٰۃ دی تو چودھری کے دل میں حسد کے جذبات پیدا ہوئے۔ چناں چہ وہ مجمعے سے

مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''دیکھ لینا لوگو! سال دو سال میں خود زکوٰۃ مانگنے نکل کھڑا ہوگا۔ اگر اس وقت تک قیامت نہ آگئی تو۔ میراثی جب زکوٰۃ دینے لگے تو سمجھو سورج سوا نیزے پر اُترنے کو ہے۔'' ۲۹۷ع

ہمارے معاشرے میں کارندوں کا سماجی رتبہ بڑھ جانا ایک جرم سمجھا جاتا ہے۔ چودھریوں کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایک ادنیٰ درجے کا انسان خوش حالی کی زندگی بسر کرے۔ اقتصادی آزادی کا تقاضا ان جاگیرداروں کے لیے ایک سنگین خطرہ تھا۔ اُن کے پیش نظر آدمیت کی تذلیل، زیردستوں کی پامالی تھی۔ ایک روز جب کرموں کو سنہرے رنگ کا خوب صورت کمبل اوڑھے دیکھا تو چودھری بے چین ہو گیا اور اُس وقت تک اُسے چین نصیب نہ ہوا جب تک وہ خوب صورت کمبل کرموں سے خرید نہ لیا۔ قاسمی لکھتے ہیں:

''تب چودھری اپنے سامنے کمبل پھیلوا کر مسکرایا۔ اُسے خوب اچھی طرح جھڑوایا جیسے کمبل کا میراثی پنا نکال رہا ہے۔ اُسے تہ کروا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو اور کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں اور پھر کسی پیٹی میں پھینک دیں۔ پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔ درجنوں پڑے ہیں اس طرح کے کمبل مگر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھائی تین سو روپے کا کمبل اوڑھے دیکھ نہیں سکتا۔ جوتے کو پاؤں میں ہی رہنا چاہیے۔'' ۲۹۸ع

قاسمی کے افسانوی سرمائے میں چند کہانیاں ایسی ہیں جہاں عورت کی فریاد نے اپنی لے خود متعین کی ہے۔ قاسمی نے اگرچہ ''مظلومیٔ نسواں'' کے موضوع پر موثر اور دل گداز فن پارے تخلیق کیے مگر ''ایک عورت تین کہانیاں'' اور ''بین'' کی کہانیوں سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہانیاں قلم دل میں ڈبو کر لکھی گئی ہیں۔ ''ایک عورت تین کہانیاں'' پنجاب کی دیہاتی عورت کی ابتلا سے عبارت کہانی ہے جسے قاسمی نے درد اور پرتاثیر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا رنج و محن کے منظر سے ہوتی ہے:

''میں گاؤں کی ایک ننھی سی بچی ہوں۔ میرا نام نور خاتون ہے۔ میں نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی ہے کہ اگر خدا نے میری پیدائش کے فوراً بعد مجھے عقل و شعور سے بہرہ ور کر دیا ہوتا تو میں ایک ہولناک چیخ مار کر مر جاتی۔ میں اشرف المخلوقات کے ایک فرد کی حیثیت سے دنیا میں آئی تھی مگر میں نے جس کوٹھے میں جنم لیا، وہ موت کی طرح تاریک تھا۔ اس کے ایک کونے میں میرے بابا کی اکلوتی بکری بندھی تھی جو بیٹھے بیٹھے تھک جاتی تھی اور اُٹھ کر ایک جھرجھری سے اپنا جسم جھاڑتی تھی تو اس کی غلاظت اُڑ کر میری چیختی ہوئی ماں کے بالوں میں اٹک جاتی تھی۔ میرے پیدا ہوتے ہی دنیا کی جس پہلی چیز نے میرا استقبال کیا وہ اس غلاظت کا ایک چھینٹا تھا، جو سیدھا میرے ماتھے پر آ گرا اور میری تقدیر لکھ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد میرے کان میں اذان

بھی دی گئی اور مجھے چیتھڑوں میں لپیٹ بھی لیا گیا مگر غلاظت کا چھینٹا اس سے پہلے ہی اپنا کام کر چکا تھا۔'' ۲۹۹ؔ

اس بچی کی پیدائش نے باپ کو مغموم اور ماں کو بے حد اُداس کر دیا۔ اہلِ گاؤں نے اس کی پیدائش پر رو رو کر ماں سے ہمدردی کی جیسے کسی کی موت واقع ہوئی ہو۔ نور خاتون صبح سویرے اٹھتی، گھر میں جھاڑو دیتی، بکری کا تھن صاف کرتی، کنویں سے گاگریں بھر کر لاتی، جنگل سے خشک لکڑیاں اکٹھی کرتی، مٹی کھودتی، گھاس کاٹتی، دیواریں لیپتی، یہی اس کا روز کا معمول تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی نور خاتون اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں تنہا محسوس کرتی۔ اس کے محسوسات کا یہ عالم تھا:

''۔۔۔ میری جوانی بھی عجیب جوانی ہے کہ میرے ہونٹ سرخ تو ہیں مگر شعلوں کی طرح سرخ ہیں۔ میری آنکھوں میں چمک تو ہے مگر ریت بھی تو چمکتی ہے۔ میری رگوں میں خون کی جگہ آنسو دوڑتے ہیں اور میں اوپر سے سانس لے رہی ہوں مگر اندر سے چیخ رہی ہوں۔'' ۳۰۰ؔ

جب نور خاتون رات کو چیتھڑوں کے انبار میں سونے لگتی تو ماں باپ ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کرنے لگتے۔ نور خاتون کو یہ محسوس ہوتا جیسے وہ شادی کی نہیں بلکہ جنازہ اُٹھانے کی فکر میں ہوں۔ جب نور خاتون کی شادی کا مرحلہ آیا لیکن شادی تو امیرزادیوں کی ہوتی ہے۔ غریب لڑکیوں کے تو صرف ہاتھ پیلے کیے جاتے ہیں۔ قاسمی نے اس حقیقت آفریں زندگی کی جھلک اپنی نظم ''سہاگن بیوہ'' میں دکھائی ہے:

نہ بزرگ باپ سے کچھ گلہ، نہ غریب ماں سے ملال ہے
نہ کسی کے رحم کی آرزو، نہ دراز دستِ سوال ہے
مری زندگی کے نصیب میں جو خزاں ہی تھی تو خزاں سہی
مجھے آہ و نالہ سے کام ہے جو یہاں نہیں تو وہاں سہی
جو فلک پہ بیٹھے ہوئے خدا کی یہی رضا ہے تو شکر ہے
جو عدالتِ مہ و سال کا یہی فیصلہ ہے تو شکر ہے
مگر اک عجیب کرید سی مرے دل میں رہتی ہے پرفشاں
کہ مرا مقدر غم نشاں، مجھے لے چلے گا کہاں کہاں ۳۰۱ؔ

پھر نور خاتون اپنے سہاگ کے احوال کچھ اس طرح قلم بند کرتی ہے:

''۔۔۔ میں بہت دُکھی ہوں، میں اس لیے بھی بہت دُکھی ہوں کہ میری پانچوں بیٹیاں زندہ ہیں اور میرا گھر والا مکان کی چھت کے لیے مٹی کھودتے ہوئے مٹی کے ایک تودے تلے دب کر مر گیا ہے۔ اس وقت میری بیٹیاں قطار میں بیٹھی ایک دوسری کی

جوئیں دیکھ رہی ہیں۔ میرے بیٹے کے ہل کی پھال ٹوٹ گئی ہے اور وہ لوہار سے نئی پھال بنوانے کے لیے کہیں سے قرض لینے گیا ہے۔ میں مٹکے کا ڈھکنا اُٹھائے سوچ رہی ہوں کہ نئی فصل اُٹھنے میں تو ابھی چار مہینے باقی ہیں اور مٹکے میں تو چار دن کا بھی اناج باقی نہیں۔'' ۳۰۲

نور خاتون کی کہانی ہر غریب عورت کی داستان ہے۔ قاسمی نے اسے نہایت سادگی، دانش اور صوفیا کے قلبی گداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قاسمی نے مظلومی نسواں کو بھی پیش کیا ہے مثلاً افسانہ ''بین'' میں عورت کا حسن اگر پیرزادے کی ہوس کا نشانہ بنتا ہے تو ''لارنس آف تھیلیبا'' میں ایک جاگیرزادے کی درندگی کا شکار ہوتا ہے۔ ''بین'' کی رانو اور ''لارنس آف تھیلیبا'' کی رنگی اپنی عزت کھونے کے بعد بغاوت کی راہ اپناتے ہوئے اپنے شکار پر جھپٹتی ہیں۔ فتح محمد ملک ان افسانوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ندیم کے ہاں مظلومی نسواں۔۔۔ ہمہ گیر انسانی صورتِ حال کا ایک حصہ ہے۔ یہ صورتِ حال جبر و استبداد کے مروجہ نظام نے پیدا کر رکھی ہے۔ جب تک یہ نظام باقی ہے خدا بخش اور سائیں جی، رنگی اور رانو کی سی فاختاؤں پر عقاب بن کر جھپٹتے رہیں گے۔ حسن تاراج ہوتا رہے گا اور آدمیت کی تذلیل ہوتی رہے گی۔ چوں کہ یہ نظامِ استحصال فقط آنسو بہائے چلے جانے سے تبدیل نہیں ہو سکتا، اس لیے ندیم نے اپنے فن کو رنگی کی سی لالیوں کے تنِ نازک میں بازو کا دل پیدا کرنے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔'' ۳۰۳

''ننھے نے سلیٹ خریدی'' معاشی عدم مساوات پر مشتمل افسانہ ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار عزیز اپنے معصوم دل و دماغ میں معاشی عدم مساوات پر سوچتا ہے۔ اسکول جاتے ہوئے ٹھوکر لگنے سے گر جاتا ہے۔ اس کے مفلس والدین زخمی پاؤں کو بھول کر سلیٹ ٹوٹنے کے غم میں پریشان ہیں۔ زمانے کے تغیر کا احساس قاسمی کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس احساس نے واضح رجحان کی صورت اختیار کر لی جس کی جانب سید وقار عظیم نے اپنے مضمون ''ندیم کے افسانے، سناٹے کے بعد'' میں بھی واضح کیا ہے۔ ان کے کردار اس امر کے شاہد ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے مثلاً ایک کردار کی زبانی قاسمی یہ کہلواتے ہیں:

''بڑا سخت زمانہ آنے والا ہے زینو! یہ بچے بڑے ہوں گے تو ایسے ایسے کام لیے جائیں گے ان سے کہ ہم تم سوچیں تو دماغ پھٹ جائیں۔'' ۳۰۴

افسانہ ''اصول کی بات'' میں زمین دار کا سائیں عبداللہ کہتا ہے:

''بڑا بُرا زمانہ آ گیا ہے چاچا! پیٹ کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔'' ۳۰۵

تغیر زمانہ کا احساس قاسمی کے افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں ''بازارِ حیات''، ''برگ حنا'' اور '' گھر سے گھر تک'' میں زیادہ ملتا ہے۔ قاسمی نے اپنے افسانوں میں تہذیب اور جدید علوم وفنون سے محروم دیہاتیوں کی ذہنی پسماندگی کی داستان بھی بیان کی ہے۔ جو نئی سائنسی ایجادات پر ایقان نہیں رکھتے۔ توہمات اور اساطیر کے سحر میں گرفتار یہ افراد جامد اجتماعی لاشعور کے مالک ہیں۔ وہ نئی سائنسی ایجادات کو اجنبی ہونے کی بنا پر قبول نہیں کرتے۔ افسانہ ''ایک رات چوپال'' کا مرکزی کردار وحید خاں تعطیلات پر گاؤں آتا ہے۔ وہ چوپال پر دیہاتی لوگوں کو نئی سائنسی ایجادات کے متعلق بتاتے ہیں لیکن کم علم دیہاتی اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ اس کی باتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ ذیل دار صاحب ریڈیو کے متعلق کہتے ہیں:

> ''ہزاروں میل دُور ایک شخص گانا گا رہا ہے، تار وار ہے نہیں اور وکیل صاحب مزے سے اس کا گانا سن رہے ہیں تو گویا خدا ان کے قابو میں آ گیا۔ گویا اب لوگوں نے جنوں بھوتوں پر قبضہ جما لیا۔ اب یہ جن بھوت کا کام نہیں تو اور کیا کہ اچانک وکیل نے لندن پر سوئی گھمائی اور کوئی عورت لمبے لمبے بین کر کے رونے لگی۔۔۔ میرے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی اور اگر یہ بات سچ ہے تو کوئی دن میں قیامت آئی جانو۔'' ۳۰۶

مندرجہ بالا اقتباس قاسمی کے اپنے تجربات کی عکاسی کر رہا ہے۔ جب وہ شہر سے گاؤں واپس لوٹ کر آئے ہوں گے تو انھیں اس قسم کے حالات و واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اور کم علم دیہاتی اس شہری بابو کا مذاق اُڑاتے ہوں گے۔

قاسمی نے عوام کے دُکھ درد کو کہانیوں میں پیش کیا۔ اُنہوں نے ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ایک حساس افسانہ نگار کی مانند معاشرے کی برائیوں کو بھرپور طریقے سے اُجاگر کیا۔ افسانہ ''جوتا'' کا کرموں مراثی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی اور شادیوں میں ڈھول اور شہنائی بجانے کی بجائے اس کے بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تو گاؤں کے متمول افراد اس کا مذاق اُڑانے لگے۔ جب اس نے تینوں بچوں کو اسکول داخل کروایا تو اہلِ گاؤں پر سناٹا چھا گیا اور لوگوں کے خیال میں یہ پہلا میراثی ہے جو اپنے بچوں کو تعلیم دلوا رہا ہے۔ چودھری نے کرموں کو بلا کر ڈانٹا:

> ''میراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو؟ کیا شادیوں میں ان سے لوگ ڈھول شہنائی کی بجائے کتابیں سنیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انھیں؟ کیوں ناس مارتے ہو اپنے نسلی پیشے کا۔'' ۳۰۷

پنجاب کے دیہات میں پیر پرستی غیر انسانی حدوں کو چھو جاتی ہے۔ لوگوں سے خدا اور رسول کے نام کی تجارت کے ذریعے نذرانے لیے جاتے ہیں۔ قاسمی پیروں کے خاندان سے متعلق ہونے کے باوجود اسے لوٹ کھسوٹ کا افسوس ناک طریقہ کہتے ہیں جس میں نذرانے کے نام پر مفلس افراد سے پیسے بٹورے جاتے ہیں۔ پیر پرستی کے

متعلق ان کے افسانوں میں ''پیپل والا تالاب''، ''بین'' اور ''چبھن'' زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ افسانے ان کے مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ جس میں سادہ افراد کبھی پیر کی ستم گری کا شکار ہوتے ہیں اور کبھی خانقاہی نظام سے متعلق افراد کی نفسیات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے مثبت و منفی دونوں پہلو کی عکاسی افسانہ ''چبھن'' میں ملتی ہے۔ وہ جنوری ۱۹۷۲ء کے دوہے میں کہتے ہیں:

نذرانے لیتا ہوا ، گاؤں میں آیا پیر
ریشم کے ملبوس میں ، مانگے بھیک فقیر ۳۰۸

لڑائی جھگڑا ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ قاسمی نے گلی محلے کی خواتین کے جھگڑے کو ان کی مخصوص زبان میں دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اپنی آنکھوں سے دو عورتوں کی آپسی لڑائی دیکھ رہے ہیں۔

''۔۔۔بات بڑھتے بڑھتے اس انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔۔۔ اللہ کرے تیرا بچہ مرجائے۔۔۔
میرا بچہ خدا کا مال ہے پر خدا کرے پہلے تیرا بچہ مرے کہ میں اپنی آنکھوں سے تجھے
اپنے پہ چڑیلوں کے سے بال نوچتے دیکھوں۔
میں ابھی کھڑکی سے کود کر آؤں گی اور تیری زبان پر انگارہ رکھ دوں گی۔
اس سے پہلے میں تیری ٹانگیں نہیں توڑ دوں گی۔'' ۳۰۹

طبقاتی تفاوت معاشرے میں سرایت کر چکا ہے۔ اُس کی چھاپ گھریلو فضا پر بھی ملتی ہے۔ افسانہ ''فالتو'' میں جہاں ماں باپ اور بیٹے کی فطری محبت کا اظہار ملتا ہے وہاں گھریلو ناچاقی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ پیش نظر افسانے میں مرد اور عورت کے نفسیاتی مطالعے کی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً پیر بخش اپنی بیوی سے کہتا ہے:

''کھل کر رونے والا معاملہ ایسا ہے جس میں عورتیں مردوں سے بھی زیادہ آزاد ہیں ورنہ
رونے کو تو مردوں کا بھی جی چاہتا ہے۔'' ۳۱۰

قاسمی کے کردار مثالی نہیں نہ وہ محض فرشتہ ہیں نہ ہی محض شیطان بلکہ اسی دنیا کے عام کردار ہیں جو خوبیاں بھی رکھتے ہیں اور خامیوں سے بھی مبرا نہیں۔ قاسمی اپنے افسانوں میں کرداروں کی فطری عکاسی کرتے ہیں جو سادہ، معصوم اور نیک ہونے کے ساتھ ساتھ بے باک اور گناہ گار بھی ہیں۔ محبت اور نفرت کے جذبات بھی رکھتے ہیں اور خلوص اور نیک نیتی بھی بدرجہ اُتم موجود ہے۔ یہ کردار اپنی زندگی میں جن حالات و کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان سے مقابلہ کرنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔ اس کا بیان بھی وہ اسی حقیقی اور فطری انداز میں کرتے ہیں۔ ان کرداروں میں بلا کی حرکت اور جوش موجود ہیں۔ ان کرداروں کی ذہنی کیفیات کی عمدہ عکاسی اور زبان و بیان کی سلاست سے افسانوں میں حقیقت نگاری کا پہلو بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ محمد عالم ان کرداروں کی سادہ لوحی،

شرافت اور معصومیت کے متعلق رائے زنی کرتے ہیں:

> ''ان کرداروں کی سادہ لوحی، بنیادی شرافت اور حیرت، افسانے میں بہت لطف پیدا کرتی ہے اور قاری ان سے مل کر بہت فرحت اور مسرت محسوس کرتا ہے اور اسے اس مانوس اجنبی فضا میں رہ کر اپنے ماضی میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔'' ۳۱۱؎

قاسمی کے افسانوں کی کردارنگاری عمدہ ہے۔ انھوں نے کردارنگاری کی اوٹ میں دیہات کا چہرہ داغدار نہیں کیا اور نہ ہی دیہات نگاری کے جوش میں کردارنگاری کو نظرانداز کیا۔ اس طرح ان کے افسانوں میں کردار اور دیہات کا خوب صورت امتزاج اپنا اصلی رنگ پیش کرتا ہے۔ ایسا رنگ جو خود قاسمی کی زندگی کا حصہ تھا۔ قاسمی ان کرداروں کی تصویرکشی اتنی عمدگی سے کرتے ہیں کہ وہ زندگی سے بھرپور حرکت اور حرارت کے حامل نظر آتے ہیں۔

افلاس کے شکنجے میں مبتلا رہنے کے باوجود قاسمی کے افسانوی کردار نہایت جرات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ زمین داروں، مہاجنوں، چودھریوں اور جاگیرداروں کے سامنے اپنی غیرت کو گروی نہیں رکھتے۔ بھوکے پیٹ رہ کر بھی ان کی غیرت وحمیت میں فرق نہیں آتا۔ افسانہ ''غیرت مند بیٹا'' ایک مفلس بیوہ اور یتیم بیٹے کی کہانی پر مشتمل افسانہ ہے۔ گھر میں مفلسی کا راج ہے۔

> ''رات کو بھوکا سونا، دن کو خالی پیٹ رہنا، مجھے کچھ انوکھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں سمجھتا تھا ہر کوئی اسی طرح رہتا ہے۔ سب کی مائیں یوں ہی دن رات کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔'' ۳۱۲؎

قاسمی کے افسانوی کردار اپنے طبقے کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے ''پرمیشر سنگھ'' کا پرمیشر سنگھ، ''کفن دفن'' کا میاں سیف الحق، ''گنڈاسا'' کا مولا اور ''بابا نور'' کا بابا نور غیرہ زندہ و جاوید کردار ہیں۔ ان کرداروں کی آوازوں میں زندگی کی کسک اور دھڑک موجود ہے۔ یہ وہ درد، کسک اور ہمک اور احساس ہے جس کی ترجمانی قاسمی کے دل سے اُٹھنے والی لہریں کرتی ہیں۔

قاسمی کے افسانوں میں ہمیں فطری کردار اور روتی سسکتی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ یہ سادہ اور معصوم کردار ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر رہتے ہیں۔ قاسمی نے کرداروں کے انتخاب میں بڑی چابکدستی سے کام لیا مثلاً افسانہ ''کنجری'' میں کمالاں کا کردار، ''گنڈاسا'' میں مولا، ''الحمد للہ'' میں مولوی اُبل، ''رئیس خانہ'' میں مریاں، ''جوتا'' میں کرموں، ''آتش گل'' میں گلابو، ''سناٹا'' میں کلثوم کے کردار جہاں ارتقا کی منازل طے کرتے ہیں وہیں معاشرے کے تلخ حقائق کو بھی منظرعام پر لاتے ہیں۔ قاسمی اس فن کاری سے کہانی کے واقعات پیش کرتے ہیں کہ ان کرداروں سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے نزدیک:

> ''بابا نور، سیف الحق، نھو کی ماں، وحشی کی خوددار بڑھیا، فضلو، مریاں، کرموں

احمد ندیم قاسمی کے ایسے کردار ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے اور قاسمی کو اُردو افسانے میں زندہ رکھیں گے۔" ۳۱۳ے

قاسمی کے افسانوں میں ترقی پسند نسوانی کردار بھی دکھائی دیتے ہیں مثلاً افسانہ "میرا دیس" کی سونی کسان کی جوان بیٹی ہے جو زر خرید لونڈی کی طرح زمین دار کی خدمت کرتی ہے لیکن جب اس میں خود اعتمادی اور ذہنی بیداری کے عناصر پیدا ہوتے ہیں تو یہی خدمت گار کنیز افسانہ "ووٹ" کی حلیمہ اور "کہانی لکھی جا رہی ہے" کی فاطمہ بن جاتی ہے جو اپنا حق مانگتی ہے۔

قاسمی کے افسانوی کرداروں کا تعلق ماورائی دنیا سے نہیں بلکہ ہماری اسی سماجی زندگی سے متعلق ہے۔ ان کرداروں میں فطری ارتقا نظر آتا ہے۔ یہ ہر گھڑی تبدیلیوں اور مختلف تغیرات سے ہم کنار رہتے ہیں۔ یہ کردار زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو قبول بھی کرتے ہیں اور اس کے مطابق خود کو ڈھالتے بھی ہیں۔ ترقی پسند فکر کا پرتو بھی ہمیں انہی کرداروں میں ملتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانوی کردار تعصب، گروہ بندی، فتنہ و فساد کو ناپسند کرتے ہیں۔ امن کا پرچار کرنے والے یہ کردار ہر فرقے اور گروہ کے افراد سے یکساں محبت کرتے ہیں۔ یہ کردار جان دار اور موثر صورت میں سامنے آتے ہیں۔ غافر شہزاد، قاسمی کے افسانوی کرداروں کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"ندیم صاحب کے افسانوی کرداروں کی کئی پرتیں بنتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ کردار بہت جان دار اور موثر شکل میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔۔۔ عملی زندگی کے یہ کردار کوئی ایسے مافوق الفطرت یا اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے مسلح کردار نہیں ہیں کہ اس وجہ سے وہ مختلف اور منفرد قرار پاتے ہیں۔ بس ان کرداروں میں انسانی سطح پر جینے کے لیے اور مضر حالات میں لڑنے اور مقابلہ کرنے کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔" ۳۱۴ے

قاسمی نے خواتین کی نفسیاتی الجھنوں کو بھی فن کاری سے پیش کیا ہے۔ افسانہ "سناٹا" کی کلثوم جوانی کے بھرپور جذبات رکھتی ہے۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر، گھر کی ذمہ داریوں سے تنگ آ کر دیوانہ وار چیخنا بھی شروع کر دیتی ہے۔ جب اس کی ماں اسے کلثوم بیٹا یا میری مرد بیٹی کہہ کر پکارتی تو وہ یوں محسوس کرتی جیسے اس کی مونچھیں اُگ آئی ہیں۔ جب اس نے گھر میں اپنی شادی کا ذکر کیا تو جواب میں ماں کی گالیاں سنیں۔ اس کی ماں مردوں کے متعلق اسے بتاتی ہے:

"اری وہ لفنگا تو تجھے دو چار دن استعمال کر کے پھٹے جوتے کی طرح کوڑے پر ڈال دے گا۔ مجھ سے پوچھو ان مردوں کے چلن۔۔۔ تم لڑکیوں کو پڑھا لیتی ہو تو کیا ہوا میں پڑھی لکھی ہوتی تو میں بھی پڑھا لیتی۔ مرد نے تجھے پڑھایا تو ساری فارسیاں بھول جائے گی۔" ۳۱۵ے

جب کلثوم کی جذباتی وابستگی اسکول کے کلرک جمال سے ہو جاتی ہے۔ جب وہ گھر داماد بننے پر رضامند ہو جاتا ہے

تو کلثوم رشتے سے انکار کر دیتی ہے کیوں کہ اسے پناہ لینے والا نہیں بلکہ پناہ دینے والا انسان چاہیے۔ وہ اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہتی ہے:

> ''میں جمال سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی اور کلثوم نے اپنے اوپر کے ہونٹ والے روئیں چھو کر کہا ''میں مرد بن چکی ہوں!'' ۳۱۶

قاسمی کے افسانوں میں قصہ پن بھی موجود ہے اور کہیں کہیں ظرافت کی جھلک بھی نظر آتی ہے جو عموماً دیہاتیوں کی سادگی، لاعلمی یا المیہ کی جانب اشارہ کرتی ہے مثلاً ''ننھے نے سلیٹ خریدی'' میں جب ماں غصہ کی حالت میں اپنے بچے سے کہتی ہے کہ اب سوال سر پر نکالے گا تو ننھا نہایت معصومیت سے سوچتا ہے کہ ماں نہیں جانتی کہ سوال سلیٹ پر نکالے جاتے ہیں سر پر نہیں۔ ان کی کہانیوں میں دل چسپی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ ان کے طنزیہ وظریفانہ جملوں سے ناگواری یا بدمزگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اکثر نہایت لطیف حقائق بیان کر جاتے ہیں جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

قاسمی کے افسانوں کی کامیابی کا انحصار عمدہ اور برجستہ مکالموں میں بھی موجود ہے۔ وہ مکالمہ کا استعمال موقع ومحل کی مناسبت سے کرتے ہیں۔ ان کے مکالموں کا لب ولہجہ فطری ہے۔ سادگی و برجستگی ان کے مکالموں کی جان ہے۔ درج ذیل اقتباس سے جاگیردار کے ظلم وستم اور کسان کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے:

> ''ہل روک لو۔
> کون ہے؟ ہانپتا ہوا پیرو چلایا۔ اور سفیدوں کے پیچھے لپکا چلا گیا۔
> روک لو ہل۔ گرج دار آواز آئی۔
> ہل نہیں رُکے گا۔ پیرو چنگھاڑا۔
> میں کہتا ہوں روک لو ہل۔
> ہل نہیں رُکے گا، ہل رُکنے کے لیے پیدا نہیں ہوا، ہل چلتا رہے گا۔
> ہل اناج کا خالق ہے، ہل خدا کا اشارہ ہے۔
> میں کہتا ہوں روک لو ہل سُور کے بچے۔'' ۳۱۷

محبت کے گیت بھی پنجابی افراد کے جذبات و احساسات کے بہترین عکاس ہیں۔ ان گیتوں میں وصل و ہجر کی اذیتوں، محبّت کے جذبات، ساون کی بارشوں اور زندگی کی دیگر مسرتوں کی خواہش پائی جاتی ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں ماہیے ہمیشہ موقع ومحل کی مناسبت سے گائے جاتے ہیں۔ یہ ماہیا پنجاب کی ثقافتی زندگی کا جزو بنتا ہے؛ محفل کی رونق بڑھاتا ہے اور افسانے کی دل کشی میں اضافے کا موجب بھی بنتا ہے مثلاً ساون کے دنوں میں گاؤں کی چنچل دوشیزائیں پیا ملن کے گیت گنگناتی ہیں۔ وہ محبوب سے ملنے کی آس کو گیت کی صورت

میں کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں کہ یہ گیت دل کے تاروں کو چھو جاتے ہیں مثلاً:

اونچے بسنے والے پتیم آ جا میرے پاس
تجھ بن مجھ بے بس دکھیا کی ہر ہر سانس اُداس
کون بندھائے آس
پتیم
آ جا میرے پاس ۳۱۸؎

افسانہ ''سناٹا'' کا مرکزی کردار کلثوم نا آسودگی کا شکار ہے۔ انھوں نے شہری زندگی کے اشرافیہ کی روایتی اقدار کے سہارے زندگی بسر کرنے والے گھرانے کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے نسوانی کرداروں کی کیفیات کا گہری توجہ سے تجزیہ کر کے پیش کیا ہے۔ یہ کردار زندگی کے حسن اور معاشرے کی بدصورتیوں کو واضح انداز سے منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ یہ کردار اپنی آرزوؤں کو دل میں رکھتے، اپنی گھٹن، اپنی کمزوریوں، روحانی و مادی آسودگیوں کو معاشرے کے تئیں بیدار رکھتے ہیں۔ ان کے اکثر کردار مناظر سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ فاروق حسن "The Resthouse Ahmad Nadeem Qasmi" میں رقم طراز ہیں:

> "Qasimi's technique of characterization is fairly old fashioned, based on observing what the characters say or do within their web of relationships and recording the opinions ironic or otherwise, which the others form of them. Whether the story is located in a village or a city, character is always its most important and memorable constituent." ۳۱۹؎

قاسمی کے ابتدائی افسانوی مجموعوں میں مقصد اور موضوع کو اہمیت حاصل تھی لیکن تقسیم کے بعد کے افسانوں میں کرداروں نے مرکزی حیثیت اختیار کی۔ اگرچہ موضوع اور مقصد کو بھی نظر انداز نہیں کیا لیکن یہ سب کردار کی مرکزی حیثیت کے ساتھ ہی رو بہ عمل ہوا۔ قاسمی کے افسانوں میں کردار نگاری اور حقیقت نگاری کا فن بہت بالغ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کے افسانے ''الحمدللہ''، ''ثواب''، ''رئیس خانہ''، ''عالاں''، ''عاجز بندہ''، ''پرمیشر سنگھ'' اور ''گنڈاسا'' وغیرہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں دل چسپی اور تجسس کے عناصر نمایاں ہیں۔ افسانہ کی ابتدا، عروج اور اختتام میں ایک ربط اور تسلسل ہوتا ہے کہ قاری کی دل چسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں ایسے ان پڑھ کردار بھی ملتے ہیں جو دقیق، فلسفیانہ گفتگو کرتے ہیں جو کئی فلسفیانہ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے مطالعہ سے زندگی کی پیچیدہ گرہیں کھلتی ہیں۔ وہ معاشرے کی بدصورتی کو ملائمت سے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے متعلق واضح نکتہ نظر پیش کیا۔ محمد صادق "A History of Urdu Literature"

میں لکھتے ہیں:

"What makes these stories so effective is the author's reticence, the absence of comment or expression of opinion. A significant action, well described, is expressive enough. In many of his stories his attitude is ironical, taking may forms. Sometimes, it points out the disparity between things as they are and as they should be. This incongruity is seen in the callousness of the priest in Savab." ؎۳۲۰

قاسمی مظاہر فطرت کے حسن کی تصویر کشی اور جذبات و احساسات کو فنی حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے نظریہ فن کو نہایت مہارت سے ماحول کا حصہ بناتے ہیں کہ افسانے کی افسانویت مجروح نہیں ہوتی اور مسحور کن تاثر بھی قائم ہو جاتا ہے۔ قاسمی کے افسانوی کرداروں کے مکالمے دل کش ہیں۔ "Twentieth century of Urdu Literature" میں ہے کہ:

"Another strong point in his mastery of dialogue. His man and women talk in character which makes his stories sound real." ؎۳۲۱

قاسمی کے ڈرائیور عبدالغفار نے راقم الحروف کو انٹرویو دیتے ہوئے زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے قاسمی کے متعلق بتایا کہ ''انھوں نے اپنے افسانوں میں ایسے کرداروں کو منتخب کیا جو ہمارے مفلس افراد کی نمائندگی کرتے تھے اور جینے کا حوصلہ عطا کرتے تھے۔ ہم تو ان کے ماحول اور صورتِ حال کا حصہ تھے۔'' ؎۳۲۲

قاسمی کے افسانوں میں فنی در و بست بھی موجود ہے۔ وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یا کبھی واقعات کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے ایک لفظ یا ایک جملے کی تکرار سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ تکرار قاسمی کی فنی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔ جملوں کی خوب صورت تکرار اگرچہ قاسمی کے دیگر ہم عصروں کے فن میں مفقود ہے۔ افسانہ ''میں انسان ہوں'' میں پیاس اور ''انسان'' کے لفظوں کو بار بار دہرایا ہے مثلاً:

''آج ساری انسانیت پیاسی ہے اور میں بھی انسان ہوں۔ اس لیے میں بھی پیاسا ہوں۔'' ؎۳۲۳

''اور میں زمین پر پڑا ہوں، اس لیے کہ میری بنیادیں کمزور تھیں۔ اس لیے کہ میں انسان ہوں۔۔۔ اور میں پیاسا ہوں۔'' ؎۳۲۴

''مجھے پانی کی تلاش ہے۔ مجھے ایک زندگی کی تلاش ہے مگر میری تلاش بے کار ہے، کیوں کہ میں خدا کی محبوب ترین مخلوق ہوں۔۔۔ میں انسان ہوں۔'' ؎۳۲۵

تغیر وتبدل زندگی کا لازمی جز ہے۔شہری اور دیہی علاقے کی طرزِ بود و باش کا گہرا فرق ہے۔ گاؤں کو چھوڑ کر شہر میں سکونت اختیار کرنے والے کو جب گاؤں واپس آنے کا کہا گیا تو وہ کہنے لگا:

''گاؤں میں آ کر کیا کریں۔ مٹی کے برتنوں کا رواج اُٹھ رہا ہے۔ ہم خود چینی کے برتنوں میں چائے پیتے ہیں۔'' ۳۲۶

اسی طرح افسانہ ''گڑیا'' میں ''آنکھوں'' کے لفظ کی تکرار عمدہ معلوم ہوتی ہے:

''مگر آنکھیں کالی، بالکل بھک کالی ہوں۔'' ۳۲۷

''نیلی آنکھوں کی جگہ کالی آنکھیں لگا دیں، بھک کالی آنکھیں۔'' ۳۲۸

''اتنے گورے رنگ پر اتنی کالی آنکھیں۔'' ۳۲۹

اسی طرح ''ماسی گل بانو'' کے افسانے میں:

''تاجو جب ذرا سی بڑی ہوئی تو اس کی آواز میں پیتل کی کٹوریاں بجنے لگیں۔'' ۳۳۰

''تب پیتل کی کٹوریاں سی بجنے لگیں۔ زار زار روتی ہوئی تاجو دُلہن کی رخصتی کے گیت گانے لگی۔'' ۳۳۱

افسانہ ''پہاڑوں کی برف'' کے یہ جملے بہت خوب صورت لگتے ہیں:

''اس پر مجھے لگا کہ وہ ہنسی ہے، نہایت مختصر مگر نہایت سریلی ہنسی جیسے چینی کی پیالی کو چینی کی پیالی چھو جائے۔'' ۳۳۲

''اور پھر چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں۔'' ۳۳۳

''وہ بے اختیار چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجاتی دروازے میں سے نکل گئی۔'' ۳۳۴

قاسمی کے افسانوں میں الفاظ اور جملوں کی تکرار حسن بھی پیدا کرتی ہے اور ایک ہی جملے میں ایک لفظ کو ایک سے زائد بار استعمال کرنے سے باہم ربط پیدا ہوتا ہے جو قاسمی کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔

قاسمی کا اسلوب دل کش ہے۔ ان کے اسلوب کے متعلق چوہدری شوکت علی رقم طراز ہیں:

"Ahmad Nadeem Qasmi is a master of style. He knows how to use words and phrases to best advantage." ۳۳۵

اگرچہ تشبیہات و استعارات کا شاعری میں دخل ہے لیکن قاسمی اپنے اسلوب کو دل فریب بنانے کے لیے تشبیہات و استعارات کا بھی برمحل استعمال افسانے میں کرتے ہیں۔ قاسمی کی تشبیہات و استعارات میں حقیقت

کے ساتھ ساتھ زندگی کی دل آویزی بھی پائی جاتی ہے۔ ایسی تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے جو قاری کو اپنے سیل رواں میں بہالے جاتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کی مثالیں پیش خدمت ہیں:

''مسجد کے مینار پر چیل پر سمیٹے کھلونے کی طرح بے حس بیٹھی تھی۔ بچے تو پیسے لے کر تتلیوں کی طرح مہین پگڈنڈیوں پر اُڑتے ہوئے گاؤں کو بھاگ گئے۔'' ۳۳۶

ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

''جب قاسمی دیہی پس منظر میں افسانہ تحریر کرتے ہیں تو موقع محل اور دیہی فضا سے ہم آہنگ تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں جو ان کی فن کاری کی دلیل ہے۔'' ۳۳۷

دانائی وحکمت ایسا خزانہ ہے جو وقت کی قیود سے پاک ہے۔ یہ لوگوں کے دل و روح کے سچے ترجمان ہوتے ہیں۔ مختصر جملوں میں بڑی حقیقتیں سمونا قاسمی کا خاصہ ہے۔ قاری ان معصوم دیہاتیوں کے جملوں میں مخفی رمزیہ فقروں اور فلسفیانہ نکات سے حیران ہوتا ہے مثلاً ''ہرجائی'' اور ''وہ جا چکی تھی'' میں ایک خاتون بادلوں کے متعلق کہتی ہے کہ جب پورے بادل برستے ہیں تو اولے برسانے کے ساتھ ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح جب عبداللہ بھیک مانگ کر چار روٹیاں اور چار آنے لے کر کانپتا ہوا بیوی کے پاس آتا ہے تو وہ پوچھتی ہے:

''کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے۔ پہلے تم خون پسینا بیچ کے روٹی لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہی کا ہے۔'' ۳۳۸

اسی طرح افسانہ ''کہانی لکھی جا رہی تھی'' کا مرکزی کردار کہتا ہے:

''مستقبل میرا یا تمہارا نہیں، چراغ کا ہے۔ ہم تم تو وقت کے ریلے میں بہتے ہوئے سکتے ہیں۔ ہوا کے بہاؤ میں گھرے ہوئے کوئل کے نوچے ہوئے پر ہیں۔'' ۳۳۹

قاسمی نے اپنی ثقافت، روایات اور فطرت سے تعلق مضبوط رکھا۔ انھوں نے انسانی زندگی پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر زندگی پر اثر انداز ہونے والے عناصر سے اپنا رشتہ کمزور نہیں کیا۔ وہ گرد و پیش کے عناصر مثلاً کھیتوں کی پگڈنڈیاں، ندی نالے اور دشت وصحرا وغیرہ یہ مناظر فطرت ان کی کہانیوں میں مثبت امکانات پیدا کرتے ہیں۔ یہی خوب صورت منظر نگاری افسانے کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔ مناظر فطرت کی طرح ''بادل'' کا تذکرہ بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ درج ذیل اقتباسات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قاسمی نے بادلوں کا تذکرہ کیسے اور کن کن مواقع پر کیا ہے:

''بادلوں کے دو چار گول گول ٹکڑے مشرق میں پربت پر منڈلا رہے تھے۔ اُبھرتے ہوئے سورج کی لرزتی ہوئی کرنوں سے ان پر لحہ لحہ گلابیاں دوڑی جا رہی تھیں۔'' ۳۴۰

''مصیبتوں کا کیا ہے، بھادوں کے بادلوں کی طرح آتی ہیں اور گزر بھی جاتی ہیں۔'' ۳۴۱

''اچھا تو اس پری کی کہانی سنو گے جس نے بادلوں کا لباس پہنا۔ اس پر کرنوں کی کناری ٹانکی۔'' ۳۴۲

''اچانک بادل اس زور سے ٹکرائے جیسے بے جان ہو کر زمین پر آ رہیں گے۔'' ۳۴۳

مندرجہ بالا اقتباسات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ چلتے پھرتے، اٹکھیلیاں کرتے، مچلتے، دھوم مچاتے، گرجتے برستے، ناچتے بادل قاسمی کی جذباتی اور تخیلاتی دنیا میں ایک ہلچل مچا دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کی مصوری کے ساتھ ساتھ دیہات کے پیڑ، گھر، کھلیان، چراگاہیں، دریا، چشمے، پہاڑیاں اور برسات وغیرہ سب ملتے ہیں۔

قاسمی کے افسانوں میں جہاں بھوک، مفلسی اور ناداری کا ذکر ملتا ہے وہاں قاسمی کی فطری شعریت اور خوشاب کے پہاڑوں سے روحانی اُنسیت کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ وہ ایک رومانی ادیب کی طرح فطرت کے مناظر سے اپنے افسانوں کو مزین کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خوب صورت منظر نگاری موجود ہے۔

''اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جمے ہوئے ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جس کے ٹخنوں سے لپٹی جھانجنیں ہر قدم پر ایک دل آویز جھنا کا پیدا کرتی ہیں جس کی ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل ہے، اپنی پیلی چھینٹ کے لہنگے سے اس کے زخم دھو رہی ہے۔'' ۳۴۴

بعض اوقات افسانوں میں ایسی شاعرانہ اور مسحور کن فضا پیدا ہوتی ہے جس کے مطالعہ سے قاری کا دل جھوم جاتا ہے۔ قاسمی جب زمانے کے اقتصادی، سماجی اور معاشرتی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ ہنگامہ خیز زندگی سے نکل کر فطرت کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں جہاں فطرت ان کو لوریاں سناتی اور ان کے لیے ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہے:

''زرد چاند دُور مغرب میں اُفق کے قریب اونگھ رہا تھا اور موٹے موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔۔۔ ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی تھی۔۔۔ صبح کا ستارہ مشرقی افق پر کسی سانولی دُلہن کے ماتھے کی طرح چمک رہا تھا۔'' ۳۴۵

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدرتی مناظر قاسمی کے ہم نوا ہیں؛ وہ ان سے محوِ گفتگو ہیں؛ ان کے دل کی آواز کو سنتے ہیں اور یہی مناظر فطرت ایسے معلم کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں جو قاسمی کو درسِ حیات دیتے ہیں اور ان کے دل میں جاگزیں ہو کر فرحت اور انبساط کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ محمد عالم خاں اپنے مضمون ''احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری'' میں لکھتے ہیں کہ ''ندیم فطرت نگاری سے اپنے افسانوں میں دل کشی اور حسن پیدا کرتے ہیں۔''۳۴۶ فطری مناظر کی عمدہ عکاسی گاؤں کی معاشرتی زندگی میں نمایاں ہے۔ یہ فطرت نگاری ان کے افسانوں میں دل کشی پیدا

''گنڈاسا'' اور ''آتش گل'' موضوع فن اور شخصیت کی ہم آہنگی اور رچاؤ کے مظہر بھی ہیں
اور فنی انہاک توجہ اور حسن بیان کے لطیف پیکر بھی۔'' ۳۵۰

قاسمی ان افسانوں کے ذریعہ سیاسی، معاشی اور تہذیبی عصری حالات و واقعات کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی صداقتوں کو جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے دور کے تمنائی ہیں جہاں ہر سو محبت کا پہرہ ہو۔ نازیہ بشیر لکھتی ہیں ''وہ ایک ایسے دور کے خواہشمند ہیں جہاں ہر طرف امن و آشتی کا پہرہ ہو۔ کوئی جاگیردار کسی مزارع کا حق نہ لوٹے، کوئی اعلیٰ طبقے کا فرد کسی ادنیٰ طبقے کے فرد کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچلنے کی کوشش نہ کرے۔'' اسلوب احمد انصاری قاسمی کے فنِ افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنے مضمون ''احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ'' میں رقم طراز ہیں:

''ندیم قاسمی اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور بے جھجک اور انسانی فطرت کے پیچ وخم سے ان کی واقفیت بڑی دُور رس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگیں پردہ نہیں ڈالتے اور انسانوں کے عصری محرکات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ جنس سے ان کی دل چسپی معمول کے مطابق ہے۔ اس میں مریضانہ لذت اندوزی نہیں۔ ان کے یہاں طنز کے چھینٹے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں مگر یہ طنز ایسا نہیں جو مردم آزادی کی سرحدوں کو چھو لے۔ ان کے نقطۂ نظر میں اعتدال اور سلامت روی اور ان کے لہجے میں نرمی، شائستگی اور حلاوت ملتی ہے جو برسوں کے عمل صیقل اور کام و دہن کی ہر آزمائش سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔'' ۳۵۱

قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کی دھرتی کی خوش بو اپنے رنگ بکھیرتی ہے۔ وہ انسانی جذبات کو فطری انداز اور تخلیقی آہنگ میں پیش کرتے ہیں۔ زندگی جس روپ میں ان کے سامنے آئی انھوں نے من وعن پیش کر دیا۔ ان کے ہاں انسان اور انسانیت کی آواز ایک صدائے بازگشت بن جاتی ہے، لیکن قاسمی اپنے شدید احساس بصیرت، گہری نظر اور تخیل بلند کی بنا پر زندگی کے سمندر سے حقائق کے موتی تلاش کر لیتے ہیں جن سے مفر ممکن نہیں۔ بقول شہاب صفدر:

''ان کے افسانوں میں گھر سے گھر تک کا ماحول بھی ہے اور گردوپیش کے سنگین حقائق بھی۔ دُور دُور تک کہیں کپاس کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور کہیں نیلے پتھر اپنے رنگ بکھیرے ہوئے ہیں۔'' ۳۵۲

اردو ادب کی شناوری کی جائے تو ایسے ادیب مل جائیں گے جنھوں نے مناظر فطرت کو خوب صورت آب دار موتیوں سے مزین کیا۔ قاسمی بھی اپنے افسانوں کو خونِ جگر دے کر رنگین بناتے ہیں۔ ان کا کمالِ فن ہے کہ ان کی تصویریں بولتی، ہنستی اور آنسو بہاتی ہیں۔ ان کے افسانے ہمارے معاشرے کے حسن و قبح کا عکسِ جمال ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خلیق احمد خلیق، یادگار انٹرویو، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، جلد ۳۰، شمارہ ۵۸، جنوری، فروری ۱۹۷۵ء، ص ۲۶۷

۲۔ اصغر عبداللہ (انٹرویو)، ایک عہد ختم ہوا، مشمولہ ماہنامہ دنیائے ادب، کراچی، ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۳۳

۳۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۸

۴۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع وغروب، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۳۰

۵۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۹

۶۔ ایضاً، ص ۲۵۲

۷۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۶

۸۔ احمد ندیم قاسمی (دیباچہ)، مشمولہ طلوع وغروب از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا ۴، ص ۱۲

۹۔ انور سدید، فکر و خیال، سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۴۴

۱۰۔ شہاب صفدر، کوئی میر ہو کہ ندیم ہو، مشمولہ ماہنامہ بیاض، لاہور، جلد ۱۴، شمارہ ۱۱، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۸

۱۱۔ وقار عظیم، نیا افسانہ، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۶

۱۲۔ انور سدید، فکر و خیال، محولہ بالا ۹، ص ۲۴

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۷

۱۴۔ انور سدید، فکر و خیال، محولہ بالا ۹، ص ۲۴

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، سیلاب و گرداب، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۶۴

16. The Oxford India Anthology of Modern Urdu Literature, Edited by Mehr Afshan Farooqi, 2008, Oxford University Press, Page No.85

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۲۔۱۳۳

۱۸۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵۸

۱۹۔ عباس طوروی، احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۵

۲۰۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، محولہ بالا ۱۳، ص ۷

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، محولہ بالا ۷، ص ۱۶۸

۲۲۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۶

۲۳۔ ڈاکٹر انور سدید، فکر و خیال، محولہ بالا ۹، ص ۴۲

۲۴۔ ڈاکٹر پروین اظہر، اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، طبع اوّل ۲۰۰۰ء، ص ۴۸۰

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، سیلاب و گرداب، محولہ بالا ۱۵، ص ۶۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۷۱

۲۷۔ عباس طوروی، احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک، محولہ بالا ۱۹، ص ۶۵

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵، ص ۱۱۰

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی (اداریہ)، سہ ماہی فنون، لاہور، شمارہ ۱۲۳، جنوری تا اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۱۷

۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۴۶

۳۱۔ ڈاکٹر آغا سلمان باقر، پاکستانی کہانیوں کے افسانوں کا مطالعاتی اور تنقیدی جائزہ، لاہور، ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۴۰

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۲

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۲۴۹

۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۹۹

۳۷۔ سیما صغیر، منفرد افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، جلد ۴۷، شمارہ ۲، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵

۳۸۔ حسن عسکری کاظمی، احمد ندیم قاسمی۔ تخلیقی سرچشموں کا نشانِ امتیاز، مشمولہ ماہنامہ ادب دوست، لاہور، جلد ۱۲، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۴۲، ۴۳

۳۹۔ ڈاکٹر سہیل احمد، مشمولہ احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری از غلام حسین ورک، غیر مطبوعہ مقالہ ایم۔اے اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۷

۴۰۔ سید وقار عظیم، نیا افسانہ، محولہ بالا ۱۱، ص ۱۷۲

۴۱۔ احمد ندیم قاسمی (دیباچہ)، سیلاب و گرداب، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۴۳ء

۴۲۔ قاسمی سے انٹرویو، مشمولہ ندیم نامہ، مرتبہ اسلم فرخی، کراچی، ادارہ تصنیف و تالیف، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۱

۴۳۔ جمیل ملک، ندیم کی شاعری، راول پنڈی، نوید پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء، ص ۴۳، ۴۷

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، کوہ پیما، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۷

۴۵۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳

۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۵، ص ۱۲۲، ۱۲۳

۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۱۳۷

۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا ۳۴، ص ۱۹۱

۴۹۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، محولہ بالا ۲، ص ۲۳۵

۵۰۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۴

۵۱۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۵، ص ۵۱

۵۲۔ احمد ندیم قاسمی، برگ حنا، محولہ بالا ۱۳، ص ۵۸

۵۳۔ اسلوب احمد انصاری، احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ، مشمولہ ندیم نامہ، مرتبہ اسلم فرخی، کراچی، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۸

54- Sajjad Sheikh, Selected poems of Ahmad Nadeem Qasmi, Islamabad, Alhamra, 2004, Page No.xii

۵۵۔ ڈاکٹر محمد صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، دہلی، اردو مجلس، ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۵

۵۶۔ ڈاکٹر قاسم ظفر خان، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، بہار، ڈاکٹر قاسم ظفر، مئی ۱۹۹۶ء، ص ۴۴

۵۷۔ پروفیسر غلام رسول تنویر، اکیلا کولمبس، مشمولہ ماہ نامہ افکار، کراچی، محولہ بالا ۱، ص ۳۵۰

۵۸۔ محمد عباس طوروی، احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک، محولہ بالا ۱۹، ص ۴۰

۵۹۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۶۲

۶۰۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۸

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا ۵۹، ص ۶۲، ۶۳

۶۴۔ محمد سرور اعوان، وادی سون سکیسر، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۳

۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۶۰

۶۶۔ ایضاً

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۸۶

۶۸۔ الطاف حسین قریشی، احمد ندیم قاسمی سے انٹرویو، مشمولہ ادبی مکالمے، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۴۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۵۳

۷۰۔ خالد سہیل، احمد ندیم قاسمی سے انٹرویو، مشمولہ ماہنامہ بیاض، لاہور، جلد ۱۴، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۷

۷۱۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۷

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۷۴۔ پروفیسر فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی کا قومی و ملی طرز احساس، مشمولہ ماہنامہ احساس، پشاور، ستمبر نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۴

۷۵۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۲۳۹

۷۶۔ پروفیسر فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی کا ملی طرز احساس، مشمولہ ماہنامہ احساس، پشاور، محولہ بالا ۷۴، ص ۱۷

۷۷۔ فتح محمد ملک، مرتبہ، جب بادل اُمڈے، اسلام آباد، شفیق ناز الحمد پبلشنگ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵

۷۸۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا ۵۹، ص ۱۴۷

۷۹۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا ۳۴، ص ۱۵۰، ۱۵۱

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۸۱۔ ڈاکٹر قمر رئیس، افسانہ نگار ندیم، مشمولہ ماہ نامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱، ص ۳۷۱

۸۲۔ غافر شہزاد، ندیم کے افسانوی کردار، لاہور، ادراک پبلشرز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵، ۱۶

۸۳۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۸۷

۸۴۔ ایضاً

۸۵۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، محولہ بالا ۶، ص ۸۳

۸۶۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا ۶۰، ص ۱۴۷، ۱۴۸

۸۷۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۰

۸۸۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۹۴

۸۹۔ ایضاً، ص ۹۶

۹۰۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۹۶

۹۱۔ ایضاً، ص ۹۷

۹۲۔ ڈاکٹر افشاں ملک، افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، شمارہ ۹، جون ۲۰۱۰ء، ص ۲۷

۹۳۔ رابعہ اختر، احمد ندیم قاسمی کے نسوانی کرداروں کا جائزہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۹۹

۹۴۔ احمد ندیم قاسمی، کوہ پیما، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

۹۵۔ پیرزادہ محمد بخش، شاہ، مشمولہ سہ ماہی عبارت، حیدر آباد، خصوصی شمارہ ۵، ۶، مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۸۰

۹۶۔ الطاف حسین قریشی، احمد ندیم قاسمی سے انٹرویو، مشمولہ ادبی مکالمے، محولہ بالا ۶۸، ص ۴۹، ۵۰

۹۷۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۴۴

۹۸۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا ۵۹، ص ۵۰

۹۹۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا۵۹، ص۴۷

۱۰۰۔ ایضاً، ص۲۳

۱۰۱۔ ایضاً، ص۲۹

۱۰۲۔ شیخ محمد غیاث الدین، ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۱ء، ص۱۹۴

۱۰۳۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا۴۴، ص۱۹

۱۰۴۔ ایضاً، ص۲۷

۱۰۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، کپاس کا پھول، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا۱، ص۴۷۲

۱۰۶۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا۵۹، ص۴۶

۱۰۷۔ ایضاً

۱۰۸۔ ایضاً

۱۰۹۔ ایضاً

۱۱۰۔ ایضاً

۱۱۱۔ ایضاً

۱۱۲۔ فتح محمد ملک، جب بادل اُمڈے، اسلام آباد، شفیق ناز، الحمرا پبلشنگ، ۲۰۰۲ء، ص۱۹

۱۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا۵۹، ص۲۹

۱۱۴۔ ایضاً

۱۱۵۔ شیخ محمد غیاث الدین، ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ، محولہ بالا۱۰۲، ص۱۹۶

۱۱۶۔ ممتاز شیریں، معیار، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء، ص۲۴

۱۱۷۔ الطاف حسین قریشی، احمد ندیم قاسمی سے ایک انٹرویو، مشمولہ ادبی مکالمے، محولہ بالا۶۸، ص۴۷، ۴۸

۱۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، محولہ بالا۵۰، ص۱۵۳

۱۱۹۔ ایضاً، ص۱۵۸

۱۲۰۔ پروفیسر فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا۶۰، ص۶۲، ۶۳

۱۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا۵۹، ص۸۶

۱۲۲۔ پروفیسر فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا۶۰، ص۱۳۲

۱۲۳۔ ایضاً، ص۲۲۰

۱۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا۴۵، ص۶۳، ۶۴

۱۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۲۴۲

۱۲۶۔ ایضاً

۱۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۳۳

۱۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، کوہ پیما، محولہ بالا ۴۴، ص ۲۲، ۲۳

۱۲۹۔ پروفیسر فتح محمد ملک (مرتبہ)، جب بادل اُمڈے، محولہ بالا ۷۷، ص ۲۹

۱۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۳۵

۱۳۱۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف، احمد ندیم قاسمی۔ ایک ہمہ جہت، مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو، لاہور، جلد شمارہ ندارد، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۳۸

۱۳۲۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۲۹، ۱۳۰

۱۳۳۔ ایضاً

۱۳۴۔ انور سدید، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، لاہور، ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۶۵

۱۳۵۔ طاہرہ اقبال، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات نگاری، مشمولہ سہ ماہی معاصر، لاہور، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۱

۱۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع وغروب، محولہ بالا ۴۱، ص ۱۰۰

۱۳۷۔ ڈاکٹر انوار احمد، احمد ندیم قاسمی اردو افسانے کی تاریخ کا اہم کردار، مشمولہ ندیم نامہ از اسلم فرخی، محولہ بالا ۵۳، ص ۱۴۴

۱۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۹، ۲۰

۱۳۹۔ ڈاکٹر شفیق انجم، اردو افسانہ، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۶

۱۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع وغروب، محولہ بالا ۴۱، ص ۱۴۳

۱۴۱۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۱۴۲۔ منصورہ احمد، منصور آفاق، مرتبہ گل پاشی، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۴

۱۴۳۔ محمد الیاس میراں پوری، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی فکری جہت، مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، جلد ۲۵، شمارہ ۲، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

۱۴۴۔ غلام حسین ورک، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے اردو، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۷۴

۱۴۵۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۱۱۱

۱۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱۱، ص ۲۳

۱۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، کوہ پیما، محولہ بالا ۴۴، ص ۱۱۳

۱۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱۱، ص ۲۳

۱۴۹۔ صلاح الدین حیدر، سناٹا میں جینے والے لوگ، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، شمارہ ۳۰، ستمبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء، ص ۵۴

۱۵۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، احمد ندیم قاسمی۔انسانیت کا نمائندہ، مشمولہ ادب وفن، لاہور، مغربی پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۸۳،۸۴

۱۵۱۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۶۸

۱۵۲۔ ایضاً، ص ۹۳

۱۵۳۔ فرمان فتح پوری، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۴۱

۱۵۴۔ انیس ناگی، پاکستانی اردو ادب کی تاریخ، لاہور، جمالیات، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۸

۱۵۵۔ کرشن چندر (دیباچہ)، بگولے از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا ۱۷، ص ۹

۱۵۶۔ ایضاً

۱۵۷۔ راقم الحروف، استفسار از ڈاکٹر سعادت سعید بمقام گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور، مورخہ ۲۸ر جون ۲۰۱۰ء

۱۵۸۔ ریاض احمد شیخ، افلاس ناہمواری اور ترقی کا تصور، لاہور، فکشن ہاؤس، بار اول ۲۰۰۶ء، ص ۳۸

۱۵۹۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۹۱

۱۶۰۔ محمد عباس طوروی، احمد ندیم قاسمی اور رومانیت، مشمولہ مونتاج، شمارہ ۹، جون ۲۰۱۰ء، ص ۵۷

۱۶۱۔ اصغر عبداللہ، ایک عہد ختم ہوا، مشمولہ ماہنامہ دنیائے ادب، کراچی، ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۸

۱۶۲۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع وغروب، محولہ بالا ۴، ص ۹۳

۱۶۳۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، محولہ بالا ۶، ص ۹۲

۱۶۴۔ ایضاً

۱۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۲۳

۱۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۳۷،۱۳۹

۱۶۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر، نیلا پتھر، مشمولہ ماہنامہ بیاض، لاہور، جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۱۱، نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۱

۱۶۸۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، اردو افسانہ تعبیر وتنقید، محولہ بالا ۲۲، ص ۱۲۳

۱۶۹۔ ریاض احمد شیخ، افلاس سماجی ناہمواری اور ترقی کا تصور، محولہ بالا ۱۵۸، ص ۴۰،۴۱

170 Afsar Sajjid, Profiles and Dialogues, Abdul Jabbar, 2005, Page No. 22

۱۷۱۔ صلاح الدین درویش، انسان دوستی نظریہ اور تحریک، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۸

۱۷۲۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۱۱۰

۱۷۳۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی ایک لیجنڈ، لاہور، مکتبہ اساطیر، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲

۱۷۴۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع وغروب، محولہ بالا ۴، ص ۵۴

۱۷۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۸

۱۷۶۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا ۵۹، ص ۹

۱۷۷۔ ایضاً

۱۷۸۔ خلیق احمد خلیق، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ماہ نامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱۱، ص ۲۶۶

۱۷۹۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب و فن، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، ۱۹۷۵ء، ص ۸۲،۸۱

۱۸۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مشمولہ ندیم نامہ مرتبہ محمد طفیل بشیر موجد، لاہور، مجلس اربابِ فن، ۱۹۷۶ء، ص ۲۱۶،۲۱۵

۱۸۱۔ سید وقار عظیم (دیباچہ)، بازارِ حیات، محولہ بالا ۳۴

۱۸۲۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا ۶۰، ص ۱۹۰

۱۸۳۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، محولہ بالا ۶، ص ۱۸۱

۱۸۴۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا ۶۰، ص ۱۹۱

۱۸۵۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا ۳۴، ص ۴۳

۱۸۶۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا ۳۴، ص ۵۱

۱۸۷۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۵، ص ۴۸

۱۸۸۔ سید وقار عظیم، ندیم کے افسانے، سناٹا کے بعد، مشمولہ ماہ نامہ عبارت (ندیم ایڈیشن)، حیدرآباد، شمارہ ۶،۵، اکتوبر تا مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۶،۱۱۵

۱۸۹۔ احمد ندیم قاسمی، آنچل، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۶۴

۱۹۰۔ ایضاً، ص ۸۵

۱۹۱۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، محولہ بالا ۵۰، ص ۴۹

۱۹۲۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، محولہ بالا ۱۳، ص ۸۳

۱۹۳۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۶۸

۱۹۴۔ ایضاً، ص ۲۵۲

۱۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۸، ص ۴۸

۱۹۶۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا ۵۱، ص ۹۳

۱۹۷۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۸، ص ۱۵۹

۱۹۸۔ ایضاً، ص ۱۶۳،۱۶۲

۱۹۹۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۸۱

۲۰۰۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۸، ص ۲۱۳

۲۰۱۔ شہلا کشور، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ عالمی اردو ادب مرتبہ نند کشور وکرم، دہلی، جلد ۱۴، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۸

۲۰۲۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۳۴

۲۰۳۔ انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۱۹۹۸ء، ص ۴۷۹

۲۰۴۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۲۷

۲۰۵۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۳۳

۲۰۶۔ احمد ندیم قاسمی، سیلاب و گرداب، محولہ بالا ۱۵، ص ۵۸

۲۰۷۔ ایضاً، ص ۵۹

۲۰۸۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۴۷

۲۰۹۔ ایضاً، ص ۷۸

۲۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۸، ۱۲۹

۲۱۱۔ افروز اسماعیل، ترقی پسند افسانہ نگاروں میں رومانوی جمالیات کے عناصر، ملتان، کاروان ادب، ۱۹۹۸ء، ص ۹۳

۲۱۲۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، آج کا اردو ادب، کراچی، رہبر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۵

۲۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۳۲

۲۱۴۔ ایضاً

۲۱۵۔ سید وقار عظیم، نیا افسانہ، محولہ بالا ۱۱، ص ۱۶۸، ۱۶۹

۲۱۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اردو افسانے کے تین دور، مشمولہ تنقید و احتساب، لاہور، جدید ناشرین، ۱۹۶۸ء، ص ۳۸

۲۱۷۔ ڈاکٹر محمد عالم، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، سن ندارد، ص ۱۹۹

۲۱۸۔ اسلوب احمد انصاری، احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱، ص ۳۱۲

۲۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۳۴

۲۲۰۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، محولہ بالا ۵۰، ص ۱۶۲

۲۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع و غروب، محولہ بالا ۴۱، ص ۲۴، ۲۵

۲۲۲۔ ایضاً

۲۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۲۴۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء، ص ۳۶۶

۲۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، آنچل، محولہ بالا ۱۸۹، ص ۹۰

۲۲۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، خودکشی ایک نفسیاتی مطالعہ، مشمولہ ہماری جنسی و جذباتی زندگی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۷

۲۲۷۔ ایضاً، ص ۱۷۸،۱۷۷

۲۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، کوہ پیما، محولہ بالا ۴۴، ص ۴۷

۲۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۴۲

۲۳۰۔ پروفیسر وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، لاہور، جمہور پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۰، ۱۶۱

۲۳۱۔ احمد ندیم قاسمی، گرداب، حیدرآباد دکن، ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۲ء، ص ۱۹۷

۲۳۲۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۷۳

۲۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۴۹، ۵۰

۲۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۹

۲۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۸۰

۲۳۶۔ ایضاً

۲۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۷۴، ۷۵

۲۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، محولہ بالا ۶، ص ۹۱

۲۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۴۱

۲۴۰۔ ایضاً

۲۴۱۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا ۳۴، ص ۹۵

۲۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۲۰۱

۲۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱، ص ۸۹، ۹۰

۲۴۵۔ ایضاً

۲۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، محولہ بالا ۵۰، ص ۶۹

۲۴۷۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا ۶۰، ص ۱۵۷

۲۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، چند یادیں، مشمولہ افکار، کراچی، محولہ بالا ۱، ص ۹۰

۲۴۹۔ احمد ندیم قاسمی (دیباچہ)، جلال و جمال، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۲۰۰۰ء، ص ۸

۲۵۰۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۵۶

۲۵۱۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۲۵۲۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، محولہ بالا ۶، ص ۱۹۶

۲۵۳۔ پروفیسر فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا ۶۰، ص ۱۶۲

۲۵۴۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۹۷، ۹۸

۲۵۵۔ بشریٰ شیرازی، سناٹا از احمد ندیم قاسمی کا فکری و فنی جائزہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے اردو، گورنمنٹ مدینہ ٹاؤن کالج، فیصل آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۷

۲۵۶۔ الطاف حسین قریشی، احمد ندیم قاسمی سے انٹرویو، مشمولہ ادبی مکالمے، محولہ بالا ۶۸، ص ۴۳

۲۵۷۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا ۶۰، ص ۱۶۷

۲۵۸۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۶۷

۲۵۹۔ احمد ندیم قاسمی، آنچل، محولہ بالا ۱۸۹، ص ۵۷۔۵۸

۲۶۰۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۵۶، ۱۵۷

۲۶۱۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، محولہ بالا ۱۳، ص ۳۲

۲۶۲۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۴۰

۲۶۳۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۷۴

۲۶۴۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، محولہ بالا ۱۳، ص ۶۸

۲۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، محولہ بالا ۵۰، ص ۶۸

۲۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، محولہ بالا ۱۳، ص ۱۶۵، ۱۶۶

۲۶۷۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۰۱

۲۶۸۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۵۳

۲۶۹۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۴۰

۲۷۰۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، محولہ بالا ۲۲۴، ص ۳۳۹

۲۷۱۔ مشتاق احمد بیگ، اردو افسانے میں بچوں کے کردار کا سماجی و نفسیاتی مطالعہ، لاہور، محبوب پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۷

۲۷۲۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۹۳

۲۷۳۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۷۴۔ ڈاکٹر افشاں ملک، افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی آثار و افکار، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۹

۲۷۵۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۰۳

۲۷۶۔ احمد ندیم قاسمی، آنچل، محولہ بالا ۱۸۹، ص ۷۷

۲۷۷۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۱۲۲

۲۷۸۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۴۷

۲۷۹۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع وغروب، محولہ بالا ۴، ص ۱۱۸

۲۸۰۔ ڈاکٹر سلیم اختر، احمد ندیم قاسمی کے افسانے، مشمولہ افسانہ حقیقت سے علامت تک، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۹

۲۸۱۔ ڈاکٹر عصمت جمیل، اردو افسانہ اور عورت، ملتان، زکریا یونی ورسٹی، طبع اوّل ۲۰۰۱ء، ص ۷۹

۲۸۲۔ اصغر عبداللہ، مصاحبہ بعنوان احمد ندیم قاسمی کے منفرد خیالات، مشمولہ سہ ماہی سورج، لاہور، شمارہ ۱۵، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۶۱۴

۲۸۳۔ مصاحبہ بعنوان احمد ندیم قاسمی سے مسرور احمد زئی کا انٹرویو، مشمولہ سہ ماہی عبارت (ندیم نمبر)، محولہ بالا ۹۵، ص ۵۵

۲۸۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کا افسانوی ادب، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱۳

۲۸۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، کپاس کا پھول، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱، ص ۴۷

۲۸۶۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، احمد ندیم قاسمی سے انٹرویو، مشمولہ ندیم نامہ، محولہ بالا ۵۳، ص ۱۵۵

۲۸۷۔ فرمان فتح پوری، قومی شعور کے داعی احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ندیم نامہ مرتبہ اسلم فرخی، محولہ بالا ۵۳، ص ۱۱۸

۲۸۸۔ منشایاد، احمد ندیم قاسمی کے افسانے، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، خصوصی شمارہ، دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۸۸

۲۸۹۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا ۱۷۹، ص ۲۳۵، ۲۳۷

۲۹۰۔ ایضاً

۲۹۱۔ احمد ندیم قاسمی، میرا نظریہ فن، مشمولہ ندیم نامہ مرتبہ محمد طفیل بشیر موجد، لاہور، مجلس ارباب فن، ۱۹۷۶ء، ص ۳۴۱

۲۹۲۔ ڈاکٹر افشاں ملک، افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی، مشمولہ سہ ماہی موستاج، محولہ بالا ۹۲، ص ۳۵

۲۹۳۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۱۹، ۲۰

۲۹۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۱۳۲

۲۹۶۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، محولہ بالا ۳۴، ص ۱۲۷، ۱۲۸

۲۹۷۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، محولہ بالا ۵۰، ص ۳۶

۲۹۸۔ ایضاً، ص ۴۴

۲۹۹۔ ایضاً، ص ۹۱

۳۰۰۔ ایضاً، ص ۹۶

۳۰۱۔ ایضاً

۳۰۲۔ ایضاً، ص ۹۷

۳۰۳۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر و افسانہ نگار، محولہ بالا ۶۰، ص ۱۸۰

۳۰۴۔ احمد ندیم قاسمی، سیلاب و گرداب، محولہ بالا ۱۵، ص ۸۱

۳۰۵۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳۱، ص ۸۶

۳۰۶۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۵، ص ۸۱

۳۰۷۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، محولہ بالا ۵۰، ص ۳۶

۳۰۸۔ محمد عباس طوروی، احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک، محولہ بالا ۱۹، ص ۲۳

۳۰۹۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۶۳

۳۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۵، ص ۱۳۵، ۱۳۶

۳۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳۱، ص ۹۳

۳۱۲۔ ڈاکٹر محمد عالم، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، مشمولہ ماہ نامہ بیاض، لاہور، جلد ۱۷، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۳۳

۳۱۳۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے، محولہ بالا ۲۲، ص ۲۳۹

۳۱۴۔ غافر شہزاد، ندیم کے افسانوی کردار، محولہ بالا ۸۲، ص ۱۲

۳۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، مشمولہ جب بادل اُمڈے، مرتبہ فتح محمد ملک، محولہ بالا ۷۷، ص ۲۲۱

۳۱۶۔ ایضاً، ص ۲۲۴

۳۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، محولہ بالا ۲۸، ص ۶۳، ۶۴

۳۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۹۷

319- Farooq Hussain (Translated), The Resthouse, Katha New Delhi, 2003, Page No.31

320- Muhammad Sadiq, A History of Urdu Literature, Oxford University, New York, 1985, Page No.589

۳۲۱۔ ایضاً، ص ۳۱۳

۳۲۲۔ راقم الحروف، استفسار از عبدالغفار، بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۲۴ نومبر ۲۰۱۰ء

۳۲۳۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا ۵۹، ص ۱۰

۳۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱

۳۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳۱، ص ۳۳

۳۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، برگ حنا، محولہ بالا ۱۳، ص ۲۴

۳۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا ۵، ص ۸۴

۳۲۸۔ ایضاً، ص ۸۵

۳۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، محولہ بالا۵، ص ۸۵

۳۳۰۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۳۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۳۳۲۔ ایضاً، ص ۷۲

۳۳۳۔ ایضاً، ص ۸۴

۳۳۴۔ ایضاً، ص ۸۲

335- Sajjad Sheikh(Translated), Selected short stories of Ahmad Nadeem Qasmi(Preface), Islamabad, National Book Foundation, 1996

۳۳۶۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۶، ۱۸۷

۳۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، سیلاب و گرداب، محولہ بالا ۱۵، ص ۵۴

۳۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، محولہ بالا ۴۵، ص ۶۵

۳۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، محولہ بالا ۵۹، ص ۱۰۸، ۱۰۹

۳۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، سیلاب و گرداب، محولہ بالا ۱۵، ص ۸۴

۳۴۱۔ احمد ندیم قاسمی، آنچل، محولہ بالا ۱۸۹، ص ۵۳

۳۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، محولہ بالا ۱۷، ص ۷۸

۳۴۳۔ ایضاً

۳۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، محولہ بالا ۱۷، ص ۳۲، ۳۳

۳۴۵۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع و غروب، محولہ بالا ۴۱، ص ۴۵

۳۴۶۔ ڈاکٹر محمد عالم خان، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، مشمولہ ماہ نامہ بیاض، محولہ بالا ۱۰، ص ۲۳

۳۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ماہ نامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۱، ص ۹۲

۳۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع و غروب، محولہ بالا ۴۱، ص ۵۰

۳۴۹۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، محولہ بالا ۳، ص ۷۱

۳۵۰۔ سید وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۱، ۳۵۲

۳۵۱۔ اسلوب احمد انصاری، احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ، محولہ بالا ۵۳، ص ۱۷۴

۳۵۲۔ شہاب صفدر، کوئی میر ہو کہ ندیم ہو، مشمولہ ماہنامہ بیاض، لاہور، جلد ۱۴، شمارہ ۱۱، ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۸

✿✿✿✿✿

باب چہارم

کالم نگاری

کالم نویس اپنے مخصوص مزاج کے مطابق کالم لکھتا ہے۔ اس لیے کالم نویس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ اگر کالم نویس کا اندازِ تحریر تجزیاتی ہے تو اس کا کالم اس تجزیاتی انداز کی عکاسی کرے گا۔ اگر کالم نویس مزاحیہ مزاج کا حامل ہے تو اس کا انداز بھی شگفتہ ہوگا۔ کالم نویس اپنے مخصوص مزاج، اسلوب اور شخصیت کے مطابق کالم تحریر کرتا ہے۔ ہر کالم اپنے نفسِ مضمون اور موضوع کے باعث منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ کالم مستقل عنوان کے تحت لکھا جاتا ہے جس کی عمر ایک دن پر محیط ہوتی ہے۔ اس میں چوں کہ دورِ حاضر کے اہم مسائل و مصائب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس لیے اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کالم ہلکے پھلکے، شگفتہ انداز میں بھی لکھا جا سکتا ہے اور مختلف ثقیل قسم کے الفاظ بحث وتکرار بھی اس میں سما سکتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا شمار ادب کے ان کالم نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اظہار و بیان کی بہترین صلاحیت رکھتے ہوئے کالم نگاری میں مقام پیدا کیا۔ قاسمی کی کالم نویسی کا آغاز روزنامہ ''انقلاب'' لاہور سے ہوا۔ انھوں نے عبدالمجید سالک کے ایما پر اس صنف میں خامہ فرسائی کی۔ پھر تا دمِ حیات اس صنف کو گلے سے لگائے رکھا۔ سالک اردو صحافت کے معیار و اثر کو بلند کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ فنِ صحافت کو اعلیٰ بلندیوں پر لے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے صحافت کے اصول وضوابط، طرزِ تحریر اور اندازِ طباعت و اشاعت پر نہ صرف پوری توجہ دی بلکہ انھوں نے نوجوان ادیبوں اور صحافیوں کی قیادت بھی کی۔ وہ بین الاقوامی معاملات پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ مختلف اخبارات امروز (حرف و حکایت)، ہلالِ پاکستان (پنج دریا)، احسان لاہور (موج در موج)، روزنامہ جنگ کراچی (لاہور لاہور ہے)، روزنامہ حریت کراچی (موج در موج) اور لاہوریات، روزنامہ جنگ (رواں دواں) سے وابستہ رہے اور مختلف عنوانات کے تحت لکھتے رہے۔ قاسمی اپنی طویل صحافتی زندگی کی ابتدا کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میری فکاہیہ کالم نویسی کا آغاز استاد مکرم حضرت مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی نگرانی میں ہوا۔ وہ روزنامہ ''انقلاب'' میں ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے روزانہ فکاہی کالم لکھتے تھے۔ کبھی کبھی میں اور جنگ کے ایک ممتاز صاحب (جن کا پورا نام یاد نہیں آ رہا ہے) ان کی خدمت میں کالم لکھ کر بھجواتے تھے اور وہ بہ کمالِ شفقت انھیں ہمارے ناموں کے حوالے کے ساتھ ''افکار و حوادث'' کے کالم میں درج فرما دیتے تھے۔ پھر جب ۱۹۵۲ء میں مولانا چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) نے روزنامہ ''امروز'' کو خیرباد کہا اور ان کا معروف و مقبول کالم ''حرف و حکایت'' اُجڑ سا گیا تو پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے بزرگوں نے عزیزی ظہیر بابر کے توسط سے مجھے یہ کالم لکھنے کی پیش کش کی۔'' [1]

قاسمی اس پیش کش کو قبول کرنے سے ہچکچا رہے تھے کیوں کہ چراغ حسن حسرت جیسے مُسلّم الثبوت مزاح نگار کے کالم کا معیار قائم رکھنا کارے دارد تھا۔ لیکن عبدالمجید سالک نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور انہی کے زیرِ سایہ کالم نگاری کے

کے عنوان سے سیاسی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر کالم لکھنے لگے۔ روزنامہ ''جنگ'' میں کالموں کا سلسلہ تاحیات جاری رہا۔

قاسمی نے اگرچہ قیامِ پاکستان سے قبل، کالم نویسی کی ابتدا فکاہیہ کالم سے کی۔ فکاہیہ کالم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ روزانہ لکھا جاتا ہے۔ اگر یہ روز نہ لکھا جائے تو لطف قائم نہیں رہتا۔ دیگر ادبی مصروفیات کی بنا پر روزانہ کالم لکھنا ممکن نہ تھا چناں چہ انھوں نے عمر کے آخری حصے میں سنجیدہ کالموں کی جانب رجوع کیا۔ تاہم ان کی مقبولیت فکاہیہ کالموں کی بنا پر ہوئی اور فکاہیہ کالم نویسوں کی فہرست میں ان کا نام شامل ہونے لگا۔ فکاہیہ کالم ایسے کالم کو کہا جاتا ہے جو ہلکے پھلکے، شگفتہ، لطیف پیرائے میں لکھا جائے۔ یہ زندگی کے ہر موضوع کو احاطہ تحریر میں لا سکتا ہے۔ اس کی کوشش اور جذبہ قارئین کے لیے قابلِ ستائش ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی فکاہی کالم کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''فکاہی کالم پر کسی موضوع کی قید نہیں ہوتی۔ یہ زندگی کے کسی بھی شعبے کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے بلکہ بعض اوقات فکاہی کالم محض ہنسنے ہنسانے کے لیے بھی لکھا جاتا ہے۔'' ۵

فکاہیہ کالم کے تصور کے ساتھ ہی طنز و مزاح کا خیال ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ادبی چاشنی کے ساتھ عوام کی تفریحِ طبع کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ اخبارات میں ایک صفحہ ''ستارے کیا کہتے ہیں'' یا ''آپ کا یہ ہفتہ کیسے گزرے گا'' ہوتا ہے جس میں ہر بُرج سے تعلق رکھنے والے قارئین کو مستقبل سے باخبر رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ قاسمی نے فکاہیہ انداز میں ہر برج کے متعلق اظہار خیال کیا ہے مثلاً برج حمل کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کاروبار میں لگائی ہوئی رقم ڈوب جائے گی اور اگر کوئی رقم نہیں لگائی تو کوئی رقم نہیں ڈوبے گی۔ دوسرے آپ سے فیض یاب ہوں گے مگر آپ کسی دوسرے سے فیض یاب ہونا چاہیں گے تو کامیاب نہیں ہوں گے۔
>
> برج جوزا: بٹیر بازی، مرغ بازی اور جلد بازی سے اجتناب کریں ورنہ نقصان ہوگا۔ مہمان کچھ زیادہ ہی تعداد میں آئیں گے اور آپ ان کی مدارت کے سلسلے میں مقروض ہو جائیں گے۔
>
> برج قوس: آپ کی صحت قابل رشک ہو جائے گی کیوں کہ بلڈ پریشر بڑھ جانے سے آپ کے چہرے کا رنگ گہرا سرخ ہو جائے گا۔'' ۶

قاسمی کو زندگی سے پیار اور انسانوں سے اُنس ہے۔ وہ عام انسانی بوالعجبیوں پر مسکراتے ہیں اور دوستانہ انداز میں فقرے کستے ہیں۔ وہ زندگی کے مبصر ہیں، پھر طبیعت دل چسپی کا مرقع ہے۔ وہ شاعروں، ادیبوں اور عام انسانی زندگی کے بے ڈھنگے پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں لیکن انھیں طنز کی آڑ میں زچ نہیں کرتے۔ انھوں نے عمدہ کالم نویس کی طرح واقعات و امکانات کو دیانت داری سے جمع کر کے پوری چھان بین اور تجزیہ کر کے صائب

اصول وضوابط بتائے۔ بے روزگاری کے دن تھے چناں چہ قاسمی نے اس پیش کش کو قبول کیا اور بغیر کسی نام کے کالم لکھنے شروع کیے۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں میاں افتخار الدین نے انھیں روزنامہ ''امروز'' کی ادارت قبول کرنے کی پیش کش کی جسے انھوں نے بہ خوشی قبول کرتے ہوئے ''حرف وحکایت'' کے کالم کے مصنف کا نام ''پنج دریا'' اختیار کیا وہ ''حرف وحکایت'' کے نام سے چھے برس تک کالم لکھتے رہے۔ یہ کالم عوام الناس کا پسندیدہ کالم تھا۔ بقول قاسمی:

''۔۔۔ ۱۹۵۸ء سے پہلے کے دنوں میں اخباروں کو ایک حد تک آزادیِ تحریر حاصل تھی۔
اس لیے میں مسائل پر کھل کر لکھتا رہا اور میرا یہ کالم خاصا مقبول رہا۔'' ۲

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب جنرل ایوب خان نے پاکستان پر قبضے کے بعد پروگریسو پیپرز پر بھی قبضہ کرلیا تو قاسمی ''امروز'' کی ادارت سے مستعفی ہو کر ''ہلال پاکستان'' میں ''موج در موج'' اور ''پنج دریا''، ''احسان'' میں ''مکائبات'' کے نام سے فکاہی کالم لکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد جب روزنامہ ''امروز'' کی ملکیت نیم سرکاری ہوگئی تو ظہیر بابر کے اصرار پر ''امروز'' میں کالم لکھنے شروع کیے۔ مگر آپ نے ''پنج دریا'' کی بجائے ''عنقا'' کا انتخاب کیا۔ ''عنقا'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''دراصل انہی دنوں میں نے ایک متنازعہ ادبی مسئلہ پر پروفیسر احمد علی سے اختلافات کے موضوع پر انگریزی میں ایک مضمون لکھا تھا، جو میں اپنے نام سے نہیں چھپوانا چاہتا تھا چناں چہ میں نے مضمون پر اپنے نام کے تینوں حصوں کے ابتدائی حروف ''اے، این، کیو'' لکھنے پر اکتفا کیا مگر پھر سوچا کہ اگر ان حروف کے آخر میں ایک ''اے'' کا اضافہ ہو جائے تو ''عنقا'' اچھا خاصا بامعنی نام بنتا ہے، چناں چہ میں کئی برس تک ''عنقا'' ہی کے نام سے یہ کالم لکھتا رہا۔'' ۳

۱۹۶۴ء میں قاسمی نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی سے ''لاہور، لاہور ہے'' کے عنوان سے تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں کے جائزے پر ہفتہ وار کالم کی ابتدا کی۔ بعدازاں ''حریت'' اور روزنامہ ''جنگ'' میں بھی کالم لکھتے رہے جس کی تفصیل صہبا لکھنوی بتاتے ہیں:

''۱۹۷۰ء میں ''امروز'' کے مدیر ''ظہیر بابر'' اس روزنامے کی ادارت سے نواب زادہ شیر علی خاں کی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر مستعفی ہو گئے تو نتیجتاً آپ بھی ''امروز'' سے الگ ہو گئے۔ اسی کے ساتھ جنگ کی کالم نگاری کا سلسلہ.................. اور آپ روزنامہ ''حریت'' کراچی سے منسلک ہو گئے اور ''موج در موج'' کے عنوان سے روزانہ فکاہی کالم اور ''لاہوریات'' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنے لگے۔ بعد میں یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔'' ۴

۱۹۷۲ء میں قاسمی روزانہ کی کالم نویسی سے دست کش ہو گئے اور روزنامہ ''جنگ'' لاہور میں ''رواں دواں''

کے عنوان سے سیاسی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر کالم لکھنے لگے۔ روزنامہ ''جنگ'' میں کالموں کا سلسلہ تاحیات جاری رہا۔

قاسمی نے اگرچہ قیامِ پاکستان سے قبل، کالم نویسی کی ابتدا فکاہیہ کالم سے کی۔ فکاہیہ کالم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ روزانہ لکھا جاتا ہے۔ اگر یہ روز نہ لکھا جائے تو لطف قائم نہیں رہتا۔ دیگر ادبی مصروفیات کی بنا پر روزانہ کالم لکھنا ممکن نہ تھا چناں چہ انھوں نے عمر کے آخری حصے میں سنجیدہ کالموں کی جانب رجوع کیا۔ تاہم ان کی مقبولیت فکاہیہ کالموں کی بنا پر ہوئی اور فکاہیہ کالم نویسوں کی فہرست میں ان کا نام شامل ہونے لگا۔ فکاہیہ کالم ایسے کالم کو کہا جاتا ہے جو ہلکے پھلکے، شگفتہ، لطیف پیرائے میں لکھا جائے۔ یہ زندگی کے ہر موضوع کو احاطہ تحریر میں لاسکتا ہے۔ اس کی کوشش اور جذبہ قارئین کے لیے قابلِ ستائش ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی فکاہی کالم کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''فکاہی کالم پر کسی موضوع کی قید نہیں ہوتی۔ یہ زندگی کے کسی بھی شعبے کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے بلکہ بعض اوقات فکاہی کالم محض ہنسنے ہنسانے کے لیے بھی لکھا جاتا ہے۔'' ۵

فکاہیہ کالم کے تصور کے ساتھ ہی طنز و مزاح کا خیال ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ادبی چاشنی کے ساتھ عوام کی تفریحِ طبع کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ اخبارات میں ایک صفحہ ''ستارے کیا کہتے ہیں'' یا ''آپ کا یہ ہفتہ کیسے گزرے گا'' ہوتا ہے جس میں ہر بُرج سے تعلق رکھنے والے قارئین کو مستقبل سے باخبر رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ قاسمی نے فکاہیہ انداز میں ہر برج کے متعلق اظہار خیال کیا ہے مثلاً برج حمل کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کاروبار میں لگائی ہوئی رقم ڈوب جائے گی اور اگر کوئی رقم نہیں لگائی تو کوئی رقم نہیں ڈوبے گی۔ دوسرے آپ سے فیض یاب ہوں گے مگر آپ کسی دوسرے سے فیض یاب ہونا چاہیں گے تو کامیاب نہیں ہوں گے۔
>
> برج جوزا: بٹیر بازی، مرغ بازی اور جلد بازی سے اجتناب کریں ورنہ نقصان ہو گا۔ مہمان کچھ زیادہ ہی تعداد میں آئیں گے اور آپ ان کی مدارت کے سلسلے میں مقروض ہو جائیں گے۔
>
> برج قوس: آپ کی صحت قابل رشک ہو جائے گی کیوں کہ بلڈ پریشر بڑھ جانے سے آپ کے چہرے کا رنگ گہرا سرخ ہو جائے گا۔'' ٦

قاسمی کو زندگی سے پیار اور انسانوں سے اُنس ہے۔ وہ عام انسانی بوالعجبیوں پر مسکراتے ہیں اور دوستانہ انداز میں فقرے کستے ہیں۔ وہ زندگی کے مبصر ہیں، پھر طبیعت دل چسپی کا مرقع ہے۔ وہ شاعروں، ادیبوں اور عام انسانی زندگی کے بے ڈھنگے پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں لیکن انھیں طنز کی آڑ میں زچ نہیں کرتے۔ انھوں نے عمدہ کالم نویس کی طرح واقعات و امکانات کو دیانت داری سے جمع کر کے پوری چھان بین اور تجزیہ کر کے صائب

رائے کا اظہار کیا ہے کیوں کہ ایک کالم نویس روزمرہ کے واقعات کا بے لاگ نقاد ہوتا ہے۔ قاسمی کا فن زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ انھوں نے زندگی کی پیچیدگیوں اور زمانے کی روش، عوام کے ذہنی رجحانات کو خوب سمجھا ہے اور پھر نہایت میانہ روی سے اپنی تحریروں میں بیان کر دیا ہے۔ ان کے بعض فکاہی کالموں میں شگفتگی کی ایسی لہریں اٹھتی ہیں کہ بات تبسم سے آگے نکل جاتی ہے۔ ان کے کالموں میں خالص مزاح نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں اور بعض جگہوں پر طنزیہ جملے بھی خاصے کی چیز بن جاتے ہیں۔ ظفر اقبال ''امروز'' میں شامل قاسمی کے کالموں کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''روزنامہ ''امروز'' میں ندیم صاحب کا کالم ان کے شگفتہ و شاداب اور ہنس مکھ طبیعت کی پوری پوری آئینہ داری کا حامل ہوا کرتا تھا'' ۷

لاہور کے ایک صاحب نے اپنی بکری شاہدرہ کے کسان دوست کے حوالے کی کہ وہاں جی بھر کر چرتی رہے۔ کچھ عرصے بعد جب بچہ دے تو اسے لاہور پہنچا دیا جائے۔ سیلاب کے بعد لاہور اور اس کے آس پاس کے کیمپوں میں تلاش بسیار کے باوجود کسان نہ مل سکا تو ''تلاشِ گم شدہ'' کے اشتہار کی غرض سے دوست کا ناک نقشہ، چال ڈھال، نام ولدیت لکھ کر لے آئے۔ ایڈیٹر نے تصویر کا استفسار کیا تو بولے:

> ''تصویر تو میرے پاس نہیں ہے لیکن وہ جو حال ہی میں ادھر مغرب میں کسی ایکٹرس کو طلاق ملی ہے تو میں نے اس کے شوہر کی تصویر دیکھی ہے بالکل شاہدرہ کا کسان لگتا ہے۔ ایڈیٹر نے الزبتھ ٹیلر والے رچرڈ برٹن کی تصویر دکھائی تو بولے۔ بس یہ تصویر چھاپ دیجیے اور نیچے لکھیے کہ امید ہے تم جہاں بھی ہو گے، خیریت سے ہو گے مگر میاں، میری بکری تو پہنچا جاؤ ورنہ یاد رکھو، مقدمہ دائر کر دوں گا۔'' ۸

قاسمی کے فکاہیہ اسلوب کی بنیاد شرافت، شائستگی اور وضع داری پر قائم ہے۔ وہ اپنے کالموں میں دوسروں پر پھبتی نہیں کستے، نہ تمسخر اُڑاتے ہیں اور سوقیانہ پن سے بھی حتی الامکان احتراز کرتے ہیں۔ وہ اپنی متانت اور اخلاقی اقدار کی پاس داری کو قائم رکھتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> ''ندیم صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اعلیٰ پائے کے فکاہی کالم نگار تھے۔ ان کی طنز میں جو گہرائی اور مزاح میں جو شائستگی ہوتی ہے، وہ لاجواب تھی۔ ندیم نے قلم کو ذریعہ معاش بنایا اور قلم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت خوددار اور باعزت زندگی گزاری۔'' ۹

قاسمی ''مزاح برائے مزاح'' کی بجائے ''مزاح برائے اصلاح'' کے قائل تھے۔ ان کی ظرافت کو مصلحانہ اور مقصدی ظرافت کہا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی ظرافت جس کے پس منظر میں علم و فراست، دانش و آگہی کے دریا بہہ

رہے ہوں۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ کالم زندگی میں ذرا شگفتگی پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ اگر اس شگفتگی کے پردے میں معاشرے کی کسی خرابی کی اصلاح بھی ہو جائے تو سبحان اللہ!'' ۱۰

قاسمی نے زندگی کے ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی اور کامیاب رہے۔ نصر اللہ خاں، قاسمی کی کالم نویسی کا مبصرانہ جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کے مزاحیہ کالم شروع سے آخر تک پڑھتے جایئے، ہنسی کے ہلکے پھلکے فوارے پھوٹتے رہیں گے۔ وہ ہر موضوع پر لکھتے اور ہر رنگ میں لکھتے ہیں۔'' ۱۱

قاسمی نے عمر عزیز کا بڑا حصہ کالم لکھنے میں گزارا۔ انھوں نے اگرچہ ایک بار اپنے فکاہی کالموں کا انتخاب کتابی صورت میں مرتب کرنے کا ارادہ کیا لیکن:

> ''مشکل یہ تھی کہ ۱۹۵۲ء سے لے کر آخر تک میں نے لگ بھگ تیرہ چودہ ہزار کالم لکھے ہوں گے۔ اس انبار میں سے دو چار سو، یا زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سو کالموں کا انتخاب بہت دشوار تھا۔'' ۱۲

قاسمی نے کالموں کو کتابی صورت دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کالم اگرچہ ان کے پاس موجود تھے لیکن دشواری انتخاب نے راستہ روک دیا۔ جب انھوں نے کچھ نوجوان احباب کے تعاون سے فکاہی کالموں کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع کروایا تو پھر اپنے ارادے کا اظہار اس طرح کیا:

> ''میرے پیش نظر ان سنجیدہ کالموں کا انتخاب بھی تھا جو میں نے ضیاء الحق کے مارشل لا کے دنوں میں لکھے اور ایوانِ صدر میں داخل نہ ہو سکنے والے ''بلیک لسٹڈ جرنلسٹ'' کا اعزاز حاصل کیا۔'' ۱۳

شومیِ قسمت کہ ضعف صحت اور گوناگوں مصروفیت نے عمر عزیز کو اتنی مہلت نہ دی اور قاسمی اس خواہش کو سینے میں چھپائے منوں مٹی تلے چلے گئے۔ ان کا صرف ایک کالموں کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' منظرِ عام پر آ سکا۔ قاسمی اپنے فکاہی کالموں پر مشتمل مجموعہ ''کیسر کیاری'' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کیسر کیاری کے نام سے میرے مزاحیہ مضامین و تراجم کا ایک مجموعہ قیامِ پاکستان سے بھی چند برس پہلے شائع ہوا تھا۔ کتاب کا نام محترم سالک صاحب نے تجویز فرمایا تھا۔ جو ان کے ارشاد کے مطابق ''زعفران زار'' کا سلیس اور سچا ترجمہ تھا۔ یہ مجموعہ کب کا ناپید ہے۔ میں نے بھی اپنی تصانیف میں کم ہی اس کا ذکر کیا ہے کیوں کہ اس کے مشمولات میں بیشتر تحریریں عنفوانِ شباب کی جلد بازیوں کا شکار ہو گئی تھیں۔ اب میں اپنے فکاہی کالموں کا انتخاب اسی نام سے پیش کر رہا ہوں تاکہ میرے استادِ مکرم کا تجویز کردہ یہ نام ضائع نہ ہو۔'' ۱۴

قاسمی اپنے کالموں کو عوام میں مقبول کرنے کے لیے دل چسپ موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ قاسمی ادبی، سیاسی اور فکاہیہ کالم تحریر کر کے عوام کی رائے عامہ کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ اپنے کالموں کا مواد اخباری خبروں سے لیتے ہیں اور کبھی گرد و پیش کے حالات و واقعات کو کالم کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''میں اپنے کالم کے موضوع اخبارات کی خبروں سے لیتا ہوں، سنی سنائی باتوں کو بنیاد نہیں بناتا۔ ایک ہی فقرے کو طے کر کے پورا کالم لکھتا ہوں۔ بعض اوقات دوسرے کالم نویسوں کی طرح میرے کالم میں ایک سے زیادہ موضوع نہیں ہوتے۔'' [۱۵]

قاسمی کے موضوعات ایک دائرے میں قید نہیں ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں دورِ حاضر کے کسی واقعہ یا مسئلہ کو بنیاد بنا کر کالم کی ابتدا کرتے ہیں تو کبھی پرانے معاملات و مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں مثلاً کبھی وہ کارپوریشن کی بے حسی اور بدحواسیوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں؛ کبھی واپڈا کی نااہلی کو بیان کرتے ہیں؛ کبھی اربابِ ریڈیو کی واماندگیاں گنواتے ہیں؛ کبھی محکمہ خوراک کی قلت پر اظہارِ خیال کرتے ہیں؛ کبھی سیاسی لیڈروں کی بے ایمانیوں کا راز افشا کرتے ہیں؛ کبھی نسلِ نو کی بے سمتی کا رونا روتے ہیں؛ کبھی سڑکوں کی ناگفتہ بہ حالت کو بیان کرتے ہیں اور کبھی کارپوریشن کی صفائی سے اجتناب کی عادت سے بے زار دکھائی دیتے ہیں۔ کارپوریشن نے اشیائے خوردنی پر ٹیکس لگا رکھے ہیں جس کی وجہ سے مفلس عوام بے چارگی اور بے بسی کا شکار ہے۔ کارپوریشن کا کام صرف ٹیکس لگانا ہے۔ شہریوں کو سہولتیں دینا، ان کا معیارِ زندگی بلند کرنا اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، ان کا منشور نہیں ہے۔ قاسمی لاہور کارپوریشن پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم کونسلر ہوتے تو کارپوریشن کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کرتے کہ کارپوریشن کو ہر چوک، گلی کے ہر موڑ اور محلے کے ہر مرکزی مقام میں لیٹر بکس کی شکل کا ایک کشکول لٹکا دینا چاہیے۔ جس پر ''فی سبیل اللہ کارپوریشن کی امداد کیجیے'' کے الفاظ درج ہوں۔ یہ کشکول مقفل ہوں۔ اہلِ لاہور بڑے فراخ دل ہیں۔ وہ لاہور کے گداگروں کو روزانہ بیس تیس ہزار روپے تو بطور خیرات دے ڈالتے ہوں گے۔ اگر اس خیرات کا نصف بھی کارپوریشن کو ملتا رہے تو سال میں اس کے پاس پچاس لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے جس سے وہ ہر سال نیا ٹاؤن ہال تعمیر کر سکتی ہے۔ وہ چاہے تو بعض سڑکیں بھی پختہ کر سکتی ہے اور بعض نالیاں بھی کھلوا سکتی ہے مگر اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔
> اس ترقی یافتہ زمانے میں کارپوریشن صرف ٹیکس جمع کرانے کے ادارے ہیں۔ باقی شہری جانیں اور ان کا کام جانے۔'' [۱۶]

قاسمی کے موضوعات خیالی نہیں بلکہ براہِ راست عوام کی زندگی سے متعلق ہیں۔ وہ جیتی جاگتی زندگی کے

مسائل اور حقائق پیش کرتے ہیں۔ بالخصوص کراچی، لاہور اور سرگودھا کے نچلے اور متوسط طبقے کی زبان اور طرزِ زندگی کو خاص رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ہلکی پھلکی باتیں لکھتے ہوئے اچانک ایسی چبھتی ہوئی بات کہہ جاتے ہیں کہ قاری چونک جاتا ہے۔ عوامی مسائل میں ایک گھمبیر مسئلہ سڑکوں کی توڑ پھوڑ اور خستہ حالت کا ہے۔ مفلس عوام پر ٹیکس لگانے کے باوجود سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سڑک پر پیدل چلنے والوں کے اعضا تشنج میں مبتلا ہیں۔ قاسمی سرگودھا کی سڑکوں کو رقص گاہ کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ یہ بس میں بیٹھے مسافروں کی عمدہ تصویر کشی کے ساتھ ساتھ حکام بالا کی بے حسی یا کم عملی کا مذاق اس طرح اُڑاتے ہیں:

''سرگودھا کے حکام بالا کو تو شاید اس سڑک کے مدوجزر کا تو علم نہیں ہوگا کیوں کہ ان کی کاریں تو چھاؤنی کے علاقے میں سے گزرتی ہوئی، سڑک پر تیرتی ہوئی نکل جاتی ہوگی مگر ان کا علم ان مسافروں کو بہت اچھی طرح بلکہ بہت بُری طرح حاصل ہے۔ جو روزانہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں یہاں سے رقصاں، جولاں گزر جاتے ہیں۔'' ۱۷

قاسمی ایسے صائب الرائے شخص تھے جو اپنے علم، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں مخصوص معیاروں کی کسوٹی پر رائے قائم کرتے ہیں، پھر مضبوط دلائل سے نہایت ذکاوت وفراست سے اپنے خیالات ومصائب کا اظہار کرتے ہیں مثلاً لاہور میں مچھروں کی آمد سے شہری نہایت پریشان ہیں۔ طنزیہ ومزاحیہ انداز میں لکھتے ہوئے ان کا طنز زہریلا نہیں رہتا بلکہ وہ شگفتہ انداز اپناتے ہیں۔ وہ زندگی کی مضحکہ خیز صورتِ حال کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

''لاہور میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ اہلِ لاہور ملیریا میں مبتلا ہیں۔ مریضوں کو یہ خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ وہ ملیریا میں نہیں بلکہ کسی اور مرض میں مبتلا ہیں۔ اسے بے شک ماسکیوریا، مچھریا کہہ لیجیے لیکن براہ کرم ملیریا نہ کہیں ورنہ محکمہ انسداد ملیریا والے خفا ہو جائیں گے وہ تو صاف صاف اعلان کر چکے ہیں کہ ملیریا والے مچھر کا بیڑہ غرق کیا جا چکا ہے جو دوسرے مچھر لوگوں کو کاٹتے رہتے ہیں تو یہ ملیریا کے مچھر نہیں کسی اور ''ایریا'' کے مچھر ہیں۔'' ۱۸

قاسمی کے ابنائے روزگار کے چلن اور معاشرتی ناہمواریوں کو دیکھ کر قاری رو بھی پڑتا ہے۔ قاسمی اپنے دکھ کی کیفیت کو مختلف کرداروں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اس لیے فکاہی کالم نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے کالموں میں درد کی کسک، آنسوؤں کی نمی اور دھیمی دھیمی آگ میں سلگنے کی کیفیت کا احساس بھی ملتا ہے مثلاً:

''ایک نوجوان سمجھوتے کے متعلق دوسرے سے پوچھ رہا ہے۔ شہر بھر میں سمجھوتے کا شور برپا ہے۔ کیا دال، کپڑے، دوائی، سستی ہوگی۔ جب اسے آئینی سمجھوتے کے

متعلق بتایا گیا تو بولا صاف صاف کہیے نا کہ لیڈروں نے آپس میں کچھ میل ملاپ کیا ہے۔ جب اُسے سمجھایا گیا کہ میل ملاپ کی وجہ سے ملک میں امن و امان قائم ہو گا۔ لوگ محنت کریں گے۔ چیزیں زیادہ پیدا ہوں گی۔ نوجوان بولا مگر کب تک جب اسے بتایا گیا کہ تقریباً دو برس لگیں گے تو گھوڑے کو چھانٹا مارتے ہوئے بولا مگر میاں جی! برس دو برس کا روزہ کون رکھے۔" ۱۹

صحافت کا مقصد محض لوگوں تک معلومات بہم پہنچانا ہی نہیں بلکہ حقائق کی روشنی میں لوگوں کے لیے راہ عمل بھی تجویز کرنا ہے۔ اس نقطہ نظر سے ایک صحیفہ نگار کی ذمہ داری میں اضافہ ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ واقعات و امکانات کا پوری چھان پھٹک اور دیانت داری کے ساتھ تجزیہ کرتا، پھر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔

قاسمی کے حواس سماعت و بصارت ہمہ تن چوکنے رہتے تھے۔ ان کی بصیرت ہر وقت نت نئے نکات سجھاتی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے مسائل پر یکساں توجہ مبذول کرتے۔ انھوں نے اخلاقی و معاشرتی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے عوام کے ذہنی رجحانات، قومی اور ملکی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ صداقت ان کا شعار ہے۔ یہ اپنے قلم کی بنا پر بڑی شخصیات اور حکومت پر وار کرتے ہیں۔ قاسمی اپنے کالموں میں غریب عوام کی بے چارگی اور بے بسی کو اُبھار کر منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ وہ استحصالی معاشرے میں موجود بے کس عوام کے روایتی انداز کو بڑے کرب سے اپنے کالموں میں پیش کرتے ہیں۔ عوام اپنے ردعمل کا اظہار ''ہڑتال'' کے ذریعے کرتے ہیں۔ قاسمی اپنے فرائض کو احسن طریقے سے انجام نہ دینے والے افراد کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ قاسمی محکمہ جنگلات کے اہل کاروں کی ہڑتالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہڑتال سے درختوں کی افزائش و پرورش کو روکا نہیں جا سکتا جب تک کہ جنگلات خود ہڑتال نہ کریں۔ ٹیکسٹائل مل کے مزدور، ریل کے کارکن، بنکوں کے کلرک، اساتذہ اور طلبہ کی ہڑتالوں سے مروجہ نظام میں گڑبڑ پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے مگر محکمہ جنگلات کے اہل کاروں کی ہڑتال سے جنگلات کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لکھتے ہیں:

''محکمہ جنگلات کے اہل کاروں کی نا اہلی کہ کاٹے جانے والے درختوں میں اُن کی اجازت شامل ہونی چاہیے۔ ہڑتال سے لوگ درخت کاٹنے لگیں گے۔ ہفتہ وار شجر کاری مشکل ہو جائے گی۔ بکریاں فاقے سے مرنے لگیں گی۔ بکریوں کے مرنے سے سبزی خور ہونے کا احتمال ہے۔'' ۲۰

قاسمی نہایت فن کاری سے ''ہڑتال'' کے موضوع کا رُخ ادب کی جانب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو ادیب اور شاعر اپنی نگارشات تحریر نہیں کرتے وہ اپنے ہی خلاف ہڑتال کرتے ہیں:

''ہم لوگ ہڑتال کر کے کون سے کارخانے کی مشینیں جام کر دیں گے۔ ساتھ ہی ہڑتال تو خود ہمارے اپنی ہی خلاف ہو گی کہ اگر ہم شعر و افسانہ نہ لکھ سکے تو ہماری حالت

اُس انڈونیشی خاتون کی سی ہو جائے گی جو دو تین برس سے پیٹ میں بچہ اُٹھائے
پھرتی تھی اور اسے جنم نہیں دے پاتی تھی اور بچے نے تنگ آ کر ماں کے پیٹ ہی میں
کھیلنا شروع کر دیا۔" ۲۱

قاسمی نے اپنے کالموں میں کھیل، معاشرہ، معیشت، کاروبار، سیاست، سائنس، طب اور فیشن غرض ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ لکھتے ہیں:

"میں نے ہر موضوع پر نکاہی کالم لکھے۔ اپنے آپ کو کسی موضوع کا پابند نہیں کیا۔
چناں چہ سیاست، معیشت، معاشرت، ادب، فن کوئی بھی موضوع ایسا نہیں جو میری ۳۳
برس کے روزانہ نکاہی کالموں میں بار نہ پا سکا ہو۔" ۲۲

قاسمی نہایت محنت سے موضوع تلاش کر کے نئے اور اچھوتے انداز سے اظہارِ خیال کر کے اسے زندہ کر دیتے ہیں۔ ان کے ہر جملے میں جذبہ اور لطف و کیف بھرا ہوتا ہے۔ تحریر میں آمد و روانی کا احساس ملتا ہے۔ قاری ان کی تحریر کے سحر میں تا دیر گرفتار رہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کبھی وہ طنز کے تیز نشتر چلاتے ہیں اور کبھی شگفتہ انداز سے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں:

"کبھی وہ سیاسی گتھیاں سلجھانے لگتے ہیں اور کہیں سرمایہ کاروں کے خلاف آواز بلند
کرتے ہیں۔ ان تمام سے بڑھ کر ان کے کالموں کی اصل روح انسانوں میں احساسِ فرض،
احساسِ شرافت اور احساسِ آدمیت پیدا کرنا ہے۔" ۲۳

قاسمی کے کالموں میں ژولیدگیِ فکر اور اظہار و بیان کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ ان کے سیاسی، ادبی، تہذیبی اور شخصی اقسام پر مشتمل کالم بڑے واضح اور متوازن ہیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے اور بے تکان لکھتے ہیں۔ وہ شخصیات کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے شائستگی و ہمدردی کے عناصر کو فراموش نہیں کرتے مثلاً لسانی مسائل کے موضوع پر پروفیسر اشفاق علی خاں کے سالانہ کنونشن کے دوران ایک صدارتی خطبے میں ایک معاصر نے "اپوا کالج" کو "اچھرہ کالج" لکھا۔ زبان کے جھگڑے پر بحث و مباحثہ کے دوران پروفیسر اشفاق نے مفہوم کو زبان پر اہمیت دی تو قاسمی نے لکھا کہ:

"۔۔۔ پروفیسر اشفاق علی خاں کی خدمت میں ہم دست بستہ گزارش کریں گے کہ
پاکستان کے لسانی مسئلے پر کچھ Commit نہ کرنے اور اس سے کترا کر نکل جانے کا یہ
طریقہ ان کے سے اہلِ علم کو زیب نہیں دیتا۔ وہ اس حقیقت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں
کہ زبانوں کا مسئلہ ہمارے باقی ماندہ وطن کے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے اور
اہلِ علم کو اس مسئلے کے ساتھ حقیقت پسندی اور بے تعصبی سے نمٹنا چاہیے۔" ۲۴

قاسمی بعض اوقات کسی ایک موضوع کو لے کر کالم تحریر کرتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی ایک

واقعہ یا کسی شخص کے منفی رجحانات پر تنقید و تبصرہ کر کے اس کی اصلاح کی جائے۔ وہ اہلِ اقتدار اور اہلِ ثروت کے رویوں کی بڑے رازدارانہ انداز سے نشان دہی کرتے۔ عموماً جب کسی مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے تو پہلے تمہید باندھتے اور قاری کو ذہنی طور پر بات سننے کے لیے تیار کرتے۔ اشعار کا غلط تلفظ انھیں بہت ناگوار گزرتا۔ حتیٰ کہ بعض عالم فاضل حضرات کو بھی شعر غلط پڑھتے ہوئے سنتے تو غصے کے عالم میں فرماتے:

> ''م۔ش بھی اکثر غلط شعر پڑھا کرتے تھے اور بعض افراد غالبؔ کے اشعار اتنے غلط پڑھتے ہیں اگر مرزا سن لیتے تو انھیں قتل کر ڈالتے۔'' ۲۵

مندرجہ ذیل واقعات افسانوی طرز کو ظاہر کرتے ہیں جس سے قارئین کی دل چسپی کالم میں بڑھ جاتی ہے۔ وہ اکثر اشعار کی اصلاح مزاح کے ذریعے اس طرح کرتے ہیں کہ غلط پڑھنے والے کے ذہن میں یہ اصلاح ثبت ہو جاتی۔ وہ اکثر واقعات کے ذریعہ دھیمے الفاظ میں غلطیوں کی نشان دہی کرتے۔ ایک شخص نے مومنؔ کا شعر غلط پڑھا۔ جب قاسمی نے تصحیح کرنا چاہی تو اس منظر کو بڑے عمدہ طریقے سے پیش کرتے ہیں:

> ''اس غیرت ناہید کی ہر تان دیپک ہے۔
> ہم نے عرض کیا: واہ!
> اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
> دوبارہ اس عمل کو دہرایا گیا تو وہ ہمارا مقصد سمجھ گئے مگر مزاج میں بہت ضد تھی۔
> آنکھیں نکال کر بولے: ''دیپک ہے'' ہم نے عرض کیا ''ہے دیپک''۔
> میز پر مکا مار کر کہنے لگے: ''دیپک ہے''
> ہم نے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مار کر کہا: ''ہے دیپک''
> تنگ آ کر بولے۔ ''آخر آپ کو یہ کیا تکلیف ہے کہ ''ہے'' جو ہمیشہ فقرے کے آخر میں آتا ہے، اسے پیچھے گھسیٹے لیے جا رہے ہیں۔
> دیپک ہے! ہم نے کہا: ''بہت اچھا دیپک ہے'' سہی مگر آگے بھی تو پڑھیے۔
> مصرع تھا: شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔
> مگر انھوں نے یوں پڑھا: شعلہ سا لپک ہے جائے، آواز دیکھو تو
> ہم نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے کہ ان کا مرض کرانک معلوم ہوتا ہے۔'' ۲۶

حکومت پنجاب نے ایک بار فروری کے تیسرے ہفتے میں قومی ''میلہ اسپاں و مویشیاں'' کے ساتھ صنعتی نمائش لگانے کا فیصلہ کیا تھا مگر یوں مشاعرہ اور مویشیوں کا میلہ اکٹھا ہو گیا۔ اگر دوپہر کو میلہ لگتا تو رات کو مشاعرہ ضرور ہوتا۔ یوں علی پور کی دیواروں پر یہ پوسٹر چسپاں تھے: ''میلہ اسپاں مویشیاں و دنگل و مشاعرہ''۔ قاسمی کی

رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی۔ لکھتے ہیں:

''جن میں پہلوانوں اور شاعروں کے ناموں کو آپس میں یوں مدغم کر دیا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا بھولو پہلوان غزل سنائیں گے اور فیض احمد فیض کشتی لڑیں گے۔'' ۲۷

قاسمی جس شخص کو اپنی طنز و ظرافت کا نشانہ بناتے، وہ بھی اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وقار انبالوی ''قاسمی بطور مزاح نگار'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔اس کا طنز حقیقت میں طنز لطیف ہے جس کا لطف وہ خود بھی لیتا ہے اور جن پر طنز کرتا ہے اُس کے دل کے تاروں کو بھی اس طرح چھیڑتا ہے کہ مسرت کی راگنی پھوٹ نکلتی ہے۔'' ۲۸

قاسمی جب طنز کا تازیانہ ہاتھ میں لیتے ہیں تو زندگی پر سنجیدگی سے غور کرنے والے افراد کے دلوں کے تار بھی ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ افتخار مجاز رقم طراز ہیں:

''قاسمی صاحب کی بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی، حاضر جوابی اور بالخصوص لطیفہ گوئی ان کے مزاج کا خصوصی وصف تھا۔ اس فن لطیف میں بھی احمد ندیم قاسمی صاحب کو یدطولی اور خصوصی دسترس حاصل تھی۔ شستگی اور شائستگی کا دامن نہ چھوڑتے۔'' ۲۹

فکاہی کالموں کے لیے اگرچہ لطافت طبع ناگزیر ہے۔ قدرت نے قاسمی کو مزاحیہ حس ودیعت کی تھی۔ وہ زندگی کے مضحک پہلوؤں پر نہایت ہمدردی سے نظر ڈالتے ہوئے اپنی تحریر کو شگفتگی سے مزین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب لکھتے ہیں:

''وہ طنز و مزاح کا تازیانہ کسی تعزیر و انتقام کے لیے نہیں اُٹھاتے بلکہ نہایت مرنجان مرنج انداز میں اصلاح احوال کے لیے اس اسلوب نگارش سے کالم لکھتے ہیں جسے طنز و مزاح کہتے ہیں۔'' ۳۰

معاشرے میں جب ناانصافی ہو یا کسی پر ظلم و ستم ہو ان کا قلم بے نیاز نہیں رہتا۔ قاسمی مہذب انسان ہیں۔ وہ بدتہذیبی اور بدعنوانی کے ناسوروں پر نشتر زنی کرتے ہیں لیکن ان کے نشتر سم آلود نہیں ہوتے۔ شاید اسی میں ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ان کے ہر مضمون میں اصلاح معاشرت کی کوشش ہوتی ہے۔ اگرچہ قاسمی نے سماجی اور معاشرتی مسائل اور معاملات کے متعلق بھی کالم تحریر کیے ہیں۔ قاسمی اس قسم کے کالموں کے ذریعے معاشرے میں موجود معاشرتی برائیوں کی نشان دہی شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔ انھوں نے لوگوں کو رشوت، چوری، ملاوٹ، بدعنوانی، ڈاکے اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے واقعات کا ذکر قارئین کو باخبر کرنے کے لیے مزاحیہ انداز میں کیا ہے مثلاً رشوت کے متعلق ایک بڑھیا اور پولیس کانسٹیبل کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک بڑھیا، آئی جی پولیس سے ملنے آئی تو گیٹ پر کھڑے کانسٹیبل نے کہا کہ مائی،

> اپنے نام کی چٹ لکھ دو۔ بڑھیا ''چٹ'' دینے کے لیے جیسے تیار ہو کر آئی تھی، فوراً بند مٹھی کھولی اور کرنسی نوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کانسٹیبل نے یہ نوٹ بڑھیا کو واپس دیتے ہوئے اسے سمجھایا کہ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ کاغذ پر نام لکھ دو یا لکھوا دو۔ وہاں چند لوگ بھی موجود تھے۔ بولے: ''بڑھیا پولیس کی زبان سمجھتی ہے۔'' ۳۱

قاسمی نے نہایت مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں محکمہ پولیس کی بے ایمانیوں اور عادات کو منکشف کیا ہے۔ وہ نہایت فن کاری سے غریب عوام کی بے بسی اور پولیس والوں کے رویہ کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے حکومت کی توجہ عوام کی جانب دلاتے ہیں۔ حکومت عوام کی بدحالی کو خوش حالی میں بدلنے کی کوشش ہی نہیں کرتی اور اگر کبھی عوامی مسائل کی جانب حکومت متوجہ ہو تو عوام ان کو بہت مایوس کرتی ہے مثلاً کراچی میں ایک مرتبہ، عوام کی سہولت کے لیے سڑکوں پر پبلک ٹیلی فون بوتھ لگا دیے۔ عوام نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ چناں چہ دوسرے روز جب محکمہ ٹیلی فون کے اہل کاروں نے بوتھوں کا معائنہ شروع کیا تو انھیں معلوم ہوا:

> ''کہ پبلک ٹیلی فون اٹھا کر اور تار کاٹ کر لے گئی ہے اور بعض حضرات نے تو ان بوتھوں کا ''بوتھا'' یوں بگاڑا ہے کہ انھیں بطور بیت الخلاء استعمال فرمایا ہے بلکہ ان میں سے بعض تو کہتے بھی پائے گئے کہ آخر بیت الخلاؤں میں ٹیلی فون لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا انتظامیہ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم خلانورد نہیں ہیں۔ بیت الخلاء نورد ہیں اور ہمیں ان بوتھوں میں ٹیلی فون کی نہیں لوٹے کی ضرورت ہے۔'' ۳۲

قاسمی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ ۱۹۴۹ء میں کچھ عرصے کے لیے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ ترقی پسند نظریات کی پاداش میں پابند سلاسل رہے۔ ظفر محی الدین ''اردو کالم نگاری کے مرد بزرگ'' میں لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری میں جو وسعت نظر، سماجی شعور اور انسانیت کے لیے گہرا کرب ملتا ہے، وہ کسی حد تک ترقی پسند تحریک کا نظریاتی اثر ہے جس نے اس دور کے بیشتر قلم کاروں کو عصری آگہی اور ایک وژن عطا کیا۔'' ۳۳

قاسمی اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> ''مجھ پر اور دوسرے ترقی پسند مصنفین پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نئے وطن کی مصلحتوں سے آنکھیں پھیر کر اندھا دھند لکھا لیکن کم از کم میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا، وہ ذرا سا ڈر کر بھی لکھا۔ ورنہ اگر حکومت کے عتاب کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے تو ہر ذی اقتدار طبقے کو نہایت کریہہ قسم کے ناسور اور گھناؤنے انداز کے زخم دکھانے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ ادھر بھی متوجہ ہوں۔۔۔ میں نے جھجک جھجک کر بھی جو کچھ لکھا، اس نے مجھے آخر کار جیل میں لا ڈالا۔'' ۳۴

قاسمی نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود انتہا پسندی کی بجائے اعتدال پسندی کی راہ اختیار کی۔ وہ مارکس ازم سے متاثر تھے اور ملک کے غریبوں کو جاگیرداروں، سرمایہ داروں کے شکنجے سے نجات دلا کر مساوات اور انصاف پر مبنی نظام لانے کے خواہش مند تھے۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، قاسمی کے متعلق لکھتے ہیں:

''قاسمی انسانی معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان کو انسان سمجھا جائے۔ آدمی کو آدمیت کے درجے سے نہ گرایا جائے۔ ان لوگوں پر ان کا وار بڑا گہرا اور سخت ہوتا ہے جو تحقیرِ انسانیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں میں غریب سے ہمدردی کا جذبہ، انسانیت سے دوستی، ٹھگوں، لٹیروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور تقدیرِ انسانی سے کھیلنے والوں کے خلاف ایک بلند آہنگ آواز پائی جاتی ہے۔'' ۳۵

تحقیرِ انسانی، پاکستان میں ہو یا پاکستان سے باہر، قاسمی اپنے نوکِ قلم کو سیدھا کر لیتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں امریکا نے مریخ پر انسانی زندگی کے آثار کا سراغ لگانے کا اعلان کیا تو قاسمی شعلہ مستعجل کی مانند بھڑک اُٹھے اور انھوں نے امریکا کی ان زیادتیوں کی نشان دہی کی جن کی وجہ سے اس دنیا میں حیاتِ انسانی کو خطرہ درپیش ہے۔ امریکا کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امریکا چند برس بعد مریخ پر ایک آلات بردار جہاز اُتارنے والا ہے۔ اس جہاز کا ایک مشینی بازو مریخ کی مٹی کے نمونے سمیٹے گا اور یوں اس مٹی کے معائنے سے مریخ پر زندگی کے وجود کا سراغ لگایا جائے گا۔ خلا کی تسخیر کی طرف یہ ایک اہم قدم ہوگا مگر کیا یہ دل چسپ بات نہ ہوگی کہ مریخ پر جانے سے پہلے خلائی جہاز کا یہ مشینی بازو خود زمین کے بعض حصوں کی مٹی کے نمونے جمع کرے اور امریکی لیبارٹریوں میں اس مٹی کے سائنسی تجزیے کے بعد دنیا کو بتایا جائے کہ اس مٹی میں سے زندگی کے آثار کب ختم ہوں گے اور کہیں ہائیڈروجن بم پھٹنے کے بعد بھی اس مٹی میں زندگی کے زندہ رہنے کا کوئی امکان تو باقی نہیں رہ جاتا۔'' ۳۶

دنیا کے جس خطے میں بھی ظلم ہوگا، قاسمی کا قلم وہاں پہنچ جائے گا۔ یہ ستم ان کے جذبات و احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے جس کے نتیجے میں ان کے کالموں کے الفاظ اور جملے انسانی ہمدردی کے ترجمان ہیں۔ ان کے متعدد کالم یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ استحصال کا شکار غریب اور عام افراد کیوں ہوتے ہیں؟ زندگی کی نعمتوں سے نادار افراد کیوں محروم ہیں؟ ظفر محی الدین اپنے مضمون ''اردو کالم نگاری کے مردِ بزرگ'' میں لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی نے اپنے ملک کے مظلوم طبقات کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ افریقی، ایشیائی اور لاطینی امریکی عوام پر ہونے والے مظالم اور مغربی سامراج کی پالیسیوں کے خلاف بھی جدوجہد کی۔'' ۳۷

سیاست کے موضوع پر لکھے گئے کالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کالم نگار کے پاس مطالعہ اور مشاہدے کی کمی نہیں۔ قاسمی سیاسی موضوعات اور خبروں پر اتنے ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز سے بحث کرتے ہیں کہ طبیعت ادق نہیں ہوتی۔ قاسمی ان کالموں میں اشارتاً، کنایتاً اور مزاحیہ انداز میں سیاسی تجزیہ پیش کر کے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۷۲ء میں جب روس اور امریکا کے مابین معاہدوں پر دستخط ہوئے تو:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری باتیں ٹیلی فون کے ذریعے پہلے ہی طے پا گئی تھیں۔ بس ماسکو میں صدر نکسن کی آمد کی کمی تھی۔ یہ کمی دور ہوئی تو آج کل طرفین طے شدہ معاہدوں پر یوں کھٹا کھٹ اور فٹافٹ دستخط ثبت کیے جا رہے ہیں جیسے ڈاکیے ڈاک خانوں میں لفافوں پر مہریں لگاتے ہیں۔'' ۳۸

قاسمی معاشرے کے ہر پہلو کو کھلی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ سیاسی خلفشار اور معاشی عدم توازن میں اضافہ ہو رہا ہے جس کے باعث معاشرتی تقسیم دو طبقوں تک محدود ہے۔ وہ سماجی مرتبے کے بڑھتے تفاوت سے بے چین ہیں۔ وہ ان کے متعلق سوچتے ہیں پھر کالموں میں اظہار کرتے ہیں مثلاً پاکستان میں موجود سیاسی جماعتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''پاکستان کی سب سیاسی جماعتوں کی خدمت میں ہماری التجا ہے کہ وہ شخصیتوں کے پھیر سے نکلیں۔ شخصیتوں نے سیاسی جماعتوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اب اگر کسی سیاسی جماعت کو زندہ رہنا ہے تو اسے براہِ راست عوام سے تعلق پیدا کرنا ہوگا۔ اس تعلق کو حقیقی بنانا ہوگا۔'' ۳۹

سیاسی جماعتوں سے وابستہ افراد معصوم پاکستانیوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ سیاست سے وابستہ افراد غریب عوام سے بناوٹی ہمدردی پیدا کرتے ہیں۔ عوام اور سیاسی حضرات کے مابین غیر حقیقی تعلق ہے مثلاً کسانوں کے چند بچے دھوپ میں کھیل رہے تھے جب ایک سیاسی فرد نے کسانوں کو بلا کر کہا:

''آپ کے بچوں کو دھوپ میں کھیلتا دیکھ کر بڑا افسوس ہوا۔ میں لاہور جاتے ہی محکمہ جنگلات سے کہوں گا کہ وہ آپ کے گاؤں کے اردگرد گندم کے درخت لگا دے تاکہ بچے سائے میں کھیلیں۔'' ۴۰

قاسمی غیر ملکی وفد کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''پچھلے دنوں ہندوستان کے وزیراعظم نہرو دفتر خارجہ میں ایک لفٹ کے ذریعے اوپر جا رہے تھے تو راستے میں بجلی فیل ہوگئی۔ لفٹ لٹک گئی اور اس کے ساتھ پنڈت نہرو بھی لٹک کر رہ گئے۔۔۔ رہا یہ سوال کہ بجلی اس وقت کیوں فیل ہوئی۔ جب پنڈت نہرو لفٹ سے کام لے رہے ہوں تو عرض یہ ہے کہ ہر شخص کے ماتھے کا ایک اپنا ستارہ ہوتا ہے۔'' ۴۱

اپنے وطن سے محبت ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ وہ اپنے وطن کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اگر وہ اپنے

کالموں میں جہاں باغ کے کانٹوں کا شمار کرتے ہیں وہیں پھولوں سے بھی غافل نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں روشن خیالی عطا کی ہے جو انھیں اندھیرے میں بھی اُجالا دیکھ لینے کا ہنر عطا کرتی ہے۔ قاسمی نے کالم محض اخبار کا پیٹ بھرنے یا اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے نہیں لکھے اور نہ ہی ان کے کالم لکھنے کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہے۔ ان کے فکاہی کالموں کے پس پردہ مقصدیت کارفرما ہوتی ہے تاکہ انسان دوستی کے جذبے کو فروغ ملے۔ قاسمی کے کالم موضوعات کی قدغن سے یکسر آزاد ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں ادبی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی مسائل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے نزدیک سیاست، معاشرت اور معیشت قومی رویے کے تین پہلو ہیں جو ایک دوسرے کو متاثر کرتے، ایک دوسرے کی مدد کرتے اور ایک دوسرے کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ جب کسی واقعہ یا حادثے پر تبصرہ کرتے ہیں تو تینوں پہلوؤں کو زیر بحث لاتے ہیں۔ قاسمی سیاست کی کوچہ گردی بھی کرتے ہیں اور معاشرتی زندگی کے مظاہر کو بھی طنز و مزاح کا پیرہن عطا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ الفاظ کو نیا مفہوم دے کر زندگی کی ناہمواریوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ قاسمی کے سیاسی کالموں کے متعلق عبدالباری آسی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔یہ ارباب سیاست اور خداوندانِ بسط و کشاد کی غلط حکمت عملی پر کہیں ہنستے ہیں، کہیں طنز پر اُتر آتے ہیں، کہیں زہرخند کا مظاہرہ کرتے ہیں، کہیں شدید طنز کے زہر میں بجھے ہوئے تیر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس قدر شدید کہ فراخ کا لطیف عنصر بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔'' ۴۲

قاسمی اپنے کالموں میں کہیں سیاسی پارٹی پر بحث کرتے ہیں؛ کہیں اپنے قارئین کو سیاسی جماعتوں کی اقسام گنواتے ہیں؛ کہیں وہ مسلم لیگ کی قسمیں گنواتے ہیں اور کہیں سیاست سے ریٹائرمنٹ کی بات کرتے ہیں مثلاً ''چند سیاسی پارٹیاں'' کے عنوان سے قاسمی مختلف سیاسی شخصیات پر طنز کے وار کرتے ہیں۔ پھر عبارت کو مزید رنگا رنگ بنانے کے لیے اشعار کا برمحل استعمال بھی ہنرمندی سے کرتے ہیں:

> ''اب جسٹس پارٹی بھی پی ڈی پی سے رخصت ہو گی تو بوجھیے کہ باقی کیا رہا۔ چودھری محمد علی ویسے ہی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ مولوی فرید احمد ویسے ہی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔۔۔ اب اس پارٹی میں مسٹر نورالدین ہیں یا نواب زادہ نصر اللہ خاں ہیں یا چلیے ایک نواب زادہ صاحب کا حقہ بھی ہے۔ آہ! پی ڈی کی اس حالت زار پر میر کے یہ اشعار یاد آ رہے ہیں اور آنکھیں بھیگ رہی ہیں:
>
> کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو جا پڑا   یکسر وہ استخوان شکستوں سے چُور تھا
>
> کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر   میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا
>
> انا للہ و انا الیہ راجعون   رہے   نام   اللہ   کا! ۴۳

قاسمی جب سیاسی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو سیاست دانوں کی اندرونی کمزوریوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ سیاسی معاملات و امور پر لکھتے ہوئے کسی واقعہ، معاملہ یا خبر کا حوالہ دے کر سیاسی لیڈروں کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ وہ مخالفین پر سیدھے سادے انداز سے تیر اندازی کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان سیاسی شخصیات کو آئینہ دکھاتے ہیں تاکہ اپنے گریباں میں جھانک سکیں اور اپنے آستین پر غریب عوام کے خون کے چھینٹے دیکھ سکیں۔ قاسمی نے کالم کو موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے سیاسی کالموں میں صاحب اقتدار لوگوں کی پگڑیاں اُچھالی ہیں۔ ان کے کالموں کے غائر مطالعہ سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ وہ مشاہدہ اور تجربہ کی سان پر کسے ہوئے اعلیٰ پائے کے تجزیہ نگار ہیں۔ سرحد اسمبلی کے قائم مقام سپیکر کے کرسی جانے کا واقعہ مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کرسی کے عنوان پر چار نکات پیش کرتے ہیں:

۱۔ قائم مقام سپیکر کی طرح کرسی کو بھی اپنے مقام پر قائم نہیں رہنا چاہیے۔
۲۔ با اعتبار مزاج کرسی اپنے ہم نشیں کی ہوتی ہے ورنہ خالی کرسی پر کوئی بھی بیٹھ سکتا ہے۔
۳۔ جو کرسی سے اٹھا، گرتا ہے۔ اس لیے بیٹھے رہنے میں ہی عقل مندی ہے۔
۴۔ اراکین کا مل کر انھیں کرسی پر بٹھانا سپیکر کے دوبارہ انتخابات کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔

قاسمی بعض اوقات کسی تصویر کو کالم کی بنیاد بناتے؛ کسی سیاسی اور سماجی رہنما کے بیانات کے پوشیدہ پہلوؤں سے قارئین کو آگاہ کرتے ہیں اور بعض اوقات انہی افراد کی تصاویر پر موجود شکل و شباہت پر تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ مسند اقتدار شخصیات کو پھولوں کی چھڑی سے ضرب لگاتے تو کبھی حزبِ اختلاف کی چٹکیاں لیتے مثلاً مسٹر عبدالوحید مغربی پاکستان یونٹ 1 کے وزیر کی تصویر پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی تصویر کو لڑکپن کی تصویر قرار دیتے ہیں۔ بات سے بات نکالنے کے فن کے ماہر قاسمی نے بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار عطا اللہ مینگل کی ڈاڑھی اور بغیر ڈاڑھی کی تصویر دیکھی جس سے پہچان میں گڑبڑ کا احتمال ہوا۔ تصویر کے حوالے سے اپنے عہد کی صحافت پر نشانہ لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمیں خطرہ ہے تو صرف یہ کہ آئندہ چند برس میں کیفیت یہ ہو جائے گی کہ اخباروں کے دفتر میں قلم سے کام کرنے والوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ پورے کے پورے اخبار صرف تصویروں سے مزین ہوں گے اور جنھیں خبریں پڑھنے کا شوق ہو گا وہ ریڈیو سن لیں گے۔'' ۴۴

قاسمی کے کالموں کی ایک منفرد خوبی ان کا بے باکانہ پن تھا۔ اس حوالے سے ناہید ندیم لکھتی ہیں:

> ''اپنے کالموں میں اعلیٰ عہدے داروں کو (صدر، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، گورنر سمیت) سیدھا بلاواسطہ مخاطب کر کے اظہار خیال کرنے کا آغاز بھی ندیم صاحب نے کیا۔'' ۴۵

قاسمی سیاسی طنز نگار تھے۔ ان کے بیشتر کالم اگرچہ اس موضوع کے گرد گردش کرتے ہیں۔ وہ اقتدار کو خاص طبقہ سے چھین کر عوام کی دہلیز تک لانا چاہتے تھے۔ کبھی وہ حکومتِ وقت پر برستے ہیں اور کبھی نہایت خوش ذوقی اور سلیقے سے لگی لپٹی رکھے بغیر اہلِ اقتدار کی توجہ عوام کے مسائل کی جانب مبذول کراتے ہیں۔ پنجاب میں جب تعمیر مکانات کی وزارت قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تو قاسمی ملک میں مفلسی کے ہاتھوں تنگ عوام کے بے گھر ہونے پر طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''جن دنوں ''روٹی، کپڑے اور مکان'' کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے ''روٹی اور مکان'' کا نعرہ لگایا۔ انھوں نے کپڑے کو اپنے مطالبے سے خارج کر دیا تھا۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ روٹی اور مکان مل جائے تو میں اپنے مکان میں ننگا بھی بیٹھ سکتا ہوں۔'' ۳۶

جب تہذیبی قدریں اور ثقافتی مظاہر بے توجہی اور لاپرواہی کا شکار ہوتے ہیں تو نتیجتاً پورا معاشرہ بے سمت ہو جاتا ہے۔ جب روحانی زندگی بنجر ہونے لگتی ہے تو خارج میں بھی رستہ کھلنے لگتا ہے۔ اس موقف کو قاسمی نے کہیں نہایت شائستگی سے، کہیں دل گدازی اور کہیں نوحے کے پیرائے میں بیان کیا ہے:

> ''جب معاشرے میں دوستیاں اور محبتیں تک بزنس کے شعبے میں شامل کر دی جائیں تو اصول اور اخلاق کی پابندی کا مطالبہ کرنا دیوانگی معلوم ہوتا ہے۔ آج کل تو رشتے تک ترازو میں تل گئے ہیں اور بڑے بڑے نظریاتی دیوتا بھی صرف یہ سوچ کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار فرماتے ہیں کہ اس طرح معانی کی شرح کیا رہے گی۔'' ۳۷

قاسمی اپنی حساس طبیعت کے باعث ایسے معاملات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔ وہ اعلیٰ اور پست اخلاقی اقدار سے افرادِ معاشرہ کو غافل نہیں ہونے دیتے۔ وہ صداقت کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور اس رمز سے آگاہ ہیں کہ تحریر میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے فلاحِ انسانیت اور سدھار کے سچے جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قاسمی ایک فعال، حساس، سچے اور کھرے پاکستانی تھے۔ انھوں نے اپنے اوصاف کو طلب زر کا ذریعہ نہ بنایا۔ درحقیقت وہ عشاق پاکستان کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو پاکستان کی تعمیر و ترقی میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی زبان اور قلم دونوں تعمیر و استحکامِ پاکستان کے لیے وقف رہے۔ حب الوطنی قاسمی کا امتیاز تھا اور وجہ پہچان بھی۔ وظیفہ حیات تھا اور مقصدِ حیات بھی۔ محکمہ بحالیات کے سابق آفیسر ملک غلام جیلانی (تحریکِ استقلال کے ایک افسر کا بیان جنھیں پاکستان ایک جیل کی مانند دکھائی دیتا ہے) قاسمی ان پر اپنی حب الوطنی کا اظہار فخریہ انداز میں مندرجہ ذیل پیرائے میں کرتے ہیں:

> ''اگر جادو کے کسی کھیل سے کل تحریکِ استقلال برسرِ اقتدار آ جاتی ہے تو دیکھ لیجیے گا کہ ملک میں اس جیل کو جنتِ ارض قرار دینے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگائیں گے۔'' ۳۸

قاسمی کے کالم اپنے باطن میں رجائی انداز کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں امید افزا مستقبل کی خوش آئند جھلک دکھائی دیتی ہے جو پاکستان کے لیے ان کا خواب بھی ہے اور دیرینہ خواہش بھی۔ قاسمی کا شمار مسائل سے گھبرا کر مایوس ہونے والوں میں نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ایسے امید افزا مستقبل کے منتظر ہیں جب ان کے خواب حقیقت کا روپ اختیار کریں گے اور بزرگوں کی محنتیں رنگ لائیں گی۔ ان کے کالموں میں ہمیں وطن کی مٹی کی خوش بو، عوام کی بے بسی، ان کے مسائل کا حل اور معاشرتی ناہمواریوں کی کرب ناک تصاویر ملتی ہیں۔ اگر چہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ ہمیں ایک الگ قاسمی اپنے کالموں میں نظر آتا ہے جو کچلے ہوئے عوام کا دُکھ سمیٹنے کے لیے بے تاب ہے اور اپنے کالموں میں ان تصورات کی نشان دہی کرتے ہیں جس سے ہمارا وطن عزیز سنور سکتا ہے۔ وہ ان روایتی سیاست دانوں کے خلاف تھے جنھوں نے ہمارے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اُن کا قلم معاشرے کے ہر اس فرد کو سزا دینے کا قائل تھا جس نے اس ارضِ پاک سے غداری کی۔ وقار انبالوی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔اس کے چشمہ فکر و خیال سے جو سوتا پھوٹا، وہ جیسے جیسے بڑھتا، اور پھیلتا گیا۔ اس کا پاٹ دل نواز و دل کشا ہوتا گیا۔ بلاشبہ سیلان، فکر اور طوفانِ بیان کے ساتھ کبھی کبھی خس و خاشاک بھی ان سوتوں کے بہاؤ پر نظر آئے لیکن انہی خس و خاشاک سے تو قاسمی بے زار ہے اور انہی کو بہا کر اتنی دُور لے جانا چاہتا ہے کہ زندگی مصفا، پاکیزہ اور منور تر ہوتی چلی جائے۔ اس کا یہ عیب نہیں، ہنر ہے۔'' ۴۹

قاسمی اپنے کالموں میں معاشرے کے رِستے ہوئے ناسوروں کی نہ صرف نشان دہی کرتے ہیں بلکہ طنز کے نشتر چلا کر ان ناسوروں کے فاسد مادے کو نکالنے کی حتی الامکان کوشش بھی کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں بُری طرح سرایت کر چکے ہیں۔ وہ قوم کو باہمی اتفاق و اتحاد کا درس دینا کبھی فراموش نہیں کرتے۔ ایک احساسِ کمتری کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم مانتے ہیں کہ دشمن ملک کبھی کبھی دوست بھی بن جاتے ہیں اور دوست ملک کبھی کبھی دشمن بھی ہو جاتے ہیں مگر دشمن جب تک دشمن ہے وہ دشمن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ منطق صرف احساسِ کم تری کے مریضوں ہی کی ہو سکتی ہے کہ دشمن کے ہاتھ کو بوسہ دو ورنہ وہ تمھیں ایک اور ہاتھ مار دے گا۔'' ۵۰

قاسمی کے کالموں میں استحصالی معاشرے کے بے کس، مظلوم عوام کی چیخ و پکار بھی سنائی دیتی ہے اور دُکھ بھی ہوتا ہے لیکن اشتعال اور انگیخت کی ترغیب پیدا نہیں ہوتی۔ وہ سیدھے سادے، ہلکے پھلکے انداز سے معاشرے کی بے اعتدالیوں کی دُکھتی رگ پر طنز کرتے ہیں۔ اس طنز میں شدت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور یہ شدت تلخی کی حد تک پہنچ جاتی ہے لیکن یہ تلخی کرواہٹ میں تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ طنز کے ایسے نشتر چلاتے ہیں کہ قاری تلملا اُٹھتا ہے۔

یہ اس رمز سے آشنا ہیں کہ ہمارے دیس میں بھوک، جبر، ناانصافی اور ظلم و ستم کے دیو کا راج ہے۔ غریب مفلسی کے ہاتھوں تنگ آ کر خودکشی کرنے لگے ہیں۔ قاسمی نے اپنے کالموں میں حکمران طبقہ کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑنے کی حتی المقدور جسارت کی ہے۔ مفلس عوام پر مہنگائی کے کوڑے برسائے گئے۔ قاسمی حکمران طبقے کے سامنے اسلام کے سنہری دور کے حکمرانوں کا کردار پیش کرتے ہیں۔ مہنگائی ملک کا ایک گھمبیر مسئلہ ہے۔ اشیائے خوردنی کی مہنگائی سے عوام بدحالی کا شکار ہیں۔ اقتصادیات کے مفہوم سے ناآشنا اَن پڑھ افراد بھی روپے کی کمی اور مہنگائی کے موضوع پر محوِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ چینی کی قلت پر قاسمی طنزیہ لہجہ اپناتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مہینے میں ایک آدھ چھٹانک خرید لی۔ اسے خوب کوٹ پیس کر، چھان پھٹک کر، سفوف بنا لیا۔ پھر اس میں روح کیوڑا کے دو قطرے ٹپکا دیئے اور جب بھی جسم کو شیرینی کی ضرورت محسوس ہوئی، ڈبیا کھولی اور ایک چٹکی نسوار لے کر دونوں نتھنوں میں چڑھالی۔ رقم بھی بچے گی، جسم کی طلب بھی پوری ہو جائے گی۔" ۵۱

کسانوں نے چینی کے نرخ بڑھنے سے گندم کی بجائے گنا بونا شروع کر دیا۔ جس سے عوام کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک تو مہنگائی نے غریب عوام کا جینا دوبھر کیا ہے اور دوسرا ملاوٹ کرنے والے منافع خور تاجر انسانی صحت سے کھیل رہے ہیں۔ چائے میں لکڑی کا برادہ، چنے کی بھوسی، ماش کی دال کا چھلکا، بیری اور شیشم کے پتوں کی ملاوٹ، بناسپتی گھی میں چربی، موبل آئل، گریس ملائی جاتی ہے۔ چینی میں میدہ اور سوپ اسٹون جب کہ دودھ میں جوہڑوں کے پانی کے علاوہ سنگھاڑے کا آٹا بھی شامل کیا جاتا ہے۔ پسی ہوئی مرچوں میں پسی ہوئی اینٹیں ملائی جاتی ہیں۔ قاسمی طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

"ملاوٹ کے یہ نسخہ جات اس لیے بھیج رہا ہوں کہ آپ بے چارے ملاوٹیوں کے خلاف غلط افواہیں نہ پھیلائیں اور "حرف و حکایت" میں آئندہ کوئی ایسی غلطی نہ کریں جس سے اس بھولے بھالے کاروباری طبقے کو صدمہ پہنچے۔

ے
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہمدم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو " ۵۲

قاسمی نے گپ شپ کے انداز میں اداروں، افراد اور شخصیات پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے عوام کی دُکھتی رگ کو بھی چھیڑا ہے اور انھیں ہنسنے کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ یہ اپنے قارئین کو نئے نئے مفہوم، نت نئے افکار و خیالات سے روشناس کراتے ہیں۔ اپنے منفرد اندازِ فکر اور طرزِ نگارش سے قارئین کا دل جیت لیتے ہیں اور قارئین نہایت دل چسپی اور لگن سے کالم پڑھتے ہیں۔ مخاطب ان کی حاضر دماغی، خوش کلامی اور بذلہ سنجی کا معترف ہو جاتا ہے۔ تاجر حضرات کا اشیا میں ملاوٹ کرنا، پھر باجماعت نماز ادا کرنا، حکومت کے افراد کا تاجر حضرات کی حوصلہ افزائی کرنا، ان تمام

امور کی نقاب کشائی کرتے ہوئے طنزاً لکھتے ہیں:

''ان بیشتر افراد نے ملاوٹوں کے وہ کرتب دکھائے ہیں کہ انہی تاجروں نے کفن کو بھی اتنا مہنگا کر دیا ہے کہ آدمی مرنے سے بھی ڈرتا ہے کہ مر تو جاؤں مگر کفن بہت مہنگا ہے۔ اس کے سستا ہونے تک زندہ رہنے کی مصیبت کو سہنا پڑے گا۔'' ۵۳

قاسمی کے کالم پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح حکامِ بالا کی کوتاہیوں کا راز عوام کے سامنے فاش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ایوب خاور کا نکتہ نظر یہ ہے:

''ایک سچے اور کھرے صحافی کا چہرہ دیکھنا ہو تو کوئی احمد ندیم قاسمی کا چہرہ دیکھے، جو سورج کی طرح تپاں بھی ہے اور چاند کی طرح اپنی روشنی میں گداز بھی رکھتا ہے۔'' ۵۴

قاسمی نے نہایت مہارت سے تاجر برادری کی حقیقت منکشف کی ہے۔ جب حکومت کے بارسوخ افراد نے ملک بھر کے صنعت کاروں اور تاجروں کو مکمل تحفظ کے ساتھ ساتھ نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ بھی عنایت کیا۔ قاسمی مبالغہ آمیز لہجے میں لکھتے ہیں کہ تاجروں کا طبقہ واحد طبقہ ہے جس نے قیامِ پاکستان کے بعد ملکی ترقی کے لیے اپنا کردار تحسین وخوبی سے نبھایا ہے۔ یہ ملاوٹ کرنے والے، چند روپوں کی خاطر انسانی صحت سے کھیلتے ہیں:

''سچی بات یہ ہے کہ زر پسند معاشرے میں ہم نے صحت، اخلاق، معاشرتی اور تہذیبی قدروں کو دیمک کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ انھیں جی بھر کر چاٹے۔ اب بھی کہیں کہیں اگر کوئی قدر زندہ مل جاتی ہے تو سمجھ لیجیے کہ دیمک ابھی اس تک نہیں پہنچی اور کوئی دن کی بات ہے کہ وہ بھی دیمک کی زد میں آ جائے گی۔'' ۵۵

قاسمی اپنے معصوم قارئین کی توجہ طنز کے تیز نشتر سے سماج کے رِستے ناسوروں کے فاسد مادوں کی جانب بھی کراتے ہیں مثلاً آٹے میں ملاوٹ معاشرے کی الم ناک حقیقت ہے۔ قاسمی محکمہ خوراک کی توجہ مبذول کراتے ہوئے بعض افراد کی باہم گفتگو کو بھی اپنے کالموں کا حصہ بناتے ہیں:

''میاں طفیل محمد اور مسٹر بروہی نے ایک بار شاید آٹے کی اس خرابی ہی سے تنگ آ کر کہا تھا کہ ہمارے ملک میں لوگ بھوک سے نہیں مرتے، روٹی کھانے سے مرتے ہیں۔'' ۵۶

قاسمی اپنے کالموں میں افراد کی بے حسی اور اقدار کی شکست و ریخت کا نوحہ طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ دراصل ہمارے معاشرے کے افراد میں بددیانتی اس انتہا کو جا پہنچی ہے کہ محض کچھ نفع کمانے کی خاطر تاجر حضرات اپنے ہم وطنوں کی صحت سے کھیلتے ہیں۔ جب کچھ نفع کما لیتے ہیں تو حج کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بزرگانِ دین کے مزاروں پر مسکینوں کے لیے چاولوں کی دیگیں چڑھاتے ہیں؛ بڑے خشوع وخضوع سے نماز ادا کرنے کے بعد

تسبیح پر سبحان اللہ کا ورد کرتے ہیں اور تمام مناسک ادا کرنے کے بعد ملاوٹ کے نت نئے طریقے سوچتے ہیں۔ قاسمی دُکھ کے پیرائے میں لکھتے ہیں:

''خیر و شر کے درمیان جو دوستی ہم نے پیدا کی ہے اس کا جواب شاید ہی کوئی اور قوم دے سکے۔ یہ دوستی اتنی گہری ہے کہ خیر کو شر سے اور شر کو خیر سے الگ پہچاننا مشکل ہو رہا ہے۔'' ۵۷

قاسمی کے کالموں میں تہہ در تہہ مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے۔ کالم کا ظاہر و باطن ایک نہیں ہوتا۔ قاسمی بعض اوقات ایک بات کرتے ہیں لیکن باطن میں اس سے نیا مفہوم مترشح ہوتا ہے مثلاً حکومت جب عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی بات کرتی ہے تو مفلس عوام کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں کہ یہ مژدہ کس نئی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

''ایک دیہاتی نے اُٹھ کر اپنی قمیص اسٹیج پر پھینک دی اور بولا آپ ہمارا معیارِ زندگی بلند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے پیشگی قمیص حاضر ہے، دھوتی تو میں کسی صورت بھی نہیں دوں گا۔۔۔ مگر عوام کو اپنے معیارِ زندگی کا سراغ ضرور ملنا چاہیے۔ معیارِ زندگی کا نہ سہی زندگی کا سراغ مل جائے تو معیار کو وہ خود بخود ڈھونڈ لیں گے۔'' ۵۸

قاسمی بات سے بات نکالنے کے فن کے ماہر ہیں لیکن ایسے کہ کہیں بھی عبارت میں جھول پیدا نہ ہو، نہ ہی واقعات کا تسلسل ٹوٹے۔ ان کا قلم محض ادبی روایات کو ہی نہیں سمیٹتا بلکہ قومی اور عوامی مسائل پر بھی ان کا قلم یکساں جواہر ریزے بکھیرتا ہے۔ عام آدمی کے مسائل پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عوام پر مصائب لانے والے حکومت کے بےعمل ادارے اور سیاست دان ہیں جو ملک عزیز کو دیمک کی طرح اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ وہ عوام کو ان سفید ہاتھیوں سے خبردار کرتے تھے۔ ایسا لکھتے ہوئے ان کا قلم تلخ ہو جاتا ہے۔

قاسمی سیاسی موضوعات پر لکھیں یا معاشرتی موضوعات پر خامہ فرسائی کریں ان کا مطمحِ نظر غریب اور پسماندہ عوام کے مسائل کو منظرِ عام پر لانا ہے۔ وہ ایک نڈر اور بے باک کالم نویس تھے جن کا قلم نہ بکتا تھا اور نہ ہی جھکنا گوارہ کرتا تھا۔ قاسمی اپنے کالم میں ''عوامی مسائل اور وزرا کی تقریریں'' کے عنوان سے عوامی مسائل کی جانب توجہ مبذول دلاتے ہیں مثلاً جب حکومت کے افراد نے عوام کو خوش آئند مستقبل کی اُمید دلائی۔ یہ بھی کہا کہ برسرِ اقتدار آ جانے کے بعد گورنر اور وزیر عالی شان عمارتوں میں نہیں رہیں گے تو اس پر قاسمی لکھتے ہیں:

''اُنھوں نے کہا تھا کہ اگر ہماری عوام ننگی ہوگی تو ہم بھی اعلیٰ قسم کے کپڑے نہیں پہنیں گے جب کہ انھیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ اگر عوام بھوکی ہوگی تو یہ بھی بھوکے ہوں گے۔ اگر عوام ننگی پیاسی بے گھر ہوگی تو یہ بھی بھوکے، ننگے، پیاسے اور بے گھر ہوں گے۔'' ۵۹

قاسمی کے کالموں کے موضوعات عام آدمی کے مسائل ہیں جنھیں حکام بالا تک رسائی نہیں ملتی۔ وہ اپنے

کالموں میں کسی خبر، واقعے، مثال، روایت کے ذریعے قاری کو مکمل گرفت میں لیتے ہیں۔ پھر انتہائی سادہ عام فہم الفاظ و عبارت استعمال کرتے ہوئے حکام بالا اور صاحبِ اختیار و اقتدار کی توجہ عوام پر کی جانے والی زیادتیوں پر مرکوز کرتے ہیں مثلاً ٹول ٹیکس کے متعلق لکھتے ہیں:

''۔۔۔یہاں تک لاہور میں کارپوریشن نے پبلک کے لیے جو بیت الخلا تعمیر کیے ہیں ان میں ٹول ٹیکس ہے یعنی اگر آپ کی جیب خالی ہے تو یہ آپ کا مسئلہ ہے یا آپ کے پاجامے کا۔'' ۶۰

قاسمی کے کالموں میں زبان و بیان کی شیرینی اور شگفتگی بھی ملتی ہے جو قارئین کو محظوظ کرنے کے ساتھ ساتھ تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔ مزاح اس شگفتہ کیفیت کا نام ہے جو ماحول کی ناہمواریوں اور بے ربطیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ بے ڈھنگی اور بے ہنگم چیزوں کو دیکھ کر قاری میں بھی مسکرانے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ قاسمی ماہر فن کار کی طرح اپنے گرد و پیش کے ماحول کی ناہمواریوں کو دریافت کرتے ہیں اور انھیں ہمدردانہ شعور کے ساتھ نہایت ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری خندہ زیرلب کی کیفیت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ قاسمی کے کالموں کے حوالے سے نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

''قاسمی صاحب بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کا مزاحیہ کالم شروع سے آخر تک پڑھتے جائیے۔ ہنسی کے ہلکے ہلکے فوارے پھوٹتے رہیں گے۔ وہ ہر موضوع پر لکھتے ہیں اور ہر رنگ میں لکھتے ہیں۔ زبان و ادب کی چاشنی سے ان کی یہ تحریریں جہاں صحافت کا حصہ ہیں وہاں وہ ادب میں بھی شامل ہیں۔'' ۶۱

قاسمی کی شخصیت شاعری اور افسانہ کی نسبت کالم میں مختلف ہے۔ شاعری اور افسانہ میں تو زندگی کی تلخیوں کو کرب ناک انداز سے بیان کرتے ہیں لیکن کالموں میں خوب ہنستے ہیں۔ خود بھی قہقہے لگاتے ہیں اور قارئین کو بھی مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ معروف کالم نویس نصر اللہ خان، قاسمی کی کالم نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔۔ان کے مزاح میں کلیوں کی چٹک ہے۔ پھولوں کی خوشبو ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ وہ آنسو پی کر مسکراتے ہیں۔۔۔ ان کا مزاح بھی ایک بھلے آدمی کا مزاح ہے۔'' ۶۲

شوخی اور مزاح کی جانب قاسمی کی طبیعت ابتدا سے ہی مائل تھی۔ آغاز میں جب قاسمی نے مزاحیہ کالم تحریر کرنے پر توجہ مرکوز کی۔ ان کی شوخی طبیعت اور فکاہیہ کالم کی ابتدا کے متعلق پیرزادہ محمد بخش رقم طراز ہیں:

''۱۹۵۲ء میں جب اس نے ''امروز'' میں مزاحیہ کالم ''حرف و حکایت'' لکھنا شروع کیا تو عام لوگ شاہ کی شخصیت کی سنجیدگی اور وقار سے دھوکا کھا گئے اور اس شبے کا اظہار کیا

گیا کہ یہ شخص مزاح سے کیسے نپٹے گا مگر میں جانتا ہوں کہ شاہ کے مزاح کی شوخی کو
اظہار کا صحیح ذریعہ ملا ہے۔" ۶۳

وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ پیرزادہ محمد بخش کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ جب فکاہی کالم نویسوں کی فہرست میں قاسمی کا نام بھی شامل ہونے لگا۔ چراغ حسن حسرت نے کالم کے شبستانِ ظرافت میں جو شمع روشن کی اس کے آب و تاب کو قائم رکھنا کارے دارد تھا۔ قاسمی نے نہایت کامیابی سے اس مرحلے کو طے کیا۔ وقار انبالوی لکھتے ہیں:

"۔۔۔قاسمی کے سوز و درد نے اس مشکل کو بڑے طلسماتی انداز میں حل کیا۔ طلسماتی
یوں کہ سوز و درد کی جھلک تو بہت باریک بینی کی متقاضی ہے لیکن گل باری و گل ریزی
اُسی طرح جاری ہے۔" ۶۴

بطور کالم نویس قاسمی کی ادبی خدمت اپنی مثال آپ ہے۔ بہت کم مدت میں ان کے کالموں کا وسیع ذخیرہ ملتا ہے۔ اس حوالے سے وقار انبالوی رقم طراز ہیں:

"حرف و حکایت کا کالم نوے سطر کا ہے اور ہر سطر میں دس سے زیادہ الفاظ سماتے ہیں۔
پھر کالم کے اخیر میں اکثر و بیشتر یہ چھپا ہوتا ہے کہ آگے فلاں صفحہ، فلاں کالم دیکھئے۔
یوں قاسمی اوسطاً ایک ہزار الفاظ روزانہ اس کالم میں لکھتا ہے یعنی سال بھر میں تین لاکھ
پینسٹھ ہزار الفاظ اور دس برس کے حرف و حکایت کے الفاظ کی تعداد چھتیس، سینتیس لاکھ
کے درمیان ہوتی ہے۔ آپ ہی سوچیں کہ مختصر سے مختصر بھی انتخاب ہو تو کتنی ضخیم کتاب
ہو سکتی ہے۔" ۶۵

قاسمی کے قارئین کا حلقہ نہایت وسیع ہے۔ ان کے کالموں میں عالم فاضل ہی نہیں بلکہ کم تعلیم یافتہ افراد بھی دل چسپی رکھتے ہیں۔ موج در موج کے کالم "حرف و حکایت" کی طرح ہلکے پھلکے، شگفتگی کے حامل مزاحیہ کالم ہیں جس میں اذکار و افکار کے ساتھ معاشرے کے مصائب کا بھی ذکر مہارت سے کرتے ہیں کہ قاری مسئلے کے گھمبیر ہونے پر گھبراتا نہیں۔ "موج در موج" اولین کالم ۲/مارچ ۱۹۷۸ء کو شائع ہوا۔ پہلے کالم میں واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ نہ سراسر مزاحیہ کالم ہے نہ جبڑے بھینچ دینے والا شدید نوعیت کا سنجیدہ کالم ہے۔ یہ
محض ہلکی پھلکی گفتگو کا کالم ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک شگفتہ کالم کہہ لیجیے۔ میں
اسے مزاحیہ کالم بھی قرار دے سکتا تھا مگر ہماری معاشرت اور سیاست کے زیرِ اثر مزاحیہ
کالموں میں بھی ذاتیات گھستی چلی آ رہی ہے نظریاتی چھیڑ چھاڑ تو بہرحال جائز ہے مگر
کسی نظریے کے حوالے کے بغیر اشخاص کی تضحیک میری نظر میں مزاح نہیں ہے۔۔۔
میری کوشش ضرور ہوگی جو بات بھی کی جائے ہلکے پھلکے انداز میں کی جائے مگر یہ قطعی

ضروری نہیں کہ سبھی قارئین اس سے محظوظ ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ موج در موج یخ بستگی
کے ماحول میں الفاظ کے چقماق سے چند چنگاریاں پیدا کرنے کی سعی کا نتیجہ ہے، اس
سے زیادہ کچھ نہیں۔" ۶۶

قاسمی خوش ذوق اور خوش قطع انسان تھے۔ وہ کسی کی بھی بدذوقی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بار قائداعظم کی "صد سالہ تقریبات" کی جگہ "صد سالہ برسی" کے الفاظ استعمال کرنے پر قاسمی نے اپنا سارا فکاہیہ کالم ریڈیو والوں کی لغزش کے حوالے سے لکھ ڈالا۔ انھوں نے ریڈیو والوں کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا:

"اطلاعاً عرض ہے کہ سال رواں میں قائداعظم کی صد سالہ برسی نہیں منائی جا رہی بلکہ
صد سالہ یوم پیدائش منایا جا رہا ہے۔" ۶۷

مزید لکھتے ہیں:

"۱۹۷۷ء کا سال علامہ اقبال کے صد سالہ یومِ ولادت کا سال ہوگا۔۔۔ ابھی سے
ذہن نشین کر لیں کہ برسی نہیں ہوگی۔ علامہ کی صد سالہ برسی تو آج سے ۶۳ سال بعد
۲۰۳۸ء میں منائی جائے گی۔" ۶۸

قاسمی اس طرح اپنے کالموں میں اپنے قارئین کو ساتھ لے کر صحت مند قہقہے لگاتے ہیں۔

صحافت کا پیشہ صحافی کو وقتی مصلحتوں کے جال میں جکڑ دیتا ہے۔ اکثر صحافی دل کی بات زبان پر لے آئیں تو دُکھ سہتے رہتے ہیں اور اگر نہ لا پائیں تو نئے گرفتار پرندے کی مانند زیرِ دام تڑپتے پھڑکتے رہتے ہیں۔ عبدالباری آسی، قاسمی کے روزنامہ "امروز" میں شامل "حرف و حکایت" کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"ندیم صاحب بھی لاکھ اعلیٰ پائے کے شاعر و ادیب سہی، کبھی کبھی محض مصلحت اندیش
صحافی بن کر رہ جاتے ہیں اور دل کی بات کہتے کہتے اسے ایسا موڑ دیتے ہیں کہ صاف
پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں تک قلم کار ادیب ہے اور اس کے آگے۔۔۔ صرف
صحافی۔۔۔ مثال کے طور پر پاکستان میں جہاز توڑنے کی صنعت پر بات اُٹھاتے ہیں
اور بات سے بات پیدا کرتے ہوئے یہ بلیغ جملہ کہتے ہیں: "دراصل جوڑنے کی
بجائے توڑنے کے فن میں ہم ایسے ماہر ہیں کہ توڑنے کے جوش میں اپنی ہی جوڑی
ہوئی چیزیں بھی توڑ ڈالتے ہیں؛ اس کے آگے ادیب کے قلم پر صحافی کی مجبوری گرفت
حاصل کر لیتی ہے اور وہ اس جملہ کو یہ بے جوڑ پیوند لگا دیتا ہے۔ "مثال کے طور پر
سڑکیں پیش کی جا سکتی ہیں۔" ۶۹

قاسمی نے اپنے کالموں بالخصوص "حرف و حکایت" اور "موج در موج" میں ملکی اور غیر ملکی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی برائیوں پر طنزیہ کالم لکھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ قاسمی طنزیہ انداز میں معاشرے کی گرتی ہوئی

اقدار پر چوٹ لگاتے ہیں:

''ہمیں یاد ہے کہ ایک زمانہ تھا جب چور پکڑا جاتا تھا اور سزا بھگتنے کے بعد واپس آتا تھا تو اپنا منہ چھپائے رکھتا تھا مگر اب معاشرتی قدریں اس حد تک منقلب ہو چکی ہیں کہ اگر کوئی چوری نہ کرے تو اسے مرد مانا ہی نہیں جاتا اور اگر محض بفرضِ محال پکڑا جائے تو فخر کرتا ہے اور چوری کو دلیری، بہادری اور حوصلہ مندی کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔'' ۷۰

کتنا گہرا طنز ہے، معاشرتی اقدار اور معاشرے میں بسنے والے افراد کے اندازِ فکر پر۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کی طنزیات نہ تو مجید لاہوری کی طرح عوامی ہے اور نہ ہی وہ عطاالحق قاسمی کی طرح چھوٹے چھوٹے افسانے اور انشایے تراشتے ہیں۔۔۔ یہاں تو تیز طنز ہے اور ہلکی پھلکی شگفتگی۔'' ۷۱

قاسمی کے کالموں میں طنز و مزاح کے تمام رنگ موجود ہیں۔ انھوں نے طنز میں شدت پیدا کرنے کے لیے مبالغہ اور موازنہ جیسے مختلف حربوں سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے کالم ہنرمند فن کار کی طرح کاغذ پر پھولوں کے ساتھ طنز و مزاح کے کانٹے بھی بکھیرتا ہے لیکن ان کانٹوں کی چبھن میٹھی ہے۔ ان کی اسی انفرادیت نے قاسمی کے کالموں کو اردو صحافت میں مقامِ بقا عطا کیا ہے۔ قاسمی اپنے کالموں میں جو طنز کے حربے استعمال کرتے ہیں اس میں زہرناکی نہیں بلکہ وہ طنز کے آمیزے سے ایسا ماحول تخلیق کرتے ہیں کہ قاری اس طنز کے نشیب و فراز میں محو ہو جاتا ہے۔ اپنے کالموں میں وہ سنجیدگی و متانت سے اپنے افکار و خیالات کا برملا اظہار کرتے ہیں تو کبھی رنگینی مزاح سے کام لیتے ہیں۔ ان کے کالموں میں مزاح کی شگفتگی اور طنز کی چبھن دونوں موجود ہیں۔ ان کے کالموں میں:

''۔۔۔ صحافت اور ادب کا ایک اچھا امتزاج ہے اور طنزیات کے اس سارے کاروبار میں ان کا قلم کہیں بھی آپے سے باہر ہوتا نظر نہیں آتا۔'' ۷۲

قاسمی کے کالموں میں ادب اور زبان و بیان کی چاشنی موجود ہے کہ قاسمی سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی طنز کی کاٹ، مزاح کی شگفتگی پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکے۔ نصر اللہ خاں، قاسمی کی کالم نگاری کا مبصرانہ جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زبان و ادب کی چاشنی سے ان کی یہ تحریریں جہاں صحافت کا حصہ ہیں وہاں وہ ادب میں بھی شامل ہیں۔'' ۷۳

قاسمی کے کالم جذباتی اور لفظی گھن گرج سے یکسر پاک ہیں۔ وہ اپنا مدعا نہایت سادگی و شستگی سے بیان کر دیتے ہیں۔ اپنے کالموں میں سنجیدگی، متانت اور ظرافت کا حسین امتزاج رکھنے والے قاسمی، اپنی آنکھوں سے قارئین کو گرد و پیش کے ماحول اور واقعات دکھاتے ہیں۔ طنز کے نشتر چلاتے ہوئے بھی اپنے قارئین کو لمحہ فکریہ عطا کرتے ہیں۔ قاسمی اپنے دوست کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے دوست نے ایک بچے کو گلی میں

کرکٹ کھیلنے سے منع کیا تو لڑکے کا باپ لڑائی جھگڑے پر اُتر آیا۔ قاسمی کے دوست نے کہا کہ:

''اگر میرا بیٹا وہاں جا کھیلے اور آپ کی کھڑکی کا ایک شیشہ توڑ دے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب ملا: آپ کے بیٹے کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' ۴۷

یہاں سے بات نے لڑائی کی صورت اختیار کر گئی۔ قاسمی کے دوست نے صرف اتنا کہا:

''ویسے ٹانگیں تو آپ کے بیٹے کی بھی ہیں مگر میں انھیں توڑوں گا نہیں، ان ٹانگوں پر میرے ملک کے مستقبل کا ایک حصہ کھڑا ہے۔'' ۵۷

اُن کے فکاہیہ کالم اپنے اندر مزاح سے زیادہ فکر و تدبر کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتے تھے چنانچہ یہ کالم مسکراہٹیں دینے کے ساتھ ساتھ قاری کی سوچ کے در وا کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کے اکثر افراد ناخواندہ ہیں جس کے باعث وہ رسم الخط سے عدم واقفیت رکھتے ہیں۔ گاؤں کی چوپال پر قاسمی اسکول ماسٹر سے رسم الخط کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ ایک بزرگ کسان رسم الخط سے عدم واقفیت رکھتے ہوئے نہایت معصومیت سے بولے:

''بابو لوگو! خط لکھنے کی رسم اچھی ہے۔ یہ شوق تم کل ڈاک خانے جا کر پورا کر لینا۔'' ۶۷

قاسمی قاری کو لمحہ فکریہ دیتے ہیں اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ان کسانوں کی سادہ لوحی اور چیزوں کے متعلق عدم واقفیت پر دُکھ کا اظہار کرے، وہ ان کی سادہ لوحی پر مسکرائے یا ناخواندگی کا ماتم کرے۔ ان کے کالموں میں ان کی پوری شخصیت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ عمر بھر فکاہی کالم لکھتے رہے لیکن عمر کے آخری حصے میں پیرزادہ احمد شاہ کے شوخ و شنگ جملوں نے سنجیدہ صورت اختیار کر لی۔ قاسمی ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میں نے فکاہی کالم لکھنا ترک کر دیا ہے۔ اب سنجیدہ سیاسی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی موضوعات پر لکھتا ہوں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اب اس عمر میں مصروفیات کے باعث روزانہ کالم لکھنا میرے بس میں نہیں ہے اور اگر فکاہی کالم روزانہ نہ لکھا جائے تو لطف نہیں آتا۔'' ۷۷

قاسمی کا ذریعہ معاش چوں کہ کالم تھا وہ اپنے خاندان کی بقا کے لیے روزانہ کالم لکھتے تھے۔ انھوں نے کافی عرصہ فکاہی کالم لکھے۔ جب نامور فکاہی کالم نویسوں کی فہرست میں ان کا نام شامل ہو گیا تو ۱۹۷۲ء میں قاسمی نے روزنامہ ''جنگ'' میں ''لاہور، لاہور ہے'' کے نام سے کالم لکھنے شروع کیے۔ یہ سلسلہ تادم آخر جاری رہا۔ اداریہ نما ان کالموں میں قاسمی مزاحیہ عناصر کی بجائے علمی، ادبی اور قومی مسائل کو منظرِ عام پر لاتے تھے۔ وفات سے چند روز قبل انھوں نے اپنے کالم میں جمہور کے حق میں کالم لکھا۔ علی تنہا لکھتے ہیں:

''انتقال سے چند روز قبل انھوں نے جمہور کے حق میں (اپنے کالم میں) مضمون لکھا

ہے۔ یہ ہے ادب سے سچے اور کھرے رشتے کا اعتبار، سو احمد ندیم قاسمی ہماری ادبی تاریخ
کا زندہ جاوید استعارہ بن گئے ہیں۔" ۸ے

قاسمی کے ہفتہ وار ان کالموں کی نوعیت تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی جائزے کی ہوتی ہے۔ عمرِ عزیز کے آخری حصہ کے کالموں میں وطن سے محبت، معاشرتی انحطاط، دورِ حاضر کے مسائل اور ملکی مسائل پر نہایت سادگی سے تبصرہ کرتے ہیں۔ قاسمی کے سنجیدہ کالموں کے اسلوب اور موضوعات کے متعلق ڈاکٹر عبدالغفار کوکب اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اپنے مخصوص اسلوب مزاح کے برعکس ان کے یہ کالم گہرے اندازِ فکر کے حامل تھے۔
ان میں ہمیں سنجیدگی اور متانت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کالموں میں ہمیں وہ
شوخ و شنگ پیرزادہ احمد شاہ ندیم کی بجائے وہ حساس شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی
نظر آتا ہے جو اپنے وطن کے سادہ لوح عوام کے مسائل پر کڑھتا ہے۔" ۹ے

قاسمی اپنی وفات سے چار روز پہلے تک کالم لکھتے رہے۔ ان کی وفات سے قبل شائع ہونے والے کالموں کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ تجھ کو پرائے کیا پڑیں، اپنی نبیڑ تو۔ ۴/جنوری ۲۰۰۶ء

۲۔ ہر ملک کو دنیا کے ہر ملک کی آزادی کا احترام کرنا چاہیے۔ ۱۵/فروری ۲۰۰۶ء

۳۔ مختاراں مائی کے ساتھ ہی اب اُردو مائی کی فریاد بھی سن لیجیے۔ ۱۰/مئی ۲۰۰۶ء

۴۔ بیسویں صدی کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل اور مسئلہ کشمیر۔ ۲۲/مئی ۲۰۰۶ء

۵۔ سیکورٹی۔ سیکورٹی، سیکورٹی۔ ۲۴/ جون ۲۰۰۶ء

۶۔ نیا آئین بنانا ناممکنات میں شامل ہے۔ ۶/ جولائی ۲۰۰۶ء

قاسمی کے کالموں کا وصف خاص ان کا اسلوب ہے جو قوت توانائی، شدت جذبات سے مسحور ہے۔ ان کی اپنے موضوع اور مواد سے دل چسپی ہر جملے اور حرف میں رچی بسی ہے۔ قاسمی کے اسلوب کا اہم وصف موازنہ ہے۔ موازنہ دو اشیا یا دو اشخاص کے مابین وہ تقابلی صورت ہے جو مشابہت اور تضاد کو نمایاں کرتی ہے۔ اس عمل سے ایک ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔ قاسمی موجودہ دور کے بادشاہوں اور خلفائے راشدین کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دراصل بادشاہ انسانوں سے دُور جا کر انسانوں سے مختلف مخلوق قرار پا گئے، ورنہ
حضرت عمر فاروق ؓ بھی تو ایک طرح سے بادشاہ ہی تھے مگر جب کسی بڑی طاقت کا
سفیر ان سے ملنے آیا اور لوگوں سے ان کے بادشاہ کے محل کا راستہ پوچھا تو انھوں نے

کہا: محل کیسا؟ ۔ ۔ ۔ رہا بادشاہ تو ہمارا تو خلیفہ ہوتا ہے اور ہمارا خلیفہ ادھر اس درخت کے
سائے میں پتھر کا تکیہ بنا کر ستانے کے لیے لیٹ گیا ہے۔'' ۸۰

قاسمی کے کالموں کا اہم وصف اختصار اور جامعیت ہے۔ وہ الفاظ کے استعمال میں فضول خرچی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ ان کی تحریروں میں ''کفایت لفظی'' کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قاسمی ہر لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اور جملے سے ایک لفظ بھی حذف یا تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ صوتی ہم آہنگی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''۔ ۔ ۔ خود ہمارا یہ عالم ہے کہ بھوک لگی اور کچھ کھانے کو نہ ملے تو ہاتھوں کے طوطے
تو رہے چاروں طرف فضا میں کھوتے تک اُڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔'' ۸۱

''طوطے'' اور ''کھوتے'' کی صوتی ہم آہنگی قاسمی کے کمالِ فن کی دل پذیر دلیل ہے۔ قاسمی کے نزدیک لفظوں کی بہت اہمیت ہے۔ وہ تخلیقِ مزاح کے لیے لفظوں سے بے تکلفی تو برتتے ہیں لیکن یہ بے تکلفی لفظوں سے معاندانہ سلوک کی بجائے دوستانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ وہ لفظوں کے برمحل استعمال سے کالم کا روپ دوبالا کر دیتے ہیں۔ ان کالموں میں قاسمی کی شخصیت کے جوہر زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں:

''بیٹے نے باپ کو لکھا کہ اب مجھے جو ماہانہ خرچ بھیجئے گا اس میں ایک سو روپے کا
اضافہ فرما دیجیے گا۔ مجھے ''انسائیکلوپیڈیا'' خریدنا ہے۔ باپ نے جواب دیا۔ پیارے بیٹے
ابھی دو ماہ پہلے تو تم سائیکل خرید چکے ہو۔ پھر اب تمھیں انسائیکلوپیڈیا پر بیٹھنے کا شوق
کیوں چڑھ آ رہا ہے۔ سائیکل سے کام لو۔ میں غریب آدمی ہوں۔ اپنے بیٹے کے لیے
انسائیکلوپیڈیا کی سواری کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ یہ بھی سوچو کہ کیا ہمارے باپ دادا
انسائیکلوپیڈیا چلاتے رہے ہیں کہ اب تمھیں اسے چلائے بغیر چین نہیں آئے گا۔ ویسے
یہ تو بتاؤ انسائیکلوپیڈیا میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے۔ کیا سائیکل کے مقابلے میں اس میں
صرف ایک پہیہ ہوتا ہے۔'' ۸۲

قاسمی اپنے فکاہی کالموں میں ایسے واقعات اور معاملات کو بنیاد بناتے ہیں جس میں مزاح کا پہلو نکلتا ہے۔ ان کالموں میں قارئین کی دل چسپی اور تفریح کا پہلو پیدا کرنے کے لیے الفاظ سے کھیلا جاتا ہے مثلاً قاسمی پی۔آئی۔اے کے مختصر الفاظ لے کر اپنے کالم میں شگفتگی کے عناصر دل پذیر انداز میں بکھیرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''پی آئی اے میں جو یونین بنتی ہے، ان میں پی اور آئی اور اے کے حروف ضرور شامل
ہوتے ہیں۔ اردو میں ان حروف سے ''پیا'' کا لفظ بنتا ہے جو محبوب کے معنوں میں
مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بھی یونین بنے گی اس میں یہ ''پیا'' ضرور موجود ہو گا
چناں چہ پی آئی اے میں سب سے پہلی یونین کا نام ''ایوبیا'' تھا۔ سابق صدر ایوب کا

زمانہ تھا اور ادھر مری کی طرف ''ایوبیا'' کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس لیے لوگ
اس یونین کو ایوبیا ہی کہنے لگے۔'' ۸۳؎

قاسمی کے کالموں کے مطالعہ سے بے زاری کا احساس نہیں ہوتا بلکہ طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔ ان کے کالموں کو شبنم کی اس پھوار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو آنکھوں کو طراوت بخشنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈک کا احساس بھی دلاتی ہے۔

قاسمی اگر چہ اعلیٰ قوت متخیلہ، تیز مشاہدہ اور جودتِ طبع کے مالک تھے جس کی وجہ سے اندازِ بیان میں تغیر کے باوجود ان کی شخصیت کا اُجلا رنگ ان کے منفرد و دل کش اسلوب کو ختم نہ کر سکا۔ قاسمی مضحکہ صورتِ واقعہ سے بھی مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے ہاں طبع زاد یا خود ساختہ واقعات موجود ہوتے ہیں۔ وہ کبھی دوسروں کو پیش آنے والے واقعات سے استفادہ کرتے ہیں اور کبھی اپنے واقعات بیان کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ واقعہ کالم کے مطالعہ میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ چناں چہ ان کے اکثر کالموں میں کوئی قصہ یا واقعہ ضرور موجود ہوتا ہے جو قارئین کے ذوق میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ ایک مچھر اور مچھیرن کے مابین مکالمے کو مزاحیہ رنگ دیتے ہیں کہ مچھر اگر موڈ میں ہو تو نہ صرف انسانوں کی طرح بولتا، باتیں کرتا ہے بلکہ جس علاقے کا باشندہ ہو، زبان بھی ویسی ہی بولتا ہے:

''جاگ رہا ہے، نہ منہ کھلا ہے، نہ خراٹے مار رہا ہے۔ دیکھنا کہیں ہاتھ نہ مار دے۔
مچھیرن بولی: تم کاٹ کے تو دیکھو۔ اگر اس نے کوئی حرکت نہ کی تو میں بھی اس کا ایک آدھ گھونٹ پی لوں گی۔ مگر یہ تم کس پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہ تو بوڑھا سا ہے کسی جوان کو تاکو کہ جوانوں کے خون میں کوکا کولا کا سا مزہ آتا ہے۔
جب مچھر نے ڈرتے ڈرتے حضرت انسان کو کاٹنے کا سوچا تو اشرف المخلوقات انسان نے فوراً اپنا ہاتھ کمبل میں کر لیا تو مچھیرن بولی: مٹ مارے پڑا تھا! جوانوں کی نیند بہت گہری ہوتی ہے، انہی کو کاٹا کرو، خدا نخواستہ یہ کم بخت تم پر ہاتھ مار دیتا۔ میں غریب تو بیوہ ہو جاتی۔
تم میری فکر چھوڑو میں نے آج ایک موٹی سی بیگم کا بہت سا خون پیا ہے تم اپنی بھوک پیاس جلدی سے بجھا لو۔ کیوں کہ آدھی رات کو تمہیں مچھروں کے جلسہ عام کی صدارت بھی تو کرنا ہے۔'' ۸۴؎

قاسمی اس طرز کے دلِ چسپ واقعات قصہ گوئی کے شوق میں نقل کرتے ہوئے صورتِ حال کے مطابق ان کا اطلاق کرتے ہیں۔

فکاہیہ کالم نویس ہونے کی بدولت قاسمی اپنی تحریر کو دل چسپ اور شگفتہ بنانے کے لیے لطائف سے بھی مدد لیتے ہیں۔ قاسمی پامال لطائف سے گریز کرتے ہوئے تازہ لطائف کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ لاہور میں بسوں

کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں ایک غریب مسافر کی چادر چوری ہو گئی۔ تلاش بسیار کے باوجود جب چادر دست یاب نہ ہو سکی تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چادر کے غم میں آئندہ سے داڑھی نہیں منڈوائے گا۔ ایک روز اس نے سرراہے ایک پھٹے حال بزرگ کو دیکھا جس کی داڑھی اس کی ناف تک پہنچ رہی تھی۔ قریب جا کر اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا: قبلہ، کیا آپ کا پورا بستر کھو گیا ہے؟ سو بسوں کے معاملے میں کراچی والے صرف ایک چادر سے محروم ہوئے ہیں۔ مگر بے چارے اہلِ لاہور تو اپنا اوڑھنا بچھونا سب کچھ کھوئے پھرتے ہیں۔'' ۸۵

واقعہ اور لطائف کے ساتھ ساتھ قاسمی کے کالموں میں افسانوی عناصر بھی موجود ہیں۔ وہ موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے بعض اوقات ایک افسانوی فضا ترتیب دیتے ہیں لیکن اس عمل کے دوران بھی اپنی روایتی زندہ دلی اور شگفتگی کو قائم رکھتے ہیں مثلاً گزشتہ عالمی جنگ کے دوران ایک مفلس نوجوان دیہاتی کسان کو اپنی نو بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر جبراً پولیس میں بھرتی ہونا پڑا۔ ایک دن پولیس کی پارٹی آئی اور کھیت کی کھدائی شروع کر دی۔ پولیس والوں نے کھیت کھود ڈالا۔ دلہن نے اس کا سبب پوچھا تو بتایا گیا کہ اس کے میاں نے بیوی کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ میاں نے بیوی کے لیے ایک لاکھ پونڈ زمین میں دفن کر رکھے ہیں۔ انھیں کھود کر نکالو اور زندگی کے دن مزے سے بسر کرو۔ پولیس نے چپہ چپہ کھود ڈالا لیکن پونڈ نہ ملے۔ دلہن نے خاوند کو خط لکھا کہ یہ کیا مذاق ہے؟ جواب آیا:

''اسی لیے تو لکھا تھا کہ تم نرم و نازک لڑکی ہو۔ کھیت کیا کھودو گی۔ اب کھیت کھد چکا ہے تو اس میں آلو بو دو اور مزے اُڑاؤ۔'' ۸۶

قاسمی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ چناں چہ ۱۹۵۱ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت انھیں جیل ہوئی۔ جیل جو سوہانِ روح ہے جہاں انسانی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ قاسمی جیل کی روداد بیان کرتے ہوئے نہایت جزئیات کے ساتھ جیل کے اندر کا ماحول اور قیدیوں کی حالت زار بیان کرتے ہیں کہ تمام منظر آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے:

''ہم ایک کوٹھری میں کچے اور گیلے فرش پر نڈیوں، جھینگروں، چیونٹیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کے ہمراہ سوئے۔ ہمارے سر کے نیچے سے اینٹ کا تکیہ بھی نکال لیا گیا کہ جیل میں اینٹ کا ٹکڑا اسلحہ کی ذیل میں آتا ہے۔ ہم نے وہاں کالے رنگ کی وہ دال کھائی جس کے بارے میں ہم نے پوری جیل میں اعلان کر دیا تھا کہ اگر دال کے اس پیالے میں سے کوئی دال کا ایک دانہ بھی دریافت کرے تو ہم اسے ساری دال دے دیں گے۔ صبح ناشتے میں ہم نے چنے کھائے اور رات کو مچھروں نے ہمارا ڈنر کھایا۔'' ۸۷

ملک میں چینی کی قلت پیدا ہو جاتی ہے تو قاسمی اس کو مبالغہ کے رنگ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگ اپنے مہمانوں کو بڑی قیمتی ڈبیوں اور صندوقچیوں میں محفوظ رکھی چینی دکھا کر فخر محسوس کریں گے اور دیکھنے والوں کی آنکھیں بیش قیمت جواہرات کو دیکھ کر دنگ رہ جائیں گی۔ وہ کہیں گے:

''اتنی بڑی قربانی! یعنی آپ میرے لیے چینی جیسی چیز کا پورا چمچہ لے آئے ہیں۔ نہیں میں اس قابل کہاں؟ میری طرف سے یہ چمچہ اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر دیجیے گا۔ شکریہ۔'' ۸۸

قاسمی چینی کی قلت کے باعث حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ اگر ہماری حکومت مانے تو:

''۔۔۔جلدی جلدی سے چینی کا ایک آدھ من محفوظ کر کے اسے عجائب گھر میں منتقل کر دے تاکہ آئندہ نسلیں جب کتابوں میں چینی کا ذکر پڑھیں تو اسے گڑ نہ سمجھ بیٹھیں۔ چینی کو فوری طور سے نوادرات میں شامل کر لینا بے حد ضروری ہے۔'' ۸۹

قاسمی کے کالموں میں ''تجاہلِ عارفانہ'' کی کارفرمائی بھی دکھائی دیتی ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن جانا قاسمی کی ادائے خاص ہے۔ اس ادائے خاص کو عطاالحق قاسمی ''تجاہل کالمانہ'' کا نام دیتے ہیں۔ تحقیق اگرچہ تلاش، کھوج اور جستجو کا نام ہے لیکن قاسمی کی تحقیق فی البدیہہ ہوتی ہے مثلاً مقبرہ نور جہاں کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ یہ نور جہاں بلحاظِ نسل پٹھان تھا اور جہانگیر کا محبوب مقرب تھا۔ نور جہاں کی وفات پر جہانگیر نے اسے مقبرہ بطور انعام دیا تھا مگر کتابت کی غلطی کے باعث مقرب نور جہاں کی بجائے مقبرہ نور جہاں رہ گیا:

''۔۔۔نور جہاں کا مقبرہ جو سری نگر میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا علم، ہمارے سمیت کسی کو نہیں ہے۔ اور علم ہونا ضروری بھی نہیں ہے کیوں کہ تحقیق کی نہیں جاتی، تحقیق تو ـــــ محبت کی طرح ـــــ شعر کی طرح ـــــ بس ہو جاتی ہے۔'' ۹۰

قاسمی کے اسلوب کی انفرادیت ''جملہ سازی'' بھی ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب اور خیال کی شوخی سے ایسا جملہ ترتیب دیتے ہیں جو قاری کو ذہن نشین ہو جاتا ہے اور عمدہ شعر کی طرح حافظے کا حصہ بن کر محفوظ رہ جاتے ہیں۔ مناسب جملے سازی سے تحریر کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ ذیل میں قاسمی کے چند شوخ اور شگفتہ جملے دیے جاتے ہیں:

''مجھے یقین ہے کہ اسے ''بس سٹروک'' ہو گیا ہے۔'' ۹۱

''کسی شخص سے کرسی خالی کرا کے اس کرسی پر قبضہ کرنے میں جو مزا ہے وہ کسی خالی کرسی پر بیٹھنے میں کہاں۔'' ۹۲

''بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ کدال تو شاہی قلعے میں چلے اور مورتی صاحبہ حویلی

دھیان سنگھ میں نمودار ہو پڑیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ کھانا تو ہم کھائیں اور پیٹ ہمارے پڑوسی کا بھر جائے۔" ۹۳

"ساون کی آوارہ بدلی کو شرارت سوجھی اور ٹوٹ کر برس پڑی۔" ۹۴

قاسمی کے کالموں میں بعض لفظوں اور جملوں کی تکرار دکھائی دیتی ہے لیکن یہ تکرار قاری پر گراں نہیں گزرتی۔ لکھتے ہیں:

"سنا ہے سابقہ پنجاب کے علاقے میں چینی کی چیں بول گئی ہے اور مرکزی حکومت کا راوی چین لکھتا ہے۔ یعنی مرکز کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہ جو ہم نے تمھیں دسمبر میں چینی دینے کا وعدہ کیا تھا تو وہ وعدہ بدستور موجود ہے لیکن چینی موجود نہیں اس لیے چین کی بنسی بجاؤ اور چین بجیں ہونے یا تکتہ چینی پر اُتر آنے کی بجائے چینی کا انتظار کرو۔" ۹۵

قاسمی کے کالموں کا اسلوب تحریر روانی، سادگی اور سلاست سے عبارت ہے۔ یہ اسلوب بظاہر سادہ نظر آتا ہے لیکن اس میں کمال درجے کی پرکاری بھی موجود ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال میں مشکل پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ قاسمی درست اور معیاری زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ درست املا کا خاص اہتمام بھی کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب گنجلک اور پیچ دار نہیں ہے۔ وہ اپنے کالموں میں کتابت کی غلطی اور اضافی الفاظ کے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں مثلاً ایک اخبار میں یوں درج تھا:

"بھارت کے دفاعی بجٹ پر دس عرب خرچ ہوں گے۔" ۹۶

ایک شادی کی تقریب میں میراثی نے دولہے کو دُعا دی:

"خدا آپ کا علامہ اقبال بلند کرے۔" ۹۷

قاسمی اپنے کالموں میں شعر یا مصرع کو بروئے کار لاتے ہیں تو تحریر کی برجستگی، تاثیر اور معنویت میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً ۱۹۷۲ء میں جب مفتی محمود کی جانب سے شراب پر پابندی لگائی گئی تو پشاور کے آسمان پر بادل چھا گئے۔ اس حوالے سے قاسمی، اختر شیرانی کا یہ شعر رقم کرتے ہیں:

پارسائی کی جواں مرگی نہ پوچھ
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی ۹۸

کراچی کی بسوں کے متعلق لکھتے ہیں:

عمر دو روزہ بس ہی پکڑنے میں کٹ گئی
ہم سے تری جفا کا گلہ بھی نہ ہو سکا ۹۹

قاسمی اپنی تحریروں کو شگفتہ بنانے کے لیے جہاں ماضی کے حوالے دیتے ہیں وہیں چٹکلوں، لطائف اور موقع محل کی

مناسبت سے کلاسیکی و جدید شعرا کے اشعار بھی اپنے کالموں کا حصہ بناتے ہیں۔ یہ اشعار تحریر میں یوں محسوس ہوتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑ دیے ہوں۔ ان اشعار کے استعمال سے جہاں قاسمی کے کالموں میں تاثر پیدا ہوتا وہیں قاری کالم نویس کے وسعتِ مطالعہ سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ قاسمی ذاتی جذبات و احساسات سے بھی کام لیتے ہیں۔ کئی باتیں بین السطور اور بالواسطہ کہہ دیتے ہیں اور بعض اوقات کئی باتوں کے لیے اشاروں، کنایوں، علامتوں، محاوروں اور تماثیل کا سہارے ڈھونڈتے ہیں لیکن اپنا مافی الضمیر واضح کرنے سے باز نہیں آتے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''مگر جس شاعر کا نام سید مستنصر باللہ شاہ ہو۔ وہ تو اس نام کو مقطع میں استعمال کرنے بیٹھے گا تو اسے دانتوں پسینہ آ جائے گا۔'' ۱۰۰

قاسمی ہنسی مذاق میں بڑے پتے کی بات بھی کہہ جاتے ہیں۔ جب لطائف کا ذخیرہ ان کے پاس ختم ہونے لگتا ہے تو وہ اپنے قارئین، دوست، احباب کے خطوط پر تبصرے شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد پھر قصہ گوئی اور لطیفہ بازی کرنا شروع کر دیتے ہیں مثلاً بگاڑنے کے متعلق تحقیق کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ناموں کے تلفظ بگاڑنے کے پیچھے کسی کی جہالت یا احساسِ کم تری پوشیدہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''گردشِ ایام نہیں تو انگریزی ہجے ہی شہروں اور افراد کے نام بگاڑ دیتے ہیں۔ انگریزی ہجوں کے مطابق دہلی کو ''دلہی''، کراچی کو ''کاراچی''، جہلم کو ''جھیلم'' اور پشاور کو ''پیشہ ور'' لکھا جاتا ہے۔'' ۱۰۱

لفظی اُلٹ پھیر سے قاسمی کی تحریروں میں ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ قاسمی نے سارے کے سارے نام اُلٹ کر عجیب مضحکہ خیز صورتیں پیدا کی ہیں:

''جس طرح وزیرِ داخلہ کو کابینہ میں خارجہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح مسز اندرا کو بھی اندر آ کی جگہ باہر جا کر دیا جائے۔'' ۱۰۲

نثر میں صنائع بدائع کے استعمال کے لیے جس ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے بخوبی آشنا ہیں۔ ان کی نثر فکری رجحان کی حامل ہے۔ انھوں نے اپنے جذبے کو نہ تو بے لگام کیا نہ ہی بے ترتیب بلکہ ان کی نثر میں ایک منظم ترتیب پائی جاتی ہے۔ ان کا فکاہی کالم بھی کسی خیال کے تحت گہرے مشاہدے کے زیرِ اثر لکھا جاتا ہے۔ اس پر مستزاد الفاظ، تراکیب، محاورات، ضرب الامثال، لفظی الٹ پھیر، ضلع جگت کا استعمال برمحل اور برموقع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گہرے طنز کے وار بھی طبع نازک پر گراں نہیں گزرتے بلکہ قاری کی مذاق سلیم اس سے محظوظ ہوتی ہے۔ قاسمی کے کالموں میں اردو اشعار کے علاوہ کہیں کہیں فارسی اشعار اور ضرب الامثال کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

''یعنی اول خویش بعد درویش کی پرانی ضرب المثل سے بغاوت کریں اور اول درویش بعد خویش کا اصول اپنائیں۔'' ۱۰۳

قاسمی ذومعنی الفاظ کے استعمال سے بھی قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

''لاہور میں یہ جو یکم سے ۶ جنوری تک ہفتہ سیاحت منایا جا رہا ہے۔ اُسے ہفتہ کی بجائے ''ششتہ'' کہنا چاہیے کہ یہ ہفتہ تو شش (چھ) دنوں پر مشتمل ہے۔ آٹھ دنوں کا ہوتا تو ''ہشتہ'' کہلاتا۔ بہرحال محکمہ سیاحت والے جو چاہیں منائیں اور جس طرح چاہیں منائیں۔ ہم اپنی لاہور کارپوریشن سے بھی عرض کریں گے کہ لگے ہاتھوں وہ بھی ہفتہ سیاحت لاہور منا ڈالے۔ کارپوریشن کی محنت، امپروومنٹ، ٹرسٹ کی توجہ، بجلی، تار، ٹیلی فون اور گیس کی مہربانیوں، شہریوں کی بے پروائیوں اور کارپوریشن کے اہل کاروں کی عنایت فرمائیوں نے اس شہر کو اس لحاظ سے ایک یادگار شہر بنا دیا ہے کہ جتنا کچھ دیکھنے کو یہاں ہے وہ نہ ٹوکیو میں ہے نہ نیویارک میں، نہ لندن میں، نہ پیرس میں۔ یوں سمجھیے:

ع کرشمہ دامنِ دل می کشید کہ جا ایں جاست۔'' ۱۰۴

تیز قوت مشاہدہ اور بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک، قاسمی کے کالموں میں آورد کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ نہایت فطری انداز سے لکھتے ہیں کہ ان کی تحریریں عام بول چال کی زبان معلوم ہوتی ہیں۔ آسان، عام الفاظ، دل نشیں انداز قاری کی فہم میں بھی بآسانی آ جاتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ سائنس دان کی بیوی کافی دیر سے کسی گھریلو مسئلے پر رو رہی تھی۔ سائنس دان کسی ایک نقطے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا تھا۔ بیگم نے تنگ آ کر کہا: کیا تمہیں میرے آنسو دکھائی نہیں دیتے تو سائنس دان نے جواب دیا:

''دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ تمہارے آنسوؤں میں کتنی آکسیجن، کتنی نائٹروجن اور کتنی کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے۔'' ۱۰۵

ان کی تحریروں پر رومانی عناصر بھی کارفرما ہیں۔ رومانیت ایسے ذہنی رویے کا نام ہے جو زندگی کے تلخ حقائق سے دُور طلسماتی دنیا میں لے جاتی ہے۔ قاسمی کے کالموں میں ایسی دنیا ملتی ہے جو تلخ و ترش ہے اور شیریں بھی۔ ان کی نثر سادہ اور سلیس ہے۔ تحریر کا انداز دل آویز ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقروں اور برجستہ جملوں، بولتے محاوروں سے ہر بات بے تکلفی سادگی روانی سے کہہ جاتے ہیں۔ انہی اوصاف کی بدولت انکی نثر زندہ نثر ہے کہ کئی برس گزرنے کے بعد بھی اس کی تازگی و شگفتگی برقرار ہے۔ قارئین اب بھی ان کی تحریروں کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔

کالم سے ہی ادیب کے تجزیاتی و مبصرانہ اندازِ تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے تخاطب خاص و عام، کم پڑھے لکھے، ناخواندہ اور خواندہ افراد ہوتے ہیں۔ اس لیے قاسمی اپنے کالموں میں ہلکی پھلکی شگفتگی کے ساتھ سادہ زبان تحریر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''میرے مخاطب وہ عوام تھے جو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ اس لیے میں اپنے

کالموں میں ہلکی پھلکی شگفتگی، تیز طنز اور نرم ظرافت سے یوں کام لیتا۔ لاکھوں قارئین اس سے محظوظ ہوتے تھے اور ساتھ ہی خوش طبعی کے علاوہ کچھ سیکھتے بھی تھے۔'' ۱۰۶؎

قاسمی کے کالم معلومات میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں۔ ان معلومات کا تعلق عدالت، حکمت، ادبیات، سیاست یا معاشرے سے ہوتا ہے۔ قاسمی بعض اوقات کسی خاص خبر، کسی اہم سیاسی نکتے، یا ادبی شخصیت کے بیان کی تفصیل پیش کر کے اپنے قارئین کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''سیب کا اور کوئی اثر ہو یا نہ ہو، دل کو ضرور قوت بخشتا ہے۔'' ۱۰۷؎

قاسمی جذبوں کے آدمی ہیں۔ تفکر اور آگہی کا پہلو ان کے کالموں میں بآسانی جذبے کی صورت میں ڈھل جاتا ہے اور یہ جذبے اپنے اظہار کے لیے ادق، مشکل الفاظ اور مہمل تراکیب کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ سیدھے سادے روزمرہ کے لفظوں میں خود بخود رونما ہو جاتا ہے۔ ان کے کالموں کا حسن، استعارات اور الفاظ کی سجاوٹ، صداقتِ بیاں، برجستگی، بے تکلفی، روانی اور سادگی میں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قاسمی کے کالم عوام و خواص کے دلوں کی دھڑکن بن گئے کہ آج بھی ان کے کالم تو شگفتہ پھول کی مانند شاداب اور تر و تازہ ہیں۔

قاسمی نے کالم نویسی میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ انھوں نے اپنے کالموں کے آخر میں اشعار، اقوال، ضرب الامثال اور پرتاثیر جملے درج کیے۔ ان امور کے استعمال سے قاسمی کے کالم نہ صرف قارئین میں مقبول ہوئے بلکہ ان کی فنِ کالم نگاری کو بھی چار چاند لگ گئے۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

''احمد ندیم قاسمی نے کالموں کے آخر میں دو چار معنی خیز الفاظ یا مشہور اقوال کے ٹکڑے دینے کا رواج ڈالا جو بہت دل چسپ اور پرتاثیر ثابت ہوا۔'' ۱۰۸؎

قاسمی کے کالموں میں ظرافت کی فراوانی ہے۔ وہ خامیوں پر مسکراتے ہیں لیکن جذباتی گھن گرج کو اپنا مسلک بناتے ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کی اس روایت کو زندہ رکھا جس کی ابتدا عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت نے کی۔ بقول ڈاکٹر عبدالغفار کوکب:

''احمد ندیم قاسمی کے کالموں میں حسرت کی چاشنی، سالک کی سادگی اور شوکت کا مزاح ملتا ہے لیکن وہ چراغ حسن حسرت کی طرح علمی معلومات اور ذخیرہ الفاظ کا خواہ مخواہ مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان کے ہاں سالک کی طرح علمی و ادبی کوتاہیوں پر بزرگانہ تبسم نہیں ملتا اور نہ ہی ابن انشا کی طرح متروک اور نامانوس الفاظ سے اپنی تحریر سجاتے ہیں۔'' ۱۰۹؎

قاسمی کے کالم ان کے زرخیز دماغ کی اختراع ہیں۔ انھوں نے اپنے کالموں میں ان افراد اور طبقوں کے مسائل کی ترجمانی کی جو قومی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں اساتذہ، فن کار، شاعر، ادیب، ہنرمند اور محنت کش افراد وغیرہ شامل ہیں۔

قاسمی کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو محبت اور غصہ ہے۔ وہ محبت انسانیت سے کرتے ہیں جب کہ نفرت دشمنِ انسانیت سے کرتے ہیں جو انسانوں سے ان کی مسرتیں چھینتا ہے۔ اردو صحافت میں قاسمی نے جو اضافے کیے وہ اتنے بروقت اور موثر تھے کہ ان کے تدبر اور فراست کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان کالموں کے ذریعے وہ اپنا پیغام زیادہ پرکشش انداز میں قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ انھوں نے حکومتِ وقت سے ٹکر لی۔ صاحب اقتدار افراد کو براہِ راست تنقید کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے نظریات کی جنگ آخری دم تک لڑی لیکن مشکل مراحل سے گزرنے کے باوجود اخلاقی سطح سے گر کر جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ لکھتے ہیں:

''یہ بات میں پورے اعتماد کے ساتھ کر سکتا ہوں کہ میں اس کالم میں ذاتیات سے کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ شخصیتوں کے بجائے ان شخصیتوں کے افکار و نظریات میرے طنز کا ہدف رہے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میرے طنز کا ردعمل مثبت اور تعمیری ہو۔ میں نے کسی کا مذاق نہیں اڑایا۔ البتہ دل لگی سب سے کی اور اس ضمن میں اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا۔'' ۱۰

مثلاً ''شلوار قمیص'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''خود ہم بھی شلوار اور قمیص کے بڑے رسیا ہیں مگر ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارے وہ کوٹ پتلون پرانے ہی نہیں ہوتے جو ہم نے پندرہ برس پہلے سلوائے تھے۔'' ۱۱

قاسمی کے کالموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی تحریروں میں اپنے گردوپیش، سماج اور دھرتی پر رونما ہونے والے واقعات خاص معنی رکھتے ہیں۔ یہی خاص و عام واقعات ان کے کالموں کی تخلیقی تحریک ہیں۔ ان کا کالم ہر طبقے کے افراد میں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے براہِ راست عوام کے مسائل و مصائب کو موضوع بنایا۔ انھوں نے اپنے کالموں میں نہ محض ادبی روایات کا سہارا لیا، نہ لفاظی اور رعایت لفظی کے چکر میں مبتلا ہوئے بلکہ انھوں نے عوام کی زبان میں ان کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے کالم عوامی کالم تھے۔ وہ بات سوچنے کے ساتھ ساتھ کہنے کے فن سے بھی واقف تھے۔ قاسمی کی اگرچہ اپنے مخالفین سے نظریاتی چپقلش رہی لیکن انھوں نے اپنے مخالفین کے ہر وار کا جواب تحمل سے دیا۔ لکھتے ہیں:

''بلاشبہ بعض صورتوں میں میری تحریر تلخی سے آلودہ ہوئی مگر اس تلخی کی بنیاد بھی اصولی اور نظریاتی رہی۔ میں نے گالی کا جواب گالی سے کبھی نہیں دیا۔'' ۱۲

بھارت کے معروف ادیب نند کشور وکرم اپنے ایک مضمون میں قاسمی کی طویل صحافتی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے صبر و تحمل اور شخصیت کے مثبت پہلوؤں کو بھی آشکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنی طویل صحافتی زندگی میں انھیں کئی بار نظریاتی معرکہ آرائیوں سے بھی واسطہ پڑا مگر وہ اپنے مخالفین کی باتوں کا جواب بڑے تحمل و اعتدال سے دیتے رہے اور انھوں نے کبھی بھی اپنے معترضین کی طرح شدت اور انتہا پسندی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔'' ۱۳

قاسمی کے کالموں میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ قاری کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتے۔

''۔۔۔وہ قاری کو ایک لمحے کے لیے اپنے سے دُور نہیں کرتے۔ قاری پوری توجہ سے ان کی تحریر کا مطالعہ کرتا ہے۔۔۔ جس مسئلے پر اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا، اس کی تمام گتھیاں سلجھ گئی ہیں بلکہ وہ خود کو اس موضوع پر اپنی رائے دینے کا اہل پاتا ہے۔'' ۱۱۴

قاسمی کے کالموں کی تحریر سے تازگی، ندرت اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے کالم پڑھ کر نہ تو ہیجان انگیز جذبات انگڑائیاں لیتے ہیں اور نہ ہی ان کے کالم خواب آور گولیوں کا کام کرتے ہیں کہ جن کے نگلنے سے عوام میٹھی نیند سو جائے بلکہ ان کے کالموں کو اس ٹھنڈی بہتی ندی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کا پانی وطن سے محبت کے گیت گاتا ہوا کبھی پہاڑوں کبھی ندیوں سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ انتظار حسین، قاسمی کے کالموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کالم، قاسمی صاحب کی صحافتی زندگی کی بیش قیمت پیداوار ہیں۔'' ۱۱۵

جب کہ وقار انبالوی کا نقطہ نظر ہے:

''میں بلاخوف تردید پڑھے لکھے اصحاب کے مجمع میں یہ کہتا ہوں کہ اس بارے میں جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا کوئی شریک و سہیم بھی نظر نہیں آتا، حریف تو ذرا دُور کی بات ہے۔'' ۱۱۶

قاسمی کے سوچنے اور لکھنے کا انداز عام فہم، سلیس اور تحریر رواں دواں ہے۔ ان کی تحریروں میں نہ تشبیہات کے اینچ پینچ ہیں، نہ تلمیحات کے چکر ہیں، نہ استعارات و کنایات کے گورکھ دھندے ہیں بلکہ وہ عوامی مزاح نگار و کالم نویس تھے جنھوں نے اپنے آپ کو قارئین کے دل و دماغ کے قریب رکھا۔ قاسمی نے ساری زندگی اس پیشے کی حرمت کی۔ انھوں نے انگریزی و اردو و فارسی الفاظ و تراکیب سے بھی کام لیا۔ ان کا طرزِ تحریر دل کش اور طنز سے بھرپور ہے۔ وہ معتدل مزاج کے مالک تھے۔ وہ عمر کے آخری حصے میں پھونک پھونک کر اپنے قلم کو حرکت میں لائے۔ ضبط، تحمل اور اعتدال کا مادہ قدرت نے انھیں ودیعت کیا تھا۔ ان کے اداریوں میں ہمیں گہرا مشاہدہ رکھنے والے صحافی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کالم نویسی میں ٹھنڈک اور دھیما پن ہوتا ہے جو جذبات کو مشتعل کرنے کے بجائے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے اور دعوتِ فکر اور سوچ و بچار کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ قاسمی ایسے طناز تھے جن کے قلم کی زد سے بچنا محال تھا۔ شخصیات، تحریکات و مسائل اس کے قلم کی گل کاریوں سے جاوید ہو گئیں۔ یہ مذاق ہی مذاق میں بڑے سیاسی و معاشی مسائل پر تنقید کرتے چلے جاتے تھے۔ ایک کامیاب طنز کا کمال یہ ہے کہ اس کی دسترس سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ قاسمی طنز و ظرافت کے میدان میں اشہب قلم کی لگام تھامے رکھتے ہیں۔ ان کی

شہ سواری کا مقصود روندنا، کچلنا، دل آزاری کرنا نہیں بلکہ آنسوؤں کو پونچھنا ہے جس سے زیرلب مسلسل تبسم رہتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف حکمرانوں پر تنقید کرتے ہیں تو دوسری طرف تاجروں کی سیاہ کاریوں سے بھی نقاب اٹھاتے ہیں۔ وہ جھونپڑیوں میں بسنے والے سادہ لوح افراد کی آہوں کی آواز سناتے ہیں تا کہ غیر مساوی تقسیم ختم ہو جائے۔ کبھی صوبائی مسائل پر قلم اٹھاتے نہایت خلوص سے سیاسی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ چابک دستی سے سیاسی شخصیتوں پر پھبتی کسنے کا مقصد محض تضحیک نہیں بلکہ کمزوریوں کی جانب بھی توجہ دلا کر اصلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ ادنیٰ مسائل سے لے کر اعلیٰ مسائل بھی ان کے قلم کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ پھر ان پر ایسے تنقید کرتے ہیں۔ وہ اگر طنز بھی کرتے ہیں تو اس طنز کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک سچے فن کار کی طرح اپنے ماحول کے لیے دل میں جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کے کالموں میں ادبی محاسن، لسانی اوصاف کے علاوہ علمی اور تاریخی معلومات بھی پائی جاتی ہیں جس سے ان کی وسعت مطالعہ سے آگہی ہوتی ہے۔ ان کے سیاسی کالم، سیاسی چپقلش اور حکومت کے عزائم و سیاسی شخصیات کی معاندانہ رویوں کو منکشف کرتے ہیں۔ قاسمی ان کالموں میں الفاظ کی مینا کاری اس ہنر سے کرتے ہیں کہ قارئین نہ صرف حظ اٹھاتے ہیں بلکہ ان کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ اسلوب نگارش دل نشیں ہے۔ قاسمی نے اپنی طنز میں شدت پیدا کرنے کے لیے طنز کے بہت سے حربوں مثلاً مبالغہ، موازنہ، واقعہ کو استعمال کر کے تحریر کی دل کشی، طنز کی شدت اور لفظی الٹ پھیر میں اضافہ کیا ہے۔ اس میں تصنع کو دخل نہیں۔ ان کی طنز سیاسی زندگی کی ناہمواریوں کو نشانہ بناتی ہے۔ سیاست کے علاوہ معاشرت اور عام زندگی کی کیفیات پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کا کالم جہاں کاغذ پر خوب صورت بیل بوٹے بناتا ہے وہیں طنز و مزاح کے کانٹے بھی بکھیرتا ہے لیکن ان کانٹوں کی چبھن میٹھی ہوتی ہے۔ محولہ بالا اوصاف کی بدولت قاسمی کا نام نہایت احترام سے لیا جائے گا۔ یہ وہ اعزاز ہے جو بہت کم صحافی، ادیبوں کو نصیب ہوا ہے۔ فکاہیہ کالم نویسی میں ان کا نام درخشاں اور تابندہ رہے گا۔ یہ کالم نویسی میں عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت سے متاثر دکھائی دیتے ہیں کہ دونوں سنجیدہ و متین مزاح نگار و صحافی ہیں۔ قاسمی کے کالموں میں عصری شعور اور سماجی ہم آہنگی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کا فن، ان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے۔ اشرف جاوید نے راقم الحروف سے یوں اظہار خیال کیا:

> ’’صحافت کو ہمیشہ خبر کی حد تک محدود کیا جاتا رہا ہے اور صحافتی زندگی کو ایک دن کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے لیکن احمد ندیم قاسمی نے اس ایک روزہ صحافتی زندگی کو قلم کے پارس سے نہ صرف ذرے خاص میں بدلا بلکہ اس کی عمر ابدیت کی حدوں کو چھونے لگی۔‘‘ [۱۷]

زود نویسی کے باوجود شگفتگی اور دل کشی کے عنصر کا فقدان نظر نہیں آتا۔ اگر فکاہیہ کالم نویسوں کی فہرست کا احاطہ کیا جائے تو قاسمی کے ذکر کے بغیر انصاف کے تقاضے مکمل نہیں ہوتے، ان کے پرانے فکاہی کالم کی تحریریں کئی برس

گزرنے کے بعد بھی قاری کے ذہن کو تسکین پہنچاتی ہیں۔ اسے زندگی کے مثبت و روشن پہلو کی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ قاسمی زندگی کو ایک ہمدرد کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے دل میں اُتر جانے والے الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ خدا نے انھیں ایسا قلم عطا کیا تھا جو ہر سطح کے قاری کو اپنی سوچ میں شامل کر لیتا جس کی اثر آفرینی کے طلسم سے نکلنا مشکل تھا۔

بحیثیت مجموعی قاسمی ایک زندہ نثار ہیں اگرچہ انھوں نے معاشی ضرورتوں کے پیش نظر کالم نویسی کی ابتدا کی۔ وہ ترقی پسند تحریک سے شعوری و غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے اور اس تحریک کے سرگرم رکن بھی تھے۔ جہاں یہ تحریک کے اثرات ان کی نگارشات میں در آئے ہیں وہیں وہ اپنی انفرادیت کا علم بھی سر بلند رکھتے ہیں اور شاید یہی انفرادیت ادیب کے مقام و مرتبہ کے تعین میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ ان کی نثر میں انفرادیت کا رنگ جھلکتا ہے جو ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے جس میں ان کا مخصوص ذہن، مزاج اور ماحول جھلکتا ہے۔ قاسمی تیز ذہن و احساس کے مالک تھے۔ انھوں نے احساس کی شدت کو قلم کے ذریعے عظمت بخشی۔ ان کے کالموں میں جذبہ بھی ہے اور تہذیب یافتہ عمل کی ترغیب بھی، فکر و استغنا بھی ہے اور ہنگامہ خیزی بھی۔ ان کے کالموں میں دیگر کالم نویسوں کی طرح تندی و تیزی ملتی ہے اور نہ ہی وہ ایک واعظ و خطیب کی مانند قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان کے کالموں میں دھیما پن موجود ہے جو ذہن کو مشتعل کرنے کی بجائے فکر و دانش کی مشعل جلاتی ہے۔ جذبات کی تحریک کا باعث بنتی ہے۔ مزاح میں ڈوبا ہوا طنز بھی رکھتی ہے یہی ان کی انفرادیت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، (دیباچہ) کیسر کیاری، لاہور، شفیق پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۷

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ صہبا لکھنوی، زندگی شخصیت اور فن کا مستند جائزہ، مشمولہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، مکتبہ افکار، جنوری ۱۹۷۵ء، ص ۷۰

۵۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، اردو صحافت اور فکاہیہ کالم نگاری کی روایت، لاہور، بیکن بکس، ۲۰۰۷ء، ص ۳۱

۶۔ احمد ندیم قاسمی، ستارے کیا کہتے ہیں، مشمولہ سہ ماہی ''عبارت''، حیدر آباد خصوصی شمارہ ۵، ۶، اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۴

۷۔ ظفر اقبال، ندیم صاحب، سہ ماہی ''معاصر''، لاہور، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۶

۸۔ احمد ندیم قاسمی، ہم نے رشوت دی، ندیم کے چند فکاہیہ کالم، مشمولہ سہ ماہی عبارت، محولہ بالا ۶، ص ۳۲۹

۹۔ مجتبیٰ حسین، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ مونتاج، لاہور، شمارہ ۱، ۲، جنوری تا اگست ۲۰۰۷ء، ص ۳۶۴

۱۰۔ وقار انبالوی، احمد ندیم قاسمی بطور مزاح نگار، مشمولہ ندیم نامہ، محمد طفیل بشیر موجد، مجلس ارباب فن لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۳۲۲

۱۱۔ نصر اللہ خاں، قاسمی صاحب کی کالم نگاری، مشمولہ ماہنامہ افکار (ندیم نمبر)، کراچی، محولہ بالا ۴، ص ۴۵۴، ۴۵۵

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، (دیباچہ) کیسر کیاری، محولہ بالا ۱، ص ۱۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ ''امروز''، لاہور، یکم نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۴ر مئی ۱۹۷۴ء، ص ۳

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۷ر نومبر ۱۹۷۳ء، ص ۳

۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ ''امروز''، لاہور، یکم نومبر ۱۹۶۷۲ء، ص ۳

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۰ر مئی ۱۹۷۳ء، ص ۳

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، اردو صحافت میں طنز و مزاح، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۲۔۲۵۳

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۶ر مئی ۱۹۷۳ء، ص ۳

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۲۲ر مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، شعر کا حلیہ بگاڑنا، مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱۲، ص۷۰، ۷۱

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، علی پور کا یادگار مشاعرہ، مشمولہ کیسر کیاری از احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا۱۲، ص۷۲

۲۸۔ وقار انبالوی، قاسمی بطور مزاح نگار، مشمولہ ''ندیم نامہ'' مرتبہ محمد طفیل، بشیر موجد، محولہ بالا۱۰، ص۳۲۲

۲۹۔ افتخار مجاز، یہ تھے قاسمی صاحب، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا۹، ص۴۲۴

۳۰۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، اردو صحافت اور فکاہیہ کالم نگاری کی روایت، محولہ بالا۵، ص۲۲۹

۳۱۔ احمد ندیم قاسمی، ہم نے رشوت دی، ندیم کے چند فکاہیہ کالم مشمولہ سہ ماہی عبارت، محولہ بالا۱۰، ص۳۲۹

۳۲۔ ایضاً، ص۳۳۶

۳۳۔ ظفر محی الدین، اردو کالم نگاری کے مرد بزرگ، مشمولہ ''ندیم نامہ'' مرتبہ اسلم فرخی، کراچی، وفاقی اردو یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص۲۱۷۔۲۱۸

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، اردو صحافت میں طنز و مزاح، محولہ بالا۲۳، ص۲۵۳

۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ امروز، لاہور، ۱۹/اکتوبر۱۹۷۹ء، ص۲۱

۳۷۔ ظفر محی الدین، اردو کالم نگاری کے مرد بزرگ، مشمولہ ''ندیم نامہ'' مرتبہ اسلم فرخی، محولہ بالا۳۴، ص۲۱۹

۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، چند سیاسی پارٹیاں، مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱۱، ص۳۵، ۳۶

۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۲۴/جولائی ۱۹۶۲ء، ص۳

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۲/جولائی ۱۹۶۲ء، ص۳

۴۱۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ ندیم نامہ از محمد طفیل، بشیر موجد، محولہ بالا۱۰، ص۶۴۱۔۶۴۲

۴۲۔ عبدالباری آسی، ندیم اور حرف و حکایت، مشمولہ مٹی کا سمندر، از ضیا ساجد، لاہور، مکتبہ القریش، ۱۹۹۱ء، ص۶۵۸

۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، چند سیاسی پارٹیاں، مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱۱، ص۳۵، ۳۶

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۲/مئی ۱۹۷۲ء، ص۳

۴۵۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، بار اول ۲۰۰۹ء، ص۲۴۹

۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''وزارت تعمیر مکانات'' مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱۱، ص۴۲

۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۹/اکتوبر۱۹۷۲ء، ص۳

۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۸/مئی ۱۹۷۲ء، ص۳

۴۹۔ وقار انبالوی، قاسمی بطور مزاح نگار، مشمولہ ندیم نامہ از محمد طفیل بشیر موجد، محولہ بالا۱۲، ص۳۲۳

۵۰۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۲۲/مئی ۱۹۷۲ء، ص۳

۵۱۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۲۱ر نومبر ۱۹۷۳ء، ص ۳

۵۲۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، یکم جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۳

۵۳۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۲۰ر مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۵۴۔ ایوب خاور، ''کپاس کا پھول'' مشمولہ سہ ماہی موتاج، محولہ بالا ۹، ص ۲۲۶

۵۵۔ احمد ندیم قاسمی، لاہور لاہور ہے، روزنامہ ''جنگ''، ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۴ء، ص ۳

۵۶۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۷ر مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۵۷۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۵۸۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ امروز، لاہور، ۲۶ر مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۵۹۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ امروز، لاہور، ۳۰ر مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۶۰۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ روزنامہ امروز، لاہور، ۳۱ر مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۶۱۔ نصر اللہ خاں، احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری، مشمولہ ماہنامہ افکار، کراچی، محولہ بالا ۴، ص ۴۵۴، ۴۵۵

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ پیرزادہ محمد بخش، شاہ، مشمولہ ''عبارت'' محولہ بالا ۶، ص ۴۷

۶۴۔ وقار انبالوی، ''قاسمی بطور مزاح نگار'' مشمولہ ''ندیم نامہ'' محولہ بالا ۱۰، ص ۳۲۸

۶۵۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، موج در موج، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۳ر مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۳

۶۷۔ عبدالباری آسی، حرف و حکایت، مشمولہ مٹی کا سمندر از ضیا ساجد، محولہ بالا ۴۲، ص ۶۶۰

۶۸۔ ایضاً

۶۹۔ ایضاً، ص ۶۶۱

۷۰۔ احمد ندیم قاسمی، لاہور لاہور ہے، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۴ء، ص ۳

۷۱۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، اردو صحافت میں طنز و مزاح، محولہ بالا ۲۱، ص ۲۵۲

۷۲۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۷۳۔ نصر اللہ خاں، قاسمی صاحب کی کالم نگاری، ماہنامہ افکار، محولہ بالا ۴، ص ۴۵۴، ۴۵۵

۷۴۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، (انتخاب) کچھ کالم، مشمولہ سہ ماہی موتاج، لاہور، محولہ بالا ۹، ص ۶۱ ے

۷۵۔ ایضاً

۷۶۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۰ر نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۷۷۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، احمد ندیم قاسمی اور ان کے کالم، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا۹، ص ۲۴۸

۷۸۔ علی تنہا، احمد ندیم قاسمی کی ادبی تربیت اور جنوبی پنجاب، سہ ماہی معاصر، لاہور، شمارہ۲، ۳، ۴، جلد ۷، ۸ اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۶

۷۹۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، احمد ندیم قاسمی اور ان کے کالم، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا۱۱، ص ۲۴۸

۸۰۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، (انتخاب) کچھ کالم، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا۱۱، ص ۷۵۵

۸۱۔ وقار انبالوی، ''قاسمی بطور مزاح نگار'' مشمولہ ''ندیم نامہ'' محمد طفیل، بشیر موجد، محولہ بالا۱۲، ص ۳۲۹

۸۲۔ احمد ندیم قاسمی، موج در موج، روزنامہ ''جنگ''، ۲۸ مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۳

۸۳۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۵ نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۸۴۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ امروز، لاہور، ۱۰ نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۸۵۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ مٹی کا سمندر از ضیا ساجد، محولہ بالا۴۲، ص ۴۴۸

۸۶۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۶ نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۸۷۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ امروز، لاہور، ۱۸ مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۸۸۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ مٹی کا سمندر از ضیا ساجد، محولہ بالا۴۲، ص ۴۴۵

۸۹۔ ایضاً، ص ۴۴۵

۹۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''چند تحقیقیں'' مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱، ص ۹۳

۹۱۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ مٹی کا سمندر از ضیا ساجد، محولہ بالا۴۲، ص ۴۴۹

۹۲۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ ندیم نامہ از محمد طفیل، بشیر موجد، محولہ بالا۱۰، ص ۶۲۲

۹۳۔ ایضاً، ص ۶۲۷

۹۴۔ ایضاً، ص ۶۴۴

۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ مٹی کا سمندر از ضیا ساجد، محولہ بالا۱۲، ص ۴۴۴

۹۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''کتابت کی غلطیاں'' مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱، ص ۸۷

۹۷۔ ایضاً، ص ۸۷

۹۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''کتابت کی غلطیاں'' مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱، ص ۸۷

۹۹۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، ۴ مئی ۱۹۷۲ء، ص ۳

۱۰۰۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ مٹی کا سمندر از ضیا ساجد، محولہ بالا۴۲، ص ۴۴۸

۱۰۱۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روزنامہ ''امروز''، ۵ نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۱۰۲۔ عبدالباری آسی، احمد ندیم قاسمی حرف و حکایت کے آئینے میں، مشمولہ مٹی کا سمندر، محولہ بالا۴۲، ص ۶۵۹

۱۰۳۔ وقار انبالوی، ''قاسمی بطور مزاح نگار'' مشمولہ ''ندیم نامہ'' از محمد طفیل، بشیر موجد، محولہ بالا۱۰، ص ۳۳۱

۱۰۴۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روز نامہ ''امروز''، ۵/نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳

۱۰۵۔ ایضاً

۱۰۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''جگنو کی دم'' مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱، ص ۱۳۹

۱۰۷۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، (انتخاب) کچھ کالم، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا۹، ص ۵۶۷

۱۰۸۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، محولہ بالا۴۶، ص ۲۴۹

۱۰۹۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، اردو صحافت اور فکاہیہ کالم نگاری کی روایت، محولہ بالا۵، ص ۲۲۳

۱۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روز نامہ ''امروز''، ۳/جون ۱۹۷۰ء، ص ۳

۱۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، شلوار قمیض، مشمولہ کیسر کیاری، محولہ بالا۱، ص ۳۸

۱۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، روز نامہ ''امروز''، ۳/جون ۱۹۷۰ء، ص ۳

۱۱۳۔ تندکشور وکرم، احمد ندیم قاسمی ہشت پہلو ادیب، مشمولہ سہ ماہی ''سورج''، جلد ۳۶، شمارہ ۳،۴، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء، ص ۳۰

۱۱۴۔ ظفر محی الدین، اردو کالم نگاری کے مرد بزرگ، مشمولہ نیا ندیم نامہ از اسلم فرخی، محولہ بالا۳۴، ص ۲۱۹

۱۱۵۔ انتظار حسین، نا قابلِ تلافی نقصان، مشمولہ ندیم نامہ از اسلم فرخی، محولہ بالا۳۴، ص ۸۵

۱۱۶۔ وقار انبالوی، قاسمی بطور مزاح نگار، مشمولہ ندیم نامہ، محولہ بالا۱۰، ص ۳۲۳

۱۱۷۔ راقم الحروف، استفسار از اشرف جاوید بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۱۰/جون ۲۰۱۰ء

✿✿✿✿✿

باب پنجم

تنقید نگاری

اردو ادب میں تنقید کی روایت، عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی۔ اردو میں باقاعدہ طور پر تنقید نگاری کا آغاز تذکروں سے ہوا۔ ابتدا میں تذکرے دوطرح سے لکھے جاتے تھے۔ ایک حروفِ تہجی کے اعتبار سے اور دوسرا تاریخی ادوار کے لحاظ سے۔ اس طرح حروفِ تہجی کے اعتبار سے جس فکری انتشار و بے ربطی نے جنم لیا اُس کا خاتمہ ہوا۔ پھر تاریخی اعتبار سے تذکروں کو اہمیت ہوئی۔ یہ مختصراً لکھے جاتے جن میں شاعر کے سوانحی حالات، چیدہ چیدہ واقعات اور مختصراً کلام کو پیش کیا جاتا تھا۔ اگر چہ یہ محض رسمی الفاظ، مبالغے، تاثرات اور ذاتی پسند و ناپسند پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان تذکروں کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان تذکروں سے نہ تو کبھی شاعر کی زندگی کی سرگزشت معلوم ہوتی ہے، نہ ہی عادات و اطوار کی تفاصیل ملتی ہیں۔

اس طرح محمد حسین آزاد نے ان تذکروں کی اصلاح کی جانب قدم اٹھایا۔ اُنہوں نے اردو شاعری کی تاریخ، ادوار میں منقسم کرنے کے ساتھ ساتھ شعرا کا حال تفصیل سے لکھا کہ ان کی چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویروں کے مرقعے پیش کیے۔ اس سے قارئین کو یہ سہولت ہوئی کہ وہ شاعر کے دور اور اُس کے معاصرین کا سراغ لگا سکے۔ اگر چہ ''آبِ حیات'' اپنی مرقع نگاری کی بنا پر بے مثال ہے لیکن اس کا تحقیقی و تنقیدی زاویہ کمزور اور اس کی رائے تعصب و جانب داری پر مشتمل ہے۔ اس کے اوّلین ایڈیشن میں بعض معروف شعرا مثلاً مومنؔ، میر ضاحک، خلیق، انیسؔ و دبیرؔ کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ ذوقؔ کو غالبؔ سے بہتر شاعر قرار دیا گیا۔ محولہ بالا تمام اغلاط اس کے لیے مہلک ثابت ہوئیں۔ ان کوتاہیوں اور جانب داری نے محققین و ناقدین کے لیے مسائل پیدا کیے۔ بعد ازاں حالیؔ ادب و زندگی کا تعلق، شاعری اور اخلاق، شاعری کی ماہیت، اعلیٰ شاعری کے اوصاف، لفظ و معنی کے تعلق جیسے موضوعات کو منظرِ عام پر لائے۔ انھوں نے نظری تنقید کے علاوہ عملی تنقید کے متعلق مدلل انداز میں اظہارِ خیال کیا۔ مقدمہ شعر و شاعری، حیات جاوید، حیاتِ سعدی، یادگار غالبؔ غرض تمام تحقیقی و تنقیدی کتب توجہ طلب ہیں۔ ان کی تنقیدی اہمیت سے کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد بھی انکار نہ کر سکے۔ لکھتے ہیں کہ اپنے زمانے، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالیؔ نے جو کچھ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ حالیؔ صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں، اس وقت اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔

حالیؔ کے بعد مولانا شبلی نعمانی کی ناقدانہ حیثیت بھی اہمیت کی حامل ہے۔ ''شعر العجم''، ''موازنہ انیس و دبیر''، ''سوانح مولانا روم'' میں ان کی نگاہ میں جدت، وسعت، گہرائی، پختگی ہونے کے علاوہ نظری و عملی تنقید کے نمونے بھی موجود ہیں۔ ان کی تخلیقات میں مغربی نظریہ و خیالات کی بازگشت کے باوجود مشرقی انداز جھلکتا ہے۔ حالیؔ و شبلی کے تنقیدی افکار و نظریات نے آنے والی نسلوں کو بہت متاثر کیا۔ امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق'' میں شاعری کی

ماہیت سے بحث کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کے نمونے بھی نمایاں ہیں۔ مہدی افادی ادب میں جدت کے قائل ہیں۔ مولانا عبدالحیٔ ندوی کی ''گل رعنا''، مولانا عبدالسلام ندوی کی ''شعر الہند''، حامد حسن قادری کی ''نقد و نظر''، محی الدین قادری زور کی ''روح تنقید'' کے افکار و نظریات کے علاوہ بجنوری، مولوی عبدالحق، عبدالماجد دریا بادی، مولانا ظفر علی خاں کی تنقیدی صلاحیتوں پر تبصرے کیے گئے ہیں گویا ترقی پسند تحریک اور قاسمی تک پہنچتے پہنچتے اردو تنقید نے اپنی واضح راہیں متعین کر لی تھیں۔ تنقید اگر چہ وسعت کی حامل ہے۔ اس صنف ادب کی ضمنی و ذیلی اصناف بھی بحر بے پایاں سے کم نہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا شمار اردو کے ان معتبر ترقی پسندوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ادبی تنقید اور اس کے اصول و نظریات کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہ تنقید کے اس بحر بے کراں کے ایسے شناور دکھائی دیتے ہیں جو اس کی گہرائی سے ادبی، تنقیدی، فنی و فکری گوہر تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ اس خیال سے متفق ہیں کہ نقاد کو ذاتی سوچ و بچار سے کام لے کر زندگی و ادب کا موقف اختیار کرنا چاہیے۔ قاسمی نے اپنی تنقیدی کتب ''ادب اور تعلیم کے رشتے''، ''پس الفاظ''، ''تہذیب و فن''، ''ثقافت کیا ہے''، ''علامہ محمد اقبال'' اور ''معنی کی تلاش'' میں اصول ادب سے لے کر تنقیدی نظریات کو مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۲۰۰۴ء تک بائیس برس میں طویل و مختصر مضامین پر مشتمل چھے مجموعے اشاعت پذیر ہوئے۔ ان میں خطبات و تقاریر بھی شامل ہیں جو مختلف کانفرنسوں، سیمیناروں میں پڑھتے رہے۔ اس کے علاوہ متفرق مضامین مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقیدی کتاب ''تہذیب و فن'' میں باقاعدہ نقاد ہونے کا اعتراف نہیں کیا بلکہ وطن سے محبت کا درس دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے باقاعدہ تنقید نگار ہونے کا دعویٰ نہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے مفید رہے گا کہ یہ ایک ایسے تخلیقی فن کار کے تاثرات ہیں جس کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے وطن اور قوم سے محبت نہیں کر سکتا، وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا اور جو محبت نہیں کر سکتا اُسے حسن و خیر اور عدل و توازن کا شعور ہی حاصل نہیں ہو سکتا۔'' [۱]

تنقید کے موضوع پر ان کی کتابیں مختلف ذیلی و ضمنی ابواب میں منقسم ہیں جو قدیم و جدید معلومات سے قارئین کو آگاہ کرتی ہیں۔ انھوں نے معاشرتی خرابیوں، ادیبوں کے منفی رویوں، اہلِ قلم کی بے حسی، قوم کے نفسیاتی و ذہنی محاذ، مختلف شخصیات، کلچر، پاکستانی معاشرہ، لسانی مسائل، انسان دوستی اور حسن و خیر کے ساتھ ساتھ کلاسیکی و جدید شخصیات مثلاً غالبؔ، اقبالؔ، قرۃ العین حیدرؔ کے فن پر اظہار خیال کر کے دائرہ تنقید کو وسیع کیا ہے۔ ان کے مضامین گہرے غور و تفکر کا نتیجہ ہیں اور قارئین ادب کو یہ باور کرایا ہے کہ ان کی ناقدانہ حیثیت بھی اہمیت کی حامل ہے۔ ان تحریروں میں علم و فکر، مطالعہ، محنت، لگن، سنجیدگی اور توازن کے قابلِ رشک آثار دکھائی دیتے ہیں۔ ان آثار کو پیش نظر

رکھتے ہوئے انیس ناگی انھیں بحیثیت نقاد سراہتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ مختلف اصناف اور شاعروں اور ادیبوں پر قابلِ قدر تنقیدی مضامین لکھ کر اظہارِ خیال کیا؛ وہاں مختلف اصنافِ سخن اور ادبی وفنی مسائل اور مختلف تحریکوں پر بھی خیال افروز تحریریں پیش کیں۔ انھوں نے اصولِ ادب سے لے کر تنقیدی نظریات تک بحث کی، متفرق نکات اٹھائے اور کئی تشنہ سوالات کے جواب مدلل انداز میں پیش کیے۔

قاسمی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ وہ اوائل شباب میں اس تحریک سے وابستہ ہوئے اور عمر بھر اسی تحریک کے زیراثر ادب تخلیق کرتے رہے۔ انھوں نے مسلمان رہ کر ترقی پسند تحریک میں حصہ لیا۔ اپنے تنقیدی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود ترقی پسند ادیب رہا اور اب تک ہوں اور مجھے ترقی پسند ادیب کہلانے پر فخر ہے۔'' ۲

قاسمی ترقی پسند تحریک کے حامی، ادب اور زندگی کے فن پر ایقان رکھنے والے ادیب تھے کہ اس تحریک نے ادب کو رومانیت سے نکال کر عصری شعور سے آگہی عطا کی۔ ان کے اوائل شباب میں اسی تحریک کا دور دورہ تھا۔ اس لیے وہ تنقید میں ترقی پسندانہ رویہ بھی اپناتے ہیں اور ماحول یا روح عصر کی بات کرتے ہوئے اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار بھی بے باکی سے کرتے ہیں۔ اگرچہ معاشرتی حیثیت، اقتصادی مسائل کی بنا پر ان کی زندگی سمجھوتوں کی ایک طویل داستان تھی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی مخصوص علامات میں اور کبھی مخصوص الفاظ میں بلاجھجک اور دوٹوک انداز میں بات کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں فکر وفن، اخلاقیات، جمالیات، ثقافت و اقدار کے تمام زاویے اور مشاہدات و تجربات کو مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ جدید وقدیم کی قدر شناسی کے ساتھ ساتھ نظریاتی و معاشرتی امور سے بھی اعتنا نہیں کیا۔ اگرچہ ان کی روشن تنقیدی آرا کو بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔ انھی تنقیدی مضامین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ایک تخلیق کار، ادب وفن اور زندگی کے گوناگوں مسائل کے بارے میں سوچتا ضرور ہے۔ میرے مضامین انھی سوچوں کا اظہار ہیں۔ جب بھی کسی مسئلے کی شدت کا احساس ہوا میں نے اپنی سوچوں کا اظہار ضروری سمجھا۔ ان مضامین کو ایک تخلیق کار کی بالواسطہ خودتنقیدی داستان بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی مقام پر نظریاتی اختلاف کے اظہار میں اتنی شدت یا تلخی پیدا نہ ہو کہ کسی کو شکایت کا موقع ملے۔'' ۳

قاسمی نے ترقی پسند تحریک سے آخر تک وفا کی۔ اس تحریک کے تحت ادب تخلیق کیا۔ ان تنقیدی مضامین پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے مہذب اور شائستہ لہجہ اختیار کیا۔ اس سے ایک تو ناقد کی شخصیت و مزاج کے ساتھ ساتھ مقصد سے فہم وفراست کو بھی ناگزیر قرار دیتے ہیں کہ اس سے ادب کا عام قاری بھی کسی مرحلے پر گمراہی کا شکار نہیں

ہوتا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی تمام معروف اصنافِ سخن کو جو تازگی و توانائی عطا کی اس کے اثرات تاریخ ادب اردو کا ناگزیر حصہ ہیں۔ یہ تحریک ایک مدت تک لوگوں کے دل و دماغ پر منڈلاتی رہی کیوں کہ ترقی پسند ادیب ایک بڑے معاشی اور معاشرتی انقلاب کے پیغام بر تھے۔ وہ دولت کی مساوی تقسیم کے خواہش مند تھے۔ وہ غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں لانے کے ساتھ ساتھ عادلانہ معاشی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جہاں آسودگی و خوش حالی کے گیت گائے جائیں۔ جہاں کوئی شخص فاقے سے نہ مرے۔ کسی بچے کے چہرے سے لالی نہ چھینی جائے۔ کسی مرد و عورت کے چہرے پر فکر کی شکنیں نمایاں نہ ہوں۔ ہر شخص عزت مندانہ زندگی بسر کرے اور ''ہر فرد کو ملکی دولت میں حصہ دار بننے کے مواقع حاصل ہوں اور چند ہاتھوں میں دولت کے سمٹتے چلے جانے کے عمل کو روک دیا جائے۔''[۴] ایسی مساوات قائم ہو جو معاشی و معاشرتی لحاظ سے مستحکم ہو۔ جہاں آسودگی کا استحقاق ہو۔ انہی عوامل و نظریات کی بنا پر ترقی پسند تحریک اردو ادب میں سیلاب کی مانند آئی اور بقول قاسمی اُس دور کے ادب کو سیلابی، بحرانی اور عبوری کہلواتی ہوئی رخصت ہوئی۔ اس تحریک کے مخالفین نے یہ ثابت کرنے کی حتی المقدور کوشش کی کہ یہ سیلاب گرد و پیش کے کھیتوں کو پانی کی سیرابی عطا کرنے کی بجائے فحاشی کا زہر عطا کرتا ہے جو نسلِ نو کو ابہام اور پروپیگنڈے کی سوغات بھی عطا کرتا ہے۔ قاسمی شاعرانہ زبان استعمال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''دراصل پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے خلاف بلند ہونے والی ہر آواز کے پیچھے ایک لٹا پٹا معاشرہ اور ایک گھسا پٹا اقتصاد لڑکھڑا رہا تھا اور ادب کو مرمریں سیپیوں میں موتیوں کی طرح بند رکھنے کے مطالبے کے عقب میں ایک زرپوش پری کترے ہوئے پروں کو بے تابانہ پھڑپھڑاتی پھر رہی تھی۔''[۵]

قاسمی ایسا ادب تخلیق کرنے کے خواہش مند تھے جو انسان دوستی کا خواہاں ہو۔ انسانوں میں محبت، یگانگت کی فضا پیدا کرے جہاں محنت کش کو اُس کا حق آسانی سے مل سکے۔ وہ دانش ور اور حکمرانوں کو یہ حقیقت منکشف کرانا چاہتے ہیں جس کی محنت سے کھیت لہلہاتے، کارخانے چلتے، عمارتیں بلند ہوتیں، صحرا سبزہ زاروں میں بدلتا، کوہساروں کے سینے شق ہوتے؛ انھیں اپنی محنت کا منصفانہ اور معقول معاوضہ ضرور ملنا چاہیے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جاگیرداروں، زمین داروں اور سرمایہ داروں کے ظلم و جبر کے خلاف لکھا۔ یہ ایسے انقلاب کے خواہش مند ہیں جب محنت کش طبقہ بیدار ہو کر ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرے کیوں کہ معاشی و اقتصادی عدم توازن نے ان سے زندگی کی خوب صورتیاں چھین لی ہیں۔ اس کے تمام ذمہ دار باثروت طبقہ اور ذخیرہ اندوز ہیں۔ طبقاتی معاشرت اور ذخیرہ اندوزوں کے غلط طرزِ عمل پر نہایت دردناک لہجے میں اظہارِ خیال کرتے جو ان مفلس افراد کی خون پسینے کی کمائی بٹور کر مطمئن نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند موقف کی صراحت میں رقم طراز ہیں:

> ''ترقی پسندوں کی تمنا ہے کہ ہم اپنے شہنشاہوں کی دین سے جس قدر جلد ہو سکے

چھٹکارا پالیں اور ارتقا کے عمل کو تیز تر کر کے اپنے ملک کو اس طرح پر لے آئیں
جہاں تک اُس وقت دوسری جمہوری قومیں اُبھر چکی ہیں۔'' ۶

اگر فیوڈل شکنجے میں جکڑے مزدور کسان ایکا کریں، اپنے حقوق کے لیے احتجاج کریں، اس بددیانتی و بے اعتنائی کے خلاف بغاوت کریں تو پاکستان کے ہر فرد کے ذہن سے طبقاتی تقسیم ختم ہو جائے گی۔

تنقید ادب وفن پارے میں رابطہ کا کام کرتی ہے۔ انھیں تنقید کے اس زاویہ نظر سے اختلاف ہے جس میں کسی بڑے شاعر کے کلام کے پسندیدہ حصے کو نمایاں کیا جاتا ہے جب کہ ناپسندیدہ حصے کو ماضی کی ملبے میں ملا دیا جاتا ہے۔ یہ روش ادبی وتنقیدی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس سے نہ صرف کسی شاعر کے کلام کے ناپسندیدہ حصے ماضی کے ملبے میں چھپ جاتے ہیں بلکہ شاعر کی شاعرانہ عظمت بھی صحیح طور پر جلوہ گر نہیں ہوتی۔ اس طرح قارئین سے ادیب وشاعر کے فکر وفن کو مخفی رکھا جاتا ہے۔ قاسمی کے نزدیک اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہماری تنقید لکیر کی فقیر ہے۔ قاسمی تعصب اور تنگ نظری کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔ تنقید کے متعلق ان کے خیالات قابلِ تحسین ہیں۔ واضح انداز میں لکھتے ہیں:

''تنقید انتقامی جذبے کے تحت یا نفرت کے احساس کے ساتھ لکھی جائے تو تنقید نہیں رہتی، تنقیص بن جاتی ہے اور جب مخلص لوگوں کی بیچ مچ ادب یا معاشرے یا حکومت میں کوئی چیز کھٹکتی ہے تو وہ احتیاط اور اعتدال کے تحت لگی لپٹی نہیں اُٹھا رکھتے بلکہ صاف طور پر اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔'' ۷

ان کی تنقید قاری سے براہِ راست متاثر ہو کر، اس کے احساس اور جذبے کو مکمل گرفت میں لے لیتی ہے۔ بلاشبہ ان کا مقصد انسان کی سوچ کے دھارے کا رُخ موڑنا ہے۔ قاسمی اگرچہ اپنی رائے کا اظہار دوٹوک انداز میں بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ اصابت رائے کے مالک قاسمی کی ناقدانہ صلاحیتوں کے ادیب معترف بھی ہیں۔ محمد ارشاد تنقید میں اصابت رائے کو قابلِ تحسین گردانتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ندیم صاحب کے جس وصف نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کی اصابت رائے کا وصف تھا۔'' ۸

''دانش ور عوام کے قریب آئیں'' یہ مضمون جناب ممتاز حسن کی استدعا پر مشتمل ہے جس میں زندگی کے مصائب وآلام سے پنجہ آزما ہونے کے لیے غریب عوام کے قریب آنے کی ضرورت پر زور دیا ہے لیکن جب سیاست دان اور دانش ور کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھی ہو تو وہ بے زر مفلس عوام کے قریب آ کر ان کے مسائل کا ایسا کیا حل پیش کریں گے؟ جس سے معاشرے کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا ہو سکے۔ قاسمی اس مضمون میں اس نکتے کی جانب توجہ منعطف کرتے ہیں کہ انھیں عوامی مسائل سے بدکنے کی بجائے پوری ذمہ داری سے مسائل کا حل سوچنا چاہیے۔ کلچر

کا وجود انسانی زندگی کے ساتھ ہی عبارت ہے۔ کلچر نہ تو بازار سے خریدا جا سکتا ہے نہ ہی ایسا علم ہے جو دانش گاہ سے حاصل کیا جا سکے، بلکہ کلچر انسانی زندگی گزارنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ذہنی ہوں یا جسمانی، خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔'' ۹

پاکستانی کلچر کے اسی رُخ پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''واضح رہے کہ جہاں تک کلچر کا تعلق ہے وہ نہ تو بنا بنایا درآمد ہوتا ہے اور نہ کسی مشورے یا حکم سے نافذ ہی کیا جا سکتا ہے۔ کلچر تو ایک طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے اس تہذیبی اختلاط کا نتیجہ ہے جو ایک خاص جغرافیائی وحدت کے اندر رونما ہوتا ہے۔'' ۱۰

قاسمی نے ۱۹۶۰ء میں روزنامہ ''امروز'' میں پاکستانی تہذیب کے متعلق مضامین لکھے۔ قاسمی کے نزدیک کلچر کسی گروہ، طبقہ یا قوم کے مخصوص طرزِ زندگی کا نام ہے۔ کلچر چوں کہ طریقِ حیات کا دوسرا نام ہے اس لیے ہر قوم اپنا کلچر رکھتی ہے۔ کلچر انسانی وجود، اس کے تقاضوں، رہن سہن اور افراد کی معاشرت سے پیدا ہوتا ہے۔ قومی کلچر کے ذریعے ہی قومی خدوخال کو اُبھار کر ایسے ادارے وجود میں لائے جا سکتے ہیں جو یک جہتی کے عمل کو تیز تر کریں اور شعوری طور پر تخلیقی قوتیں نشوونما پا سکیں تا کہ ایک جان دار قوم کے فرائض انجام دے سکیں۔ قومی کلچر کے حوالے سے قاسمی اپنے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''قومی کلچر تو اس فرد کے ہر قوم کے رگ و پے میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ وہ اسی کلچر کی روشنی میں اُٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا، سوچتا، فکر کرتا، محبت اور نفرت کرتا، ارادے کو باندھتا اور امنگیں پیدا کرتا، تجربوں سے گزرتا اور آدرشوں کو اختیار کرتا، گاتا اور تصویریں بناتا، شعر کہتا اور مابعد الطبیعات کو ادراک کی گرفت میں لاتا، کائنات کو تسخیر کرتا اور زندگی کو زندہ رہنے کے لائق بناتا ہے۔'' ۱۱

غرض کلچر اور فرد لازم و ملزوم ہیں۔ قومی کلچر میں وسعت اور گہرائی، انسانی رشتوں، اُمنگوں اور تفکرات سے آتی ہے۔ قومی کلچر میں ہی وطنِ عزیز کی خوشبو بھی بسی ہوتی ہے۔ قاسمی کے نزدیک قومی تہذیب میں قومی وجود کی اہمیت انسانی جسم میں چہرے کی ہے جس طرح ہر شخص اپنے چہرے اور قد و قامت سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی شناخت تہذیب و کلچر سے ہوتی ہے۔ دریں حالات قومی تہذیب کے متعلق اپنے خیالات کی صراحت کے بعد کلچر کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس قوم کو اپنے کلچر کا شعور نہ ہو، وہ روحانی طور پر منتشر رہے گی۔ قوم کی انفرادیت اس کے انفرادی کلچر میں پوشیدہ ہوتی ہے اور قومی انفرادیت کے مکمل اور غیر مبہم شعور کے بغیر قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا خواب تعبیر کو ترستا رہ جاتا ہے۔'' ۱۲

لاشعوری طور پر بعض افراد نے مغرب کو اپنے ذہن پر مسلط کر لیا ہے۔ قاسمی تہذیب کی انفرادیت کو اُجاگر کرنے کے قائل ہیں تاکہ نسلِ نو انھیں مزید صیقل کر سکے کیوں کہ آزاد ملک کی حیثیت سے اسی طرح الگ پہچان ممکن ہو سکے گی۔ جب ذی شعور اور ذمہ دار خواندہ شہریوں کو اپنی ثقافت کی شناخت ہوگی۔ وہ مغربیت کے سحر سے بچ سکیں گے۔ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ تہذیبی لحاظ سے ترقی کریں۔ اپنے ماضی کو یاد رکھتے ہوئے دوسری تہذیبوں کے اعتراف و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ایسا اس صورت میں ممکن ہو سکے گا جب ''ہماری تہذیبی انفرادیت نمایاں ہو اور ہماری نئی نسل کو معلوم ہو کہ ہم کس تہذیب کے وارث ہیں اور اس تہذیب میں کیا کیا خوبیاں اور دل آویزیاں ہیں۔'' [۱۳] قاسمی پاکستان میں قومی ثقافت کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ یہ دوست ممالک سے خیر سگالی کے تعلقات پیدا کرنے اور ثقافتی روابط کو اُستوار کرنے اور انھیں خوش گوار بنیادوں پر قائم رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ثقافتی ادب کی تخلیق اور ثقافت و فن کے موضوع پر متنوع سیمینار، مذاکرات اور مجالس میں شرکت کی۔ وہیں مضامین و مقالات کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا جہاں فاضل مندوبین اور دانش ور رونق افروز ہوتے اور سیر حاصل بحث کرتے۔ ان مضامین و مذاکرات کو کتابی صورت میں شایع کرنے کا مقصدِ اولیٰ یہی تھا کہ حکومت سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے قومی ثقافت کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ ان ثقافتی سرگرمیوں کا مقصد نظریہ حیات اور تاریخی و جغرافیائی حقائق پر منتج کرنا تھا تاکہ تہذیبی و ثقافتی اقدار سے اعتماد اور افتخار کا رشتہ بھی قائم ہو اور اس میں نکھار بھی پیدا ہو۔ یہ مقالات اہلِ فکر و نظر اور دیگر فنونِ لطیفہ سے دل چسپی رکھنے والے افراد کے لیے نئے در وا کرتے ہیں۔ قاسمی خود اعتمادی سے تہذیب کے مفہوم اور اپنے نظریات میں وضاحت کے لیے فرماتے ہیں:

> ''میں تو یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ تہذیب کا مفہوم محبت، امن اور خیر سگالی ہے بشرطیکہ
> دوسری تہذیبوں کے نزدیک بھی تہذیب کا یہی مفہوم ہو۔'' [۱۴]

قاسمی کا خیال ہے کہ تہذیبِ انسانی کو خود اعتمادی کے ساتھ اپنا علمِ انفرادیت بلند رکھتے ہوئے دوسری تہذیبوں کے عمدہ اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیے۔ قاسمی کے خیال میں جو تہذیب کسی دوسری تہذیب کے مقابلے میں احساسِ کم تری کا شکار ہوگی اسے ہمیشہ کے لیے مٹ جانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ خالد احمد، قاسمی کی تنقیدی کتاب ''تہذیب و فن'' کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کی کتاب ''تہذیب و فن'' بین السطور صرف ایک بات پر زور دیتی
> نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ثقافت کا منبع اشتراک کے قرا قرم بلندیوں میں واقع ہے نہ کہ
> اختلافات کے متعفن نشیبوں میں۔'' [۱۵]

قاسمی تہذیبی و ثقافتی انفرادیت کے حامل ہو کر بھی دوسری قوموں کا احترام اور ثقافتی و تہذیبی انفرادیت کے اعتراف پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے تہذیب کو وسیع باغ میں پھولوں سے تشبیہ دی ہے جن کی صورتیں اور خوشبوئیں

تو الگ الگ ہیں مگر ان سب کے مجموعے کا نام باغ ہے۔ کیوں کہ تہذیب تو ایک دوسری تہذیب سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ ہر تہذیب میں اُس مٹی کی خوش بو بسی ہوتی ہے جہاں وہ تہذیب پیدا ہوتی، پھیلتی، سکڑتی اور ختم ہوتی ہے۔ ہر تہذیب اپنی بعض نشانیاں چھوڑ جاتی ہے۔ قاسمی کے خیال میں تہذیب کا یہ تصور اسلامی معیارِ تہذیب کے عین مطابق ہے۔ کیوں کہ ہر تہذیب پھیلتی، سکڑتی یا ختم ہوتی ہے تو بعض نشانیاں چھوڑ جاتی ہے۔ قاسمی اپنے استدلال کی وضاحت کے لیے مثال پیش کرتے ہیں:

> ''دیا سلائی ایک چراغ کو جلا کر خود بجھ جاتی ہے مگر چراغ کی لو میں وہ اپنے وجود کا اعلان کرتی رہتی ہے۔'' [۱۶]

قاسمی خواہش مند ہیں کہ پاکستانی قوم اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کھل کر سامنے آئے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں مزاحیہ واقعات و لطائف شامل کر کے تنقید جیسے خشک و بنجر میدان کو سرسبز و شاداب بنایا ہے۔ قاری جب اکتاہٹ کا شکار ہونے لگتا ہے تو یہ قاری کی نفسیات کے مطابق مزاحیہ واقعات و الفاظ کی پھلجھڑیاں چھوڑنے لگتے ہیں جس سے قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اور ہم نے اس شخص کا سا انداز کیوں اختیار کر رکھا ہے جو سر پر ہیٹ پہنے جا رہا تھا اور اس سے کسی ستم ظریف نے پوچھا تھا کہ ''حضور! آپ آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں۔'' [۱۷]

ناقدِ فن اپنے ذہن میں حسن و قبح کا ایک معیار رکھتا ہے۔ ایک شاعر کو شعر کہنے کے دوران بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں فکری مواد یکجا کر کے فن پارے میں اضافہ و ترمیم کرتا ہے۔ قطع و برید، ترتیب و تشکیل کا یہ عمل طویل اور کٹھن مرحلہ ہے۔ شاعری دلی کیفیات کا اظہار ہے۔ یہ تاثرات، جذبات و احساسات پر مشتمل ہے۔ یہ مناظر فطرت، تخیل کی لطافت اور قوت و حسن رکھتا ہے کیوں کہ ادب و شعر زندگی کے محور کے گرد ہی گردش کرتے ہیں۔ قاسمی شعر کے ظاہری پیکر کے نکھار کے ساتھ ہی اُسے داخلی روح سے منطبق کرنے پر متوجہ کرتے ہیں۔ فن شعر سے ان کے کچھ مطالبات ہیں جن کے گرد ان کی تنقیدی فکر گردش کرتی ہے۔ ان کے تنقیدی نظریات کیا تھے؟ کس قسم کی شاعری کو پسند کرتے؟ ان افکار و نظریات پر غیر مدون مضامین منتشر ہیں جن کے یکجا کرنے سے ایک کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ قاسمی مروجہ شاعری سے غیر مطمئن تھے۔ وہ اردو شاعری کے مصائب و نقائص کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ شعر کے جمالیاتی پہلو پر مرکوز ہے۔ اس روشنی میں فکر و فن کے سانچے بناتے پھر مخصوص اندازِ نقد سے قارئین کو روشناس کراتے ہیں۔ معیاری فن بنی نوع انسان کو خیر و حسن سے رجوع کرنا سکھاتا ہے۔ معیاری شعر و فن کے متعلق ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

> ''۔۔۔جو شعر و فن، متعلقہ فن کے جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انسان کو حسن و خیر اور عدل و توازن سے رجوع کرنا سکھاتا ہے اور جو زندگی کا اثبات کرتا ہے اور انسان کے

بنیادی جذبوں کی گہرائیوں تک پر اثر انداز ہو کر ان جذبوں کی تہذیب پر قادر ہوتا ہے
وہی معیاری شعر و فن ہے۔'' ۱۸

وہ افراد جو شاعری کو بے کار گردانتے ہوئے سائنسی ترقی کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ قاسمی سوال اُٹھاتے ہوئے کہتے ہیں ''سائنس کے اثبات کے لیے شاعری کی نفی کیوں؟'' شاعری انسان کو محبت و حسن کی کیفیتوں سے ہم کنار کرتی ہے۔ یہ حیاتِ انسانی کی رعنائیوں کی ترجمانی کرتی ہے، یہ بنی نوع انسان کے مابین محبت، اتفاق، اتحاد کو ہوا دیتی۔ اگر معاشرے سے شاعر رُخصت ہو جائے تو معاشرہ بے حسی کا شکار ہو جائے گا جس میں محبت و پیار کا دور دور تک نام و نشاں نہ ہوگا۔ قاسمی صلاحِ نیک سے نوازتے ہوئے کہتے ہیں:

''سائنسی علوم کو یقیناً ترقی دیجیے مگر اہلِ علم کی خدمت میں استدعا ہے کہ شعرا کو اپنا حریف نہ سمجھے۔ شعرا سب کے رفیق ہیں اور اگر وہ حریف ہیں تو جہالت کے، تنگ دلی کے، بدنیتی کے، بے انصافی اور عدل کشی کے، ظلم و جبر کے غرض کہ وہ ہر اُس چیز کے حریف ہیں جو زندگی کے حسن و صباحت کی حریف ہے۔'' ۱۹

یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے جس میں سائنسی علوم کارگر ہیں مگر اس عوام نے مسکرانا، محبت کرنا اور غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ عوام جذبات و احساسات کی مالک ہے۔ زندہ انسان کو جذبات و احساسات کے پیش نظر شعر و ادب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سائنس دان اور شاعر دونوں کا مشترکہ اثاثہ قوتِ متخیلہ ہے۔ ہر ذی روح میں حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت موجود ہے مگر ہر شخص کا ذوق مہذب پختگی کا حامل نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ اس دنیا کی تمام دل چسپ و دل کش فن کار کے صداقت، حسن، حلاوت اور اس کے روشن نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ قاسمی کو یقین ہے کہ قومی زندگی کے ہر شعبے میں احساسِ حسن اور آرائش جمال کی اقدار کو عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ حسن کی پرزور تائید اس لیے کرتے ہیں کیوں کہ:

''سچ بولنا بھی حسن ہے، بنی نوع انسان سے ہمدردی کرنا بھی حسن ہے، فراخ دلی بھی حسن ہے، غرض ہر نیکی حسن ہے، ہر صداقت حسن ہے، ہر حقیقت حسن ہے، حسن کا مفہوم محدود کر کے ہم۔۔۔ اپنے مستقبل کو ایک شکنجے میں کس دیں گے۔'' ۲۰

قاسمی تمام افراد میں احساسِ حسن کو بیدار کرنے کے خواہش مند ہیں کیوں کہ'' احساسِ جمال تو دل و نظر کے گداز کا نام ہے اور گداز احساس کو بیدار کرتا ہے۔''[۲۱] قاسمی اپنے احساسِ حسن کو غزل کے ایک شعر سے یوں واضح کرتے ہیں:

؎ زندگی کا ذائقہ تھا ان لبوں کے لمس میں
فکر کا شاعر ہوں لیکن حُسن کا گھائل بھی ہوں ۲۲

شاعر کے نظریہ فن، نظریہ حیات اور شاعری کا مستند ماخذ اس کے تجربات و مشاہدات کا ہوتا ہے۔ کیوں کہ کسی شاعر

کے نظریات و حیات کا گہرا عکس اس کے کلام میں موجود ہوتا ہے۔ شاعر اپنی شاعری میں شاعرانہ صداقت سے کام لیتا ہے۔ بقول قاسمی:

> ''شاعر اپنے آپ سے جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ جب وہ شعر کہتا ہے تو ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے جہاں آفتاب حقیقت و صداقت کی شعاعیں کسی دُور دراز کے کونے کھدرے کو بھی منور کیے بغیر نہیں رہتیں۔ یوں شاعر اپنے شعر میں ہمیشہ سچ بولتا ہے۔'' ۴۳

قاسمی اپنے معاشرے کے افراد سے شکایت کرتے ہیں کہ یہ شاعروں کو لااُبالی، غیر ذمہ دار، مادر پدر آزاد، حقیر اور قابل نفرت مخلوق تصور کرتے ہیں۔ اگر چہ شاعر کا کلام انسان کی روح میں گداز پیدا کرنا، اسے حسن سے متاثر کرنا، خیر و شر میں تمیز کرنا، انسان دوستی کا درس دینا اور اسے زندگی اور انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ شاعری قارئین کے دلوں میں استہزائی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ قاسمی وطن دوستی، عوام دوستی اور مقصد دوستی کی مثلث کے داعی ہیں۔ یہ انسان دوستی کو اسلام دوستی کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ انسان دوستی تہذیبی اختلافات کی نفی کرتی ہے۔ بنی نوع انسان، انسان دوستی کی بنا پر ہی ایک دوسرے سے مذہبی، تہذیبی، نسلی، سیاسی اور معاشرتی اختلافات کے باوجود محبت کرتے ہیں۔ انسان دوستی کے متعلق قاسمی کے نظریات ملاحظہ ہوں:

> ''انسان دوستی دینی یا تہذیبی اختلافات کی نفی ہے۔ انسان دوستی تو خوب صورت ہی اُس وقت لگتی ہے جب وہ دینی یا تہذیبی یا معاشی امتیازات کے ماحول میں پھولے پھلے۔'' ۴۴

شاعر کی ذہنی قوتیں اپنے ماحول و گرد و پیش سے تربیت پاتی ہیں وہ اپنے ماحول سے ادراک و اکتساب حاصل کرتے ہیں۔ شاعری چوں کہ اظہارِ حقیقت ہے اس لیے اس میں کیفیات بیان ہے۔ شاعری کا ملکہ فطری ہے۔ اس میں کامرانی کے لیے خاص تربیت و اصلاح متقاضی ہے۔ شاعرانہ صداقت کے متعلق ہر شخص کی رائے مختلف ہے۔ کسی نے گزرے وقت میں شاعرانہ صداقت کو تلاش کیا۔ کسی نے ابدیت میں شاعرانہ صداقت کی سراغ رسانی کی اور کوئی اپنی ذات کی تسکین کو شاعرانہ صداقت گردانتا ہے۔ قاسمی کے نزدیک شاعرانہ صداقت اپنی ذات کا اظہار کرنے اور اس شاعر کے فن میں اپنی دھرتی کی بو باس شامل کرنے کا نام ہے۔

قاسمی فن کار کو معاشرے کا ناگزیر حصہ سمجھتے ہوئے اس کی انسان دوستی کے قدردان تھے۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے قاسمی کے فن کا بنیادی موضوع انسان اور حیاتِ انسانی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اگر انسان موجود ہے اور اس کرے پر زندگی موجود ہے تو پھر سب کچھ موجود ہے۔۔۔ سو میری نظر میں انسان اہم ہے اور فن اسی صورت میں اہم ہے جب وہ انسان کو حسن و توازن حاصل کرنے میں مدد دے اور انسان کو منفی انداز میں اُداس نہ کرے۔ وہ زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بنائے۔'' ۴۵

فن کار کا محبوب چوں کہ انسان ہے۔ اگر انسان مضطرب و بے چین ہے تو فن کار آسودہ خاطر نہیں رہ سکتا۔ ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سچا فن کار رہتا ہے لہٰذا ''جب تک دنیا میں ظلم ہے، بے انصافی ہے، بھونڈا پن ہے، عدم توازن ہے، ریاکاری ہے اور انسان کے بے ساختہ پن کی پامالی ہے۔ اس وقت تک سچے فن کار کا تخلیقی اضطراب ختم نہیں ہو سکتا۔''[۲۶] فن کار چوں کہ قوم کا ناگزیر فرد ہے۔ قاسمی ایسے ادب اور ادیب کے آرزومند ہیں جو محب الوطن ہوں، جو پاکستان کے وفادار ہوں اور تہذیب سے محبت کریں۔ حسن کاری، خیر سگالی اور امن ادیب کا شیوہ حیات ہے۔ جو آرا انھوں نے ادیب کے متعلق دی ہیں اس سے سنسنی تو ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن تشفی بخش مطلب اخذ نہیں ہو سکتا جن پر عمل پیرا ہو کر بڑے ادیب و شعرا کی فہرست میں بآسانی شامل ہوا جا سکتا ہے۔

قاسمی اپنے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں کیوں کہ مجھے اسی مٹی نے پیدا کیا اور انھی ہواؤں نے پالا ہے۔ پھر میں جس حسن و توازن کا پجاری ہوں اس کا تصور مجھے یہیں سے ملا ہے۔ اس لیے مجھ پر اس سرزمین کے خاص حقوق ہیں اور میں امن و آشتی کا پرستار ہونے کے باوجود اس کے ناموس کے تحفظ کے لیے لڑ بھی سکتا ہوں اور اس کی آن پر مر بھی سکتا ہوں۔ حد سے بڑھی ہوئی عالم گیریت والے مجھ پر تنگ خیالی کا الزام بھی دھر سکتے ہیں مگر میں اس ماں کو کیسے بھولوں جس نے مجھے جنم دیا اور جس کے قدموں میں میری جنت ہے۔''[۲۷]

ادیب اپنی تخلیق کا مواد زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ عوامی زندگی میں موجود بے ضابطگیوں اور بے انصافیوں کے راز فاش کرتا ہے۔ عوام کے ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ قاسمی اپنے مضمون ''زندگی افروزی کی روایت'' میں ادب برائے ادب کی تردید کرتے ہوئے ادب برائے زندگی کے پیروکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا واضح ثبوت یہی ہے کہ قاسمی ایک ترقی پسند نقاد تھے جو جبر کی قوتوں کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ انھوں نے جاگیرداروں، سرمایہ داروں کی بے انصافیوں کے راز فاش کیے۔ قاسمی کا خیال ہے کہ:

> ''اگر کوئی ادیب اسلامی نقطہ نظر سے مروجہ نظامِ حیات کی بے انصافیوں پر تنقید کرتا ہے اور اکتنازِ زر کی مخالفت کرتا ہے اور معاشی مساوات نہ سہی، معاشی عدل و توازن کی دہائی دیتا ہے اور انسانی محنت کا استحصال کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے اور اپنی قوم کے ایک ایک فرد کو احتیاج سے آزاد اور خوش حال دیکھنا چاہتا ہے تو وہ صدفی صد ترقی پسند ہے۔ ترقی پسندی کا قبالہ صرف کمیونسٹ ہی اپنے نام نہیں لکھوا لائے ہیں، ترقی پسندی تو ہر دیانت دار اور باضمیر ادیب کا اثاثہ ہیں۔''[۲۸]

ان کے نقطہ نظر کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی ادیب انفعال کا شکار نہیں، اگر شکست خوردگی سے پامال نہیں،

اگر اس کا فن زندگی کا ترجمان ہے اور اگر یہ مثبت نقطہ نظر کا مالک ہے تو وہ ترقی پسند ہوگا۔

سماجی شعور ایک حقیقت ہے۔ ادیب زندگی اور ماحول سے مواد حاصل کرتا ہے پھر یہی مواد ذاتی تجربات اور شخصیت میں تحلیل ہو کر دل کش الفاظ کا جامہ پہن کر ادب میں جگہ پاتا ہے۔ ان کی دور بین نگاہ بیک وقت معاشرہ، تہذیب، سیاست اور مذہب پر ہے۔ ان کی تنقید کا تعلق فلسفہ کے جمالیاتی پہلوؤں سے بھی ہے جن کا مقصد قارئین میں جمالیاتی ذوق پیدا کرنا ہے تاکہ وہ ہر شے کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اپنے دل میں کشش اور تاثیر پیدا کریں۔ حساس ادیب اپنے عہد میں اُٹھنے والے ادبی سوالات و مسائل سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ قاسمی کی تنقیدی نگارشات شاہد ہیں کہ وہ اپنے عہد کے ادبی مسائل سے کبھی بے نیاز نہیں رہے۔ ان کا تنقیدی لب و لہجہ دراصل خود اعتمادی، خوش فکری، ادبی دیانت، کشادہ نظری اور بے باکی سے عبارت ہے۔ اس لیے ان کا لب و لہجہ شبنم کی مانند خنک ہے اور جھلے ندی کی سی روانی کے ساتھ نغمہ بار ہوتے ہیں۔

ادیب معاشرے کا اہم اور حساس رُکن ہوتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کا اظہار تحریروں میں کرتا ہے۔ حساس ہونے کی بنا پر وہ معاشرے سے الگ نہیں رہ سکتا۔ وہ معاشرے کے دیگر افراد کے فکر و عمل کو متاثر کرتا ہے۔ ادیب و شاعر معاشی و سماجی زندگی کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ افراد کو معلومات بھی بہم پہنچاتا ہے۔ فن کار ہی دنیا میں موجود ظلم، ناانصافی، عدم توازن، ریاکاری، پامالی اور استحصال کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ قاسمی کا وطیرہ بھی عمر بھر یہی رہا۔ کبھی کالموں کی صورت میں اور کبھی افسانوں کی صورت میں استحصال اور ظلم و جبر کو منظرِ عام پر لائے۔ لکھتے ہیں:

> ''میں ذاتی طور پر اپنے قاری سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں اور میرے قویٰ سلامت ہیں۔ میں اس سے بحیثیت فن کار رخصت ہونے کی اجازت طلب نہیں کروں گا۔'' ۲۹

انھوں نے یہ وعدہ خوش اسلوبی سے نبھایا۔ یہاں تک کہ وفات سے دو دن قبل بھی ان کا کالم روزنامہ ''جنگ'' میں شائع ہوا۔ یہ ادیب کی اپنے مسلک سے، اپنے منصب سے، اپنے قارئین سے، الفاظ و معنی سے وابستگی تھی جسے تاعمر احسن طریقے سے پورا کیا۔

اہلِ معاشرہ جب کوتاہیوں پر رضامند ہو جائے تو بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ بے حسی قوم کے ارتقائی سفر میں مضر ثابت ہوتی ہے۔ قاسمی اسے ادیبوں کی بے حسی قرار دیتے ہیں کہ حکومت کی جانب سے کتابوں پر پابندی عائد کر دی گئی مگر اہلِ قلم کے بڑے ادارے رائٹرز گلڈ کی جانب سے احتجاج کا کلمہ بھی بلند نہ ہوا۔ اہلِ قلم اور اہلِ نقد کو اس سفاکانہ بے حسی کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس خیر و برکت کے لیے عملی اقدام اُٹھانا چاہیے۔ انھیں

اپنے عصر کا درست ادراک ہونا چاہیے اور اہلِ علم کو اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے کیوں کہ ادیب ہی زندگی کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں، ادیب کو قومی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بہت ایثار، فراخ دلی اور بے تعصبی کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ اہلِ قلم تو سکون اور آسودگی کا پیام بر ہے۔ پاکستانی ادبا نے ہر کٹھن حالات میں اہلِ ملک کا ساتھ دیا۔ بقول خالد احمد:

> ''پاکستانی ادیب بہرطور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی راست فکری کی شمع روشن کیے رکھی۔ پاکستانی ادیب کو یقین رکھنا چاہیے کہ پاکستانی عوام اپنے ادیبوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے کیوں کہ اقتداری دنیا کے سرداروں کی قبریں انھوں نے کبھی بے چراغ نہیں رہنے دیں۔'' ۳۰

تخلیقی جوہر تنقیدی شعور کے بغیر اہمیت کا حامل نہیں ہوتا اور نہ تنقیدی شعور تخلیقی استعداد کے بغیر جان دار ہوتا ہے۔ بڑے تخلیقی کارنامے عمدہ تنقیدی شعور سے ہی وجود میں آ سکتے ہیں۔ اردو ادب میں وجہی سے لے کر دورِ حاضر تک عمدہ تنقیدی شعور کو بروئے کار لا کر ہی عمدہ فن پارہ تخلیق ہوتا ہے۔ ادیب کا تنقیدی شعور اپنے فن پارے کی قدر متعین کر کے اعلیٰ معیار مہیا کرتا ہے۔ ''نئے اور پرانے اہلِ قلم'' کے عنوان پر مشتمل تنقیدی مضمون میں نئے فن کاروں کی جانب توجہ مترشح کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے پرانے اہلِ علم کو اپنا موقف تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ ادیب کو افراد کی زندگی اور اجتماع کے رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے کیوں کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں بنی نوع انسان جبر وستم کا نشانہ بنے گا تو نئے اور پرانے اہلِ قلم کے دل میں ٹیس ضرور اُٹھے گی۔ وہ اس کے خلاف آواز ضرور اُٹھائے گا۔ لہٰذا نئے ادبا و شعرا کا خیر مقدم خوش دلی سے کرنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ:

> ''نئے ادیبوں کو بے بسی سے خلا میں ہاتھ پیر مارنے سے بچایا جائے اور پاکستان کے جوہر قابل کو مغرب کی ان تحریکوں کی نذر ہو جانے سے محفوظ رکھا جائے جو کہتی ہیں کہ مسائل کا کوئی حل کبھی ڈھونڈا ہی نہیں جا سکتا۔'' ۳۱

قاسمی چاہتے تھے کہ نئے اہلِ قلم اپنی تحریروں میں پاکستان کی مٹی کی خوش بو سے اپنے وجود کا اظہار کریں۔ ان کی نگارشات سے پاکستانیت کی مہک محو نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ادیب چاہے پاکستان میں مقیم ہو یا بیرونِ ملک، اس سے نوجوان و بزرگ اہلِ قلم کو مفر نہیں ہونا چاہیے۔ لکھتے ہیں:

> ''نقطہ نظر چاہے کوئی بھی ہو، اس کی جڑیں ہماری اپنی دھرتی میں ہونی چاہئیں ۔۔۔ یہ دھرتی جس کی ایک الگ پہچانی جانے والی تاریخ اور تہذیب و ثقافت ہے۔'' ۳۲

قاسمی فن کار کے فن کے بہت بڑے قدر دان تھے۔ ایک صاحب جس کا نام قاسمی نے پوشیدہ رکھا۔

پاکستان کی بیسویں سالگرہ کی تقریب میں انھوں نے نو وارد ادیبوں اور شاعروں کو ننھے ننھے لکھاری کہہ کر مخاطب کیا جو قاسمی کو بہت ناگوار گزرا لہٰذا نہایت فراخ دلی سے اپنے موقف و خیالات سے قارئین ادب کو آگاہ کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمیں اپنی نئی پود سے ہزار اختلاف سہی لیکن یہ طے ہے کہ مستقبل کا شعر و ادب انہی نوجوانوں سے وابستہ ہے۔ پھر ہم سب جانتے ہیں کہ یہ نوجوان شاعر اور ادیب بے حد ذہین ہیں اور زندگی کے بارے میں ان کی معلومات ہم سے بھی کچھ زیادہ ہی ہیں کیوں کہ وہ جدید تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں جو جوہر اور چمک ہے اس کا اعتراف نہ کرنا نہ صرف بددیانتی ہے بلکہ شعر و ادب کے مستقبل پر ظلم ہے۔ ان نوجوانوں کو تو ہمیں پیار کے ساتھ سینے سے لگائے رکھنا چاہیے۔'' ۳۳

قاسمی کے خیال میں ملکی اور قومی آزادی کی دولت سے فیض یاب ہونا از حد ضروری ہے۔ ملک کے سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حالات پر تنقید اصلاحی جذبے کے تحت کی جاتی ہے۔ اس ہمہ گیر اصلاح کا نتیجہ ملکی آزادی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان کے خیال میں ادیبوں اور شاعروں کے فرائض واضح ہونے چاہئیں بالخصوص ملکی حالات پر شاعروں کو اپنے اشعار کے ذریعے اظہار مدعا کرنا چاہیے کیوں کہ:

''شعر فوری طور پر دلوں اور دماغوں میں اُتر کر قاری یا سامع کے مزاج کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ انسان غیر محسوس انداز میں جس شدت کے ساتھ شعر سے متاثر ہوتا ہے، شاید ہی کسی اور چیز سے متاثر ہوتا ہو۔'' ۳۴

ان امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاسمی اردو تنقید کی روایت کی مختلف جہتوں سے توسیع کر رہے ہیں۔ اُن کی زبان شگفتہ، صاف، سلیس اور ہموار ہے۔ وہ اپنے خیالات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ زبان و بیان پر ایسی ماہرانہ گرفت ان کے تنقیدی مقالات کو مبہم نہیں بناتی اور ہر ذہن اور ہر سطح کا قاری ان تحریروں سے مستفید ہو سکتا ہے۔ یہ ایسا وصف ہے جو کم افراد کو میسر آتا ہے۔ اس لیے اکثر نقاد لفظوں کے گورکھ دھندے میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ خیالات بھی مبہم اور بے ربط ہو جاتے ہیں اور قاری سے رشتہ بھی اُستوار نہیں ہو پاتا۔ قاسمی نہایت سلیقے سے قاری کے دل و دماغ میں سما جاتے ہیں۔ ان کی اس ہنرمندی کا احساس ہر مضمون میں ہوتا ہے۔ یہ ایسا ملکہ ہے جو ہر نقادانِ فن کو خدائے بزرگ و برتر نے ودیعت نہیں کیا۔

ادیب و شاعر تمام ملکی و غیر ملکی رجحانات سے لاعلم رہ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ قاسمی تنقید کے دوران نہایت غیر جانب داری سے ہم عصر شعرا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ غزل کا ایک شعر بھی قارئین کو فہم و ادراک کی دولت عطا کر کے مستقبل کے امکانات کو روشن کر سکتا ہے مثلاً منیر نیازی کی غزل کا مقطع

پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ'' ۳۵

منیر نیازی نے نہایت ہنرمندی اور سلیقہ مندی سے ملکی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی پسماندگی کا نقشہ بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔ اہلِ قلم و اہلِ دانش سے محبّ الوطن ہونے کی درخواست کرتے ہیں کہ اپنے خطہ ارض کی ترقی وتعمیر، خیر سگالی، اور امن وامان سے وطن کا ہر ذرہ خوب صورت دکھائی دینے لگتا ہے۔ مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں:

> ''یہ بہت سیدھی سادی باتیں ہیں۔ کوئی سمجھنا چاہے تو لغت دیکھے بغیر سمجھ سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ یہ فلسفے کی بجائے جذبے اور اصطلاحات کی بجائے احساسات کی باتیں ہیں۔ خاص طور پر پاکستانی تاریخ کے اس موڑ کے اہلِ قلم اور اہلِ دانش سے میری استدعا ہے کہ وہ نظریاتی اُلجھنوں اور اصطلاحاتی موشگافیوں سے ہٹ کر اپنے جذبہ واحساس کی مدد سے پاکستان کی اکائی، اس کی سالمیت، اس کے مستقبل اور اس کے استحکام کے بارے میں غور کریں۔'' ۳۶

قاسمی کا خیال ہے کہ ادیب وشاعر کو ذوقِ فن اور احساسِ جمال کی عمدہ ترجمانی کرنی چاہیے۔ ادیب وشاعر اگرچہ اپنی تخلیق کا خام مواد زندگی اور اس کے گرد وپیش کے عناصر سے حاصل کرتا ہے۔ یہ زندگی اور مظاہر زندگی کی تمام صداقتوں کو سمیٹ کر منظرِ عام پر لے آتا ہے۔ ادیب زندگی کش نہیں بلکہ زندگی افروزی پر عمل درآمد کرتا ہے۔ یہ زندگی کی بے انصافیوں اور استحصال کے خلاف قلم اٹھاتا ہے۔ اکتنازِ زر کی مخالفت کرتا اور معاشی مساوات کی تائید کرتے ہوئے ادب میں چمک دمک اور توانائی پیدا کرتا ہے۔ یہ زندگی پر تنقید اور اس کی تطہیر بھی کرتا ہے۔ اپنے معاشرے کے ہر فرد کو خوش حال دیکھنے کا خواہش مند ہوتا۔ قاسمی ادیب سے زندگی کے مسائل کو منکشف کروانا اور اپنے منصب کا درست ادراک چاہتے ہیں۔ اب اہلِ قلم اور دانش ور حضرات مل کر تمام مسائل پر سنجیدگی سے غور وفکر کریں۔ اس ضمن میں وہ جن صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے اتنا ہی نئی نسل ان کے ممنون ہوگی۔ ''کیا لفظ مر رہا ہے؟'' کے عنوان پر مشتمل مضمون میں لفظ کے درست استعمال، اس کی حیات وممات اور تغیر وتبدل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس طرح مصور کے فن کا ہتھیار اس کا رنگ اور موقلم ہے بعینہٖ ادیب کے فن کا ہتھیار قلم اور کاغذ اور لفظ ہے۔ سچے قدردان ہی لفظ کو اس کے درست منصب کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور برتنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ اردو غزل میں میر، غالب، اقبال، فانی، جگر، حسرت، اصغر اور یگانہ کے کلام میں الفاظ کی خوب صورت در و بست اور فکر وخیال پایا جاتا ہے۔

اُردو زبان ایک متحرک زبان ہے جو نہایت فراخ دلی سے باقی ماندہ زبانوں کو اپنے اندر جذب کرنے

کی صلاحیت رکھتی ہے۔ قاسمی عصری تقاضوں کے حوالے سے قومی زبان کے متعلق اپنے افکار کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''یہ تو سراسر فراخ دل اور غیر متعصب زبان ہے۔ اس کا تو خمیر ہی وسیع القلبی اور عدم تعصب سے اُٹھا ہے۔ کسی بھی زبان کا کوئی بھی لفظ اگر اس کے مزاج کے مطابق ہے تو وہ اسے کمال بے ساختگی سے اپنا لیتی ہے۔'' ۳۷

ہمیں اپنی قومی زبان کو ہمہ گیر بنانے کے لیے اسے دانش کدوں اور تعلیم گاہوں میں اعلیٰ مقام دینا چاہیے۔ قاسمی اپنی قوم کی نفسیات سے آگاہ ہیں کہ وہ احساسِ کم تری کا شکار ہے۔ اس لیے مادری زبان یا قومی زبان کو بھی وہ مرتبہ نہیں مل رہا جس کی وہ حق دار ہیں۔ لکھتے ہیں:

''بچوں کو ابتدائی تعلیم انھی زبانوں ــــ ان کی مادری زبانوں ــــ میں دینے کا سلسلہ شروع کریں اور اس معاملے میں کسی تعصب یا احساسِ کم تری کا شکار نہ ہوں۔ اس سے اردو کا کچھ بگڑے گا نہیں بلکہ سنورے گا۔'' ۳۸

ادیب و شاعر کو اردو زبان کا تحفظ کرنا چاہیے اور علاقائی زبان و ادب سے گہرا، مضبوط اور بلیغ تعلق قائم کرنا چاہیے جو قومی یک جہتی کی پہلی شرط ہے۔ قاسمی ایسا نظامِ تعلیم چاہتے ہیں جو طبقاتی فرق اور عدم مساوات کو ختم کرے۔ تعلیم اور معاش دونوں اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ نئی نسل جو احساس محرومی کا شکار ہے اس کا سبب ہمارا ناقص نظامِ تعلیم ہے جو تبدیلی کا خواست گار ہے۔ انگریزی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں انگریزی کی تعلیم کا مخالف نہیں ہوں بلکہ حامی ہوں کہ اس وقت یہی بین الاقوامی زبان ہے۔ اس کی تعلیم جاری رہنی چاہیے۔ بس اتنا ہے کہ پانچ سات برس کے پاکستانی بچوں کے گناہ معاف فرما دیے جائیں۔'' ۳۹

قاسمی مستقبل کے نونہالوں کی ہمہ گیر تربیت و اصلاح کے خواہش مند ہیں وہ نظامِ معیشت میں متوازن اور مناسب تبدیلیاں لانے کے خواہاں ہیں۔ ترقی پسند فکر کے مالک قاسمی مساوی نظامِ تعلیم کے متمنی ہیں۔ انھیں اپنے ملک کے نونہالوں کے تاریک مستقبل کا خدشہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''جب تک دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام نہیں ہوتا اور جب تک ہر طبقے کے لوگوں کو آگے بڑھنے کے لیے یکساں مواقع میسر نہیں آتے۔ پاکستانی بچوں کی اکثریت یوں ہی سرگرداں رہے گی اور نتیجتاً ہم اپنے مستقبل کے بارے میں خود اعتمادی کے ساتھ کوئی اندازہ نہیں لگا سکیں گے۔'' ۴۰

قاسمی اپنی قوم کے معماروں کو سنسان گلیوں میں کھیلتے، کوڑے کرکٹ کے انبار کے پاس خاموش کھڑے، کسی چائے کی دکان یا ہوٹل پر چند پیسوں کے عوض کام کرتے، سائیکل کے پہیوں میں ہوا بھرتے اور

ورک شاپوں میں کام کرتے دیکھتے ہیں تو حساس فن کار یہ سوچنے لگتا ہے کہ کتابی علم کتنا کم ہے۔ سو فی صد خواندگی کے لیے نظامِ تعلیم میں مناسب تبدیلیوں اور نظام معیشت میں انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔ یہ ایسے نصابِ تعلیم سے غیر مطمئن ہیں جو ان کی انفرادی صلاحیتوں کو اُبھرنے نہ دے۔ ننھے نونہالوں کے لیے ایسا نصابِ تعلیم مرتب ہونا چاہیے جو ان کو متحرک کرتے ہوئے انفرادی صلاحیتوں کو جلا بخشے۔ تعلیمی نصاب میں کتابوں کی زبان بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہونی چاہیے جس میں بچوں کے جذبہ تجسس کو اُبھارا جائے۔ اس امر میں ان کے نزدیک سستی، کاہلی اور غفلت ملک دشمنی کے مترادف ہے۔ بچوں کو خیالی دنیاؤں کی سیر کرانے کی بجائے حقیقی دنیا سے متعارف کرانا چاہیے۔ ایسی کتابیں نہیں ہونی چاہئیں جن کے سرورق بھوتوں، ریوالوروں اور بہتے لہو سے آراستہ و پیراستہ ہوں کیوں کہ یہ تخریبی سرگرمیاں بچوں کی اخلاقی قدروں کے منافی ہیں۔ ان کتابوں سے بچے مار پیٹ اور قتل و غارت سیکھتے ہیں اور بچوں کی ذہنی نشوونما رُک جاتی ہے۔ معمولی مالی منفعت کی خاطر پاکستان کے مستقبل کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ بچوں کے لیے پاکستانی تاریخ، اسلامی تاریخ اور روزمرہ زندگی کے واقعات بچوں کے ادب کا موضوع بن سکتے ہیں۔ ایسا ادب بچوں کی قوتِ متخیلہ اور ان کی اخلاقی قدروں کی پاس داری بہتر طور پر کرتا ہے۔ بچوں کے لیے کتابیں شائع کرنے سے قبل اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ:

> ''۔۔۔ ہمارے ذمے بچوں کی ذہنی تعمیر ہے۔ اس مقصد کے لیے اوّل تو براہِ راست قسم
> کے وعظ و نصیحت کا انداز درست نہیں ہے کہ بچہ اس انداز سے متاثر ہونے کی بجائے بور
> ہوتا ہے۔ دوم ہمارے مدنظر ہمیشہ خیر و برکت اور حسن و توازن کی قدریں ہونی چاہئیں۔
> ہمیں بچوں کو انسان اور انسانیت کا احترام سکھانا چاہیے۔ انھیں بہادر بنانا چاہیے۔'' [۴۱]

بچوں کی ذہنی تربیت اور خود اعتمادی سے بہرہ یاب ہونے کے لیے وقیع کتب اشاعت پذیر ہونی چاہئیں۔ اگرچہ عمدہ کتابیں بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں لیکن قاسمی کے خیال میں ان کی تعداد ناکافی ہے لہٰذا وہ ناشرین کتب سے استدعا کرتے ہیں کہ ''وہ ہر ضخیم ناول کی ''بخ'' کی صورت میں ہی سہی بچوں کی ایک ایسی کتاب بھی چھاپ ڈالا کریں جو ایک آزاد قوم کے بچوں کے مطالعے کے لائق ہو۔ بچے کے ہاتھ میں صاف ستھری کتاب ہونی چاہیے۔''[۴۲] لہٰذا اس طرزِ استدلال پر دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔ قاسمی اپنے موقف کو صاف و صریح الفاظ میں بیان کرنے کے لیے اقبال کے شعر کا انتخاب کرتے ہیں:

> ؎ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
> نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا [۴۳]

قاسمی وسعتِ مطالعہ کے ساتھ معتدل رائے دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ وہ محض مطالعے کے بل بوتے پر رائے قائم نہیں کرتے بلکہ اس صنف کی تاریخ، تکنیک اور اسلوب غرض تمام امور کو پیش نظر رکھ کر

متوازن رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہر صنف کو فکری تسلسل کے ساتھ کھلی آنکھ اور بیدار ذہن کے ساتھ دیکھنے، پرکھنے اور پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے تمام نتائج سے اتفاق رائے ضروری نہیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے نہایت محنت ولگن سے اس سارے نشیب وفراز کا جائزہ لیا۔ انھوں نے حقیقتِ حال کی وضاحت کے لیے مثالوں سے محاکمہ کیا ہے مثلاً اپنے موقف کو مستند بنانے کے لیے مسلمانوں کی نفسیات کے عین مطابق اسلامی تاریخ سے واقعات کا انتخاب کرتے ہیں مثلاً:

> ''۔۔۔ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا کہ تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ وہ بولا کہ مدینے کے باہر چراگاہ میں چھوڑ آیا ہوں اور اللہ کے توکل پر چھوڑ آیا ہوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ پہلے جا کر اونٹ کا گھٹنا باندھو اور اس کے بعد اُسے اللہ کے توکل پر چھوڑ آؤ۔'' ۴۴

انھوں نے ماہرفن کار کی مانند انسان کی نجی کوششوں اور محنت کی افادیت کو نہایت ہنرمندی سے کہانی کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ان کا انفرادی شعور پوری قوت سے کارفرما ہے۔ وہ عصرِ حاضر کی تبدیلیوں سے کسی طور پر غافل نہیں۔ ماضی کو فراموش کرتے ہیں۔ مستقبل پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ عوام کی زندگیوں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے نہایت بے باکی سے سیاست دانوں کے موقف اور عزائم کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ حق گوئی عمر بھر ان کا وطیرہ رہی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''۔۔۔ندیم کا آدرش ہی ''حق گوئی و بے باکی'' ہے۔''[۴۵] وہ بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے پوری دیانت داری سے ہر چیز کے حسن و قبح پر روشنی ڈالتے ہیں۔ قاسمی ''پس الفاظ'' میں اس وصفِ خاص پر فخریہ انداز اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم اہلِ قلم، حق گوئی سے کبھی باز نہیں آسکتے اور ہم اظہار پر عائد ہر پابندی کو بے خوفی سے توڑ دیں گے۔ گھروں میں گھس بیٹھنے سے حکومتوں کی دست درازیوں کے راز فاش نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ میں نے گھر بیٹھے رہنے کی بجائے مارشل لا کی سجائی ہوئی اسٹیج پر جا کر مارشل لا والوں کو کھری کھری سنائیں۔ حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کا اعلان کرنے کے لیے بڑی جرأت درکار ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی مجھ میں فیاضانہ طور پر ودیعت کی ہے۔'' ۴۶

قاسمی کے دل پسند شخصی موضوعات میں غالبؔ، اقبال اور قرۃ العین حیدر شامل تھے۔ وہ ان نام وَر شعرا ونثر نگار کو روشناس خلق کرانے کے لیے تنقید کے پیمانے متعین کرتے ہیں۔ وہ ان شعرا سے جذباتی تعلق پیدا کر کے قاری کی تفہیم کے لیے ہمدردانہ رویہ اپناتے اور اختلافی نکات رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں غالبؔ کی علمی وادبی اہمیت مسلم ہے۔ ان کی علمی وفنی شخصیت کو اعلیٰ فکر کی بدولت دوام حاصل ہوا۔ ناقدین ادب نے فکر وفنِ غالب کو نئے نئے گوشوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ فلسفہ حیات ہو یا ذوقِ جمال، فلسفہ تصوف ہو یا نظریہ فن اس بے مثال فنی عظمت

کے حامل شاعر پر ہر زاویہ سے کام ہوا ہے۔ قاسمی نے بھی اسی سلسلے میں کاوشیں کیں۔ انھوں نے ''پس الفاظ'' میں نو مضامین پر مشتمل ''خصوصی مطالعہ غالبؔ'' شامل کیا۔

۱۔	غالب خستہ کے بغیر	۱۹۶۶ء	۲۔	غالب کی صد سالہ برسی	ستمبر ۱۹۶۸ء
۳۔	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟	۱۹۶۷ء	۴۔	جیتا جاگتا غالب	
۵۔	فکر وفن کا امتزاج غالب	فروری ۱۹۶۸ء	۶۔	غالب کی حسرت تعمیر	
۷۔	غالب کا اندازِ گل افشائی گفتار	۱۹۷۰ء	۸۔	غالب کی جستجوئے جمال	فروری ۱۹۶۹ء
۹۔	سخن نا شناسی	۱۹۶۸ء			

سات مضامین میں سن اشاعت درج ہے جب کہ دو مضامین میں ماہِ اشاعت کا بھی التزام کیا گیا ہے لیکن دو مضامین میں تاریخ و سنِ اشاعت درج نہیں۔ ان مضامین کی مرتبہ منصورہ احمد کے خیال میں یہ مضامین غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر لکھے گئے۔ قاسمی نے غالبؔ کے فکر وفن کا دقت نظر سے جائزہ لے کر استنباط نتائج کیا ہے۔ انھوں نے واضح، شفاف منفرد پہلو سے غالبؔ کے فکر وفن کو ژرف بینی سے پیش کیا ہے۔ قاسمی، غالب سے بہت متاثر تھے۔ ان کے دل میں تحسین غالبؔ کا نرم گوشہ موجود تھا۔ اس کا مسلمہ ثبوت محولہ بالا مضامین اور فنون کا غالبؔ نمبر ہے۔ اس نمبر میں غالب کے فکر وفن پر مبسوط مقالات تحریر کروانے کے علاوہ غالبؔ کی زمین میں معروف شعرا سے غزلیں لکھوا کر ''فنون'' میں شامل کیں۔ اس نمبر میں غالب کی نثر بالخصوص مکاتیب غالب کو بھی شامل کر کے نمبر کی افادیت و اہمیت میں دوچند اضافہ کیا۔ غالب ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ اپنے اکثر مضامین و مقالات میں دیوانِ غالب کی مثالیں دیتے۔ اکثر و بیشتر غالبؔ کے اشعار گنگناتے اور مسرور ہوتے۔ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں: ''دیوانِ غالب کو میں نے بار بار پڑھا ہے اور اب بھی پڑھتا ہوں۔''[۴۷]

قاسمی غالب پسند دانش ور تھے جس کا اندازہ ان کے غالب پر تحریر کردہ مضامین سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ غالب کو اردو ادب کی تہہ دار متحرک روایت تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی نظر غالب کے اسلوب اور فن پر گہری ہے۔ انھوں نے غالب کے اشعار میں جدت پسندی، شاعرانہ نظریات، خیال کی باریکی، پہلوداری، تہہ داری اور اظہار بیان کی شگفتگی کا سراغ لگایا ہے۔ غالب کی عظمت کا خاصہ ہے کہ لفظ اور مصرع کو اتنی دل کشی سے ادا کرتے ہیں کہ شعر شگفتگی کا حامل ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''غالب لفظ کو کچھ اس سلیقے سے استعمال کرتا ہے اور مصرع میں اس کی نشست اتنی مناسب ہوتی ہے کہ آس پاس کے الفاظ بھی چمک دمک اٹھتے ہیں۔ اس کے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں اپنے معانی کو اپنے اندر چھپا کر نہیں بیٹھی رہتیں بلکہ وہ ادھر استعمال ہوتی ہیں۔ اُدھر قاری یا سامع کے ذہن پر گل افشاں ہو جاتی ہیں۔''[۴۸]

غالب کی شاعری کے الفاظ جدید تر مفہوم کے حامل ہونے کی وجہ سے دورِ حاضر کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ اُس پر طرزِ بیان اتنا سہل اور سادہ کہ رشک آنے لگتا ہے۔

''غالب اسی لیے تو پرانا نہیں ہو پاتا۔ اس کے الفاظ کے ٹھاٹھ میں معانی کا جو سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے اور جس طرح ایک مفہوم کی لہر کے اندر سے دوسرے مفہوم کی لہر بلند ہو کر ابلاغ کا سفر طے کرنے لگتی ہے۔ یہ غالب ہی کا حصہ ہے۔'' ۴۹

قاسمی کے خیال میں غالب کے فن کا بنیادی مقصد فکری جمود کی مکمل طور پر بیخ کنی کرنا تھا جو مسلمانانِ برعظیم کے ذہنوں پر سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مسلط ہو چکا تھا۔ غالب ایک باشعور شاعر کی طرح ماضی کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کو اپنے تمام معیاروں کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ تمام امور کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر قارئین سے داد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔ قاسمی کے خیال میں:

''یہ غالب ہی کی قدآور شخصیت کا معجزہ ہے کہ ہماری شاعری رعایتِ لفظی کے مداری پن سے نکل کر مسائلِ حیات و کائنات سے پنجہ آزما ہوئی۔'' ۵۰

غالبؔ نے اپنے گرد و پیش کے افراد کے ذہنوں کو جو مدت سے جمود کا شکار تھے، اُس فکری جمود کے حصار سے باہر نکال کر حیات و کائنات کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دی۔ اپنے قارئین پر پہلی بار راز فاش کرتے ہیں:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا ۵۱

قاسمی کے خیال میں یہ وہی اسرار و رموز ہیں جو غالب کی وفات کے پینسٹھ (۶۵) برس بعد علامہ اقبال اپنے قاری پر منکشف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں ۵۲

قاسمی سنجیدہ نوعیت کے مضمون ''فکر و فن کا بے مثال امتزاج۔۔۔غالب'' میں غالبؔ کی فکر کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے شعر کو فکر اور فکر کو شعر کا جامہ پہنانے کی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ شاعر کی تخلیق پر ماحول کے اثرات گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ غالب کے دور کا رجحان صوفیانہ تھا۔ اس لیے غالب کی شاعری میں بھی صوفیانہ عناصر اور مسائل تصوف کا بیان دکھائی دیتا ہے۔ غالب کی فکر حقائق زندگی اور صداقتِ زیست پر مشتمل تھی۔ قاسمی کے اسلوب میں چونکا دینے کا عنصر بھی موجود ہے مثلاً غالبؔ کی تحسین کرتے ہوئے جذبہ تجسس کو بیدار رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''غالب کا فکر۔۔۔ صرف منطقی موشگافیوں پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کا فکر حقیقت اور صداقت سے ربط قائم رکھتا ہے۔ یوں غالب کا فکر زندہ فکر ہے کیوں کہ وہ زندگی کا فکر

ہے۔۔۔ ایسے زندہ فکر سے آراستہ ہو کر سچ مچ کا شعر کہنا اکا دُکا شاعروں ہی کا کام ہے۔
یہ ایسی آزمائش ہے جس میں بعض اوقات اقبال تک پورا نہیں اُترتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو
کہ اقبال ''ایک پیغام کا ایک مشن'' کا شاعر ہے اور غالب صرف شاعر ہے'' ۵۳

قاسمی متذکرہ بالا باتوں کا سنجیدگی و گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں اور انھیں ثابت کرنے کے لیے انھوں نے کئی اشعار درج کیے ہیں جن سے غالب ہماری قومی تہذیب کی متاع عزیز ہیں۔ قاسمی، غالبؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''۔۔۔ وہ ہماری تہذیب کا سرمایہ افتخار ہیں۔ آج ہماری تہذیب وفن کے چہرے پر جو
وجاہت اور نکھار ہے، اس میں غالب کی نظم ونثر اور اس کی شخصیت کی لطافت کا
بہت بڑا حصہ ہے۔'' ۵۴

قاسمی کے اس حقیقت کے اعتراف کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کا باشعور طبقہ اپنی تہذیبی تاریخ سے کماحقہ آگاہ ہے۔ صائب رائے اہلِ قلم جانتے ہیں کہ اگر غالب شخصیت ادب کا حصہ نہ بنتی تو علمی وفنی لحاظ سے ہم نہایت پس ماندہ ہوتے۔ قاسمی نے ۲۷رفروری کو غالبؔ کی برسی کا دن متصور کرتے ہوئے اور تحقیق کیے بغیر اسے غالبؔ کا یومِ وفات قرار دیا اور لاہور کے اہلِ قلم کو احساس دلایا کہ اتنے بڑے محسن کی برسی کا دن بھی عام دنوں کی طرح ہی گزر گیا۔ اس مضمون ''غالب خستہ کے بغیر'' میں غالب شناسوں اور غالب شناسی کے لیے قائم کردہ اداروں کو نشانہ تنقید بنایا گیا اور لکھا:

''غالب کی تاریخ وفات ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں پر نقش ہونی چاہیے۔'' ۵۵

ایسی تحریروں اور جملوں کے خالق قاسمی کے ذہن سے بھی غالب کی برسی کا دن محو ہو گیا چوں کہ یہ مضامین کالم کی صورت میں غالبؔ کی برسی کے موقع پر لکھے گئے اور اگلے مضمون میں اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لاہور کے اہلِ قلم نے میری جہالت سے بھی زیادہ شدید بے حسی کا ثبوت دیا کہ جہاں
انھوں نے غالب کی برسی میری فریاد کے باوجود نہ منائی، وہاں ان میں سے کسی نے یہ تکلیف
بھی گوارا نہ کی کہ میری تصحیح کرتا اور بتاتا کہ غالبؔ کا یومِ وفات ۲۷رفروری نہیں ہے۔
۱۵رفروری ہے اور اردو کے اس عظیم ترین شاعر نے ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا تھا۔'' ۵۶

قاسمی جیسے غالب شناس نثرنگار کی تحریروں میں مندرجہ بالا جملے کھٹکتے ہیں کہ وہ اکثر غالبؔ کے اشعار گنگناتے، ان کا دیوان سفر وحضر میں ہم رکاب ہوتا، ''دیوانِ غالب'' سرہانے رکھ کر سوتے؛ وہی شخص اپنے مرغوب شاعر کی تاریخ پیدائش بھول گیا۔ قاسمی نے اپنی لاعلمی کا اعتراف برملا کیا۔ کلیم احسان بٹ اپنے مضمون ''احمد ندیم قاسمی کی غالب شناسی'' میں لکھتے ہیں:

''اس مضمون کے مطالعہ کے بعد قاسمی کی غالب کے ساتھ دل چسپی پر سوالیہ نشان لگ جاتا
ہے اور قاری کے ذہن میں موجود ان کی شخصیت کے نقوش دھندلانے لگتے ہیں۔'' ۵۷

قاسمی کا رویہ عام نارمل انسانوں جیسا تھا۔ لہٰذا اگر کبھی قلم میں لرزش آ جائے تو ان کی صلاحیتوں پر

اعتراضات نہیں کرنے چاہیے۔ انھوں نے اپنے مقالات پر مشتمل کتابوں میں نئے زاویوں سے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ان مقالات میں نہ تو غیر ضروری تفصیلات ہیں نہ ہی بے معنی حوالے و آرا پیش کی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی کتاب کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ پیش نظر مضامین قاسمی کی تنقید کے مختلف زاویہ ہائے نظر کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ قاسمی کی فکر کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ غالبؔ کے متعلق قاسمی اپنے خیالات کو افکار کا جامہ اس طرح پہناتے ہیں:

> "۔۔۔جب ہم آج بھی اس کی غزل پڑھتے یا سنتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل کا یہ شاعر بیسویں صدی کے نصف آخر کے لہجے اور محاورے میں نہایت جیتے جاگتے تیوروں کے ساتھ ہم سے ہم کلام ہے اور مجھے یقین ہے کہ غالب ابھی صدیوں تک ہماری نسلوں سے اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ ہم کلام رہے گا۔" ۵۸

قاسمی کا خیال قابلِ غور ہے کہ غالب نے اردو شاعری کو بے چارگی، فدویت اور عاجزانہ سپردگی سے نجات دلا کر زندگی عطا کی۔ اردو غزل میں اعلیٰ حوصلہ، وسیع القلبی، جرات اور ہمت پیدا کی۔ اگر غالبؔ بھی دیگر شعرا کی طرح ماضی کی سینہ کوبی کو اپنا وطیرہ بنا لیتے تو قارئین شعر وفن کے عظیم سرمایہ افتخار غالبؔ سے محروم رہ جاتے۔ یہ وہ غالب ہے جو ہمارے سامنے آہ و فغاں کرتا ہے، آنسو بہاتا ہے، حیرت زدہ ہوتا ہے، خوش اور مغموم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود دل و دماغ پر چھا کر قارئین کے اذہان پر ان مٹ نقوش ثبت کرتا ہے۔ ان کا کلام طرفگی، شوخی، ندرت اور زندہ دلی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں توانائی بھی ہے، دل کشی بھی اور جدت و جودت کا خوب صورت امتزاج بھی ہے۔

> "غالبؔ ایک ایسا شاعر تھا جس کے ہاں دل اور دماغ یا جذبہ اور ذہن یا خواب اور حقیقت کا ایک نہایت متوازن اور نہایت خوب صورت امتزاج موجود ہے۔ احساس و دانش کے اس متناسب امتزاج کی کوئی قابلِ ذکر مثال نہ غالب سے پہلے دست یاب ہوتی ہے۔ نہ آج تک کی اردو شاعری میں میسر آ سکتی ہے۔" ۵۹

غالبؔ کا طرزِ بیان بلند آہنگ اور رنگین ہے۔ ان کے استعارات، معنی آفرینی اور خیال انگیزی میں بے مثال ہیں۔ ان کا دل کش اسلوب قاری کی روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے۔ ان کے کلام کی معنی آفرینی بے مثال ہے۔ ان کی شعریت میں وہ دبازت ہے جو متانت سے جنم لیتی ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت اور ان کے فنی مرتبے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے قاسمی رقم طراز ہیں:

> "ہومر سے لے کر اقبال تک دنیا بھر میں جتنے بھی شاعر گزرے ہیں جن کے بارے میں ہم سب متفق ہیں کہ وہ آفاقی شاعر ہیں اور انسان کے جیتے جی مر نہیں سکتے تو یہ سب غالب کے ذہن کے شاعر ہیں۔" ۶۰

قاسمی نے غالب کے فکر و فن اور عظمت کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لیے اردو و فارسی اشعار و قصائد کا سہارا لیا جو قاری کے ذہن پر خوش گوار تاثر چھوڑتا ہے، ساتھ ساتھ قاری، قاسمی کے سنجیدہ، عمیق نظر، مطالعہ فکر اور مقالات کی داد دیتا ہے۔ ''جیتا جاگتا غالب'' اور ''غالب کا اندازِ گل افشانی گفتار'' میں تکرار کا عنصر غالب ہے۔ اوّل الذکر مضمون پر سن درج نہیں جب کہ موخر الذکر مضمون ۱۹۷۰ء میں لکھا گیا۔ اس میں بعض جگہ تو اقتباسات من و عن پیش کیے ہیں اور بعض جگہ غالب کے اشعار کو قاسمی نے اپنے نثری الفاظ میں پیش کیا ہے مثلاً ''جیتا جاگتا غالب'' میں لکھتے ہیں:

> ''اسے اس کی تہہ دار فکر نے یہ یقین بخشا ہے کہ جب سات آسمان رات دن گردش میں ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ غروب کے بعد طلوع کی باری نہ آئے اور تاریک وسعتوں میں پرتو خورشید سے شبستانوں کے آئینے خانے نہ بج جائیں۔ اسی لیے تو غالب کا کرب ایک مثبت کرب ہے۔ یہ نہ تو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے پر مجبور کرنے والا کرب ہے اور نہ ماورائیت کے دھندلکوں میں بھٹکا دینے والا کرب ہے۔ اس کرب کی پشت پناہی غالب کی بصیرت کے سپرد ہے۔'' ۶۱

جب کہ غالب کا اندازِ گل افشانی اس طرح ہے:

> ''اسے اس کی گہری فکر نے یہ یقین بخشا ہے کہ جب:
>
> رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
>
> تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ غروب کے بعد طلوع کا مرحلہ نہ آئے اور پرتو خورشید سے شبستانوں میں آئینہ خانے نہ بج جائیں، اسی لیے تو غالب کا کرب، ایک مثبت کرب ہے۔ اس کرب کی پشت پناہی غالب کی عقل و دانش کے سپرد ہے۔'' ۶۲

۱۹۶۹ء میں تحریر کردہ مضمون ''غالب کی صد سالہ برسی'' میں غالب کی برسی کے حوالے سے ہونے والے اعتراضات اور اقدامات کو موضوع بنایا ہے اور بعض مثبت تجاویز دی ہیں۔ معترضین کا خیال تھا کہ غالب پاکستانی قوم کا نہیں؛ جتنا ظاہر کیا جاتا ہے۔ قاسمی نے معترضین غالب کے ہر سوال کا جواب دیا۔ مندرجہ بالا سوالوں کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ تو ہماری تہذیب، ثقافت اور معاشرت میں، ہماری موسیقی اور مصوری میں، ہماری روزمرہ کی گفتگو تک میں سانس لے رہا ہے۔ وہ تو ہماری نفسیات میں رچا ہوا ہے۔ وہ تو ہمارے خون میں رواں ہے۔'' ۶۳

قاسمی، غالب کی افتادِ طبع، طرزِ فکر، ذہنی اُپج کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے مدعا تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور پھر اپنے قاری کو نہایت عام فہم انداز میں غالب کے اشعار کے اصل مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، قاسمی کی غالب شناسی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی ایک غالب شناس اور غالب پسند دانش ور فن کار تھے۔ وہ غالب کو اردو کی ایک تہہ دار متحرک، معنی خیز روایت تصور کرتے ہیں۔ ندیم صاحب کی نظر غالب کے موضوع اور اسلوب پر بڑی گہری ہے۔'' ۶۴

قاسمی نے غالب کے فکر و فن کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے انھیں اردو کا پہلا خردمند اور صاحبِ دانش شاعر قرار دیا ہے۔ انھیں وقت کی دست برد سے آزاد کہا ہے۔ قاسمی نے مندرجہ بالا مضامین کی صورت میں ایشیا کی اس عظیم شخصیت کے حضور نذرانہ عقیدت و محبت پیش کیا ہے۔ ان کی فنی عظمت کو سراہا۔ خیالات کو بالیدگی بخشنے والے محسن غالب کے احسانات سے اردو ادب کے قارئین کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتے۔ ان مقالات کے ذریعے غالب شناسوں کی فہرست میں اپنا نام امر کر گئے۔ غالبؔ سے انھیں یک گونہ شغف تھا۔ غالبؔ پر ان کے مضامین اسی مدت العمر کے عشق کا مظہر ہیں۔ یہ تنقیدی زاویے غالب کے فکر و فن کے مخفی گوشوں کو مترشح کرتے ہیں اور بعض مقالات میں تحقیق و تنقید کے امتزاج سے قابلِ قدر نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ مقالات غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے نقطہ نظر میں تازگی اور غالب کا اسلوب توانائی کا حامل ہے۔ غالب کے متعلق قاسمی کے خیال افروز اور خیال انگیز مقالات نے غور و فکر کی راہیں روشن کیں تا کہ بعد میں آنے والے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کر سکیں۔ غالب فہمی میں قاسمی کا ایک اہم کردار یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے جمالیاتی نقطہ نظر سے غالب کی متخیلہ کو تجزیے و تحلیل سے گزارا ہے۔ قاسمی کے خیال میں فکرِ غالب کی بصیرت کا کرشمہ ہے کہ اردو کو آزادی نصیب ہوئی۔ اسے ایک کھلی فضا ملی جہاں جمالیاتی تجربات میں تہہ داری پیدا ہوئی۔ غالبؔ کو بھی اس معجزہ نگاری کا خوب ادراک تھا۔ اس لیے تو بڑے دعویٰ سے کہتے ہیں:

گنجینہ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے ۶۵

احمد ندیم قاسمی کے غالب کے فکر و فن اور شخصیت سے لگاؤ کا اندازہ مضامین سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ غالب کی اردو ادب میں اہمیت سے آگاہ تھے اور یقیناً جانتے تھے کہ غالبؔ کے ادب پر کیا احسانات ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ مخالفینِ غالبؔ کی تحریریں پڑھ کر دُکھ کا اظہار کیا۔ ۲۳/اگست ۱۹۹۹ء کو شکیل الرحمٰن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''شاید آپ کو علم نہیں کہ یہاں لاہور میں ایک صاحب نے غالب کی غزلوں کی ''مرمت'' شروع کر رکھی ہے۔ جی ہاں۔ مرمت! وہ ایک ہفت روزہ ''زندگی'' میں باقاعدہ سے ''دیوانِ غالب۔۔۔مرمت شدہ'' کے عنوان سے غالب کی غزلوں کی ہتک کرتے رہتے ہیں اور مصرعوں کی یوں مرمت کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنا سر پیٹ کے رہ جاتا ہے۔'' ۶۶

غالب کی شاعری پر تنقید کرنے والے شاعر ظفر اقبال تھے۔ اس سے پہلے لاہور سے انیس ناگی ''غالب۔ ایک اداکار'' اور کراچی سے سلیم احمد نے ''غالب کون'' کے نام سے کتابیں شایع کیں۔ قاسمی نہایت افسوس کے ساتھ اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہیں:

''اب کے میں نے ''فنون'' کا اداریہ غالب پر بدذوقوں کی اس یلغار کے سلسلے میں لکھا ہے اور مولانا حالی کے مرثیہ غالب کے چند بند پیش کیے ہیں کہ لوگو، اصل غالب تو یہ تھا جس پر آج بالشتیے فقرے کس رہے ہیں۔'' ۶۷

قاسمی نے بہترین نقاد کی طرح غالب کے مخالفین کی تحریروں پر نہ صرف اعتراض کیا بلکہ مخالفین غالب کے ہر وار کا جواب دیتے رہے اور غالب کی طرف داری میں اپنی تخلیقی توانائیوں کا بھرپور اور قابلِ تحسین استعمال کرتے رہے۔

اردو ادب میں اقبال اور ذکرِ اقبال اہم موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال مفکر و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان قوم کے رہنما، مستقبل شناس، بلند فکر و نظر رکھنے والے انسان بھی تھے۔ قاسمی کلامِ اقبال کے مداح تھے۔ وہ اقبال کو غیر فانی شاعر قرار دیتے ہیں جن کا نام تاریخ ادب میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ اس شاعر نے ملتِ اسلامیہ کو خودی کا درس دیا۔ اقبال کی شخصیت وفن ان کی مفکرانہ سطح تغیر وتبدل کا شکار رہی۔ اس کا محرک اول یہی ہے کہ قاسمی کے چچا نے انھیں زمانہ طفلی میں ہی اقبال کے فارسی و اردو کلام سے متعارف کرایا۔ انھیں اشعار یاد کراتے اور خود کلامِ اقبال کو ترنم سے پڑھتے۔ بچپن میں ہی قاسمی کو کلامِ اقبال سے رغبت ہوگئی۔ قاسمی اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

''اقبال کی ''بانگِ درا'' نے مجھے بھرپور انداز میں متوجہ کیا۔'' ۶۸

کلامِ اقبال سے پسندیدگی کی وجہ سے قاسمی نے اقبال کی صد سالہ برسی پر نومبر ۱۹۷۷ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے اپنی کتاب ''علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) شایع کرائی۔ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب تھی جس نے چند صفحات میں شخصیت اور فکرِ اقبال کو سمیٹ کر رکھ دیا مثلاً اس میں اقبال کے آباوٴ اجداد کا شجرہ نسب، اسلاف، ولادت، تعلیم، شہرت کا آغاز، تعلیمی سفر، مراجعت، اعزاز، عملی سیاست، لیکچرز، دوقومی نظریہ، گول میز کانفرنس، عزلت گزینی، بیماری و وصال، مزار اقبال، شخصیت و کردار، اولاد، تصانیف، نظریہ حیات اور تصورِ خودی کی بابت تفصیلاً اظہار رائے کیا ہے۔ اس کتاب کے لفظ لفظ سے اقبال کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہونے اور عقیدت مند ہونے کا والہانہ اظہار ملتا ہے۔ کتاب کو دل چسپ اور جاذب نظر بنانے کے لیے جابجا تصاویر پیش کی گئی ہیں جو اقبال کے بچپن سے لے کر وفات تک مشتمل ہیں۔ ان تصاویر میں اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد، اقبال کی والدہ محترمہ، آبائی مکان، مسجد مولوی میر حسن مرحوم (مکتب اقبال)، عہدِ شباب کی تصاویر، عطیہ فیضی، بائیڈل برگ (جرمنی) میں رفقا

کے ساتھ تصاویر، ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے پر تصاویر، ٹیپو سلطان کے مقبرے پر، مسجد قرطبہ، جاوید منزل، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ساتھ آخری آرام گاہ اور اقبال مصور کی نظر میں تمام تصاویر پیش کی ہیں جو بچپن سے وفات تک کے اقبال کو پیش کرتی ہیں۔

اقبال نے شاعر و مفکر اور مصلح کے طور پر اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھایا۔ انھوں نے شعر و فلسفہ میں نئی راہیں کھول کر اپنی انفرادیت کے اعلان کے ساتھ ساتھ حکیمانہ شاعری کے ذریعہ مردہ قوم میں نئی زندگی کی روح پیدا کی۔ اگرچہ قاسمی کلامِ اقبال کے معترف تھے۔ کلامِ اقبال کی بابت اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''۔۔۔اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اقبال نے واقعی مسیحائی کر دکھائی۔ انھوں نے نبضِ کائنات کی تڑپ اور قلبِ حیات کی دھڑکن محسوس کی اور اپنے احساسات کو متحرک نقش اور نغمے میں ادا کیا۔'' ۶۹

قاسمی نے فکرِ اقبال میں نظریہ خودی، مردِ مومن، نظریہ حیات کو اساسی اہمیت دی۔ اگرچہ اس موضوع پر دیگر مصنفین نے بھی خامہ فرسائی کی لیکن قاسمی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات کو خالصتاً ایک پاکستانی مدبر کی حیثیت سے دیکھا۔ جس کی شاعری نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے ان کے تنِ مردہ میں نئی روح پھونکی۔ اپنے اشعار کے ذریعے ان میں نیا جذبہ، ولولہ پیدا کرتے رہے۔ قاسمی لکھتے ہیں:

> ''اقبال کا بھی وہ زندگی افروز پیغام تھا جو ہمارے دلوں میں اُتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگا۔ مدتوں کی سوئی ہوئی قوم جاگ اُٹھی۔ اس میں تازہ ولولہ اور خود اعتمادی کا جذبہ اُبھرا اور بیدار ہوا۔ وہ غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار کر آزاد ہوگئی اور طاقت و حکومت کی مالک بن گئی۔ پاکستان اسی خواب کی تعبیر ہے۔'' ۷۰

قاسمی نے اقبال کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے قبول نہیں کیا بلکہ اقبال کو ایک مفکر اور قومی رہنما کی حیثیت سے بھی تسلیم کیا۔ انھوں نے اقبال کو ایک ایسے دانش ور ناظر کی حیثیت سے دیکھا جو بلند پہاڑ پر بیٹھا نہ صرف کارزارِ حیات کا نقشہ کھینچتا ہے بلکہ مخلوقِ خدا کی حالتِ زار کی درستی کا عزم بھی دل میں رکھتا ہے۔ علامہ محمد اقبال ۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء میں مصنف نے اسلافِ اقبال سے لے کر وفات تک کا بھرپور جامع ادبی جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ادبی تنقید کے اعتبار سے بھی جامع پیش کش ہے جس میں انھوں نے بلند مرتبت شاعر کی تخلیقات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا نظریہ فن بھی پیش کیا۔

''تعلیم ادب اور ادب و فن کے رشتے'' میں قاسمی کا مضمون ''نصابِ تعلیم میں سے اقبال کا اخراج'' اور ''پس الفاظ'' کے مضمون اقبال اور ہمارا نصابِ تعلیم میں تکرار ملتی ہے۔ صرف مضمون کا عنوان تبدیل ہے، مواد مضمون

یکساں ہیں۔ اس کی مرتبہ نصیرہ حبیب احمد ہیں اور حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ انھوں نے اپنی اس کاوش میں وسعتِ معلومات، انتقادی بصیرت، ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔ پوری کتاب میں معنوی تسلسل اور روانی موجود ہے۔ قاری کہیں اُلجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ فکرِ اقبال پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا لیکن قاسمی کے اقبال پر متنوع مضامین اور اشعار سے یہ باور کر دیا کہ اقبال کی گرویدگی میں اُن کا بھی شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قاسمی نے اپنی تنقیدی کتاب ''معنی کی تلاش'' میں ''خصوصی مطالعہ ـــ اقبال'' میں درج ذیل مضامین پیش کیے ہیں جو فلسفی اور شاعرِ مشرق کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جو شعور و آگہی کے در وا کرنے اور تحقیق و تنقید کی نت نئی جہات سے روشناس کراتے ہیں۔

۱۔ اقبال کے ساتھ انصاف کیجیے ۲۔ اقبال اور ہمارا نصابِ تعلیم

۳۔ عہد ساز اقبال ۴۔ اقبال کا نظریہ شعر

۵۔ اقبال کی ایک نظم۔۔۔شمع و شاعر ۶۔ اقبال بحیثیت شاعر

۷۔ پورا اقبال

قاسمی نے اقبال شناسی کی دھن میں نئے گوشے تلاش کیے۔ ان کے مقالات اس نقطہ نظر کے غماض ہیں۔ اس سے قاسمی کی خاص لگن واضح ہوتی ہے۔ یہ مضامین اقبال کی زندگی، ان کی فکر اور اقبال شناسی کے متعلق بہترین کاوش کے مظہر ہیں۔

قاسمی نے مذہب، سیاست اور ثقافت کے مسائل کو جب بھی موضوع بنایا تو اسے فکرِ اقبال کی روشنی میں دیکھا۔ کبھی اپنی تقاریر اور زبانی گفتگو کو کلامِ اقبال سے آراستہ کیا اور پاکستانی قوم سے خطاب کیا تو قلوبِ مردہ کو اعجازِ اقبال سے دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کی۔ انھوں نے حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اقبال ہمارے ادب اور تاریخ پاکستان کی وہ اہم کڑی ہے جو ماضی کو حال سے اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل کو بھی اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ خواب اور حقیقت کے درمیان مثبت رشتہ قائم کرتے ہیں۔ قاسمی لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال اپنی قوم کے نباض بھی ہیں اور جو انسان کو اس سے چھینا ہوا وقار واپس دلانا چاہتے ہیں اور جو احترامِ آدمیت کو آدمیت قرار دیتے ہیں اور جنھیں آزادی، اولوالعزمی، جدوجہد، جستجو اور عدل سے محبت ہے اور جو محکومی، انفعالیت، شکست خوردگی، تقدیر پرستی اور بے انصافی سے نفرت کرتے ہیں۔'' ا ے

اقبال نے اگرچہ اپنے افکار و نظریات کو انگریزی، اردو اور فارسی زبان میں پیش کیا۔ نظریاتِ اقبال کی گونج تو ان کے عہد میں ہی مغربی دنیا کو سنائی دینے لگی تھی۔ ایک مغربی نقاد نے اپنے اہلِ دانش کو سرزنش کی تھی اور کہا:

> ''تم کب تک کیٹس کی نقالی پر گزر بسر کرتے رہو گے؟ اُدھر مشرق میں لاہور کی طرف

دیکھو جہاں اقبال نام کا ایک شاعر اپنے کائنات گیر موضوعات سے ایک نیا عہد تخلیق
کر رہا ہے۔'' ۳۲

قاسمی نے اقبال کے اعترافِ عظمت کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی و ذوقی خصائص کی سراغ رسانی کی ہے۔ قارئین کو اقبال کے فکر و فن سے روشناس کرایا۔ قاسمی نے قارئین ادب کو یہ باور کرایا کہ اقبال کے شعر و فکر میں ابدیت و آفاقیت کے توانا عناصر موجود ہیں۔ چنانچہ ان کی فکر افروز شاعری کا ذوق وشوق سے مطالعہ کیا جائے۔ اس سے کئی فکری و علمی سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ انھوں نے فکرِ اقبال پر اپنی بیشتر آرا، نڈر اور کھرے انداز اور ادبی دیانت داری سے پیش کی ہیں۔ ان کی ناقدانہ صلاحیت اتنی ہمہ گیر ہے کہ فن پارے کی گہرائی تک اُتر جاتے ہیں۔ قاسمی، اقبال کی حمایت میں اپنے افکار و خیالات کو الفاظ کا جامہ یوں پہناتے ہیں:

''آج نصف صدی بعد مغرب کے اہلِ دانش کے لیے اقبال اجنبی نہیں رہا اور وہ یہ
سوچ سوچ کر حیران ہو رہے ہیں کہ اُس دور میں جب جنوبی ایشیا برطانوی استعمار کی
شدید گرفت میں تھا، یہ خود آگاہ شاعر، یہ خودنگر مفکر اور یہ عالم گیری سے کائنات گیری کی
طرف بڑھنے والا جری دانش ور پاکستان کے اُس گوشے سے کیسے نمودار ہوا جسے سیالکوٹ
کہتے ہیں اور اقبال کا مولد ہونے کے اعزاز کی وجہ سے جس شہر کا دوام جریدۂ عالم پر
ثبت ہو چکا ہے۔'' ۳۳

قاسمی نے فلسفہ اور فکر اقبال کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیتے ہوئے انھیں منبع اسلام قرار دیا ہے جو انسانی دل و دماغ کی توانائیوں کے دروں کو کھولتا اور انسان کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اقبال نے عالمِ شباب میں جو اشعار کہے وہ محض وفورِ جذبات سے بھرپور نہ تھے، نہ ہی انھوں نے خلا میں تیر چلانے کی مشق کی بلکہ وہ عالم گیر شہرت کا حامل دانش ور ایک ایسی راہ اختیار کرتا ہے جس پر بعد میں پوری قوم نے چلنے کا فیصلہ کیا۔ خونِ جگر سے پرورش پانے والی اقبال کی شاعری تمام انسانوں کے لیے زندگی دوام کا نسخہ ثابت ہوئی۔ کلامِ اقبال نے اردو ادب کے سرمایے میں جہاں بے پناہ اضافہ کیا وہاں سرمایہ حیات میں بھی تفکر ومحبت، خلوص اور ہمدردی کے پھول نچھاور کیے۔ قاسمی لکھتے ہیں:

''ان کا نظریہ شعر زندگی اور اس کے حسن، انسان اور اس کی توانائیوں، کائنات اور
اس کی پہنائیوں اور انسانی فکر کی رسائیوں کا نظریہ ہے اور یہی وہ نظریہ ہے جس سے
منفعیت، بے معنویت، معنویت اور لایعنیت کے ان نظریوں کو شکست دی جا سکتی ہے
جنھوں نے آج کے جدید انسان کو اپنی گرفت میں لینے اور اس سے اس کا انفرادی
شرف چھیننے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔'' ۳۴

اقبال شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی۔ شاعر اور فلسفی کی فکر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ فلسفی کا فکر شعور و ادراک اور منطق سے آگے بڑھتا ہے جب کہ شاعر کے فکر کی راہیں اس سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ وہ جذبے، احساس، عشق

اور وارفتگی کی وادیوں میں محوِ سفر ہوتا ہے۔ شاعر کے اشعار دل کو چھوتے ہیں جب کہ فلسفی کی فکر وشعور دماغ کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ قاسمی نہایت الم ناک انداز میں لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔مگر کتنا ستم ہے کہ جب یار لوگ اقبال کے فکر کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو اس فکر کے شعری حسن سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر اقبال صرف مفکر ہوتے تو انھیں بحر و وزن، ردیف و قافیہ، صوت و آہنگ کے جھمیلوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ انھوں نے اپنے نظامِ فکر کے لیے نثر کیوں اختیار نہ کی؟ انھیں جب صرف یہ کہنا تھا کہ پوری کائنات مسلسل ارتقا پذیر ہے تو انھوں نے یہی کیوں نہ کہا۔ یہ کیوں کہا کہ:
>
> ؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
> کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون '' ۵؎

اقبال نے نثر کی بجائے شاعری کو اپنایا کیوں کہ شاعری کے ذریعے جو بات دل میں گھر کرتی ہے اس کے لیے نثر جیسی صنف موزوں نہیں۔ اقبال حساس ادیب و شاعر ہونے کی بدولت مستقبل کی نزاکت کو قبل از وقت ہی بھانپ گئے تھے۔ قاسمی استفہامیہ لہجہ اپناتے ہوئے قارئین سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

> ''یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کو اقبال ان کی شاعری نے بنایا تو انھیں شاعر کہنے میں تکلف کیسا۔'' ۶؎

اقبال کئی حیثیتوں سے قارئینِ ادب کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ کبھی وہ ترقی پسند ہے؛ کبھی مبلغ اسلام، مردِ مومن کا خواہش مند اور خودی کا پیغام بر ہے اور کہیں صوفی اور رومی کا مقلد ہے، اقبال کی حیثیت پر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ قاسمی قارئین سے گزارش کرتے ہیں کہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن غرض پورے اقبال کو سمجھنے کی کوشش کریں کیوں کہ فکرِ اقبال کا ہر پہلو ہمارے لیے قابلِ احترام ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میری التجا صرف یہ ہے کہ ہم پورے اقبال کو سمیٹنے کا سامان کریں اور اسے ریزہ ریزہ کر دینے کے عمل سے باز آ جائیں۔ ان ریزوں کو دیکھ دیکھ کر اور اُچھال اُچھال کر ہم اپنے بعض محدود مقاصد کو تو تھپک لیں گے مگر اس طرح بیسویں صدی کی اس عظیم شخصیت کے ساتھ بے وفائی کا ارتکاب کریں گے جسے اگر سرسید احمد خاں اور قائداعظم کی درمیانی تاریخ میں سے خارج کر دیا جائے تو ہمیں حوصلوں کو پامال کر دینے والے ایک سناٹے سے دوچار ہونا پڑے گا۔
>
> ۔۔۔جو شاعر بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، سیاست شناس بھی ہیں، اپنے دور، اپنے ملک اور اپنی قوم کے نباض بھی ہیں اور جو انسان کو اس سے چھنا ہوا وقار واپس دلانا چاہتے ہیں اور جو احترامِ آدمیت کو آدمیت قرار دیتے ہیں اور جنھیں آزادی، اولوالعزمی، جدوجہد، جستجو اور عدل سے محبت ہے اور جو محکومی، انفعالیت، شکست خوردگی، تقدیر پرستی اور بے انصافی سے نفرت کرتے ہیں۔'' ۷؎

قاسمی نے اقبال کی شخصیت وفن کا جائزہ لے کر کلامِ اقبال کے اہم ترین رجحانات کو واضح کیا ہے۔ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے اقبال کے اشعار کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی مدلل انداز میں پیش کی ہے۔ اقبال سے مرعوبیت کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کی فکر پر بھی اقبال کے اثرات نمایاں تھے۔ شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں:

''ندیم صاحب کی بڑی صفت یہ تھی کہ ان کے تخیل میں کچھ اس طرح کی آسمان گیری ہے
جو اقبال کی یاد دلاتی ہے اور اقبال ہی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔'' ۸ے

قاسمی، اقبال سے بہت متاثر تھے۔ ۲۸ رجون ۱۹۳۷ء میں عبدالمجید سالک اور حسرت کاشمیری کے ہمراہ اقبال کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون ''ڈاکٹر اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات'' میں اپنے احساس و تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ مضمون کی ابتدا میں لکھتے ہیں: ''میں مرتے دم تک اس بات پر فخر کروں گا کہ زندگی میں ایک بار تو میرے ہاتھ اقبال کے ہاتھوں سے مس ہوئے تھے۔ زندگی میں ایک بار تو میں نے اُس جلیل القدر فلسفی کو جی بھر کر دیکھا۔ زندگی میں ایک بار تو اس منبع حکمت سے کسب فیض کیا۔'' ۹ے

قاسمی کا فن، دانائی، توازن اور زندگی کی خوب صورتیوں سے عبارت ہے۔ ایک آزاد و خودمختار ملک کے باشندے ہونے کی بنا پر وہ خوشحالی، آسودگی اور امن و امان کے حق دار ہیں۔ قاسمی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ وہ تنقید میں تاثراتی نقطہ نظر کے حامی تھے لیکن جذبات و احساسات کے اظہار کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی بھی ان کے ہاں در آتی ہے۔ محنت و جستجو سے حاصل کیے گئے ملک میں جب غریب عوام کو بھوک سے نڈھال پاتے ہیں اور بددیانت، خویش پرور زمین داروں اور جاگیردار کو ان کی خون پسینے کی کمائی بٹورے مطمئن پاتے ہیں تو اس طبقاتی معاشرت پر احتجاج کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ تحریک آزادی میں ادیبوں نے فعال کردار ادا کیا۔ قاسمی جیل میں اسیر ہو کر بھی شعر کہتے اور ادب تخلیق کرتے رہتے۔ آزادی کے گیت گنگناتے رہے حصول پاکستان بڑا کارنامہ ہے اس کے تحفظ کا ایک پہلو یہ بھی ہے اور یہ کہ برعظیم پاک و ہند کی تہذیب کے علم برداروں کو یقین دلائیں کہ تہذیبی انفرادیت ہی پاکستان کا حصول ہے۔ قاسمی کو ادیبوں سے شکایت ہے کہ انھوں نے ''حصولِ آزادی کے بعد اہلِ قلم نے آزادی کے موضوع کو ترک کر دیا اور ادب میں مقصدیت اتنی مطعون و ملعون ٹھہری کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ایک زبردست سنبھالے کے باوجود یہ ذہنیت اب تک موجود ہے اور یہ وہی ذہنیت ہے جو ہمیں پاکستان کی تہذیبی انفرادیت کے اعتراف سے روکتی ہے۔'' ۸۰ے اس قسم کے خیالات و نظریات کی دست برد سے عوام کو بچانا ادیب کا فرض ہے۔ ملکی آزادی کا موضوع ہر باشعور شاعر کے ذہن میں موجود ہونا چاہیے کیوں کہ آزادی غیرملکی استبداد کی گرفت سے چھینی جا چکی ہے۔ حصول آزادی کے بعد تحفظ آزادی کا مسئلہ اہم ہے۔ لہٰذا شعرا و ادبا کو ملکی آزادی کے

تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے کیوں کہ شعرا و ادبا کو قوم کا نمائندہ اور معاشرے کی زبان کہا گیا ہے۔ یہ ایسے فن پارے تخلیق کر سکتے ہیں جو عوام کے ذہنوں میں سوز و گداز پیدا کرے۔ جو اُن عوام کی سوچ میں مثبت تبدیلی لاسکیں۔ وہ ادیبوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے آس پاس ایک نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ انسانوں کے لاکھوں کروڑوں کے کارواں میں نہ جانے کتنے شاعر، کتنے حسن کار دبے پڑے ہیں اور انھیں آپ کا ایک بول ذہنی لحاظ سے مثبت تبدیلی لاسکتا ہے۔

قاسمی ادب کی تخلیق سماج سے وابستگی کا نتیجہ ہے جو اپنے ملک کے مخصوص سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل سے مشروط ہوتی ہیں کیوں کہ ادیب اسی دنیا کا باسی رہ کر ادب تخلیق کرتا ہے مگر ادیب کی نگارشات عصری و سماجی شعور سے تہی دامن ہیں۔ وہ اپنے قارئین میں زندگی کے متعلق آگہی پیدا نہیں کرسکتا تو ایسی تخلیقات تمام فکری و فنی محاسن کے باوجود خاطرخواہ سودمند ثابت نہیں ہوتی۔ اُنھوں نے درخشاں مستقبل کی نوید سنائی، کہیں شعرا اور ادبا کو ان کی کوتاہیوں سے آگاہ کیا، کہیں ان کے اولین شعری مجموعے کا والہانہ طریقہ سے استقبال کر کے انھیں میر و غالب کے فکر وسخن کا امین قرار دیا۔ وہ کبھی کسی صنف سخن کے حوالے سے مایوس نہیں ہوئے۔ غزل اپنی دل کشی، تازگی اور روانی و برجستگی کی بدولت ہر دور میں قارئین کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ قارئین تو ہمیشہ سے غزل کی زلفوں کے اسیر رہے ہیں۔ اس کی وجہ اس کا طرزِ فکر اور طرزِ احساس بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا تعلق قدیم غزل سے ہو خواہ جدید غزل سے اظہار کے سانچے بدلتے رہتے ہیں لیکن عملی تنقید اس وقت وجود میں آتی ہے جب نقاد زیر بحث فن کار کے دل کی نبض کو چھو کر اُس کے دماغ میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس طرح قاسمی ان ذہنی کیفیات کا اندازہ لگا لیتے ہیں جن کے زیر اثر مصنف نے تخلیقی کارنامہ سرانجام دیا۔ نقاد ان تمام ذہنی کیفیات کو نہایت چابک دستی سے اپنے ذہن پر سوار کر لیتا ہے جو مصنف یا فن کار پر طاری تھیں۔ پھر اُن کی جانچ پرکھ کے بعد درست قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ قاسمی عملی تنقید میں تمام عناصر کا تجزیہ کر کے مختلف پہلوؤں سے مصنف اور اس کی تخلیق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انھوں نے قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' پر کامیاب تبصرہ کیا ہے، کہیں وہ ناول کے کرداروں کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے، کہیں مصنفہ کو محنت پر اُکساتے اور جذباتی و وجدانی انداز اختیار کرنے کی بجائے سائنٹیفک نقطہ نظر اختیار کرنے کی صلاح دیتے۔ کہیں وہ قرۃ العین حیدر کی موضوع سے وابستگی کا تذکرہ کرتے، کہیں مصنفہ کی صداقت، ایمان داری وخلوص کا تذکرہ کرتے، کہیں ان کی فنی پاکیزگی کی داد دیتے:

> ''ناول میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں کہ اگر کوئی ناتجربہ کار یا بیمار ذہنیت کا ادیب ہوتا تو آن کی آن میں چوما چاٹی شروع ہو جاتی اور ایسے ایسے معرکے سر ہوتے کہ پیشہ ور فحش نگار تک دم بخود رہ جاتے۔'' [۸۱]

اسلوبِ نگارش مصنف کے فن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس سے مصنف کے ذہن وفکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ پیش نظر ناول کی زبان اور اندازِ بیاں نہایت صاف ستھرا اور منجھا ہوا ہے۔ شیریں اور شگفتہ مکالموں کے اضافے کے باوجود غم والم کی عمدہ تصویر کشی کو انھوں نے تعریفی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بقول قاسمی:

> ''قرۃ العین حیدر اتنے شگفتہ اور اتنے رومانی انداز کے باوجود غم والم کی بھی بڑی کامیاب عکاسی کرتی ہے اور شیر ہری، پی چو اور کرن کی موت پر اس نے جو کچھ لکھا ہے انھیں اردو ادب کے غیر فانی ٹکڑوں میں بلند مرتبہ ملنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کو زبان اور اسلوب پر کافی قدرت حاصل ہے۔'' ۸۲

قاسمی کی اعتدال پسندی تنقید میں واضح ہے جہاں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے وہاں بے لاگ تنقید کرتے ہیں اور جہاں اتفاق کرنے کا معاملہ ہو وہاں پوری دیانت داری اور دلائل کے ساتھ فن پارے کی تحسین کرتے ہیں۔ فن اور فن کار کی قدروں کے تعین میں جذباتیت کا شکار ہوئے بغیر نہایت معتدل انداز سے کوتاہیوں اور خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہیں مثلاً:

> ''اس ناول میں ایک بالکل نئے اسلوب کا بھی تجربہ کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر بات کہتے کہتے کہنے والے کی نفسی حالت کو بریکٹ میں لکھ دیتی ہے۔ یہ طریق کار اکثر کامیاب رہا ہے مگر کہیں کہیں بور ہونے لگتا ہے، خصوصاً اُس وقت جب بڑے زور کا معاملہ جاری ہو اور درمیان میں ایک دم بریکٹ شروع ہو جائے۔'' ۸۳

''میرے بھی صنم خانے'' میں قرۃ العین حیدر نے فطرت اور مناظر قدرت کی عکاسی اتنے دل کش اور شگفتہ انداز سے کی ہے کہ طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ قاسمی کی تحریر کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرتے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ قاسمی اپنی تنقید میں ادیبوں اور شعرا کا اتفاق و اختلاف رائے بھی شامل کرتے ہیں مثلاً پیش نظر مضمون میں امتیاز علی تاج نے قرۃ العین حیدر کی تحریر کو ''اُلجھے اور تھکے ہوئے دماغ کے لیے فرحت کا'' پیغام لانے والی تحریر کہا ہے جب کہ فاضل نقاد اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اگر ادب صرف فرحت کا پیغام لانے کا کام دینے لگے تو میرے خیال میں گرمیوں میں لیمن کی ایک برف لگی بوتل اور سردیوں میں گرم چائے کی ایک پیالی اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ امتیاز صاحب نے شاید جلدی سے فلیپ کے لیے یہ رائے لکھ دی۔ اگر وہ سارا ناول پڑھتے تو یقیناً قرۃ العین کی اس کامیاب کوشش کو صرف فرحت بخش کہہ کر مختلف شربتوں کی فہرست میں شامل نہ کرتے۔'' ۸۴

زیرنظر ناول کا شمار چند عمدہ ناولوں میں ہوتا ہے۔ قاسمی اس ناول کو قابل ستائش گردانتے ہیں۔ کہیں کوتاہیوں پر نظرثانی کا مشورہ دیتے ہیں، کہیں مصنفہ کی بالغ نظری، وسعتِ مطالعہ، شعورِفکر اور اختراعی ذہن کی داد دیتے ہیں

لیکن مجموعی حیثیت سے ان کے فن کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"قرۃ العین حیدر کا یہ ناول اردو کا ایک کامیاب ناول ہے۔ کیوں کہ یہ۔۔۔ ایک فنکارانہ تاریخ ہے، ذہانت سے لب ریز لیکن دو طرفہ خلوص سے آلودہ۔" ۸۵

قاسمی کا شمار ان نقادوں میں ہوتا ہے جو نئے خیالات و تصورات سے کتراتے نہیں۔ اسی لیے وہ نظم آزاد یا معریٰ نظم کے تجربے کے حق میں ہیں۔ وہ ان نئے شعرا سے رابطہ رکھتے۔ ان کو قابل ستائش گردانتے ہیں۔ اردو شعرا اگرچہ گزشتہ ربع صدی سے نظم آزاد اور نظم معریٰ میں خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔ یہ نظمیں کئی معروف ادبی رسائل و جرائد کی زینت بن چکی ہیں مگر اردو ادب کے قارئین پابند نظم کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور آزاد نظم کا استقبال کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود معریٰ نظموں کے خالق شعرا عدم مقبولیت کا شکار ہیں۔ قاسمی اس نئی صنف ادب کا خوش گوار استقبال کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ دیگر معاصرینِ ادب سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں لہٰذا ان کے خیال میں اس نئی صنف کو خوش آمدید کہنا چاہیے کیوں کہ نظم آزاد اور نظم معریٰ کو بے پناہ امکانات اور وسعت سے بھرپور زندگی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ قاسمی اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک وہ شعرا پوری اردو شاعری کی طرف سے داد اور شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے اردو میں آزاد اور معریٰ نظمیں لکھنے کا آغاز کیا اور اس تضحیک و نفرت کا نشانہ بنے جس کا اظہار ان کے قارئین نے شروع شروع میں ان اصنافِ سخن سے اجنبیت کی بنا پر کیا۔" ۸۶

ان کے خیال میں نظم آزاد اور معریٰ کے امکانات سے فیض یاب ہونے والے افراد کم ہیں لیکن اس صنفِ سخن کو سہل سمجھتے ہوئے اس سے مستفید ہونے والوں کی تعداد کافی ہے اور بعض شاعر ایسے ہیں جن کی نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اظہار کے لیے الفاظ کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ اردو ادب میں ہر جدت کا اولین ردعمل حیرت و استعجاب اور تضحیک کا ہوتا ہے جو حوصلہ مندی سے استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں وہی کامیاب ہیں۔ وہی افراد جدید خوش گوار روایت کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔

قاسمی اگرچہ پابند شاعری کرتے تھے لیکن پھر بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے نظم آزاد اور معریٰ نظم کے تخلیق کاروں سے اظہارِ ہمدردی کیا ہے کہ ادیب و شعرا کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔ وہ انھیں ان کے فرض سے آشنا کرتے ہیں کہ کسی امور کو اپنا کر وہ ان اصناف میں ترقی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ:

"۔۔۔ان شاداب اصنافِ سخن کو انتشار اور تباہی سے بچائیں اور یہ دردناک منظر چپ چاپ نہ دیکھتے رہیں کہ جن اصناف میں شیکسپیئر، ایلیٹ اور پاؤنڈ نے اتنی بے مثال شاعری کی ہے، انھیں اردو میں بچوں کا کھیل بنا دیا جائے۔" ۸۷

غزل کے حسن و دل کشی میں تمام قارئین گرفتار ہیں لیکن غزل کے دور میں عمدہ نظموں کے ذریعے بھی شاعری کو مزین کرنا چاہیے۔ قاسمی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انھیں باور کراتے ہیں کہ غزل اور نظم اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے لیکن جن شعرا کا طبعی رجحان نظم کی جانب ہے، قاسمی انھیں نظم کہنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے شعرا کو یقیناً نظمیں بھی کہنا چاہئیں اور ضرور کہنا چاہئیں۔۔۔آج بھی بعض غیر فانی نظمیں کہی گئی ہیں اور کہی جا رہی ہیں۔ اگر آپ نظم کہنا چاہتے ہیں تو غزل سے زبان کے انداز اور بیان کے تیور ضرور سیکھیے مگر غزل کے رعب میں نہ آیئے۔'' ۸۸

مجید امجد بیسویں صدی کے مقبول شاعر ہیں۔ قارئینِ ادب نے ان کے دھیمے لہجہ میں موجود طنز اور اظہار میں انوکھے پن کی تحسین کی ہے۔ مجید امجد کو حیرت کا شاعر کہا جاتا ہے۔ قاسمی کہیں انھیں حیرت سے پیدا ہونے والی جستجو کا شاعر قرار دیتے ہیں تو کہیں وہ ان کی شاعری میں موجود دھیمے طنز کی چابک کی آواز نکلواتے ہیں۔ وہ مظلوم انسانوں کو سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قاسمی، مجید امجد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اہلِ ذوق کی لوحِ دل پر مجید امجد کا نام ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکا ہے کیوں کہ وہ ایک ایسا شاعر تھا جس کے ذوق جستجو نے مرتے دم تک ہتھیار نہ ڈالے اور جو دمِ آخر تک دردوں، کربوں، ظلموں، تنہائیوں اور ویرانیوں سے بڑی پامردی کے ساتھ پنجہ آزما رہا۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر مر گیا مگر اپنے آپ کو سمیٹے رکھا۔ وہ اُجڑ اُجڑ گیا مگر شادابی اور آسودگی پر اس کا ایمان متزلزل نہ ہوا۔'' ۸۹

قاسمی اپنے مضمون ''پاکستان کی نئی نسل اور جدید ادب'' میں ایک تنقیدی مضمون تحریر کرتے ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں معروف شاعر عارف عبدالمتین نے ادبی مجلّہ ''اوراق'' کا حوالہ دیا کہ انھوں نے اربابِ تعلیم کو صلاح دی کہ طلبا کو ادب کی مقبول صنف نظم آزاد سے محروم نہ رکھیں کیوں کہ ''آج ہمارے ملی و شخصی ضمیر کی آواز جس شعری سانچے میں سب سے زیادہ ڈھل رہی ہے۔ وہ نظم آزاد ہی ہے۔''[۹۰] قاسمی درسی کتب میں جدید شعرا ن۔م۔راشد، میرا جی کی نظمیں شامل کرنے کے حامی ہیں۔ وہ اربابِ تعلیم سے استدعا کرتے ہیں کہ ''وہ پاکستان کی نئی نسل کو پاکستان کے جدید ادب سے محروم نہ رکھیں، کیوں کہ اس طرح وہ ایک ایسی بوالعجبی کا ارتکاب کر رہے ہیں جیسے ریل اور ہوائی جہاز کے اس زمانے میں کسی شخص کو بیل گاڑی میں بٹھا کر لاہور سے کراچی روانہ کیا جائے۔''[۹۱] نئی نسل سے مراد اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم نوجوان ہیں اور جدید ادب کی صراحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''جدید ادب سے میری مراد وہ سارا معیاری، شعری اور نثری ادب ہے جو اقبال کے بعد اب تک تخلیق ہوا ہے۔ ہماری درسی کتابوں کے مندرجات کچھ عرصہ پہلے تک تو اقبال پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔''[۹۲] اگرچہ درسی کتابوں میں نئے شعرا کا اضافہ ہوا لیکن ان کا فنی مرتبہ فیض، راشد اور میرا جی کے جتنا بلند نہیں ہے۔ جدید ادب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب کا

مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے۔ اس ادب کا مطالعہ نوجوان کو اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی پہچان کراتا ہے۔ کلاسیکی و جدید ادب کے مطالعہ سے نوجوان نسل کا تجزیہ اور تقابل ہوگا۔ ان کی تنقید کا خاص پہلو مختلف اصنافِ سخن کا محاکمہ ہے۔ فنی اعتبار سے انھوں نے کئی فن پاروں کے اصول وضوابط کا تعین کیا ہے۔ غزل ان کا محبوب موضوع ہے۔ وہ تمام اصنافِ سخن میں غزل کو ہی بہتر گردانتے ہیں۔ غزل ہی ان کی روح کی گہرائیوں اور اعماق قلب میں بسی ہوئی ہے۔ دیگر شعرا اور ادبا کے فکر وفن پر انفرادی مضامین تحریر کرنے کے علاوہ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن پر مقالات تحریر کیے۔ خاص طور پر غزل اور نظم کے متعلق ان کے مضامین کو زیادہ پذیرائی ملی۔ غزل ہی حکایات، محبت اور جذباتِ عشق کی عکاس ہے۔ حسن سے متعلق تمام کیفیات کو سادگی اور بے ساختگی سے بیان کرتی ہے۔ غزل اردو ادب میں جیسے جیسے مقبولیت کے زینے چڑھتی گئی، اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی گئی۔ کسی نے ردیف و قافیہ کی پابندی پر اعتراض کیا؛ کوئی عشق و محبت کے استعمال پر معترض ہوا اور کوئی انسانی جذبات کی کامیاب عکاسی نہ کرنے پر معترض ہوا، غرض غزل پر اعتراضات کا سلسلہ حالؔی سے ترقی پسند تحریک کے دور تک جاری رہا۔

لوک فن کسی بھی قوم کے کلچر کا ناگزیر حصہ ہوتے ہیں۔ کرہ ارض پر موجود ہر قبیلہ اپنی لوک کہانیاں، لوک گیت، لوک ناچ، لوک لطائف اور لوک پہیلیاں رکھتا ہے۔ لوک فن لائبریریوں کی بجائے لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں لوگ اپنے لوک فن کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ دیہات میں بھی لڑکیاں لوک گیتوں کی بجائے فلمی گیت گاتی ہیں اور ''دیہات کے پس منظر میں یہ گیت ایسے لگتے ہیں جیسے ہوائی جہاز کو بیل کھینچے لے جا رہے ہوں۔''[۹۳] انھوں نے عالمِ شباب میں اپنے علاقے سون سکیسر ضلع سرگودھا کے لوک گیت جمع کرنے کی کوشش کی مگر ہمت ہار بیٹھے کیوں کہ لوک فن کو جمع کرنا ان کے خیال میں ایک سمندر کی مانند ہے جسے محفوظ کرنے کے لیے اداروں کا قیام عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔

قاسمی نے اپنے مضمون ''غزل کی تجدید کا مسئلہ'' میں غزل کا جائزہ لیتے ہوئے معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا اور بطور صنف سخن، غزل کے اوصاف کا جائزہ بھی لیا ہے کہ لمحہ رواں کی غزل قدیم دور کی غزل سے مختلف ہے۔ قدیم دور کی غزل حسن کی تحسین اور عاشق کی آہ و بکا، غرض معاملات حسن و عشق پر موقوف تھی۔ لیکن عہدِ رواں کی غزل تمام معاملاتِ زندگی و کائنات کو سلیقہ سے سمیٹے ہوئے ہے۔ انھوں نے غزل کی مقبولیت کو توصیفی انداز سے دیکھا ہے جو افراد تجدید غزل کا اظہار کرتے ہیں۔ قاسمی، فراق کی شاعری کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ شاعری کی صحت مند تجدید کے منکر ہیں وہ صرف فراق کی غزل کو دیکھ لیں کہ اس میں میر کی نرمی بھی ہے، غالبؔ کی فکر بھی ہے، مومنؔ کی رنگینی اور لس کی گرمی بھی ہے،

اقبالؔ کی جلالی کیفیت بھی ہے، سیاست بھی ہے اور آج کے ترقی یافتہ انسان کی نفسیات
کی تصویر کشی اور نقاشی بھی ہے اور وہ جذبات بھی جو صرف بیسویں صدی میں رہنے والے
انسان کے ذہن ہی میں اُبھر سکتے ہیں۔'' ۹۴

انھوں نے فراق کی غزل کو تجدید غزل کا نام دیا ہے۔ اس میں میرؔ کی نرمی، غالبؔ کی فکر، مومنؔ کی رنگینی اور اقبالؔ کی جلالی طبیعت کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے صرف جدید غزل کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ قدیم و کلاسیکی غزل کے تیوروں کو بھی سمجھا ہے۔ انھوں نے جہاں دیوانِ غالب، بانگ درا اور دیوانِ حالی کو سفر و حضر میں ہم رکاب رکھا ہے وہیں جدید غزل گو شعرا کو بھی سراہا ہے۔ قدیم و جدید غزل کو ہم قاسمی کی دانش ورانہ بصیرت کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''قدیم و جدید غزل میں اگر کچھ فرق نظر آتا ہے تو وہ اتنا سا ہے کہ کلاسیکی اردو غزل کو
فارسی غزل کا عکس قرار دیا جاتا تھا مگر آج کی غزل کلاسیکی غزل کے تیوروں کو اپنائے رکھنے
کے باوجود سراسر ہماری اپنی غزل ہے۔'' ۹۵

اگرچہ غزل ایک منضبط صنفِ سخن ہے۔ اس میں تبدیلیاں بھی آئیں مثلاً لفظیات، اسلوب اظہار، لفظوں کی معنویتیں، علامتیں، پیکر اور الفاظ کے تلازمے سب کچھ تغیرات کی زد سے نہ بچ سکا لیکن باعثِ افتخار امر یہ ہے کہ غزل کی ہئیت وہی ہے جو ولیؔ کے دور میں موجود تھی۔ یہ ایسی صنفِ سخن ہے جو اپنے اندر تمام موضوعات کو سلیقے اور کامیابی سے سمونے کی اہلیت رکھتے ہوئے بھی الگ شناخت رکھتی ہے۔ اسی لیے تمام قارئین اس کی انفرادیت کے اسیر ہیں جس میں حساس جذبات، دل کش الفاظ کا پیرہن عطا کر لیں تو قارئین یہ سمجھنے لگتے ہیں:

ع میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس لیے غزل ہمیشہ سے قارئین ادب کی دل چسپی کا محور رہی ہے اور دیگر اصنافِ سخن کی موجودگی کے باوجود اس کی پسندیدگی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ غزل کا منفرد لہجہ، محاکات نگاری، نغمگی، ترنم، ماحول کی شعوری ترجمانی، رمز و ایما، تشبیہ و استعارہ، پیکر آفریں اور دل آویز بحروں کا خوب صورت استعمال کرتے ہوئے شہ پارے تخلیق کرنا ہے جس سے یہ قارئین میں کامرانی کا ذریعہ بنی ہے۔ قاسمی غزل کے بیان میں دیگر ادبا و ناقدین کی آرا بھی شامل کرتے ہیں مثلاً پروفیسر رشید احمد صدیقی کا قول لکھتے ہیں کہ ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے'' تو دوسری جگہ کہتے ہیں کہ:

''غزل تجربہ عشق سے زیادہ سراپائے محبوب میں رہ گئی۔ پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں کہ
اردو شاعری کا شاہ کار غزل ہے۔ اس کا آرٹ تلوار کی دھار کا آرٹ ہے۔'' ۹۶

قاسمی غزل کی لطیف صنفِ سخن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ تغزل کی بھرپور فضا سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ احمد فراز کا شمار عصرِ حاضر کے گنتی کے چند شعرا میں ہوتا ہے۔ فیض کی شاعری میں جہاں حسن و عشق کی

کارفرمائیاں ہیں وہیں انسان کی مظلومیت، محرومی اور شکست کا نوحہ بھی موجود ہے۔ قاسمی اپنے ہم عصر کی شاعری کا تذکرہ کرتے ہیں اور شعری مثالوں کے ذریعہ اعلیٰ معیار کی شاعری گردانتے ہوئے فرماتے ہیں:

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

آج اس نے شرفِ ہمسری بخشا تھا   اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

میں ان دونوں شعروں کے حوالے سے کہوں گا کہ جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے اس میں پوری فارسی اور اردو غزل کی دل آویز روایات گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔'' ۹۷

قاسمی اپنے موقف کی وضاحت کے لیے قرآنی آیات کا حوالہ مع ترجمہ دیتے ہیں مثلاً:

''یخدعون اللّٰہ والذین امنو وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرونO
ترجمہ: وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، حالاں کہ وہ خود ہی دھوکے میں پڑے ہیں، مگر اس کا شعور نہیں رکھتے۔'' ۹۸

ایشیا کی بڑی زبانیں مثلاً عربی، فارسی اور ہندی اور اردو کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ انھوں نے انگریزی زبان سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ اس کے اثرات بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے تحریر میں کہیں کہیں انگریزی الفاظ کے استعمال سے عبارت کو انفرادیت بخشی ہے مثلاً:

''مگر شرط یہ ہے کہ شعر پڑھنے، نغمہ سننے اور تصویر دیکھنے والے کا ذہن Receptive ہو۔'' ۹۹

قاسمی چوں کہ معروف شاعر تھے اس لیے ان کا شاعرانہ احساس، تنقید میں بھی ایک غیر فانی ادبی نقش بن کر ساتھ نبھاتا ہے۔ ان کے انداز میں شادابی اور رعنائی ہے۔ ان کی عبارت غنائیت اور کیف سے لب ریز ہے۔ جملوں میں خاص ترنم موجود ہے جب کہ اندازِ نگارش رنگینی اور نکھار کا حامل ہے۔ ان کا شاعرانہ خیال فن پارے کا سائنٹیفک تجزیہ کرنے کی بجائے شاعر کے تجربے اور تاثر کو چھونے کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں فن پارے کے قریب ہونے کا احساس ملتا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے اظہار کے سانچوں میں شاعرانہ لطف، رنگینی اور بانکپن اپنا اثر دکھاتا ہے۔ وہ تنقید میں شاعرانہ رنگینی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب معاشرے میں جذبات کی آتش زنی انتہا پر پہنچ جائے تو فقیروں کو شبنم افشانی کے کام سے روکنا نہیں چاہیے۔ اگر یہ شبنم افشانی چند چنگاریوں کو بھی بجھا سکے تو یہ بھی کوئی معمولی کام نہیں۔'' ۱۰۰

قاسمی اپنی تنقید میں ہندی ضرب والا مثال کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے:

''سوپ تو سوپ چھلنی کیا بولے جس میں بہتر چھید۔'' ۱۰۰؎

قاسمی اپنے مفہوم کی وضاحت و تفہیم کے لیے تنقید جیسے خشک میدان کو شعر و شاعری کے استعمال سے رنگین بناتے ہیں مثلاً بعض اوقات دیگر شعرا کے اشعار کا حوالہ دیتے ہیں اور بعض اوقات موقع و محل کی مناسبت سے اپنے اشعار بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً:

ندیم فلسفہ صبر کو دعائیں دیں
یہ ایں غریب کشی، جو رہے غریب نواز ۱۰۱؎

قاسمی تنقید کے دوران وضاحت طلب مشکل الفاظ کا مفہوم بھی قوسین میں بیان کر دیتے ہیں تا کہ قاری کو لغت دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو مثلاً ''یوٹوپیا (ایک خیالی اور مثالی دنیا)'' اور بعض اوقات موقع و محل کی مناسبت سے اشعار کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ وہیں واقعہ و لطائف سے بھی مضامین کو مزین کرتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''مشہور ہے کہ ایک موزوں طبع نے اپنے احباب کے سامنے غالب کے اس سیدھے سادے شعر کا بس مذاق اُڑایا تھا:

آگے آتی تھی حالِ دل پر ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی!

اور پھر یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایک رات میں ایسے ایک ہزار شعر کہہ سکتے ہیں اور جب دوسری صبح کو احباب حسبِ وعدہ ان کے گھر پہنچے تھے تو انھیں معلوم ہوا تھا کہ موزوں طبع صاحب رات بھر کسی وجہ سے جاگتے رہے اور صبح کی پہلی گاڑی سے کراچی روانہ ہو گئے۔'' ۱۰۲؎

قاسمی کی تحریروں میں تکرار کا عنصر غالب ہے۔ ایک ہی مضمون کو تین تین بار پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی الفاظ اور مضمون کا عنوان تک بھی تبدیل نہیں کیا۔ یہ خامی ان کی تحریروں میں بہت کھٹکتی ہے۔ فاضل مصنف کو بھی اس امر کا بخوبی احساس تھا لہٰذا قارئین ادب سے معذرت خواہ ہیں۔ لکھتے ہیں:

''قارئین سے میں بطور خاص معذرت خواہ ہوں کہ انھیں میری ہی لکھی ہوئی بعض باتیں دوبارہ پڑھنا پڑیں۔'' ۱۰۳؎

قاسمی کی تنقید میں درج ذیل انفرادی پہلو دکھائی دیتے ہیں:

۱۔ ان کی تنقیدی آرا پختہ ہیں جو وسعتِ مطالعہ، روشن خیالی، ملکی و قومی قدروں اور استدلال کی تاثیر سے مملو ہیں۔

۲۔ یہ نسل نو کے اہلِ قلم کے متعلق پُراعتماد رویہ رکھتے ہیں۔

۳۔ ان کی تنقید میں روشن نظری، وطن دوستی، علم پرستی، اعلیٰ انسانی اقدار سے وابستگی اور خیالات کی گہرائی کا اظہار نمایاں ہے۔

۴۔ قاسمی نہایت سادگی، خلوص اور عام فہم انداز سے علمیت کا اظہار کرتے ہیں کہ کم پڑھا لکھا طبقہ بھی ان کی تحریروں سے خاطر خواہ فیض یاب ہوسکتا ہے۔

۵۔ یہ تنقیدی افکار رشحاتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔

۶۔ یہ ناقدانہ تحریریں ادبی مسرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

۷۔ ان کی تنقیدی فکر ترقی پسندانہ افکار اور ادبی شعور کی آئینہ دار ہے۔

۸۔ ان کا تنقیدی وعصری شعور بیدار ہے جس کی بنا پر بصیرت افروز مضامین پیش کیے ہیں۔

۹۔ ادب وثقافت اور فنونِ لطیفہ کے مختلف پہلوؤں پر فنی وعلمی مضامین قلم بند کیے۔

۱۰۔ تنقید میں طویل مکاتیب کے اقتباس شامل کر کے اس صنف کو تقویت بخشی مثلاً تہذیب وفن کے مضمون ''کیا انسان دوست ہونا گناہ ہے'' اس کی ایک مثال ہے۔

۱۱۔ عملی ونظری تنقید فن کار کے فکر وفن کی قدر کا تعین کرتی ہے۔

۱۲۔ انگریزی الفاظ کے استعمال پر معذرت کے خواست گار ہیں مثلاً اپنے مضمون ''کومٹ منٹ کے مسئلہ'' کے آغاز میں رقم طراز ہیں: ''سب سے پہلے تو میں قارئین سے معافی چاہتا ہوں کہ خاصی تلاش، سوچ وبچار اور پوچھ گچھ کے باوجود مجھے انگریزی لفظ کومٹ منٹ کا کوئی معقول مترادف لفظ نہیں مل سکا۔''

فنی وفکری اعتبار سے انھوں نے ترقی پسندی، رومانی اور تاثراتی اندازِ نظر سے کام لیا ہے۔ اگرچہ ان کے ہاتھ میں ناقد کا تجزیاتی قلم تھا مگر سینے میں فن کار کا حساس و نازک دل بھی دھڑکتا تھا۔ تنقید کی زبان اگرچہ تخلیق سے مختلف ہے، قاسمی اس حقیقت سے واقف تھے لیکن ان کا تخلیق کار بعض اوقات نقاد پر چھا جاتا ہے جو لفظ ومعنی کے حسن میں الفاظ کا موجب بنتا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں بصیرت افروز نکات پیش کیے ہیں۔ ان کے قلم نے اپنے قارئین کے ذہنوں کو مجلی ومعلیٰ کرنے کا کام ہنرمندی سے انجام دیا۔ وہ آزادی فکر اور آزادی رائے کے قائل ہوتے ہوئے بھی دامنِ تنقید کو وسعت عطا کر جاتے ہیں۔ یہ معاصر شعرا کے لفظی ومعنوی غلطیوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ بعض اوقات شاعر وادیب مثلاً ظفر اقبال، م۔ش وغیرہ کے نام بھی بتا دیتے ہیں لیکن ان کا مطمع نظر ان کی دل آزاری نہیں بلکہ ادب کی صحت مند روایت کا فروغ ہے۔ کیوں کہ نئی آوازیں انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے لبیک کہیں گی۔ ان کی تنقید میں ادبی شعور جلوہ فرما ہے جسے ان کے قلم نے آب رنگ اور شگفتگی عطا کی ہے۔ ان کی تنقید غیر معمولی وسعت کی

حامل ہے۔ قاسمی نے غالبؔ، اقبالؔ، جدید شاعری، غزل، نظم آزاد، نظم معریٰ اور تہذیب ان تمام موضوعات پر خوب ڈٹ کر لکھا۔ ان کی تحریروں میں یہ امر مشترک ہے کہ وہ موضوع سے متعلق قاری کے ذہن میں دل چسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ انداز مربیانہ ہے نہ معلمانہ بلکہ بعض جگہ محققانہ حوالوں کی قلت کا احساس بھی ہوتا ہے اور بعض جگہ معلومات درست اور محنت سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان کی تنقید کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی ایک بے حد فعال اور شش جہت پر نظر رکھنے والے ادیب ہیں۔ وہ ان معنوں میں نقاد ہیں جیسے لوگ ڈاکٹر سلیم اختر کو نقاد سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی عمر ادب کے دشتِ بے وفا میں گزری ہے جس سے ان کے ہاں تخلیق پارے پر گہری نظر ڈالنے کا شعور، کمال بھی پیدا ہوا۔'' ۱۰۴

قاسمی کی تنقید اردو کی تنقیدی روایت میں ایک مقام رکھتی ہے۔ ان کی تنقیدی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وسیع تجربے کے حامل، تنقیدی بصیرت کے مالک، دور رس نگاہ رکھنے والے اور اعلیٰ ذوقِ سلیم کے مالک قاسمی دیگر ادبیات سے بھی شغف رکھتے تھے۔ یہ روحانیت و اخلاقیات کے اصول و اقدار کو انسانیت کی ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کے خواہاں ہیں۔ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے انھوں نے موزوں الفاظ کا استعمال کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب و تہذیب اور دیگر علوم وفنون کی ترقیات سے کماحقہ آگاہی حاصل کر کے اپنے نقطہ نظر کو پر تاثیر انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے تحریر دل میں گھر کر جاتی ہے اور تنقید کی خشکی کا بھی چنداں احساس نہیں ہوتا۔ ان کا اولین مقصد تنقید جیسے میدان میں دل کشی اور رعنائی پیدا کرنا ہے۔ ان کی تنقید ادب کی راہیں ہموار کرتی، عوام میں ادبی ذوق پیدا کرتی اور ادبی شعور کو ہوا دیتی ہے۔ قاسمی اپنی تنقید میں درج ذیل امور کا بطور خاص خیال رکھتے ہیں:

۱۔ ادیب و شاعر کی فنی قدر و قیمت کیا ہے؟

۲۔ ادیب پر ماحول کے اثرات کتنے گہرے اور ہمہ گیر ہیں؟

۳۔ وہ اپنے دور کی علمی اقدار اور سیاست سے کس حد تک متاثر ہے؟

۴۔ ادیب و شاعر کے فکری پہلو کی اٹھان کیا ہے؟

۵۔ زندگی کے متعلق ادیب کا نقطہ نظر کیا ہے؟

۶۔ ادیب کی تحریروں میں تازگی اور انفرادیت کے کتنے گہرے اثرات ہیں؟

۷۔ ادیب کی تحریروں میں علمی وسعت کے علاوہ تجربے کا تنوع کتنا اہم ہے؟

خوش اسلوبی سے پیش کردہ یہ تنقیدی مقالات ان کی سالہا سال کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے جو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت سے روشناس کرنے کے ساتھ ہی اہلِ فکر و اہلِ قلم کو ان کے فرائض سے آگاہ کراتا ہے۔ یہ مضامین وسعتِ معلومات، انتقادی بصیرت اور ژرف نگاہی کے اعتبار سے اردو ادب کے قارئین کے لیے یکساں کارآمد ہیں۔ انھوں نے نہایت جرات افکار کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی رائے کو مدلل انداز سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے کسی نظریے پر آنکھیں بند کر کے ایقان نہیں کیا بلکہ خود اپنی تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر واضح رائے قائم کی ہے۔ یہ خیال افروز مضامین قارئین کو دعوتِ مطالعہ دینے کے ساتھ ساتھ انھیں دل چسپی کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ بعض مضامین میں اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے اختصار کو ملحوظ رکھنے سے انقباض کا خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں بات کا ادھورا پن احساسِ تشنگی پر منتج نہ ہو لیکن وہ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقائق کو نوکِ قلم تک لے آئے ہیں۔ پیش نظر مقالات میں جہانِ معنی کا سمندر ہے جس میں معنی و مفہوم کا دریا ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ ان مضامین سے ان کی دانش افزا معنی و مفہوم، فکر انگیز دانائی اور دانش و فراست کے در وا ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ میں تخلیق کار کی ذہانت، محنت، لگن، جستجو اور فکر و تدبر کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے جن مسائل پر قلم اُٹھایا، وہ اس تیقن سے پیش کیے کہ انھیں حل کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔ محولہ بالا مقالات کا مطالعہ ان کے وقیع محاسن کو بھی عیاں کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، (دیباچہ) تہذیب وفن، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، ۱۹۷۵ء

۲۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۸

۳۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰، ۱۱

۴۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا ۳، ص ۴۷

۵۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا ۲، ص ۴۷

۶۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا ۳، ص ۱۶۸

۷۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا ۲، ص ۹۲

۸۔ ایضاً، ص ۸۱

۱۰۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۶

۱۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، کلچر اور پاکستانی کلچر، مشمولہ تنقید اور مجلسی تنقید، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۶

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا ۲، ص ۱۱۰

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا ۴، ص ۹۱

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، ثقافت کیا ہے، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اوّل، اپریل ۱۹۹۹ء، ص ۱۰

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا ۱، ص ۱۱۴

۱۶۔ خالد احمد، جدید تر پاکستانی ادب، لاہور، بیاض، ۱۹۹۸ء، ص ۵۰

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا ۱، ص ۱۱۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، تعلیم اور ادب وفن کے رشتے، لاہور، مکتبہ فنون، بار اوّل ۱۹۷۴ء، ص ۶۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۷۹

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا ۱، ص ۱۰۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۲۳۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۲، ص۱۲۴

۲۴۔ ایضاً، ص۳۶

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا۱، ص۳۳

۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۲، ص۱۳۳

۲۷۔ ایضاً، ص۱۲۶

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا۳، ص۱۲۷

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۴، ص۱۲۶

۳۰۔ خالد احمد، جدید تر پاکستانی ادب، محولہ بالا۱۹، ص۵۳

۳۱۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا۳، ص۱۹۰

۳۲۔ ایضاً، ص۱۹۶

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۲، ص۱۹۰

۳۴۔ ایضاً، ص۲۲

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا۱، ص۲۲۲

۳۶۔ ایضاً، ص۲۸۲، ۲۸۳

۳۷۔ ایضاً، ص۲۸۳

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۴، ص۲۵۲

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، تعلیم اور ادب وفن کے رشتے، محولہ بالا۱۹، ص۸

۴۱۔ ایضاً، ص۲۳

۴۲۔ ایضاً، ص۱۶

۴۳۔ ایضاً، ص۴۷

۴۴۔ خالد احمد، تعلیم اور ادب وفن کے رشتے، محولہ بالا۱۹، ص۲۳، ۲۴

۴۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، حریت فکر کا داعی احمد ندیم قاسمی، مشمولہ سہ ماہی معاصر، لاہور، جلد۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص۶۲

۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا۳، ص۱۹

۴۷۔ منور ملک، پس تحریر، لاہور، بک مارک ٹمپل روڈ، ۱۹۹۳ء، ص ۹۳

۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا ۳، ص ۵۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۵۳، ۵۴

۵۰۔ ایضاً، ۵۸

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ ایضاً، ص ۶۴

۵۳۔ ایضاً، ص ۴۱

۵۴۔ ایضاً، ص ۳۷

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ کلیم احسان بٹ، احمد ندیم قاسمی کی غالب شناسی، مشمولہ ماہ نامہ ''بیاض''، لاہور، جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۱۱، ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۱

۵۸۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا ۳، ص ۵۹

۵۹۔ ایضاً، ص ۶۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۷۰

۶۱۔ ایضاً، ص ۵۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۸۷

۶۳۔ ایضاً، ص ۴۲، ۴۳

۶۴۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی اور غالب، مشمولہ سہ ماہی موتاج، لاہور، جلد ۱، ۲، ۲۰۰۷ء، ص ۵۹

۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا ۳، ص ۴۷

۶۶۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی اور غالب، مشمولہ سہ ماہی موتاج، محولہ بالا ۶۴، ص ۶۳

۶۷۔ ایضاً، ص ۶۹

۶۸۔ منور ملک، پس تحریر، محولہ بالا ۴۸، ص ۹۱

۶۹۔ احمد ندیم قاسمی، علامہ محمد اقبال، لاہور، غالب پبلشرز، ۱۹۷۷ء ص ۴۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۵۹

۷۱۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۲، ص ۶۹

۷۲۔ ایضاً، ص ۳۳

۷۳۔ ایضاً

۷۴۔ ایضاً، ص ۴۴

۷۵۔ ایضاً، ص ۶۰، ۶۱

۷۶۔ ایضاً، ص ۷۸

۷۷۔ ایضاً، ص ۶۸

۷۸۔ شمس الرحمان فاروقی، قاسمی صاحب، مشمولہ ندیم نامہ، مرتب اسلم فرخی، کراچی، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، ۲۰۰۰ء، ص ۹۷

۷۹۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا۳، ص ۱۳۳

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۸۲۔ ایضاً

۸۳۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۸۴۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۲، ص ۱۶۸

۸۵۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۸۷۔ احمد ندیم قاسمی، تعلیم اور ادب و فن کے رشتے، محولہ بالا۱۹، ص ۴۴

۸۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۸۹۔ احمد ندیم قاسمی، اِک شرر پیراہن خاشاک میں لپٹا ہوا، مشمولہ ماہ نامہ ماورا، لاہور، جلد ۸، شمارہ ۵، مئی ۲۰۰۷ء، ص ۳۱

۹۰۔ احمد ندیم قاسمی، تعلیم اور ادب و فن کے رشتے، محولہ بالا۱۹، ص ۴۵

۹۱۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب و فن، محولہ بالا۱، ص ۱۶۳

۹۲۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۲، ص ۱۶۵

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۹۴۔ ایضاً

۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، محولہ بالا۲، ص۱۵۶

۹۶۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا۱، ص۳۱

۹۷۔ احمد ندیم قاسمی، احمد فراز کی شاعری۔ایک تاثر، مشمولہ ماہ نو، جلد۶۳، شمارہ۱، جنوری ۲۰۰۹ء

۹۸۔ احمد ندیم قاسمی، تعلیم اور ادب وفن کے رشتے، محولہ بالا۱۹، ص۶۵

۹۹۔ ایضاً، ص۶۶

۱۰۰۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، محولہ بالا۳، ص۸۹

۱۰۱۔ ایضاً، ص۱۷

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۹۸،۱۹۹

۱۰۳۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، محولہ بالا۱، ص۱۲۳

۱۰۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا، دائرے اور لکیریں، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۶ء، ص۶۹

✿✿✿✿✿

باب ششم

خاکہ نگاری

ہر شخص کے باطن میں ایک کائنات بستی ہے اس کو جاننے اور دوسروں کو اس سے آگاہ کرنے کے فن کو خاکہ نگاری کا نام دیا جاتا ہے۔ خاکہ چھوٹی چھوٹی کیفیات سے ترتیب پا کر موضوع شخصیت کا پہلودار نقش بن جاتا ہے۔ خاکہ کا مواد کسی دوسری شخصیت کے مطالعہ سے اخذ کیا جاتا ہے لیکن ایک عمدہ خاکہ نگار اس خام مواد کو بعینہٖ پیش کرنے کی بجائے متفرق واقعات و تجربات کو مشاہدہ کے تاثر اور عمل کے تجزیے سے گزارتا ہے۔ پھر مصنف کے تخلیقی جوہر موضوع شخصیت کو کندن یا راکھ بناتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے انسان کا بہترین مطالعہ انسان کو قرار دیا ہے۔ انسان چوں کہ امیر متوسط اور غریب طبقات میں منقسم ہوتا ہے اسی لیے کسی شخص کی انسانیت کا پیمانہ رسمی اخلاقیات کا پابند نہیں ہوسکتا۔ مجنوں گورکھ پوری نے خاکہ نگار کے لیے متجسس ہونا لازم قرار دیا ہے۔ ممتاز مفتی کے نزدیک اس فن میں طوفان چلنے کے لیے بے قرار ہوتا ہے لیکن ازلی طور پر اظہار کے راستے مسدود ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کرتے ہیں جو بال سے زیادہ باریک ہے۔ علی عباس حسینی خاکہ نگاری کو شخصیت نگاری کی مشکل ترین قسم متصور کرتے ہیں۔ وزیر آغا اس فن کو ''کارگہ شیشہ گراں'' کا عنوان دیتے ہیں جب کہ محمد طفیل ایک ایسی تلوار کہتے ہیں جس سے خود مصنف بھی زخمی ہوتا ہے۔ ممتاز رفیق اپنے مضمون ''خاکہ نگاری کا فن'' میں رقم طراز ہیں:

> ''خاکہ نگار کی مثال ایک ایسے فرد کی سی ہے جو اپنے ہاتھوں میں آئینہ لیے پھرتا ہے اور جو فرد اس آئینے میں تصویر ہوتا ہے اسے پوری ایمان داری سے بے کم و کاست کاغذ پر نقش کر دیتا ہے۔''

کامیاب خاکہ نگار مصور کی طرح جامع، ہمہ گیر اور متحرک تصویر لفظوں میں اُتار دیتا ہے۔ وہ خاکہ نگاری کے اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں شخصیت کے نمایاں اوصاف اُجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بشیر سیفی لکھتے ہیں:

> ''یہ کام ایک خاص سلیقے اور دقتِ نظر کا طالب ہے کیوں کہ خاکہ نگار کے پاس واقعات و تاثرات کا انبار ہوتا ہے اور اسے ان میں ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جن کے آئینے میں پوری شخصیت کا عکس نظر آئے کیوں کہ غیر ضروری تفصیلات اور واقعات کی بھرمار سے خاکہ کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔''

اردو ادب میں ایک آزاد، خود مختار صنف کی حیثیت سے خاکہ نگاری کی روایت قدیم نہیں تاہم اس کے ابتدائی نقوش قدیم تذکروں اور سوانح عمریوں میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود خاکہ نگاری کی اولین اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اگر چہ اس میں خاکہ نگاری کے فنی اصول و ضوابط پیش نظر نہیں ہیں لیکن خاکہ نگاری کے اوّلین نقوش ''آبِ حیات'' میں ہی ملتے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں اُردو ادب

میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز مولوی فرحت اللہ بیگ کی ''نذیر احمد کی کہانی'' سے ہوتا ہے جس میں نذیر احمد کا سراپا، عادات و خصائل، نظریات و افکار کے ساتھ ساتھ خوبیوں اور کمزور پہلوؤں کے علاوہ سماجی و ادبی ماحول بھی متحرک دکھائی دیتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے بعد مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر جوش، چراغ حسن حسرت، جوش ملیح آبادی، خواجہ غلام السیدین، عبدالمجید سالک، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، محمد طفیل، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، رئیس احمد جعفری، سعادت حسن منٹو، اخلاق احمد دہلوی، ممتاز مفتی، ضمیر جعفری، فارغ بخاری، رحیم گل، نظیر صدیقی، عطا الحق قاسمی وغیرہ نے اگرچہ خاکہ نگاری میں گراں قدر اضافے کیے، لیکن دوسری اصنافِ سخن مثلاً غزل، نظم، ناول، افسانہ کی نسبت کم مایہ رہی۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو کم ادیبوں نے اس صنفِ سخن کو اظہار کا مستقل ذریعہ بنایا۔ اور دوسری وجہ بیشتر فن کاروں پر عقیدت و محبت کی بنا پر ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے رہے۔

احمد ندیم قاسمی خاکہ نگاری کی صنف کی جانب اُس وقت متوجہ ہوئے جب ادب میں اس کی شہرت اور عظمت مسلم ہو چکی تھی۔ انھوں نے نقوش کے زمانے سے شخصیات کے سوانحی خاکے لکھنے کی ابتدا کی جنھیں بہت پذیرائی ملی مثلاً ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں دو خاکے ''ہاجرہ مسرور'' اور ''عبدالمجید سالک'' ملتے ہیں۔ ان کے منٹو کی شخصیت پر لکھے مضمون کو بہت سراہا گیا۔ بعدازاں راشد، فیض، ابن انشا، خدیجہ مستور، محمد طفیل، چراغ حسن حسرت، حکیم محمد سعید کے متعلق لکھے گئے تاثرات بھی ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ خاکے منتشر اور غیر مدون صورت میں مختلف اخبارات و جرائد میں موجود تھے جنھیں منصورہ احمد کے ایما پر یکجا کر کے کتابی صورت عطا کی گئی۔ قاسمی کے اولین سوانحی خاکوں کا مجموعہ ''میرے ہم سفر'' ہے اس میں فہرست مضامین کی جگہ کہکشاں کا عنوان درج ہے۔ زیرِنظر مجموعہ تیرہ شخصیات کے خاکوں، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، چراغ حسن حسرت، سعادت حسن منٹو، ن۔م۔راشد، فیض احمد فیض، ضمیر جعفری، امتیاز علی تاج، حکیم محمد سعید، خدیجہ مستور، ابن انشا، سجاد سرور نیازی اور محمد طفیل پر مشتمل ہے۔ جب کہ دوسری جلد ''میرے ہم قدم'' انیس علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ جن میں اختر شیرانی، احسان دانش، اختر حسین جعفری، ظہیر بابر، مرزا محمد ابراہیم، دادا امیر حیدر، ظہیر کاشمیری، کرشن چندر، شیخ خورشید احمد خاں، مختار صدیقی، میاں عبدالحمید، ڈاکٹر اقبال شیدائی، ظہور نظر، میر خلیل الرحمٰن، پروین شاکر، ریاض شاہد، اطہر نفیس، حسن عابدی اور کاوش بٹ شامل ہیں۔ قاسمی، منصورہ احمد اور دیگر دوستوں کے مطالبے پر شخصیت نگاری پر متفرق مضامین اور یادداشتوں کو کتابی صورت عطا کر رہے تھے کہ بلاوا اجل آ جانے کی صورت میں کتاب ان کی زندگی میں منظرِ عام پر نہ آ سکی۔ تاہم ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی نے ان خاکوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

قاسمی نے اپنی عمر طبیعی کا بیشتر حصہ علم و ادب کی معروف شخصیات اور بلند پایہ بزرگوں کی صحبت میں

محبت اور شفقت سے گزارا۔ محولہ بالا سوانحی خاکوں میں انھوں نے ان ادبی و غیر ادبی شخصیات کو شامل کیا ہے جن سے قلبی و رسمی تعلقات تھے جنھیں قریب سے دیکھنے کا قدرت نے موقع فراہم کیا۔ ان کے ساتھ گزرا ہوا قیمتی وقت قاسمی کی زندگی کا قیمتی سرمایہ تھا۔ ان شخصی خاکوں میں مصنف بھی قدم بہ قدم اپنی پیش کردہ شخصیت اور قاری کے ہم رکاب چلتے ہیں۔ ہر واقعہ میں خاکہ نگار موضوع، شخصیت اور قاری کا ہاتھ تھامے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث خودنوشت کی حسرت دل میں لے کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے لیکن ان خاکوں کی انفرادیت یہ ہے کہ خاکوں میں موجود ان شخصیات کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے اہم واقعات بھی قاری پر آشکار کرتے ہیں مثلاً بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک کے حالات و واقعات، زندگی کی محرومیاں، وسائل کی قلت، صحافت سے وابستگی، آسائش زندگی سے دُوری، ریڈیو سے وابستگی، فلم سے تعلق، تحریکِ پاکستان میں پُرجوش حصہ، ترقی پسند تحریک میں شمولیت، گرفتاریاں، ایام بے روزگاری، اُس پر مستزاد ان کی بذلہ سنجی اور فی البدیہہ لطیفہ گوئی وغیرہ وغیرہ کا تعلق قاسمی کی ذاتی زندگی سے ہے۔ اگر قاسمی اپنی سوانح عمری لکھتے تو نہایت دل چسپ معلومات افزا اور صداقت پر مبنی ہوتی۔ ''میرے ہم سفر'' کے آغاز میں اپنے خیالات کو الفاظ کا پیرہن اس طرح عطا کرتے ہیں:

> ''بہت مدت تک مجھے اس محبت بھرے مطالبے کا سامنا رہا کہ میں اپنے سوانح لکھوں
> دراصل میرے طبقے کے ہر فرد کی طرح میری زندگی بھی نشیب و فراز سے اٹی ہوئی ہے۔
> ظاہر ہے کہ ان کا مفصل بیان نہ صرف دل چسپ ہوتا بلکہ تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی،
> تحریکِ پاکستان کے بعد بیشتر سیاست بازیوں اور پھر ہماری افواج کے بعض سربراہوں کی
> یلغاروں کی تاریخ بھی مرتب ہو جاتی۔'' [۱]

مختلف احباب شعر و ادب قاسمی کو اپنی خودنوشت لکھنے پر اُکساتے تو یہ رنجیدہ ہو جاتے کیوں کہ زندگی کی گوناگوں مصروفیات میں اتنے مشغول رہتے تھے کہ دیرینہ خواہشات کی تکمیل بھی نہ کر سکے۔ عمر کے آخری حصے میں انھوں نے کچھ یادداشتیں قلم بند کرنا شروع کر دیں لیکن بچپن کے حالات و واقعات ہی سو صفحات پر محیط تھے۔ پھر زندگی کی مصروفیات نے اس جانب توجہ ہی مبذول نہ کرائی۔ زندگی انھیں مزید کچھ مہلت دیتی تو ادب کا یہ خلا بھی پُر ہو جاتا اور دوست احباب کی خواہش بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی۔ نہایت حسرت سے لکھتے ہیں:

> ''افسوس کہ میرے معمولاتِ حیات میں سے اس کام کے لیے وقت ہی نہ نکل سکا۔
> میں نے ایک بار اپنے حالاتِ زندگی کے نوٹ لینا شروع کیے تو میرے بچپن کے ابتدائی
> نو دس برسوں کی یادیں بھی ایک سو صفحات پر محیط ہوتی محسوس ہوئیں۔ یوں میں اپنی
> خودنوشت تحریر کرنے کے ارادے سے دستکش ہو گیا۔'' [۲]

قاسمی نے ان شخصی خاکوں میں ادب وصحافت، حکمت و سیاست سے متعلقہ اُن افراد پر قلم اُٹھایا جن کے نام فلکِ ادب پر زندہ و جاوید ہیں۔ ان معروف شخصیات کے خدوخال اگرچہ تحریروں میں بھی نمایاں ہوتے ہیں لیکن خاکہ نگار، ان شخصیتوں کی ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصیت وفن کے خصائص کو اُجاگر کرنے کا فریضہ بھی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ ان خاکوں میں موضوع شخصیت کے بنیادی مزاج، افتادِ طبع، اندازِ تفکر، سیرت کی اونچ نیچ، نفسی کیفیات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی قلمی تصویریں ملتی ہیں۔ انھوں نے شخصیات کے ساتھ بیتائے ایام کے واقعات و حالات کے علاوہ اُس شخص کی شخصی خوبیوں اور خامیوں سمیت قارئین کے سامنے پیش کیا ہے پھر فن کے مکمل شعور اور اندازِ بیاں کی بے تکلفی کے ساتھ ان کا بے ساختہ اور شگفتہ قلم نکتہ آفرینیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ نہایت سلیقے سے شخصیت کی خامیاں بھی بیان کرتے ہیں کیوں کہ انھوں نے انسانی زندگی کے نباض ہونے کے علاوہ حیاتِ انسانی کے متنوع پہلوؤں کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہے۔ خاکے کو مشکل صنفِ ادب قرار دینے کے ساتھ ساتھ ایسا پُل صراط بھی کہا جاتا ہے جو تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے۔ قاسمی اس پُل صراط پر خراماں اور سبک روی سے چلتے جاتے ہیں۔ ان کے خاکے، خاکہ نگاری کے اصول وضوابط سے بھی آراستہ ہیں یعنی بے ساختگی، روانی، اپنائیت، محبت، بے تکلفی اور بذلہ سنجی وغیرہ وغیرہ۔ اس پر مصداق سچائی یا حقیقت نگاری پر مشتمل واقعات کا بیان ہے۔ ''میرے ہم سفر'' کے سرآغاز میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے انفرادی اور اجتماعی سطح پر سچ بولنا بھی آتا ہے۔'' ۳۔

ذمہ دار خاکہ نگار صداقت کا دامن تھام کر ہی واقعات کو استدلال و روانی سے بیان کرتا جاتا ہے۔ قاسمی کی عمرِعزیز کا بیشتر حصہ بڑی علمی و ادبی مجالس، مشاعروں اور ادبی نشستوں میں گزرا۔ اس لیے ان میں شرکت کرنے والے ادیبوں اور شاعروں سے ان کے ذاتی مراسم بن گئے جو مضبوط ہوتے گئے۔ ان کے خاکے قاری کو چونکاتے بھی ہیں اور موضوع شخصیت کی زندگی سے متعلق اسرار و رموز بھی قارئین پر منکشف کرتے ہیں۔

''میرے ہم سفر'' میں شامل تیرہ اہلِ قلم کی کہکشاؤں میں اوّلین روشن ستارہ عبدالمجید سالک ہیں۔ قاسمی اس خاکے کا آغاز انتہائی عاجزی و انکسار سے کرتے ہیں۔ سالک بلند پایہ صحافی کے علاوہ جغرافیہ، فلسفہ، سائنس، نفسیات پر قابلِ رشک معلومات رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو میں ادب کی چاشنی بھی ہمیشہ برقرار رہی۔ سالک؛ قاسمی کے زمانہ بے روزگاری میں ان کے بہت قریب تھے۔ مصنف کی محبت وعقیدت بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ خاکے کے آغاز میں برملا اس عجز کا اعتراف کرتے ہیں:

> ''شروع ہی سے بتا دوں کہ میں سالک صاحب کی شخصیت کو ان چند صفحات میں سمیٹنے سے قاصر رہوں گا۔ اس عجز کے اعتراف ہی میں حیرت کیوں کہ جس شخصیت میں مشرق کا کلچر مجسم ہو گیا ہو، اس کا کماحقہ احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں اور جس طرح

ایشیائی کلچر کی ان گنت ایک سے ایک دل آویز موتیوں کی طرح جگمگاتی ہوئی پرتیں ہیں
اسی طرح سالک صاحب کی شخصیت کے بھی بے شمار پہلو ہیں۔'' ۴

محولہ بالا اقتباس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خاکہ نگار کو سالک کی زندگی اور شخصیت وفن کے پوشیدہ گوشوں سے اتنی واقفیت ہے کہ اگر ان کی زندگی کے تمام واقعات کو سپردِ قلم کریں تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آ سکتی تھی۔ خاکہ نگار کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے سالک کی شخصیت کے چیدہ چیدہ پہلوؤں اور زندگی کے اہم واقعات کو خاکے میں پیش کرتے ہیں۔ پھر بھی موضوعِ شخصیت سے خاکہ نگار کی عقیدت، احترام اور اپنائیت کا انداز خاکے کے لفظ لفظ سے ٹپک رہا ہے۔ ان کے مابین خوش گوار روابط کا اندازہ خاکے کے ہر جملے سے ہوتا ہے جن میں محبت وخلوص کا احساس موجود ہے۔ لکھتے ہیں:

''سالک صاحب کے اور میرے درمیان عقیدت و شفقت کا رشتہ تھا، عقیدت میری اور شفقت اُن کی۔ اور طویل عرصے تک نہ تو میری عقیدت میں کوئی کمی آئی اور نہ اُن کی شفقت میں۔'' ۵

پیشِ نظر خاکے میں مصنف نے کامیابی سے شخصیت کی کمزوریوں سے گریز کرتے ہوئے احسن پہلو کو نمایاں کیا ہے، اس کا محرکِ اوّل موضوعِ شخصیت سے بے پناہ عقیدت ومحبت تھی۔ اسی عقیدت نے ان کے قلم کی روانی کو جکڑ لیا تھا۔ اس خاکے میں قاسمی ان کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں یہاں عقیدت مدح کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ قدرت اللہ شہزاد اس خاکے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''عقیدت کے سفر میں انھوں نے اندھی تقلید کی بجائے باشعور عقیدت کو ترجیح دی جس کے سبب وہ سالک صاحب کا کامیاب خاکہ لکھ پائے جس میں شخصیت کا خاصا واضح ہیولا اُبھرا ہے۔'' ۶

سالک صحافی، شاعر اور فن کار ہونے کے ساتھ عمدہ شخصیت کے مالک بھی تھے۔ ان کی خوش طبعی اور اندازِ بیان کو نہایت خوب صورت الفاظ میں بیان کرتے ہیں جس سے سالک کی ذہانت و فطانت اور حاضر جوابی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ متبسم چہرے کے مالک؛ سالک دوسروں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹیں بکھیرنے کے متمنی تھے۔ ان کے مزاج کی شگفتگی سدا بہار تھی۔ اس شگفتگی اور بذلہ سنجی میں ادب کی چاشنی بھی موجود ہوتی مثلاً ایک موقع پر بچے مسلم لیگ کے جھنڈے اُٹھا کر نعرے لگا رہے تھے تو سالک نے حکیم دینا ناتھ کو بلی سے مخاطب ہو کر کہا:

''آج کل تو جس کو دیکھو آپ کے ہری چند اختر کو بانس پر اُٹھائے پھرتا ہے۔'' ۷

حکیم صاحب مزاح کو سمجھنے سے قاصر رہے تو انھیں سمجھاتے ہوئے بتاتے ہیں:

''جھنڈا ہرا (ہری) ہے اور اس پر چاند (چند) اور ستارہ (اختر) کا نشان ہے اور۔۔۔ ظالم اب تو ہنس دو۔'' ۸

''میرے ہم سفر'' کا دوسرا خاکہ مولانا غلام رسول مہر کے فکر وفن کے حوالے سے متفرق یادوں پر مشتمل ہے۔ فن پر زیادہ توجہ دینے کے باعث مہر کی شخصیت کی زیادہ پرتیں نہیں کُھلتیں۔ اس میں ذاتی خوبیوں اور خامیوں پر توجہ دینے کی بجائے مہر کو ایک اعلیٰ ظرف عالم سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اگرچہ اس مضمون کو سوانحی خاکوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے لیکن ''محبت بھری اس تحریر کو خاکے کی سمت اُٹھنے والا قدم تو قرار دے سکتے ہیں، خاکہ نہیں۔''[9] غلام رسول مہر عالم متبحر میں تھے جو کلاسیکی و قدیم ادب کا مطالعہ شوق سے کرتے لیکن جدید ادب سے انھیں لگاؤ نہ تھا۔ یہ سراپا جمال، ہمہ جہت شخصیت کے مالک اور شفقت و کرم کے جذبات سے مملو تھے۔ مہر سے اُنسیت کا تذکرہ جس خلوص سے کیا گیا ہے اس سے مصنف اور مہر کی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ مہر کے ابدی سفر پر روانگی کے بعد اپنی وارداتِ قلبی کا اظہار اور لاہور کی مغموم فضا کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کا لاہور جن عظیم شخصیتوں کے وجود سے منور تھا ان میں سے آخری شخصیت بھی اُٹھ گئی۔ لاہور کسی بھی دور میں ایسی شخصیتوں سے محروم نہیں رہا مگر مولانا کی رُخصت کے بعد فی الوقت اس اُفق پر کوئی ستارہ نظر نہیں آتا۔ یوں مجھے لاہور جیسے لُٹ سا گیا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ لاہور کے ایک گوشے میں وہ حجرہ اب خالی پڑا ہے جو اہلِ علم و ادب کا مرجع تھا اور جہاں علم و دانش کے پیاسے جس توقع سے جاتے تھے اس سے کہیں زیادہ شادکام ہو کر پلٹتے تھے۔''[10]

مہر کے خاکہ میں ''مولانا'' کا سابقہ ان سے عقیدت و محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے وصال کے دُکھ میں قاسمی عرصہ دراز تک مبتلا رہے جس کا اندازہ محولہ بالا اقتباس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ثمرین کوثر اپنے مقالے ''احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری'' میں اس خاکے کی بابت رقم طراز ہیں:

> ''اس پورے خاکے میں قاسمی ایک ایسے کرب میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں جو ان کی ذات اور دل و دماغ کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ انھیں ادب کے اس قیمتی خزانے میں سے اس انمول خزانے کے گم ہو جانے کا اتنا دُکھ ہے کہ انھیں ادب کی روایات جامد ہوتی محسوس ہو رہی ہیں۔''[11]

قاسمی، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے معترف ہونے کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی کی طلسماتی شاعری کے سحر میں بھی گرفتار تھے۔ یہ پہلا خاکہ ہے جس میں انھوں نے تاثراتی و نفسیاتی مطالعہ کی آمیزش سے اختر کے وہ نقوشِ حیات اُبھارے ہیں جو ان کے حافظے نے یادوں کی دنیا میں محفوظ کر رکھے تھے۔ اختر سے ان کے مضبوط روابط وفات تک بدستور قائم رہے بلکہ اختر کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مظہر محمود شیرانی اور پروین اختر سے بھی خط و کتابت جاری رہی۔ اس میں اختر کی محبت و شفقت کے ساتھ قاسمی کی عقیدت مندی کا بھی بھرپور دخل ہے۔ ان سے

اختر کی اولین ملاقات ۱۹۳۵ء میں فلیمنگ روڈ پر موجود اختر کے گھر پر ہوئی۔ قاسمی ان کی شخصیت و شاعری کے حصار میں بیک وقت قید تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''میری عقیدت مندی انتہا پر تھی مگر جب میں نے دبی زبان سے اپنا تعارف کرایا تو اختر اتنے تپاک سے ملے جیسے مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔ ان کی شخصیت بھی سیدھی سادی تھی اور ان کی گفتگو میں بھی محبت کی چاشنی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنا مشہور و مقبول شاعر اتنا نرم گفتار بھی ہو سکتا ہے۔'' ۱۲

ان سوانحی خاکوں میں جہاں موضوع شخصیت کے عادات و اطوار متنوع رنگوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتے ہیں وہیں قاسمی کے مشغولات اور شوق کا اندازہ بھی بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ قاسمی عالم شباب میں کھانا کھانے کی بجائے فلم دیکھنے کو ترجیح دیتے۔ بے روزگاری کے دنوں میں اختر شیرانی نے ''عرب ہوٹل'' میں قاسمی کے لیے صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے اور رات کے کھانے کا انتظام کیا اور دوست یا مہمان کو بھی مدعو کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اختر نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اختر کی دھمکی کے پیش نظر قاسمی کے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش نے انھیں نیک صلاح سے نوازتے ہوئے ہوٹل جانے کا مشورہ دیا۔ اگر قاسمی ایسا نہ کرتے تو اختر جیسے فرشتہ صفت، نیک سیرت اور انسان دوست کو کھو بیٹھتے۔ چناں چہ مسلسل تین ماہ تک قاسمی خود بھی اور اپنے مہمانوں کو بھی عرب ہوٹل سے کھانا کھلاتے رہے۔ ایک روز عرب ہوٹل کے مالک نے ان کے گوش گزار کیا:

> ''ویسے تو اختر صاحب مہینوں تک اپنا حساب نہیں چکاتے مگر جب سے تم ان کے خرچ پر میرے ہوٹل میں کھانا کھانے لگے ہو اختر صاحب مہینے کی پہلی تاریخ کو آتے ہیں اور سارا حساب چکا دیتے ہیں۔'' ۱۳

اختر اپنے محدود وسائل کی موجودگی میں بھی قاسمی کی مدد کرتے۔ اس والہانہ انداز کی بنا پر اختر کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ اختر کی وفات کے بعد بھی ان کے خاندان سے بے لوث اور پُرخلوص تعلقات تا حیات قائم رہے۔ مظہر محمود شیرانی کو زندگی کی کامرانیوں پر مبارک باد کا خط لکھتے۔ ان کی زندگی کے مسائل کو ممکنہ حد تک کم کرتے اور ان کے دُکھ، غم میں شریک ہوتے۔ ان کی ہمت بندھاتے مثلاً مظہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے ہمیشہ اپنے اتنا ہی قریب سمجھیے جتنا آپ کا کوئی عزیز ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ آپ کے مجھ پر اور میرے آپ پر چند حقوق ہیں اور میرے دل میں آپ کے سارے گھرانے کا احترام ہے۔'' ۱۴

قاسمی نے خاکہ نگاری کے وصف کے عین مطابق موضوع شخصیت کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کی جھلک دکھائی ہے ورنہ پیش کردہ خاکے یک رُخی رہ جاتے۔ اختر شیرانی اور ان کے والد گرامی حافظ محمود شیرانی کے مابین ناخوش گوار تعلقات کی بنیاد اختر کا شراب کے نشے میں دُھت رہنا تھا۔ اختر جیسا نیک اور پاکیزہ فطرت انسان

شراب کے سامنے بے بس تھا۔ قاسمی کرب سے لکھتے ہیں:

''اختر صاحب کے علاوہ اپنے عزیز دوستوں منٹو اور مجاز اور عدم اور میراجی کو انتہائی مدہوشی کے عالم میں دیکھ کر مجھے اس لیے کچھ زیادہ ہی دُکھ ہوتا تھا کہ کتنی پیاری شخصیتیں اس نامراد عادت نے کچھ سے کچھ کر ڈالی ہیں۔'' ۱۵

کثرت شراب نوشی کے باعث اختر کا جگر پتھر بن گیا اور یہی روگ جان لیوا ثابت ہوا۔ قاسمی نے اختر سے عقیدت رکھنے اور ان کی عظمت کا کُھلے دل سے اعتراف کرنے کے باوجود کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالا۔ انھوں نے زہرخند کی کیفیت قائم نہیں کی بلکہ اختر کی شخصیت کو فنی پختگی سے بیان کیا ہے کہ قاری ایک متوازن رائے قائم کر سکتا ہے۔ اختر جیسا معروف شاعر بھی قاسمی کی شاعری کا مداح تھا۔ ایک روز انھوں نے رسالہ نقوش میں چھپنے والی غزل اختر کو سنائی جس کا یہ شعر:

کسی چمن میں بس اسی خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بُھولے سے پاؤں دھر جاؤں ۱۶

سُن کر اختر نے شعر کی داد دی اور کہا:

''یہ غزل تو مجھے کہنا چاہیے تھی تم نے کیسے کہہ ڈالی!'' ۱۷

اُردو ادب سے والہانہ محبت کرنے والے شاعر اختر کے مقام و مرتبہ کو خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس خاکے میں گپ شپ کے رسیا، ندرت پسند طبیعت کے مالک، حسن و فن کے شیدائی، حسین زندگی کے متلاشی، مہمان نواز، وضع دار اور نرم و کومل انداز کے مالک اختر کا پیکر متحرک دِکھائی دیتا ہے۔ قاسمی اپنے مخلص دوست اختر شیرانی کی شاعرانہ اوصاف کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حق بات یہ ہے کہ اختر شیرانی کی شاعرانہ خصوصیات کا غیر مشروط اعتراف کیے بغیر اردو شاعری کی سچی تاریخ مرتب ہی نہیں ہوسکتی۔'' ۱۸

اختر شیرانی کا پیکر ان کے کمالِ فن سے یوں نکھرتا ہے جیسے پھول کی پتیاں شبنم کے شفاف قطروں سے دُھل کر اپنی رعنائیوں اور زیبائیوں سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔

ظہیر بابر مشہور صحافی اور افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ قاسمی کی بڑی بہن سعیدہ بانو کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ قاسمی کا ظہیر کے ساتھ دوستی کا رشتہ اُستوار تھا۔ وہ ظہیر کی سیرت کے ساتھ ساتھ ان کی خوب صورت شکل کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں:

''میری اکلوتی بہن (سعیدہ بانو) کا اکلوتا بیٹا ظہیر بابر اتنا بے پناہ خوب صورت بچہ تھا کہ بہن کو مسلسل یہ فکر پڑی رہتی تھی کہ کہیں اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے چناں چہ جب بھی وہ گھر سے نکلتا تھا بہن اس کے گال پر سرمے یا کاجل سے سیاہ نشان ضرور لگا دیتی تھی۔'' ۱۹

قاسمی کے خاکے ذاتی حالات کی پرکھ کے ساتھ ساتھ لمحہ فکریہ بھی عطا کرتے ہیں مثلاً پانچ برس کے ظہیر بابر مسجد کے عقب میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ ان کی بڑی روشن آنکھیں بیمار اور سرخ تھیں۔ ان میں مفلسی جھانک رہی تھی تب ان کے پھوپھی زاد بھائی ملک امیر حیدر کا بیٹا محمد قاسم بھی اس گزرگاہ میں کھیلنے کے لیے آیا۔ امیر باپ کا بیٹا ہونے کے ناطے اس کے پاؤں میں سنہری جوتا، سر پر سلمہ ستارہ والی ٹوپی اور واسکٹ پر پھول کڑھے ہوئے تھے۔ وہ سیدھا ظہیر کے قریب آیا اور طفلانہ عادت کے باعث اپنا نیا جوتا، ٹوپی اور خوب صورت واسکٹ دکھانے لگا اور ظہیر سے پوچھنے لگا کہ کیا میری طرح کی خوب صورت چیزیں تمہارے پاس موجود ہیں۔ ظہیر ایک منٹ تک مسلسل اسے گھورتا رہا۔ پھر بولا:

''کیا تمہاری آنکھیں میری آنکھوں کی طرح بیمار ہیں۔'' [۲۰]

اس جملے سے ظہیر کی حساس طبیعت، خستہ حالی اور پیلی رنگت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قاسمی، ظہیر کی خستہ حالی، بچپن کے حالات و واقعات، بے تکلفی، دوستانہ مراسم اور بذلہ سنجی کی تحسین کرتے ہوئے انھیں ادبی حیثیت سے یاد کرتے ہیں:

''ظہیر بابر غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی تجسیم تھا۔ صحافت اور ادب میں اس کا کنٹری بیوشن صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔'' [۲۱]

قاسمی نے خاکہ نگاری کو سنجیدہ صنف کے طور پر اپنایا ہے۔ اگر کہیں طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے تو مزاح کے عناصر واقعات کی دل کشی میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔ انھوں نے دیگر خاکہ نگاروں کی طرح طنز و مزاح اور لفاظی و پھبتی سے کام لیتے ہوئے تخیل کی پرواز سے آسمان کے اوج کو نہیں چھوا بلکہ اپنے ممدوح کی زندگی کے ناگزیر واقعات اور اس کے وصفِ خاص کو حقیقی رنگ میں یکجا کر کے نہایت ہنرمندی سے زمینی دنیا کے خاکے لکھے ہیں جو موثر، پُرتاثیر اور حقیقت سے بھرپور ہیں۔ خاکے کے دوران کہیں بھی اپنی مخصوص ڈگر سے ہٹتے نظر نہیں آتے بلکہ وہ اپنے خاکوں سے ایک ایسی ادبی فضا تیار کرتے ہیں جو لطف و مسرت سے قاری کو سرشار کرتی ہے۔ خدیجہ مستور کا خاکہ (کسی خاتون پر لکھا گیا) ''میرے ہم سفر'' کا پہلا خاکہ ہے۔ اس خاکے میں قاسمی نے اپنی منہ بولی بہن سے غیر معمولی محبت، گھلاوٹ، شیرینی، حساس طبیعت، نرم دلی اور عادات و اطوار کو بیان کیا ہے جس سے شخصیت کی کئی جھلکیاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے جہاں ان کے فن کا بغور جائزہ پیش کیا ہے وہیں خدیجہ کی شخصیت میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے خدیجہ کی حساسیت، انسان دوستی، بے ساختگی اور سچائی کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ کسی شخص کی زندگی کا ایک واقعہ اس کی شخصیت کی کئی پرتیں کھول کر رکھ دیتا ہے۔ خدیجہ حد درجہ حساس خاتون تھیں۔ روتے میں مسکرانا ان کی خاص عادت تھی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک بار وہ کسی ایسی ہی ننھی منی بات پر رو رہی تھی تو میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ اتنے موٹے آنسوؤں کا بندوبست کہاں سے کر لیتی ہو۔ آپ کے آنسوؤں کی جسامت تو

انگور کے دانوں کی سی ہے۔ اس پر وہ بے اختیار ہنسنے لگی تھیں۔ روتے میں کھل کر ہنسنے لگنا
ان کی ایک دل چسپ عادت تھی۔'' ۴۲

قاسمی انسانی نفسیات کے گہرے نباض تھے۔ ان خاکوں میں ماہر نفسیات کی مانند تحلیل نفسی کا استعمال بھی مہارت سے ملتا ہے۔ خدیجہ مستور کے متعلق رقم طراز ہیں:

''۔۔۔وہ انسانی نفسیات کے بے حد گہرے مسائل کو نہایت آسان اور بے انتہا سلیس جملوں میں بیان کرتی چلی جاتی تھیں۔ ان کا انداز تحریر ایک ایسی نرم روندی کا تھا جس کا کام شور مچانا نہیں ہے صرف بہنا اور شاداب کرنا ہے۔ یہ ندی جب مسائل کے پہاڑوں میں سے بھی گزرتی تو کوئی ہنگامہ برپا نہیں کرتی تھی۔ پتھروں سے اُلجھ کر بس ذرا سا گنگنا لیتی تھی۔'' ۴۳

انھوں نے اشخاص کے خاکے تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا حقیقت پسندانہ اور ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے۔ یہ جائزہ اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ شخصیات کے خدوخال کے ساتھ اُن کے درون میں ہونے والے اضطراب اور عیوب و محاسن کو بھی پیش کیا ہے۔ یوں گمان ہوتا ہے کہ قاسمی کے سامنے اشخاص کا ظاہر و باطن کُھل کر سامنے آ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خاکہ نگار ان پر قلم اُٹھاتے ہیں تو ایسے حیرت ناک انکشاف منظرِ عام پر لاتے ہیں کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ قاسمی کا مشاہدہ تیز ہے اور کوئی امر بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ یہ نہایت کمالِ فن سے موضوع شخصیت کے فن کے ساتھ ساتھ اُس کی ذات کی کئی پرتوں کو کھولتے چلے جاتے ہیں۔

خدیجہ مستور کے خاکے کی بابت قدرت اللہ شہزاد لکھتے ہیں:

''۔۔۔قاسمی صاحب نے یہاں بھی شخصیت سے زیادہ فن کو موضوع بنایا ہے یا پھر خدیجہ کے افسانوں میں ان کی شخصیت کو ڈھونڈا ہے۔ عام روش تو یہی ہے کہ داخلی و خارجی رویوں سے تصویر کشی کی جائے لیکن قاسمی صاحب کی یہ اچھوتی کاوش اس لیے قابلِ تحسین ہے کہ یہ خاکے کو ایک نئی جہت عطا کرتی ہے۔'' ۴۴

قاسمی اپنے خاکوں کے ذریعے عوام الناس کو گزشتہ سیاسی و ملکی حالات سے بھی آگاہ کراتے ہیں مثلاً ۱۹۵۸ء میں چودھری محمد علی کے مرتب کردہ آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جنرل ایوب، سکندر مرزا کی معیت میں ''حکومت پر جھپٹا'' اور ملک پر پہلا مارشل لا مسلط کر دیا گیا۔ یہ معاملہ ہوتے ہی ملک میں گرفتاریوں کی ابتدا ہوئی۔ قاسمی اپنی نظر بندی کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے سٹاف کی میٹنگ میں کہا کہ افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی طرح ہمارے ہاں بھی عوام الناس کی بدقسمتی کا دور شروع ہو گیا ہے۔ ایک مارشل لا متعدد مارشل لاز کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اپنے اخبار کو ہر قیمت پر زندہ رکھنا ہمارا واحد مقصد ہونا چاہیے، اس لیے خبردار اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ البتہ حق بات کا سلیقے سے اعلان

بھی ہر قیمت پر ضروری ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ ہر ادارے کے سٹاف کے سامنے میری
اس مختصر تقریر کی رپورٹ کر دی گئی اور چند روز بعد مجھے گرفتار کر لیا گیا۔'' ۲۵

قاسمی نے جیل میں گزرے شب و روز کی معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں جب انھیں امروز کی ادارت جاری رکھنے کا حکم دیا گیا تو سبط حسن، مظہر علی خاں اور اپنے ساتھیوں کی عدم موجودگی میں انھوں نے ادارت جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور جب استعفیٰ دے کر میاں افتخار الدین کے پاس پہنچے تو وہ دل کی تکلیف کے باعث صاحبِ فراش تھے۔ قاسمی کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو کر کہنے لگے:

''مظہر تو کھاتا پیتا آدمی ہے اور پہلے کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے نئی انتظامیہ کو قبول
نہیں ہے مگر تم تو استعفیٰ دے کر سڑک پر آ گئے ہو اس لیے میں تمہاری قربانی کی قدر
کرتا ہوں۔'' ۲۶

ظہیر کاشمیری کے خاکے میں قاسمی نے ان کی طویل رفاقت، جیل کی زندگی، مٹی کے فرش پر سونے، بازو سے تکیے کا کام لینے، مچھروں کی فوج سے بچاؤ کے طریقے اور سیاہ رنگ کی دال سے پیٹ بھرنے کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کے نزدیک:

''احمد ندیم قاسمی کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ پاکستان کے ترقی پسند حلقوں کے پُر جوش
نوجوان عام طور پر ان کی وہ پذیرائی نہیں کرتے تھے جو فیض کی شخصیت اور شعر کو میسر تھی،
اس لیے وہ یہ شعوری کوشش کرتے تھے کہ اپنی اسیری کے واقعہ کو نمایاں طور پر پیش کریں۔
اپنے اصول پسند موقف کی خاطر امروز سے مستعفی ہونے کا ذکر کریں اور اپنے جیل کے
ساتھیوں بالخصوص محنت کش تنظیموں کے رہنماؤں کے جذبات سپاس و تحسین کو ریکارڈ پر
لائیں تا کہ چشم حسود کچھ وا ہو سکے۔'' ۲۷

قاسمی نے ان خاکوں میں ادبا و شعرا کا نام صیغہ راز میں رکھا ہے۔ ایک سینئر ادیب (جن کا نام صیغہ راز میں رکھا گیا ہے) کو حکومت کی جانب سے پرائیڈ آف پرفارمنس ملا تو اہلِ قلم مبہوت رہ گئے کہ نا اہل ادیب کو کس خوشی میں اعزاز سے نوازا گیا۔ حسن عابدی اپنی شگفتہ طبعی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:

''انصاف سے کام لیجیے، انھیں ان کی استقامت کا انعام ملا ہے اور استقامت یہ ہے
کہ بُرا ادب تخلیق کرنے میں انھوں نے بلا کی استقامت کا مظاہرہ فرمایا ہے۔'' ۲۸

قاسمی نے واقعہ کے دوران سینئر ادیب کا نام پوشیدہ رکھا۔ یہ وصف بھی ان کی صفت اولیٰ میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں ادبا و شعرا کی خامیوں کا تذکرہ اس ہمدردانہ انداز سے کیا ہے کہ ان سے ہمدردی کا عنصر جاگزیں ہو جاتا ہے۔ انھوں نے نہایت اعتدال و توازن سے قلم بند کیا ہے۔ ان خاکوں کی ظرافت میں زندہ دلی اور ظریف الطبعی کے باعث تشنگی دکھائی نہیں دیتی۔ اسیری کے دوران ریلوے مزدوروں

کے لیڈر، محنت کش عوام کے رہنما، مظلوم افراد کے دوست اور استحصالی نظام کے خلاف آواز بلند کرنے سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ کارل مارکس اور اینگلز کے متعلق لیکچر دے رہے تھے۔ جیل میں سبزیاں بھی لگایا کرتے تھے۔ اسی دوران جیل افسر نے پودے سے لٹکتا ہوا ایک کیڑا لگا بینگن ہاتھ میں لے کر کہا کہ کہاں کارل مارکس کا فلسفہ اور کہاں بینگن کا کیڑا۔ اس بات کا جواب مرزا ابراہیم نے طیش میں دیتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں بزرگ حصار کرنال جاٹ (اُس نوجوان کے علاقے) کے تھے۔ افسر اپنی حمایت پر شرمندہ ہونے کی بجائے بولا:

> ''سبحان اللہ! پنجاب نے بھی کتنی بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ ''میں نے پوچھا'' پنجاب کی اور کون کون سی بڑی شخصیتیں آپ کو پسند ہیں؟ ۔۔۔ بولے: مہاراجہ رنجیت سنگھ اور مرزا غالب۔'' ۲۹

کرشن چندر ادب کے معروف ادیب اور قاسمی کے عزیز دوست تھے۔ ان کے خاکے میں شخصیت و فن کے ساتھ نفسیات، جذبات کی فراوانی، زندگی سے بھرپور انداز سے حظ اُٹھانے، صاف گوئی، انقلاب پسندی اور حقیقت نگاری غرض تمام افکار و خیالات اور عادات و اطوار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کرشن چندر لاہور، پاکستان اور مسلمانوں سے لگاؤ رکھنے کے باوجود اپنے مذہب سے شدید محبت رکھتے تھے۔ ایک روز انھوں نے کرشن چندر اور نندلال سے کہا کہ اگر تمام ہندو آپ دونوں کی طرح ظاہر و باطن سے خوب صورت ہوتے تو دنیا بہت حسین و دل کش ہوتی۔ کرشن چندر کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ نند سے مخاطب ہو کر شرارتی لہجہ میں بولے:

> ''نند لال جی! خبردار ہو جاؤ۔ یہ پیرزادہ تبلیغ اسلام کر رہا ہے۔'' ۳۰

خاکہ نگاری کی روایت کے برعکس، قاسمی نے اگرچہ اپنی توجہ واقعات کی جانب مبذول کی ہے جس سے خاکہ میں افسانہ کا لطف پیدا ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں شکل و صورت، عادات و اطوار اور مزاج کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے۔ کرشن چندر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ٹھوٹا سا قد، صاف ستھرا، سوٹڈ بوٹڈ، محبت ہی محبت، شائستگی ہی شائستگی۔'' ۳۱

قاسمی حلیہ نگاری کو ضمنی طور پر بیان کرتے ہیں مثلاً ''ایک دن جیل خانوں کے آئی۔ جی صاحب دورے پر آئے ۔۔۔ اونچے، لمبے، گورے، چٹے اور ہنس مکھ افسر تھے۔'' ۳۲ قاسمی نے اپنے چند واقعات و مکالمات کے ذریعے انسان کی اندرونی شخصیت کی پرتوں کو کھولنے کے علاوہ اُبھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے عبدالمجید سالک، پروین شاکر، اطہر نفیس، ابن انشا، اختر شیرانی، منصورہ احمد کے کرداروں کو محبوب شخصیات کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ بیان اور اندازِ تحسین ایسا انوکھا اور نرالا ہے کہ دل میں اُتر جاتا ہے۔ انھوں نے سالک کی یک رُخی تصویر پیش کرتے ہوئے انھیں ایسا فرشتہ صفت انسان دکھایا ہے جو تمام کوتاہیوں اور خامیوں سے مبرا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''سالک صاحب مجسمِ عظمت تھے اور مجسم پیار اور اس کے ہزاروں شناساؤں میں سے اگر

کسی کو اس سے شکایت تھی تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس نے سالک کو سمجھا ہی نہیں تھا اور پھر بعض لوگوں کا ذائقہ ہی خراب ہوتا ہے اور ان کا ذہن شہد میں بھی کونین کا مزہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔'' ۳۳

ضمیر جعفری مقبول کالم نویس، مزاح نگار اور شاعر تھے۔ یہ شگفتہ طبع محفل آرا تھے۔ ان کی موجودگی حاضرین محفل کے لبوں پر شگفتہ مسکراہٹیں بکھیرتی رہتی۔ انھیں بہت سے لطیفے یاد تھے اور موقع و محل کی مناسبت سے لطائف تخلیق بھی کرتے تھے۔ حاضر جوابی ان کی شخصیت کی نمایاں خوبی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ بقول قاسمی:

''اوچھے وار کا بھی وہ اس سلیقے سے جواب دیتے تھے کہ وار کرنے والا بھی مشرف بہ ضمیر ہو جاتا تھا۔ شاعروں کی ایک پُر ہجوم محفل میں ضمیر شمع محفل بنے بیٹھے تھے جب حضرت حفیظ جالندھری بولے''ضمیر! یہ تو نے اپنے مجموعہ کلام کا نام ''مافی الضمیر'' کیوں رکھا ہے۔ اس مجموعے کا مناسب نام تو ''بے ضمیر'' تھا''۔ ضمیر فوراً بولے'' قبلہ یہ عنوان بھی میرے ذہن میں آیا تو تھا مگر پھر میں نے سُنا کہ آپ اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھ رہے ہیں چناں چہ میں نے یہ عنوان اس کے لیے رہنے دیا۔'' ۳۴

ضمیر نے شگفتہ دل چسپ خاکے لکھ کر اس صنف کو وسیع کیا۔ وہ ایک ناولٹ بھی لکھ رہے تھے۔ قاسمی اگرچہ اس ناول کا مطالعہ کیے بغیر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں جو مناسب معلوم نہیں ہوئی:

''میں آنکھیں بند کر کے یہ اعلان کرنے کو تیار ہوں کہ یہ ناولٹ بھی ان کی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری اور شعری تراجم کی طرح کامیاب اور دل و دماغ کو گرفت میں لے لینے پر قادر ہو گا۔'' ۳۵

مندرجہ بالا اقتباس جہاں موضوع شخصیت کی فنی عظمت کا اعتراف کرتا ہے وہیں قاری پر منفی اثرات بھی منقسم کرتا ہے اور قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا عمدہ کالم نویس یا مزاحیہ شاعر اچھا نثرنگار بھی ہوسکتا ہے؟ کیا کسی صنف کی عمدگی کا تعین پڑھے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ خامی اس خاکے میں بُری طرح کھٹکتی ہے۔ قاسمی نے شخصی خاکوں میں واقعات کے حسن انتخاب کو خاص اہمیت دیتے ہوئے زیر بحث شخصیت کی اخلاقیات، مذہبی رجحان اور شرافت کے واقعات کو ترجیح دے کر خاکہ میں بیان کیا ہے جس سے زیر بحث شخصیت بھرپور تاثر قائم کرتی ہے۔ سید ضمیر جعفری کی انسانی محبت کے متعلق لکھتے ہیں:

''جنھیں ایک نظر دیکھ کر بھی کچھ اور زندہ رہنے کو جی چاہتا تھا کہ زندگی کا حُسن اور محبت اور گہما گہمی اور شگفتگی اس ایک شخص میں مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔ ضمیر محبتوں کا کروڑپتی بھی تھا اور تخلیقی صلاحیتوں کا جزیرہ بھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جنت الفردوس میں مقیم ہو گا۔'' ۳۶

حکیم محمد سعید پر لکھا گیا خاکہ، خاکے سے زیادہ تقریباتی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں خاکہ نگاری کے لوازمات اور اصول و ضوابط کے مطابق ذات پر روشنی ڈالنے کے برعکس ان کے کارناموں اور شخصیت نگاری مثلاً

علم و حکمت، بلند اخلاق، محب الوطن، مفت علاج، اَن تھک محنت، بچوں سے محبت اور کتابوں کے تذکرے کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاکہ کو خاکہ نگاری کی صنف میں شامل کرتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے۔ قاسمی قاری کی سہولت کے لیے اسے بتاتے ہیں کہ:

"۔۔۔یہ تحریر حکیم محمد سعید صاحب کی موجودگی میں لاہور میں برپا ہونے والی ایک تقریب میں پڑھی گئی۔" ۳۷

قاسمی ایک اعلیٰ پائے کے ادیب و شاعر تھے۔ اس کتاب کی محرک و مرتبہ منصورہ احمد کی پہچان بھی ادبی حلقوں میں نوجوان شاعرہ کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس مضمون کو سوانحی خاکوں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ حکیم محمد سعید کی سادہ زندگی کی جھلک دکھانے کے بعد ان کے کارناموں کا اعتراف خوب صورت الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے انھیں "سپر ہیومن" صفات سے نواز رکھا ہے اور انھوں نے ہماری ۴۷ برس کی سیاہ اندھیری تاریخ میں خدمتِ خلق کا ایک ایسا آفتاب روشن کر رکھا ہے جو غروب ہونا جانتا ہی نہیں۔" ۳۸

پیش نظر خاکے میں کئی امور شخصیت کی عاجزی و انکسار کا اظہار کرتے ہیں لیکن قاری ان کی زندگی کے بیشتر گوشوں کو دیکھنے سے محروم رہتا ہے۔ اس خاکے کے متعلق ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"حکیم محمد سعید کا یہ خاکہ سب سے کمزور ہے کہ یہ شاید ان کے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں پڑھا گیا اور حکیم صاحب کی خود پسندی کی تسکین کے لیے ایک رسمی تحریر ہے۔" ۳۹

انسانی بشر خیر و شر کا مجموعہ ہے پھر شخصیت کے دونوں رُخ سے واقفیت حاصل کرنے کے باوجود ایک کا اظہار اور دوسرے کا اخفا ادبی بددیانتی ہے۔ قاسمی نے شخصیت کے جس رُخ کو دیکھا اُسے نہایت کامیابی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرا۔ چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک کی چپقلش اور علمی و قلمی جنگ کا سلسلہ بھی تواتر سے قائم رہتا ہے، جب ان دونوں کو محوِ گفتگو دیکھا تو درج ذیل الفاظ میں اظہارِ رائے کیا:

"۔۔۔میں ان کی باتیں سُن کر حیران ہوتا رہتا کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہ جب اپنے کالموں میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے انھیں ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہ ہوگا مگر یہاں پکے دوستوں بلکہ سگے بھائیوں کی طرح نجی معاملات میں ایک دوسرے سے مشورے لے رہے ہیں۔" ۴۰

حقیقت نگاری کے وصف کے ساتھ ساتھ خاکوں میں رمز و ایما کی خاصیت بھی نمایاں ہے۔ وہ حقیقت سے پردہ تو اُٹھاتے ہیں مگر اس طرح کہ شخصیت کے لیے ہمدردانہ نقطہ نظر رکھتے ہوئے اس کی کمزوریوں کے بیان

سے رمزیہ انداز سے کام لیتے ہیں۔ ان کا مقصد اپنی شخصیت کی روح کو پیش کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں شخصیت ساکت و جامد نظر آنے کی بجائے متحرک دکھائی دیتی ہے۔ قاسمی کے طویل خاکوں میں ''فیض احمد فیض'' کا خاکہ بھی شامل ہے۔ یہ خاکہ نہ تو اندھی تقلید کے زیرِ اثر لکھا گیا نہ ہی ظاہری شخصیت کے بیان پر منحصر ہے۔ اس خاکے میں فیض سے مخلصانہ جذبات دکھائی نہیں دیتے بلکہ موضوع شخصیت کی اصل تصویر پیش کی ہے جو نظروں سے اوجھل تھی۔ اس میں تمام امور کو ادبی رکھ رکھاؤ سے پیش کیا گیا ہے مثلاً ''فیض صاحب بورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کی صحبت میں خوش رہتے تھے۔''[۴۱] زیرِ نظر خاکے میں ترش باتوں کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ مثلاً اس خاکے میں چین کی تہذیب کو بے باکی سے بیان کیا ہے۔ اس میں فیض کی شخصیت کے مختلف روپ دکھائی دیتے ہیں مثلاً اگر وہ ہنستے تو ہنستے ہی جاتے اگر پینے پر آتے تو بیک وقت کئی کئی گلاس ختم کر لیتے۔ فیض شراب پینے میں منہمک ہوتے جب کہ قاسمی جزیروں پر درختوں کی قطاریں دیکھنے میں مشغول ہوتے۔ ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن فیض احمد فیض کے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ ترقی پسند تحریک کے شعرا میں اگر کسی ایک شاعر میں بھی زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے تو وہ فیض احمد فیض ہے جب کہ خاکہ نویس اس حقیقت سے پردہ یوں اُٹھاتے ہیں:

> ''فیض صاحب کی ترقی پسندی تو کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر تھی مگر ترقی پسندوں کی سرگرمیوں میں وہ بھرپور دل چسپی کم ہی لیتے تھے جس کی اُن سے توقع کی جاتی تھی۔'' ۴۲

فیض کی ساحرانہ شخصیت نے بیشتر افراد کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس لیے لوگ مدلل مداحی میں پناہ لیتے جب کہ قاسمی نے:

> ''اس طلسم کو بڑی جرات سے توڑا اور فیض کی مکمل شخصیت سے ہمارا تعارف کرایا۔
> ہمارے اردگرد ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو فیض سے اندھی عقیدت کا دم بھرتے ہیں۔
> جناب قاسمی۔۔۔ دوسروں کی طرح انھیں پیر و مرشد یا ولی سمجھنے کی بجائے انسان ہی سمجھتے تھے۔'' ۴۳

قاسمی کے شامل تمام خاکوں میں ہمدردانہ بیان ملتا ہے جب کہ فیض کا خاکہ گلے، شکوؤں اور بدگمانیوں پر مبنی ہے جو ان کی شخصیت کے منفی روپ کو سامنے لاتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس خاکے کو ہنگامہ خیز قرار دیتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ قاسمی صاحب نے اپنے عہد کی بڑی ثقافتی اور ادبی شخصیتوں پر لکھا اور اپنی وضع داری کو قائم رکھا اور سوائے فیض احمد فیض کے، جنھیں وہ بوجوہ اپنا حریف خیال کرتے تھے۔ انھوں نے تمام شخصیتوں کے بارے میں محبت یا احترام کے جذبات کو حاوی رکھا۔'' ۴۴

ڈاکٹر ناہید قاسمی، فیض احمد فیض کے اس خاکے کی اشاعت اور قارئین کے ردِعمل پر یوں اظہارِ خیال

کرتی ہیں:

> ''اس کے سرورق پر ایک بریکنگ نیوز کے انداز میں اس کا تعارف کچھ یوں کروایا گیا جیسے کوئی نہایت ہنگامہ خیز معرکہ آرا انکشافی تحریر ہے۔ سو قارئین نے اسی تعارف کے زیر اثر صرف ہنگامے کی گنجائش والے جملوں ہی کو چن لیا اور باقی سب وہ پیار، وہ سچائی، وہ دوستی، وہ چھوٹے چھوٹے گلے شکوے، وہ ننھی منی انسانی خوبیاں خامیاں، وہ مخلصانہ خواہشیں، وہ تعلق کی معصومیت سب کچھ کو پیچھے دھکیل دیا گیا اور بغیر سوچے سمجھے حد یہ کہ خود سے یہ خاکہ مکمل پڑھے بغیر ہی خوب گرد اُڑائی گئی۔'' ۴۵

قاسمی نے پیش نظر خاکے میں صداقت سے کام لیتے ہوئے صاف گوئی کا وتیرہ اپنایا ہے لیکن اس پر نام نہاد ادیبوں، شعرا اور دیگر معاصرین نے انگلیاں اُٹھائیں۔ اس خاکے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں شخصیت کے دونوں رُخ دکھائے ہیں کہ یہ خاکہ ایک زندہ شخص کا خاکہ ہے جو خیر وشر کا مجموعہ ہے لیکن فیض کی شخصیت کے متعلق اس قسم کے واقعات کھٹکتے ہیں کیوں کہ عوام کی کثیر تعداد اُن سے عقیدت ومحبت رکھتی ہے۔ اس لیے ان واقعات کو قارئین کا ذہن آسانی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

سعادت حسن منٹو کا خاکہ قاسمی کے رشحاتِ قلم کا کرشمہ ہے۔ اس میں منٹو کی زندگی، باغیانہ شخصیت، بے باکی، شرارتی ذہن، تلخ لہجہ اور اس نوع کے متعدد واقعات کو مختلف وسیلوں سے بیان کیا ہے اور واقعات کو اس ہنرمندی سے ترتیب دیا ہے کہ منٹو کا کردار اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ منٹو مزاجاً بذلہ سنج، شرارتی ذہن کے مالک تھے بالخصوص دوستوں کی محفل میں ان کی حسِ مزاح بیدار ہو جاتی۔ وہ اوپندر ناتھ اشک کو پنجابی لہجے میں ''اشکے'' مخاطب کرتے۔ قاسمی لکھتے ہیں:

> ''ن م راشد کا جب بھی ادھر سے گزر ہوتا تھا منٹو اسے پکڑ لیتا تھا کہ آؤ! میرے ساتھ مغربی رقص کے دو چار Steps ناچ کر دکھاؤ۔ اور جب راشد معذرت چاہتا تھا تو منٹو کہتا تھا کہ میاں نذر محمد! جب تمہیں مغربی رقص کی ابجد ہی کا علم نہیں تو تم اپنی شاعری میں کس ہم رقص سے مخاطب ہوتے ہو۔'' ۴۶

منٹو کا راشد پر طنز ان کی معروف نظم ''رقص'' کی بنا پر تھا۔ اس خاکے میں قاسمی کے بیان کی صداقت قاری کو چونکا دیتی ہے۔ مثلاً منٹو کی خامیوں میں ایک شراب کا رسیا ہونا اور دوسری انانیت تھی۔ قاسمی اس خامی کو بھی ہمدردانہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں:

> ''۔۔۔دوسری خامی۔۔۔ اگر اسے خامی کہا جا سکتا ہے۔۔۔ یہ تھی کہ اس کی انا کی دھار بہت تیز تھی مگر یہ انانیت اس پر بجتی تھی کیوں کہ وہ ایک بڑا تخلیق کار تھا۔'' ۴۷

منٹو کے خاکے میں خاکہ نویس نے مدحیہ انداز اپنایا ہے۔ ان کے نزدیک بڑے قلم کار میں انانیت کا ہونا ضروری

ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ انا بڑے تخلیق کار میں موجود ہو یا عام آدمی میں؛ سرشتِ انسانی کو زیب نہیں دیتی۔ مسلسل شراب نوشی کی بنا پر منٹو کا جگر بگڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے شراب نوشی سے منع کیا مگر منٹو اندھا دھند شراب پینے کے عادی تھے۔ وہ ہمیشہ تازہ دم ہونے کے لیے وہسکی پیتے۔ یہ ان کے خون میں بُری طرح سرایت کر چکی تھی۔ قاسمی، منٹو جیسے عزیز دوست کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ قاسمی نے صفیہ منٹو کے ایما پر اور اپنی دوستی اور محبت سے مجبور ہو کر، جب منٹو کو شراب پینے سے منع کیا تو منٹو درشتی سے بولے:

''دیکھو احمد ندیم قاسمی، میں نے تمھیں دوست بنایا ہے۔ اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔ مجھے وعظ نہ دیا کرو، سمجھے!'' ۴۸؎

مندرجہ بالا اقتباس سے چار باتیں عیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو قاسمی کی بے بسی، قوتِ برداشت اور پُرخلوص احساس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس ایمان داری سے حقیقت و صداقت کا دامن تھامے رکھا۔ دوسرا منٹو کی شراب سے رغبت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی پر شراب کو ترجیح دی۔ تیسرا، قاسمی کو ہمیشہ پورے نام احمد ندیم قاسمی سے پکارتے۔ چوتھا، دوستی کے کئی برس کامیابی سے طے کرنے کے باوجود منٹو نے اپنی ذات کے کسی پہلو پر قریبی دوست کو بھی بات کرنے کی اجازت نہ دی۔ قاسمی کے خاکوں میں موضوع بننے والے افراد فرشتے نہیں بلکہ بشری تقاضوں سے متصف ہیں۔ وہ نہ تو سراپا برائی کے پیکر ہیں، نہ سراپا اچھائی کے۔ ماہر خاکہ نویس نے نہایت فن کاری سے مثبت و متضاد دونوں رجحانات کی عملی تصاویر پیش کر دی ہیں۔ قدرت اللہ شہزاد نے اس خاکے کو قابلِ ستائش گردانا ہے۔ لکھتے ہیں:

''قاسمی صاحب کی شخصی تحریروں میں ''سعادت حسن منٹو'' سب سے اچھا خاکہ ہے۔۔۔ اس خاکے میں منٹو کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ کمزوریوں کے بیان میں اعانت ہرگز نہیں، محبت و ہمدردی کا عنصر شامل ہے جو خاکے کی مبادیات میں سے ہے۔'' ۴۹؎

قاسمی نے موضوع خاکہ کی علمی عظمتوں کی بجائے شخصی محاسن پر زور دیا ہے۔ خاکہ نویس نے اپنے جان دار فن کی بدولت غیر ادبی شخصیات مثلاً دادا امیر حیدر، مرزا محمد ابراہیم، شیخ خورشید احمد اور اقبال شیدائی کو ہزارہا ادیبوں اور ادب شناسوں کی دل چسپیوں کا مرکز بنایا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کے جیالے انقلابی رہنماؤں میں مرزا محمد ابراہیم اور دادا امیر حیدر کے خاکے لکھے۔ یہ معاشی، اقتصادی و ملکی آزادی کے خواہاں تھے۔ دادا امیر حیدر ملکی آزادی کی خاطر چودہ برس قید رہے۔ وہ ایسے انقلابی نوجوان تھے کہ انھوں نے اپنی ہمت اور زندگی کی تمام آسائشوں کو تج دیا تھا۔ ''پنجاب کے انقلابی رہنما'' میں اسلم رحیل مرزا ان کی سیاسی و نظریاتی اوصاف پر روشنی ڈالتے ہیں:

''اپنے سیاسی و انقلابی نظریات سے قطع نظر ذاتی طور پر بھی دادا امیر حیدر انسانیت کے لیے دردِ دل رکھنے والے ایک محب وطن شہری اور غیرت مند اور خوددار انسان تھے

جب کہ سیاسی و نظریاتی طور پر وہ ایک مضبوط قوت ارادی(Will Power) کے مالک، بیک وقت مزدور کارکن اور سیاسی راہنما تھے۔'' ۵۰

دادا امیر حیدر کے خاکہ میں؛ قاسمی ان کی سادہ مزاجی، سلاست روی، اپنے مقصد سے لگاؤ، سچی لگن، انسان دوستی، امن پسندی، وسیع النظری، عدل و انصاف، محبت، خلوص اور وضع داری غرض فرد کی سیرتوں کے نمایاں اوصاف کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مصنف اپنے موقلم سے شخصیتوں کی ایسی پرتاثیر اور دل کش تصویر بناتے ہیں کہ شخصیت چلتی پھرتی سامنے آتی ہے بلکہ شخصیت کا ظاہر و باطن اور محاسن اخلاق سامنے آ جاتا ہے مثلاً قاسمی (۲۰۔نومبر اپنے یومِ پیدائش کے دن) جیل میں اُداس بیٹھے تھے۔ دادا امیر حیدر کو اس اُداسی کی وجہ کا علم ہوا تو وہ قاسمی کو: ''بازو سے پکڑ کر ایک اور بارک میں لے گئے وہاں ایک میز پر کھانے کی وہ سب چیزیں پڑی تھیں جو انھوں نے تمام نظربندوں سے فرداً فرداً حاصل کی تھیں۔بسکٹ اور چاکلیٹ اور ریوڑیاں اور پشاوری گڑ اور ساتھ ہی چائے رکھی تھی۔ کیک نہیں تھا چناں چہ مجھ سے ایک بسکٹ تڑوایا گیا اور پھر سالگرہ مبارک کا کورس گایا گیا تب دادا امیر حیدر اُٹھے۔'' ۵۱

پیش نظر خاکے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خاکہ نگار یادِ ماضی کو نہ صرف آواز دیتے ہیں بلکہ ان خوب صورت یادوں کی آغوش میں پناہ بھی لیتے ہیں۔ قاسمی نے تقریباً ہر خاکہ میں خاکہ نگاری کے اہم وصف ''ہمدردی'' کو بدرجہ اتم اپنے انداز میں سمویا ہے۔ ہمدردانہ لہجہ اور پرتاثیر بیان ان کا فطری انداز تھا۔ جس کی بنا پر ان کی شخصیت ذاتی حالات اور ذہنی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قاسمی کو قدرت سے انقلابی، سیاسی، ادبی شخصیات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان بزرگوں کی صحبت سے نہ صرف فیض یاب ہوئے بلکہ ان شخصیات نے جو نقوش دل و دماغ پر ثبت کیے انھیں بآسانی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان انقلابی و سیاسی شخصیات کے دور کی تصویر آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتی ہے۔ قاسمی کو جن شخصیات سے عقیدت و محبت تھی، ان شخصیات کے گہرے رنگ اور تیکھے نقوش اور ادبی قد و قامت حقیقی تصور سے کہیں زیادہ خوب صورت دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی عقیدت و محبت کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ ہم ان کی مسرتوں اور تکلیفوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کے درد سے اپنے دل میں ایک ٹیس اُٹھتی محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں تو قاسمی کے ساتھ ساتھ قاری کا گلا بھی رُندھ جاتا ہے مثلاً اطہر نفیس کی بے وقت موت کا انھیں بہت رنج تھا۔ لکھتے ہیں:

''اگر اطہر کو اس بات کا کماحقہ اندازہ ہوتا کہ وہ مر کر دوسرے سینکڑوں عزیزوں اور دوستوں کے علاوہ مجھے بھی اُجاڑ جائے گا تو مجھے یقین ہے کہ کم از کم میری موت سے پہلے وہ کبھی نہ مرتا۔'' ۵۲

معروف مزاح نویس ابن انشا ان کے فیضانِ خاص میں تھے۔ ان کی بے وقت وفات نے انھیں بہت متاثر کیا اور

اس ملال میں کافی عرصہ تک اپنے حصار میں رکھا۔ ان کی موت کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''کاش! ابن انشا کے سے عزیز وجود کو اس دنیا سے اُٹھا لے جانے والی اور ہمارے معاشرے اور ہماری تہذیب کو غریب تر کر دینے والی موت کے خلاف عدالتِ الٰہی میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا۔'' ۵۳

قاسمی ایک حساس اور محبت کرنے والے انسان تھے جو اوروں کی تکلیف سے بے قرار ہو جاتے۔ دوسروں کی محرومیوں اور دُکھوں کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے۔ انھیں اوروں کا غم اپنی ذات کا غم محسوس ہوتا۔ اسی غم کی کسک ان خاکوں میں ملتی ہے۔ انارکلی کے خالق امتیاز علی تاج کی موت پر اپنے احساسات کو الفاظ کے پیکر میں اس طرح ڈھالتے ہیں:

> ''کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے شگفتگی کی انتہا پر پہنچے ہوئے ایک پھول کو مسل ڈالا گیا۔'' ۵۴

یہ خاکے عزیز دوست احباب کی موت پر لکھے۔ ان کے ذہن میں جو واقعات و حادثات کے نقوش مرتسم تھے انھیں سپردِ قلم کیا۔ ان خاکوں میں محبت کا قلزم ٹھاٹھیں مار رہا ہے کہ ضبط بھی اس پر کوئی بند نہیں باندھ سکا، ان خاکوں میں شامل شخصیات کی دُکھ بھری زندگی، ان کا شخصی حسن و جمال، خودنگری، باطنی خوب صورتی، مزاج، میلان طبع، پسند و ناپسند، غرض ہر شے اس آئینہ خانہ میں جھلکتی نظر آتی ہے مثلاً ڈاکٹر اقبال شیدائی نے اٹلی میں قیام کے دوران ایک اطالوی نوجوان کا ادنیٰ سا کام کیا جس سے ترقی کی راہیں کھل گئیں اور وہ کروڑ پتی بن گیا۔ اس نوجوان نے کئی سو ڈالر کا چیک اس وقت بھجوایا جب وہ شدید بیماری میں مبتلا تھے اور ان کے عزیزوں نے بھی انھیں تنہا مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ جب اقبال شیدائی نے شکریے کے ساتھ معذرت کی تو نوجوان نے جواباً ایک اور چیک بھجوا دیا اور اٹلی مدعو کیا تا کہ مبتلا بیماریوں کا تسلی بخش علاج کروایا جا سکے۔ بقول ڈاکٹر اقبال شیدائی:

> ''بعض اوقات خلوص کتنا بے بس کر دیتا ہے اور میں حیران ہوتا ہوں کہ مغرب کے انفرادیت پسند معاشرے کے اس فرد کو عین اس وقت میری یاد کیوں آئی ہے جب ان حالات میں دوسرے لوگ اپنے سگے بھائی بہنوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔'' ۵۵

قاسمی کے خاکے مختصر سوانح کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اس میں عظمتوں کے تذکرے بھی ہیں اور موضوع شخصیت کی شرافت، نیکی، پاس داری، وضع داری، خدمت خلق اور ایثار کے اوصاف بھی نمایاں ہیں۔ انھوں نے ان شخصیتوں کے احوال اور ان کی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں۔ بعض اشخاص کے بیان پر صرف تین صفحات لکھے ہیں مثلاً ظہیر کاشمیری، میر خلیل الرحمٰن وغیرہ وغیرہ اور بعض شخصیات پر کئی صفحات لکھ کر ان کے نقوشِ زندگی کو ان خاکوں میں جگہ دی ہے۔ مثلاً پروین شاکر سے خصوصی لگاؤ کا، بیٹیوں کی طرح محبت کا اظہار اس خاکے سے ہوتا

ہے۔ اپنے شعری مجموعہ ''دوام'' کا منظوم انتساب پر اپنے اہلِ خانہ کے علاوہ پروین اور منصورہ کے نام بھی کرتے ہیں جس کا آخری بند ہے:

میری دو اور بیٹیاں ہیں جنھیں　　منتخب میرے قلب و جاں نے کیا
میری اولاد کی طرح میری　　ایک پروین، ایک منصورہ
غم کی حدت میں ان کا طرزِ تپاک　　سرد جھونکوں، گھنی گھٹاؤں سا ہے
زندگی کی تمازتوں میں ندیم　　پیار ان بیٹیوں کا، چھاؤں سا ہے
روحِ انسانیت کی تجسیمیں
رحمتِ ایزدی کی تصویریں ۵۶؎

اس منظوم انتساب میں پروین و منصورہ کے پیار و محبت کو گھنی چھاؤں سے تشبیہ دے کر اپنی زندگی میں ان کی قدر و قیمت کو ابھارا ہے۔ پروین شاکر کو بھی اپنے عمو (احمد ندیم قاسمی) سے مثالی محبت تھی۔ اپنے اولین شعری مجموعے کا انتساب قاسمی کے نام اس طرح معنون کیا:

اپنے
عمو کے نام
جو
باقی دنیا کے لیے
احمد ندیم قاسمی
ہیں　　۵۷؎

پروین کا یہی عقیدت و احترام آخر تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی شادی کے کارڈ پر صرف قاسمی کا نام لکھوانے کی فرمائش کی اور قاسمی نے ہمیشہ انھیں پُرسکون اور خوش و خرم زندگی کی دعائیں دے کر رخصت کیا۔ لیکن یہ دعائیں بارگاہ ایزدی میں قبول نہ ہوسکیں۔ اس خاکے میں ان کا جذباتی والہانہ پن اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے بلکہ اکثر مقامات پر ان کا یہ مخلصانہ انداز نہ صرف قاری کو ورطہ حیرت میں ڈالتا ہے بلکہ ان کی موت قاری کی آنکھوں کو بھی نم کرتی ہے۔ پندرہ صفحات پر مشتمل پروین کا یہ خاکہ ان کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی اور دلی کیفیات کے اظہار نیز شخصیت کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ وہیں ان کی زندگی کی تلخیوں، اندرونی گھٹن، زندگی کے درد و کرب اور محرومیوں سے نبرد آزما ہونے کی فن کارانہ کوشش کا اظہار بھی کرتا ہے۔ پروین کو زندگی کی ناخوش گواری کے باعث انھیں کسی کام سے دلچسپی نہ رہی تھی جب ۱۹۹۴ء میں مجلس ترقی ادب کے دفتر آمد پر پروین نے یونی ورسٹی کی چند طالبات سے بے نیازی کا رویہ برتا تو قاسمی کو یہ بات ناگوار گزری۔ انھوں نے بذریعہ خط اس بدسلوکی کی مذمت

کی۔ پروین فوراً لاہور آئی اور کہا:

> ''آپ نے مجھ پر جائز تنقید کی ہے مجھے اپنی روش کو بدلنا ہوگا مگر عمو میں تھک سی گئی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر کے معمول میں مبتلا کر لیا ہے۔ میں کسی تقریب میں شامل نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہوں تو بالکل مجبور ہو کر شامل ہوتی ہوں۔۔۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔'' ۵۸

کمزوریوں کا براہِ راست اظہار شخصیت اور اس کے مداحوں کی دل آزاری کا محرک بن سکتا ہے۔ اس لیے ایسی فن کاری سے ان لغزشوں کی نشاندہی کی ہے کہ شخصیت کی دل آویزی اور دل پذیری میں بھی فرق نہیں آتا اور شخصیت کی فطرت بھی آشکار ہو جاتی ہے مثلاً اقبال شیدائی نے برطانوی استعمار اور ہر استعمار کے خلاف نصف صدی تک جنگ لڑی۔ عنفوانِ شباب میں جلاوطن ہو کر حصولِ آزادی کے لیے قربانیاں دیتے رہے جب بوڑھے ہوئے تو پاکستان کا خواب حقیقت میں بدلا۔ عمر بھر ان کا یہی وتیرہ رہا:

> ''انھیں جب بھی علم ہوا کہ فلاں مقام پر ان کی موجودگی سے استعمار دشمن تحریک کو قوت حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر وہاں پہنچے اور یوں انھوں نے افغانستان، روس، اٹلی، فرانس، جرمنی، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ، مصر، لیبیا اور سعودی عرب وغیرہ کی بار بار خاک چھانی۔'' ۵۹

قاسمی کا وصف خاص ہے کہ وہ شخصیت کے اندر مخفی کردار کے انوکھے گوشوں کی جانب قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ زیر بحث خاکے سے موضوع شخصیت کا واضح عکس مرتب ہوتا ہے۔ خاکہ نگار جہاں ماہر فن کار کی طرح ان حالات و تاثرات سے شخصیت کی بنیادی خوبیوں کی تلاش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدوخال کی تصویریں متحرک ہو کر نظر آتی ہے اور قاری ان کے گھر کے اندر تک جھانک سکتا ہے اور خاکہ نگار شخصیت کے مخفی کردار کے انوکھے گوشوں کی طرف قارئین کی توجہ منعطف کراتے ہیں۔ انھوں نے ظہور نظر کے گھر میں سیندھ لگائی، ان کے ذہن کے دریچوں میں جھانکا، سینے کو ٹٹولا ہے کیوں کہ کسی شخص کی زندگی کا ایک واقعہ اس کی شخصیت اور زندگی کے کئی پرت کھول کر رکھ دیتا ہے۔ ان کے خاکوں میں داخلی و خارجی زندگی کے عناصر بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ ظہور نظر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ظہور نظر اپنے گھروندے میں بیٹھا مرغیوں کے انڈے جمع کرتا تھا اور ہر انڈے پر اسے جو ایک پیسہ منافع حاصل ہوتا تھا۔ اسی سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ یا وہ نظمیں اور غزلیں لکھتا تھا جن سے اسے اپنے ضمیر کے سکون کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔'' ۶۰

ظہور نظر سکونِ قلب کی دولت سے مالا مال تھے۔ وہ خودغرض یا مطلب پرست نہ تھے بلکہ بے لوث محبت کرنے والے

انسان تھے جو بغیر ستائش و صلہ کے اپنے فن میں مگن رہتے تھے جن کا منشا فلاح انسانیت تھا۔ قاسمی، ظہور نظر کو خراجِ تحسین اس انداز سے پیش کرتے ہیں:

> ''میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ظہور نظر اس دور کے شعرا میں وہ واحد درویش تھا، جو اپنے سینے میں لعل و جواہر کی مٹھیاں بھر بھر کر سرِ راہ اس توقع سے بکھیرے اور لٹائے چلا گیا کہ وہ جو اس کے پیچھے آ رہے تھے، ان لعل و جواہر سے انسان اور انسانیت کا مستقبل آراستہ کریں گے۔'' ۶۱

قاسمی نے حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے اشخاص، زندگی کے اجتماعی رشتوں، رسوم و رواج، خاندانوں اور تہذیبی عوامل کی تصویریں دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس میں تکرار کا عنصر بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ قبلہ میاں عبدالحمید کی زندگی کے حالات و واقعات قلم بند کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''یوں سمجھیے کہ حضرت قبلہ میاں عبدالحمید صاحب محبت، شفقت اور شائستگی کا ایک پیکر تھے۔ آپ مجسم حسن و خیر تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے ہمہ جہت، خوب صورت انسان بہت ہی کم دیکھے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک مینارہ نور کی تھی جو چار طرف روشنی ہی روشنی پھیلاتا ہے۔'' ۶۲

قاسمی اپنے ہم عصروں کی تعریف کرنے اور تعصب سے گریز کی حکمت عملی پر عمل پیرا تھے۔ کرشن چندر نے اردو افسانے میں قابلِ قدر شہ پارے تخلیق کیے۔ یہ قاسمی کے عزیز دوست تھے جن کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار بھی کیا ہے اور اردو ادب میں ان کی علمی کاوشوں کو بھی سراہا ہے۔ کرشن چندر سے متعلق غیر جانب داری کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''وہ اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اردو زبان زندہ ہے اور وہ زبانیں زندہ ہیں جن میں کرشن کے افسانے اور ناول منتقل ہو چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کرشن ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' ۶۳

قاسمی کی نگاہ صرف مسند ادب کے اعلیٰ مقام پر فائز شخصیات کو احاطہ تحریر میں نہیں لاتیں بلکہ انسان کی پوشیدہ عظمتوں کو بھی منظرِ عام پر لاتی ہے۔ انھوں نے صرف جواہر ریزوں پر ہی نگاہ مرکوز نہیں کی بلکہ انھوں نے ایسے افراد کو بھی اپنے خاکوں میں جگہ دی ہے جو اعلیٰ قلم کار ہونے کے باوجود اپنے معاصرین کے مقابلے میں بلند مقام حاصل نہ کر سکے لیکن باوجود اس کے ان کی نگاہ بلندی کی متلاشی رہی مثلاً مختار صدیقی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم و جدید رنگ کو سلیقے سے آمیخت کر کے اپنا جدید طرزِ اظہار پیدا کیا۔ آزاد نظم کی ہئیت میں بھی تبدیلی کی۔ مختار صدیقی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مختار صدیقی اردو کے وہ واحد شاعر ہیں جن میں ولیؔ، سراجؔ، شاہؔ حاتم، نظیرؔ، میرؔ، سوداؔ،

مصحفی، انشا، انیس، غالب، مومن، داغ، فانی، میراجی، غرض اردو کے بیشتر اہم اور
صاحب طرز شعرا کا لہجہ کہیں نہ کہیں سُنائی دے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا بائی
اور کبیر کا لہجہ بھی ہے۔ بلھے اور باہو کا لہجہ بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختار نے اردو،
ہندی اور پنجابی (اور ساتھ ہی فارسی، عربی اور انگریزی) کی شاعری کے اساتذہ کو
گھول کر پی لیا ہے، اتنے وسیع اور گہرے اور گھمبیر علمی اور ذوقی پس منظر کا ثبوت گزشتہ
تیس پینتیس برس میں شاید ہی کسی اور شاعر نے دیا ہو۔'' ۶۴

چراغ حسن حسرت نہ صرف بڑے غزل گو تھے بلکہ کلاسیکی و جدید غزلوں سے انھیں جذباتی لگاؤ تھا۔ غزل سنتے ہی ان پر سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ بعض اوقات غزل سے اتنی وابستگی دوسروں کے لیے دل شکنی کا باعث بنتی۔ ن م راشد کے متعلق کہتے ہیں:

''ن۔م۔راشد سے کہہ دو۔ ایک وقت آئے گا جب غزل کہنے کو اس کا بھی جی چاہے گا
مگر کہہ نہیں سکے گا۔ آگے آگے قافیے بھاگے جا رہے ہوں گے اور ان کے پیچھے راشد
دوڑا جا رہا ہو گا۔'' ۶۵

پیش نظر خاکہ میں موضوع شخصیت کی لطافت طبع، بڑا پن اور غزل سے وابستگی کو بیان کیا گیا ہے۔ چراغ حسن حسرت سراپا شگفتگی تھے۔ چہرے مہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا مگر جب بولتے تو طنز و مزاح کے ترازو میں معیار قائم کر دیتے۔ قاسمی کے اکلوتے عزیز بھانجے ظہیر بابر کی شادی خدیجہ مستور سے ہوئی۔ نکاح کے بعد سب نے ظہیر کو مبارک باد دی لیکن حسرت کا اندازِ مبارک باد ملاحظہ ہو:

''مبارک ہو ظہیر! اب تو اردو ماشاء اللہ تمہاری مادری زبان ہو گئی۔'' ۶۶

حسرت شگفتہ مزاج انسان تھے۔ دوستوں کی نجی محفلوں میں پُرلطف باتیں کرتے۔ قاسمی نے سینکڑوں منتشر یادوں اور واقعات سے حسرت کی بوقلموں شخصیت اور خوش طبعی کے چند واقعات بیان کیے ہیں جس کے بیان سے ان کی نثر شگفتگی کے ساتھ طنز و مزاح کی پھلجھڑیوں سے بھی آراستہ ہو جاتی ہے۔ حسرت نے کافی ہاؤس میں قاسمی کے ہمراہ کافی کا آرڈر دیا۔ جب خاصی دیر تک کافی نہ آئی تو انھوں نے کافی ہاؤس کے منیجر سے شکایت کی۔ منیجر نے پوچھا:

''کیا آپ نے اس ویٹر کو آرڈر دیا تھا جس کی داڑھی سفید ہے؟ مولانا بولے: جب ہم نے
آرڈر دیا تھا تو اس کی داڑھی سیاہ تھی۔ اب سفید ہو چکی ہو تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' ۶۷

حسرت محفل کو کشت زعفران بنا دیتے۔ ان خاکوں میں بیشتر واقعات کی تکرار کا ذکر بھی ملتا ہے مثلاً حسرت اور راشد دونوں کے خاکوں میں بیک وقت ایک ہی واقعے کو دُہرا کر تکرار کا عنصر پیدا کیا ہے۔ ان خاکوں میں شخصیت ظرافت کے قہقہوں تلے دب کر نہیں رہ گئی۔ قاسمی نے نہایت ایمان داری سے خود پر کیے گئے طنز کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ منٹو صفائی پسند اور نفیس انسان تھے۔ ایک روز قاسمی کے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سفیدی دیکھ کر اسے خوب بُرا بھلا کہا۔

پھر قاسمی کو اپنے گھر لے آئے اور ڈرائینگ روم میں خود کردہ سفیدی دکھائی اور صفیہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

''میں ندیم کے ہاں ایسی سفیدی دیکھ کر آ رہا ہوں جیسے کسان نے کھیت میں ہل چلایا ہو۔'' ۶۸

قاسمی نے اپنی ذات پر کیے گئے طنز کو بھی ایمان داری سے بتایا ہے مثلاً منٹو نے قاسمی کے فن میں موجود دیہاتی عناصر اور کسانوں کی مفلوک الحالی کے حوالے سے طنز کیا ہے۔ اس طرح خود پر بھی طنز کرتے ہیں مثلاً معاشی بدحالی کے دوران لنڈے بازار سے خریدے ہوئے کوٹ پہن کر بیرون ملک جاتے اور ترقی پسند مصنفین کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ ان امور کا برملا اظہار خاکوں میں ملتا ہے۔

قاسمی ادب برائے زندگی کے نباض، پاکستانی تہذیب اور مشرقی مساوات کی پاس داری کے خواہاں تھے۔ حسن عسکری (ادب برائے ادب کے قائل) اور منٹو (ادب برائے زندگی کے عکاس) کی ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں تو قاسمی کو اندیشہ ہوا کہ کہیں منٹو اپنے موقف سے بدل نہ جائے چناں چہ انھوں نے منٹو سے اس خدشے کا اظہار بذریعہ خط کیا۔ جس میں منٹو کے پُرخلوص مزاج کا معترف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی صاف دلی، مدح اور فنی عظمت کو بڑے سلیقے سے بیان کیا۔ لکھتے ہیں:

''آپ کے ہاتھ میں ایک آتشیں قلم اور آپ کے ذہن میں ایک شدید جذبہ ہے۔ اس جذبے اور اس قلم کا خوش گوار تعاون آپ کو جبھی میسر آ سکتا ہے جب آپ زندگی کے عکاس اور نباض رہیں (جیسا کہ آپ اب تک ہیں)۔ آپ کی ذات سے پاکستان کو ان گنت توقعات ہیں۔ اس تعمیری دور میں ادب برائے ادب کی افیون سے بچیے۔'' ۶۹

اگر چہ خاکے میں خط کو شامل کرنا عبارت کی طوالت کا باعث بنا ہے۔ اس پر اعتراضات بھی ہوئے لیکن انھوں نے اپنے معاصرین کی شخصیت کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کے اکثر پہلوؤں کو بھی بے نقاب کیا ہے مثلاً انھوں نے بعض جگہ اپنی خامیوں اور جلد بازیوں کو بھی آشکار کیا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن کے سٹاف کے اجلاس میں ن۔م۔راشد نے ان کی منہ بولی بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے متعلق نازیبا کلمات کہے۔ قاسمی اجلاس ختم ہونے پر انتہائی طیش کے عالم میں راشد کے کمرے میں گئے جہاں وہ تنہا بیٹھے تھے اور اُن سے یوں مخاطب ہوئے:

''راشد صاحب! ابھی ابھی آپ نے میری بہنوں پر جو جملہ کسا ہے، اس کا جواب اس طرح بھی دیا جا سکتا تھا کہ میں پورے سٹاف کے سامنے آپ کے منہ پر ایسا تھپڑ مارتا کہ آپ کا چہرہ پھر جاتا مگر یہ سلوک صرف اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ آپ بہت عمدہ شاعر بھی ہیں اس لیے میں نے محض لفظی احتجاج پر اکتفا کیا ہے۔'' ۷۰

راشد ادب کے شیدائی اور ادبی دنیا کے پرستار تھے۔ وہ ادبی محفلوں اور لوگوں میں منفرد مقام رکھتے

تھے۔ اس خاکے کی سب سے نمایاں خوبی راشد کی شخصیت میں وضع داری، اخلاقی پاس داری اور ادبی لوگوں سے محبت کرنے کا فن ہے۔ قاسمی ان کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہونے کے ساتھ رقم طراز ہیں:

''میں راشد کی شاعری کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے معاصرین میں شاید ہی کوئی اس کا ہم پلہ ہو۔ وہ صحیح معنوں میں بڑا شاعر تھا اور اگر اس کے مزاج و کردار میں چند کمزوریاں تھیں تو کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔'' ۱؎

''میرے ہم سفر'' اور ''میرے ہم قدم'' میں ان افراد کے خاکے شامل ہیں جو اس دنیا میں موجود نہیں۔ ان سے قاسمی کے ذاتی تعلقات تھے۔ بعض شخصیات کے وہ بہت قریب تھے جن کی وفات کا دلی صدمہ ہوا۔ اس دنیا کو خیر باد کہنے کے بعد یہ لوگ نہ صرف قاسمی کے دل و دماغ میں موجود تھے بلکہ ان کی یادوں کے چراغ بے شمار افراد کے دلوں میں فروزاں تھے۔ ان خاکوں کے غائر مطالعہ سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ انسان کی خوبیاں اور اچھائیاں تلاش کر کے انھیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لینے کے بعد صفحہ قرطاس پر مرکوز کرتے ہیں۔ ان خاکوں میں انسان دوستی کا رویہ ملتا ہے جس کا دوسرا نام مثبت رویہ ہے۔ وہ بشری کمزوریوں سے قطع نظر اپنے موضوع کی خوبیوں اور اچھائیوں سے سروکار رکھتے ہوئے دل کش خاکہ پیش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد قاری کو موضوع شخصیت سے بدظن کرنا نہیں اور نہ ہی اس کی خامیاں گنوانا ہے بلکہ وہ تو شخصیت کے اندر مخفی جذبات و خیالات کی عکاسی کرنا چاہتے تھے۔ مدیر افکار صہبا لکھنوی نے قاسمی کے چاروں شعری مجموعوں کا جامع انتخاب شائع کیا تو راشد نے اسے سراہتے ہوئے خط لکھا۔ قاسمی ان خطوط کو اپنے خاکوں میں من وعن شامل کر کے خاکہ نگاری کی صنف کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔ ن۔م۔راشد لکھتے ہیں:

''اس انتخاب کو میں کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں اور ہر بار قاسمی صاحب کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھتی چلی گئی ہے۔ ایران میں بعض شیعہ حضرات کا یہ ایمان ہے کہ قرآن دراصل حضرت علیؑ پر نازل ہونے والا تھا لیکن فرشتے کی غلطی سے حضرت محمدؐ کے ہاتھ لگ گیا! چناں چہ مجھے بھی یہ انتخاب پڑھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ یہ وحی خود مجھ پر نازل ہونے والی تھی لیکن ہاتف کی غلطی سے۔۔۔ قاسمی صاحب پر نازل ہوگئی! قاسمی صاحب مجھے معاف فرمائیں۔'' ۲؎

ن۔م۔راشد کے خاکے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ممدوح سے زیادہ قاسمی خود نمایاں ہیں۔ اردو ادب کی معروف شخصیات میں انھوں نے جو جو واقعات و تجربات غلام گردشوں میں پرچھائیوں کی مانند موجود تھے انھیں جہاں جہاں وہ یاد آتی رہیں، ان کا قلم اس سے متعلق تفصیلات بیان کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ابن انشا بیسویں صدی کے بے مثل مزاح نویس، شاعر، مترجم، سفرنامہ نگار سے جذباتی وابستگی اور خوب صورت یادوں کا سرمایہ سینے میں لیے

ہوئے ہیں۔ اس خاکے کی ابتدا سے ہی محبت و پیار کی مہک آتی ہے۔ یادوں کی بازیافت کو خوب صورت انداز سے بیان کرتے ہیں:

> ''رخصت ہو جانے والے دوستوں کی یادیں ہی تو محبت و رفاقت کا سرمایہ ہوتی ہیں۔
> ان یادوں کی بازیافت اس ہمیشہ کے لیے چھن جانے والے دوست کو عارضی طور پر
> زندہ کر لینے کی ایک کوشش ہے۔'' ۳ے

خاکہ نویس نے شخصیت کے ظاہر و باطن تک کماحقہ رسائی کی ہے تاکہ حسبِ ضرورت پوشیدہ پہلوؤں کی پرتیں کھول سکے۔ انھوں نے موضوع شخصیت کے فکر و نظر، رجحان اور مزاج سے سروکار رکھتے ہوئے انھیں جھروکوں سے دکھایا ہے۔ اس خاکے سے بظاہر متبسم چہرہ لیے ابن انشا (شیر محمد قیصر) مغموم و اُداس شخص نظر آتا ہے۔ کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس شگفتگی اور زندہ دلی کے پس پردہ کتنا مغموم انسان موجود ہے جو یہ کہتا ہے:

> انشا جی اُٹھو اب کوچ کرو

انشا کا یہ روپ، ان کی اُداسی کی جانب اُس وقت قارئین کی توجہ مبذول کراتا ہے جب ان کے مابین بے تکلفی کی دیوار گر جاتی ہے۔ ان کے قلم کا اعجاز ہے کہ قاسمی موضوع شخصیت کے خدوخال واضح کرتے ہوئے ظاہریت کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ اکثر خاکوں میں انسان کو انسان ہی رہنے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کھینچی ہوئی قلمی و شخصی تصویروں کے سامنے قاری نہ تو عزت سے سر جھکانے پر مجبور ہوتا ہے اور نہ ہی وہ نفرت سے منہ موڑتا ہے بلکہ قاسمی ہر شخص میں کوئی وصفِ خاص تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ ادیبوں اور شاعروں اور دیگر شخصیات کی نجی زندگی اور ان کے مزاج و اطوار کے متعلق قاری کو بہت سی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ معلومات خوبیوں اور خامیوں کے تذکرے کے ساتھ ہمدردانہ نقطہ نظر سے پیش کی ہیں یہاں تک کہ اپنی کوتاہیوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں سال یاد رکھنے کے سلسلے میں نہایت درجہ کوتاہ ہوں۔'' ۴ے

خاکہ نگار شخصیت پر پڑا ہوا پردہ ہی نہیں ہٹاتا بلکہ اپنے موقلم سے شخصیت سے بھرپور تصویریں پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات سے ان تصویروں میں افسانوی رنگ ہی نہیں بھرتا۔ اس کا شخصی مطالعہ ان بنیادوں پر نہایت کامیابی سے اُستوار ہوتا ہے جن سے کوئی بھی شخصیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت ادب کے پردہ اسکرین پر اُبھرتی ہے۔ قاسمی نے ہاجرہ مسرور کا خاکہ ''نقوش'' میں لکھا لیکن کتابی صورت میں شایع نہ کیا۔ اس کی وجہ ہاجرہ کی طویل العمری ہے جب کہ کتابی صورت میں شامل خاکے اُن شخصیات کے ہیں جو رحلت پا چکی ہیں۔ قاسمی کی دوربین نگاہ رکھنے والی بادامی آنکھیں انسان کے باطن تک سراغ لگا لیتی ہیں۔ پھر خاکے میں شخصیت کو پیاز کے چھلکے کی مانند پرت در پرت کھولتے رہتے ہیں۔ یہ شخصیات اپنے مخصوص ظاہری و باطنی نقوش کو اُبھارنے کے ساتھ چوکھے اور دل چسپ انداز سے سامنے آتی ہے۔ انھوں نے ہاجرہ کی سہل پسندی، بچپن کے حالات و واقعات،

مشاغل، کفایت شعاری، خدا ترسی، حاضر جوابی، عالم تخیل میں محو رہنے، چھالیہ و مطالعہ کی شوقین، موسیقی سے لگاؤ، ہزاروں خواہشات رکھنے والا دل اور خواب دیکھتی آنکھوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ہاجرہ اپنے لالہ (قاسمی) سے یوں گویا ہوتی ہیں:

''میرے پاس کچھ جمع ہو جائے تو میں دنیا بھر کے سفر پر چل پڑوں۔ کہیں پیدل کہیں لمبے سمندری سفر، برف زاروں، حسین ریگستانوں میں، سبزہ زاروں میں، زندگی سفر میں کٹ جائے۔ احمد علی اور میں مل کر سفرنامہ لکھیں۔ بڑا شان دار سفرنامہ ہوگا۔ لالہ تم بھی کچھ جمع کرلو تا کہ تمہارے بچے بعد کو پریشان نہ ہوں۔ خدیجہ اور ظہیر کو بھی چلنا چاہیے۔'' ۷۵

انھوں نے گویا شخصیت کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے جہاں دیگر افراد نے سینکڑوں صفحات سیاہ کیے۔ قاسمی نے نہایت مختصر وقت میں بڑے اعلیٰ پائے کے خاکے لکھے۔ ان کی زندگیوں کو ہنرمندی سے پیش کیا کہ اختصار کے باوجود تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ شخصی خاکوں میں شخصیت کے اُن نقوش کو بیان کیا جاتا ہے جس کے امتزاج سے کردار تشکیل پاتا ہے۔ یہ خاکہ کسی فرد کی مکمل داستانِ حیات نہیں ہوتا بلکہ فرد کے نمایاں اوصاف کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ اس خاکے میں شخصیت سے متعلق ایسے اشارے کیے جاتے ہیں کہ شخصیت کے ہر پہلو سے واقفیت ہو جائے۔ اخگر سرحدی، سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ قاسمی ان کی شرافت، شفقت، وضع داری اور مستقل مزاجی کو قابل ستائش گرداننے کے بعد لکھتے ہیں:

''جس شخصیت کے اتنے بے شمار گوشے اس انتہا تک عزیز ہوں، اس کی صحت اور درازی عمر کی دعا دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ آج ایسے پیارے، ایسے مہذب، ایسے ہمہ صفت لوگ کہاں ہیں جن کا نام لینے سے بھی دل و دماغ میں نرمیاں اور گداز بھر جاتے ہیں۔ میں محبت اور اپنائیت کے ساتھ اپنے دور کی اس دل رُبا شخصیت کے علمی و ادبی کارناموں اور اس کے مزاج کی نیکیوں اور لطافتوں کو سلام کرتا ہوں۔'' ۷٦

''میرے ہم سفر'' کا آخری خاکہ ''محمد طفیل'' کا ہے جو پندرہ صفحات پر محیط ہے۔ اس خاکے میں قاسمی نے نہایت ہنرمندی سے محمد طفیل سے پہلی ملاقات سے لے کر وفات تک کے طفیل سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ قاسمی اور محمد طفیل کے مابین دوستانہ تعلقات، نشیب و فراز، کٹھن حالات اور اختلافات کے باوجود قائم رہے۔ لکھتے ہیں:

''زمانے کی تند و تیز آندھیوں کے باوجود ان کی دوستی کا رشتہ قائم رہا جو کئی بار طنبورے کی تار کی طرح تن گیا مگر ٹوٹا ایک بار بھی نہیں۔'' ۷۷

اس خاکے میں محمد طفیل کی بے غرض محبت اور قاسمی کا خلوص و احترام واضح دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹٦۳ء میں فنون کے اجرا پر محمد طفیل نے بالمشافہ ملاقات پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

''یہ آپ نے کوئی الگ رسالہ نہیں نکالا۔ ''نقوش'' اور ''فنون'' طفیل اور ندیم کی طرح

دو بھائی ہیں اور جس طرح ہم دونوں نے زندگی کے نشیب و فراز میں رفاقت کا حق ادا
کیا ہے۔ اسی طرح ''نقوش'' اور ''فنون'' بھی ادب کی دنیا کے مثالی رفقائے کار
ثابت ہوں گے۔'' ۷۸ے

احسان دانش ''مزدور شاعر'' تھے۔ انھوں نے مزدوری کی اینٹیں اور روڑی ڈھوئی۔ رات کو چوکیداری کی اور دن کو مالی کے فرائض سرانجام دیے۔ انہی ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر ان کا انفرادی اسلوب صورت پذیر ہوا۔ قاسمی احسان دانش کی شخصیت کے مختلف پہلو کو منظرِ عام پر لانے کے ساتھ ساتھ ان کے معمولات اور مشاغل کا بیان بھی کرتے ہیں۔ اس خاکے میں خاکہ نگار نے جہاں احسان کی انسان دوستی، فراخ دلی اور فطرت پسندی کو بیان کیا ہے وہیں ان سے شعروسخن اور علم و ادب سیکھنے والے ان نو وارد ادیب و شاعر کا بھی تذکرہ کیا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کاروانِ ادب میں شامل ہوتے گئے اور نام ور ادیبوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ احسان جب انارکلی کے بالاخانے میں بیٹھتے تو ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انارکلی کے اس بالاخانے پر علم وفن کا ایک چشمہ جاری ہے جس سے کتنے ہی تشنگانِ شعروادب جی بھر کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔'' ۷۹ے

پیش نظر خاکے متذکرہ شخصیت وفن کے مختلف پہلوؤں مثلاً علمی و ادبی مباحثہ، شعر و شاعری میں انفرادیت، تنقید وتبصرے سے دل چسپی کے ساتھ ساتھ ان کی ظرافت طبع کو بھی منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ احسان کسی بھی موضوع کو اُکتاہٹ کا شکار نہ ہونے دیتے۔ یہاں تک کہ عروض جیسے خشک موضوع میں بھی شگفتگی کا پہلو تلاش کر لیتے۔ ایک بار قاسمی سے کوئی ایسا شعر سننے کی فرمائش کا اظہار کیا جس میں ایک لفظ سات بار آیا ہو؟ انھوں نے معذرت چاہی تو فرمایا:

ے آتے ہیں میرے گھر وہ برابر کبھی کبھی
گاہے کبھی کبھی، کبھی اکثر کبھی کبھی ۸۰ے

احسان سے ان کے دوستانہ روابط اُس وقت مضبوط بنیادوں پر اُستوار ہوئے جب ان کی بگڑتی صحت، وسائل کی قلت اور خالی جیب کی خبر سن کر احسان ان کی مدد کو پہنچے اور ایک ہزار روپیہ عنایت کرتے ہوئے صحت افزا مقام کی جانب سفر کرنے کا حکم دیا۔ ان کے اس ہمدردانہ رویے نے قاسمی کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ ان دونوں کی قدر مشترک انسان دوستی تھی۔ ''جہانِ دانش'' میں لکھتے ہیں:

''ندیم کے یہاں انسانی قدروں کی حفاظت اور انسانی قدر و قیمت پہچاننے پر زور تھا جو
میرے مشرب سے بہت نزدیک کی بات تھی۔'' ۸۱ے

اختر حسین جعفری سے قاسمی کے دوستانہ روابط چالیس برسوں پر محیط تھے۔ خاکہ نگار نے ان کے کردار،

مزاج، بے مثل محبت اور درگزر کو بے حد پسند کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔حق بات یہ ہے کہ اختر حسین جعفری اس صدی کے نصف آخر کا صرف ایک بڑا انسان یا بڑا شاعر ہی نہیں تھا، ایک Phenomenon تھا جو آنے والی کتنی صدیوں کو منور کرتا رہے گا۔'' ۸۲

ظہیر کاشمیری کا خاکہ جہاں ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی اور اپنے فن سے لگاؤ کا اظہار کرتا ہے وہیں شیخ خورشید احمد خاں کا خاکہ ان کے مزاج، کردار، حصولِ پاکستان کے لیے کوششوں، سیاست سے لگاؤ اور افکار و نظریات سے بھی آگاہ کراتا ہے۔ انھیں اگر چہ عمدہ خاکہ نگار ہونے کا زعم نہیں لیکن خاکے کے دوران شخصیت کو مکمل گرفت میں رکھتے ہیں۔ وہ شخصیت کی مختلف پرتوں کو پیاز کے چھلکے کی مانند چھیلتے جاتے ہیں، پیاز ختم ہو جاتا ہے لیکن شخصیت ان کی مٹھی سے باہر نہیں نکلتی۔ مثلاً ان کے خاکے جہاں خلیل الرحمٰن کی آزادیِ اظہار کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہیں حسن عابدی کی زندگی کے متنوع پہلوؤں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ وہ جہاں ریاض شاہد کی فلمی صنعت میں انقلاب کا واشگاف اظہار کرتے ہیں وہیں کاوش بٹ کی ادبی وابستگی اور نظریہ میں شدت کو وسیع القلبی اور جذبہ محبت کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ ان کے اشعار محبت و اتحاد کا درس دیتے ہیں۔ کاوش نے درج ذیل شعر میں فلسفہ حیات بیان کیا ہے:

ہر کسی سے اُلفت ہے، ہر کسی سے یاری ہے
ہم نے زندگی اپنی اس طرح گزاری ہے ۸۳

خاکہ نگاری کے متعلق قاسمی اپنا خاص وژن رکھتے ہیں۔ وہ زیرِ مطالعہ شخصیت کی ظاہری جزئیات و حلیہ نگاری اور سراپا نگاری پر ورق کے ورق سیاہ کرنے کی بجائے اس شخصیت کے باطن میں جھانکنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ عامر سہیل لکھتے ہیں:

''قاسمی صاحب کے ہاں کسی شخصیت کو اُجاگر کرنے کے لیے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے جو زیرِ مطالعہ شخصیت کے نوع بہ نوع زاویے دکھاتا چلا جاتا ہے۔ ہر واقعہ شخصیت کے مزاج، کردار اور افکار پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے (ان واقعات کا مقصد محض ممدوحین کے عیب و ہنر دکھانا نہیں ہے) باطن کو مجسم کرنا ہے۔'' ۸۴

قاسمی نے سوانحی خاکوں میں شخصیات کی زندہ تصویریں دکھانے کے ساتھ ساتھ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر بھی اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی ہے۔ ان کے خاکے تکنیکی لحاظ سے بہتر ہیں جب کہ اسلوب، ترتیب واقعات، دل چسپی کے عناصر اور شخصیت کا عمیق جائزہ موجود ہے۔ انھوں نے خاکے کے جمالیاتی اوصاف سے ان سوانحی خاکوں کو مزین کیا ہے۔ قاسمی کے خاکوں کے اوصاف یا انفرادیت حسبِ ذیل ہے:

۱۔ ان کے خاکوں میں بلاغت کا عنصر نمایاں ہے۔

۲۔ لہجہ میں مٹھاس، گھلاوٹ، بات چیت کا انداز، ہمدردانہ لہجہ ہے۔

۳۔ قاسمی موجودگی کا احساس ہر خاکے میں نمایاں ہے۔ بعض جگہ موضوعِ شخصیت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور خاکہ نگار کی شخصیت منظرِ عام پر آتی ہے۔

۴۔ بیشتر خاکے یک رُخے ہیں جن میں فن کو عقیدت، دوستی اور محبت پر قربان کر دیا ہے مثلاً عبدالمجید سالک کا خاکہ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ ان کے بعض تذکرے محض تعارفی بلکہ بعض سوانحی نوعیت کے حامل ہیں۔

۶۔ قاسمی زیرِنظر شخصیت کو مکمل سبھاؤ سے خاکہ نگاری کے اُصولوں کے عین مطابق فطری انداز سے پیش کرتے ہیں۔

۷۔ قاسمی نے جدید شعرا کا موازنہ کلاسیکی شعرا کے فن سے کیا ہے۔ پھر مماثلتیں تلاش کر کے منظرِ عام پر لائے ہیں مثلاً ضمیر جعفری محب الوطن تھے۔ ان کی نظموں میں پاکستان سے محبت کا درس اور اپنی مٹی کی خوش بو رچی ہے۔

ضمیر جعفری اور نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں آگرہ اور اس کے نواح بولتے تھے۔ ضمیر کی نظموں میں پورے پنجاب کی آڑ میں پورا پاکستان بولتا ہے۔ پھر یہ نظمیں محض قدرتی مناظر کی عکاس نہیں ہیں بلکہ انسان اور فطرت کا ایک خوب صورت ارتباط ان نظموں میں نظر آتا ہے۔'' ۸۵

۸۔ ان کے خاکے سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی حقائق کے کشف کو کمالِ مہارت سے عیاں کرتے ہیں۔

۹۔ بعض خاکوں مثلاً اختر شیرانی، غلام رسول مہر، اطہر نفیس اور منٹو کے خاکے میں مثالیت پسندی کا غلبہ ہے۔

۱۰۔ ان کے مشاہدے میں ذاتی نظریات کا دخل ملتا ہے جو بعض جگہ کھٹکتا ہے جس کی بنا پر موضوع شخصیت کا توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ ان خاکوں میں موضوع شخصیت زندہ، سانس لیتی، چلتی پھرتی، متحرک دکھائی دیتی ہے۔

عامر سہیل لکھتے ہیں:

> ''شخصیات کے اس نگارخانے میں ہر تصویر بولتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ ہر مورت کا رنگ اور انگ مختلف ہے اور اپنے عصر سے پوری طرح جُڑی ہوئی ہے۔'' ۸۶

۱۲۔ خاکوں میں بذلہ سنجی، صحافتی تبصرہ، لطیفوں کا استعمال ملتا ہے۔

۱۳۔ وہ خاکہ لکھتے وقت سادہ زبان، نرم لہجے، دھیمے اور فطری صداقت کو بروئے کار لاتے ہیں۔

۱۴۔ قاسمی موضوع شخصیت کے داخلی اوصاف اور خارجی خوبیوں کو دل کھول کر بیان کرتے ہیں۔

۱۵۔ شخصیت کے منفی و مثبت پہلوؤں غرض عقیدت و محبت کا باہمی امتزاج ان خاکوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

۱۶۔ قاسمی نے حقیقت و صداقت کے بیان میں اپنی خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

۱۷۔ اُن کے خاکوں میں برجستگی، بے تکلفی اور روانی کی فضا غالب ہے۔ پیشِ نظر خاکوں کی اثر آفرینی اور دل کشی کا راز قاسمی کے اندازِ بیان میں مضمر ہے۔

۱۸۔ ان خاکوں میں انگریزی اور فارسی الفاظ و محاورات کا بکثرت استعمال موجود نہیں۔

۱۹۔ اُنھوں نے محاوروں اور تشبیہات و استعارات کی کثرت سے حتی الامکاں گریز کیا گیا ہے۔

۲۰۔ قاسمی کم مواد کے ذریعے موضوعِ شخصیت کے اعماق تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

۲۱۔ وہ قارئین کے احساسات و جذبات کو برانگیخت کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

۲۲۔ ان خاکوں میں شامل تمام شخصیات خاص سیرت و کردار کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فن کے ماہر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

۲۳۔ روزمرہ زندگی کے واقعات و مشاہدات کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ قاری ان کے اندازِ تحریر کی داد دیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مناظر واقعات کی مدد سے آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔

۲۴۔ ان خاکوں میں خاکہ نویس کا لہجہ دھیما، طرزِ احساس عمدہ اور طرزِ بیان منفرد ہے۔ انھوں نے اگرچہ تمام معروف شخصیات سے کسبِ فیض لیا لیکن ان اکتسابات کو اپنے اسلوب میں یوں مدغم کیا کہ ان کے جاوداں اسلوب پر مہرِ انفرادیت ثبت ہوتی ہے۔

۲۵۔ ان خاکوں میں اہلِ قلم کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور خامیوں سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے مگر بعض خامیوں کو محبت آمیز لہجے میں بیان کیا ہے کہ شخصیت کی دل آویزی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

۲۶۔ خاکے کی ابتدا اس انداز سے کرتے ہیں کہ خاکہ شروع ہی میں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ فضا خاکے کے اختتام تک قائم رہتی ہے۔

قاسمی نے محولہ بالا شخصیات کو اپنی عینک سے دکھانے کی بجائے جیسی وہ ہیں بعینہٖ ویسی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مہربان قلم کسی شخص سے ناانصافی کو روا نہیں رکھتا۔ ان خاکوں کے مطالعے سے شخصیات سے قلبی تعلق اور احساس پیدا ہوتا ہے۔ قاسمی کے خاکوں کی بنیاد جذبات و احساسات اور تاثرات پر ہے۔ اُس پر مستزاد یہ کہ واقعات کا بیان و انتخاب اس شخصیت کو دل کش اور دل پذیر رنگوں سے مزین کرتا ہے۔ ان کے خاکے ایک فرحت بخش چمنستان کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں مسرت بہجت ہے، ہنسی مذاق اور درد و غم کے ساتھ ساتھ زندگی کا کیف بھی پایا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر دل کو روحانیت بخشنے والی بے کراں شرافت و شفقت اور محبت و پیار بھی موجود ہے۔ یہ خاکے ان کی نوے برس کے شب و روز اور دل چسپ معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ان خاکوں میں قاسمی، موضوعِ شخصیت کے گوشہ زندگی کو بے نقاب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اسلوب سے کسی بھی شخصیت کی تہذیبی تربیت، ذہانت اور تخلیقی چستی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی زبان روزمرہ بول چال کی زبان ہے۔ روانی، فصاحت، چست فقرے اور برجستگی کی حامل ہے۔ ان کا اسلوب واضح اور منفرد ہے جو انھیں دیگر ہم عصروں سے انفرادیت بخشتا ہے۔ واقعات کا بیان براہِ راست اور بے تکلف ہے۔ ان کا اسلوب سلیس، بامحاورہ اور رواں دواں ہے۔ لب و لہجہ دل کش ہے۔ شگفتہ جملوں کا استعمال واقعات کی چستی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ تشبیہ کا استعمال عبارت کی دل کشی اور شگفتگی میں اضافے کا موجب بنتا ہے مثلاً امتیاز علی تاج، کرشن چندر کے افسانوں کی تعریف کرتے ہیں تو قاسمی اس تحسینی انداز کو غیر مانوس تشبیہات اور کم مانوس الفاظ کو تشبیہاتی پیرہن اس طرح پہناتے ہیں:

"۔۔۔یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ندی ہے جو گل پوش جھاڑیوں سے لدی ہوئی ایک وادی میں حدِ نظر تک بہے جا رہی ہے۔" ۸۷

انھوں نے سید ضمیر جعفری کا خاکہ بہت اپنائیت سے لکھا۔ وہ اپنے خاکوں میں جذبات و تاثرات کے اظہار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو روزانہ بول چال کے الفاظ ہیں جو کل پرانے ہوئے تھے، نہ آج۔ مثلاً:

"ان کی شخصیت کو چائے سے تشبیہ دیتے تھے جو ہر موسم میں راحت بخش ہے کہ سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" ۸۸

قاسمی نے اپنے اسلوب کو فارسی اشعار و جملوں سے بھی مزین کیا ہے۔ خورشید احمد کے خاکے کے اختتام میں لکھتے ہیں:

رفتید ولے نہ از دلِ ما ۸۹

اقبال شیدائی ۱۳ رجنوری ۱۹۷۴ء کو عالم خانہ نشینی میں اس دنیا سے رخصت ہوئے جن کے قدموں کی چاپ سے براعظم گونجتے تھے جس نے برطانوی استعمار کو ناکوں چنے چبوائے۔ ان کی وفات پر اظہارِ افسوس کے بعد دعائے مغفرت کرتے ہیں:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت ۹۰

اسی طرح ایک جگہ فارسی اور اردو کے مشترکہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"قہر درویش بر جانِ درویش میں ان کے ساتھ چل پڑا۔" ۹۱

استعارہ کا دل کش استعمال عبارت کی رنگینی میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ اس کی ایک بلیغ مثال ظہور نظر کے خاکے میں ملتی ہے:

"کسی کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ ہماری مسکراہٹوں کے پیچھے آنسوؤں کے کتنے آبشار گر

رہے ہیں اور ہمارے قہقہوں کے عقب میں کتنے زخم خوں فشاں ہیں تو قصور ہمارا نہیں ہے، معترض کے ذوقِ نظر اور معیارِ نظر کا ہے۔'' ۹۲

محاورے کا برمحل استعمال، جملے کی اثر انگیزی میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ قاسمی محاورات کے استعمال سے نثر کو زندہ و جاوید بناتے ہیں۔ فیض احمد فیض کے ہمراہ جہاز کے سفر کے دوران جب طیارہ قلابازیاں کھا رہا تھا تو فیض سو رہے تھے مگر ندیم کی ''نیند ہوا ہو چکی تھی۔'' ۹۳ خدیجہ مستور کے خاکے میں طنز و مزاح کے لطیف پیرائے میں شخصیت کی مناسبت سے موزوں محاورات کا استعمال بھی ملتا ہے:

''وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں پر اکثر اوقات ایسے ایسے فقرے چست کر جاتی تھیں کہ مخاطب کو بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔'' ۹۴

''کوئی اور اتنی پابندی کے ساتھ آزاد نظم لکھے تو اسے دانتوں پسینہ آ جائے۔'' ۹۵

''جب فلمی دنیا میں اُس کا طوطی بول رہا تھا۔'' ۹۶

قاسمی نے عام فہم زبان و بیان کے اعتبار سے اپنے خاکوں میں مختلف محاورات اور ضرب المثال کا استعمال کیا ہے جو عبارت میں چستی اور خوب صورتی پیدا کرتا ہے۔ تابع مہمل کا استعمال نہایت فن کاری سے کرتے ہیں:

''عاجزی واجزی مجھ سے نہیں ہوتی۔'' ۹۷

قاسمی عمدہ شاعر بھی تھے۔ اس لیے شعریت کا رنگ ان کے اسلوب کا خاصا ہے۔ شاعرانہ پرچھائیوں کی جھلک ان کے خاکوں میں نظر آتی ہے۔ وہ مختلف شعرا کے اشعار استعمال کر کے خاکہ کی صنف کو دل چسپ بنانے کے ساتھ ساتھ گل و گلزاریاں پیدا کرتے ہیں:

؎ محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے ۹۸

؎ عمر بھر چلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم ۹۹

بایں ہمہ بعض مقامات پر نثر میں شاعرانہ طرز اختیار کیا ہے جو نثر کے حسن کو جاذبیت و پرتاثیر بناتا ہے۔ ظہور نظر کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔ جب بھی میں محبت کی راہ پر اپنی آگہی کی رفاقت میں عشق کی طرف بڑھتا تھا تو مجھے ظہور نظر مل جاتا تھا جو میری آگہی کا بھی حصہ دار تھا اور میری محبت کا بھی۔ اس کی نظریاتی استقامت میری آگہی کی بہشت تھی اور اس کی دل رُبائی اور محبوبی میری محبت کا فردوس تھی۔'' ۱۰۰

قاسمی کی خاکہ نگاری کو جس چیز نے منفرد بنایا، وہ ان کا اسلوب ہے جو جادوئی حسن اور تاثیر سے بھرپور

ہے کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے۔ قاسمی ایسے خاکہ نگار ہیں جو حقائق و واقعات پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ ان کا پختہ اسلوب پہلے خاکے سے لے کر آخری خاکے تک بدستور قائم رہتا ہے۔ یہی ان کے خاکوں کی معراج ہے۔ بقول عامر سہیل:

> ''احمد ندیم قاسمی کا اُسلوب خاکہ نگاری، تازہ کاری کی عمدہ مثال ہے۔ فالتو الفاظ و تراکیب سے دامن بچا کر چلنا، ڈرامائی صورتِ حال پیدا کرنا اور ہلکا پھلکا مزاح، اُن کے تقریباً ہر خاکے میں نظر آتا ہے۔ الفاظ کا استعمال ایسا چچا تُلا ہے کہ ہر خاکہ نگار اُس پر رشک کر سکتا ہے۔ اُسلوب کی یہ۔۔۔ صفات بہت کم تخلیق کاروں کو ارزانی ہوئی ہے۔'' ۱۰۱

قاسمی کے خاکے خامیوں سے مبرا نہیں۔ بعض خاکوں میں لفظوں، جملوں اور واقعات کی تکرار ملتی ہے مثلاً ایک واقعہ منٹو اور کرشن چندر کے خاکے میں بیک وقت دہرایا گیا ہے تو دوسرا واقعہ کرشن چندر اور امتیاز علی تاج کے خاکے میں دُہرا کر تکرار کا عنصر پیدا کیا ہے جو قاری کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ خود پسندی کا عنصر بھی ان خاکوں میں ملتا ہے۔ ضمیر جعفری کے خاکے میں قاسمی اپنی ادبی خدمات کے صلے میں ملنے والے اعزازات کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ موضوع شخصیت پس منظر میں چلی جاتی ہے:

> ''ندیم صاحب کو تو اس سے کہیں زیادہ بڑے بڑے۔۔۔ جلیل و جمیل اعزازات۔۔۔ مل سکتے ہیں کہ کوئی ادبی اعزاز ان کی قامت کے برابر نہیں ہے۔'' ۱۰۲

سید ضمیر جعفری کے خاکے میں ان کی خود پسندی عجیب تاثر پیدا کرتی ہے۔ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ ندیم اگلی صبح کا شاعر اور مستقبل کا صورت گر ہے۔۔۔ میرے نزدیک وہ۔۔۔ اقبال کے بعد۔۔۔ ان چند قارئین میں شمار ہوتا ہے جن کی شاعری میں تاریخ کیا انسانی تقدیر کے خلاف ایک بڑی طاقت ور بغاوت کا شعلہ جلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔'' ۱۰۳

ان خاکوں میں مصنف کی شخصیت حاوی نظر آتی ہے جب کہ خاکہ نویس کو موضوع شخصیت اُبھارنے پر توجہ مبذول کرنی چاہیے تھی۔ قدرت اللہ شہزاد لکھتے ہیں:

> ''جب ہم احمد ندیم قاسمی صاحب کے خاکوں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہمیں تقریباً ہر خاکے میں خود تحسینی کے بلوریں قلعے میں محصور دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں وہ زیرِ نظر شخصیت کی زبان یا قلم سے اپنی بڑائی کا اعتراف کراتے ہیں اور کہیں واقعات ان کی عظمت کو ظاہر کر رہے ہوتے ہیں۔ ''میں'' کا عنصر قاسمی صاحب کے ہر خاکے میں شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔'' ۱۰۴

ابن انشا کے خاکے میں بیشتر واقعات خوش طبعی کے حوالے سے ہیں جب کہ دیگر رویوں سے اغماض برتا گیا ہے۔ خاکے کے آغاز میں ہی خاکہ نویس نے بیان کر دیا تھا کہ وہ انشا کی صرف متبسم شخصیت کو ہی بیان

کریں گے جب کہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ کسی کی ذات کا صرف ایک پہلو خواہ وہ کتنا ہی نمایاں کیوں نہ ہو خاکے کی صنف کے لیے ناکافی ہے۔

''جب کہ قاسمی صاحب فن کار کو بطور انسان پیش کرتے کرتے اکثر اس کے فن کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے جس سے خاکے کی روح متاثر ہوئی۔'' ۱۰۵

ان خاکوں میں قاسمی نے تحت الشعور میں اُبھرنے والی خواہش کو دبانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شراب نہ پینے کا تذکرہ بار بار کرتے ہیں۔ اس طرح خاکوں میں احباب کے ذکر کے دوران القابات کی تکرار بھی ملتی ہے مثلاً بار بار ''میرے عزیز دوست سعادت حسن منٹو'' لکھتے ہیں تو آورد اور تصنع کا گماں ہوتا ہے جب کہ خاکہ نگاری میں غیر معمولی تکلف پسند نہیں کیا جاتا۔ ان خاکوں میں قاسمی کے آدرش و نظریات مثلاً انسان دوستی، مساوات، محبت اور رواداری کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ان خاکوں میں موضوع اشخاص چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی محبتیں، طبع کے مخصوص رجحانات، مشاغل، پسند و ناپسند، علمی و ادبی سرگرمیاں، نجی زندگی، داخلی المیے، محرومیاں اور زندگی میں ہونے والے تغیرات کو ماہر خاکہ نگار نے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ مجسم ہو کر قارئین کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ قاسمی کا کمالِ فن ہے کہ ان خاکوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ مقدار و معیار کے لحاظ سے اہم خاکہ نگاروں کی فہرست میں قاسمی کا نام بھی شامل ہوتا ہے۔ ان کے ذکر کے بغیر خاکے کی تاریخ ادھوری ہے۔ انھوں نے اپنی مصروف زندگی کے باوجود بہترین خاکے لکھ کر خاکہ نگاری کی صنف میں اضافہ کیا۔ ان خاکوں کی سنجیدگی و شگفتگی، متانت و رواداری، واقعات کی دل چسپی اور مثبت پہلوؤں پر گرفت انھیں بڑے خاکہ نگاروں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ ان کی عبارت کی روانی کو اس صحرائی چشمے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی اور وہ سبک خرامی سے بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ خاکے غیر جانب دارانہ اور حقیقت پسندانہ رجحان کی عکاسی عمدگی سے کرتے ہیں۔ ان خاکوں میں مصنف نے اپنے دوستوں کی سنگت کے لمحات کو تازہ کیا ہے۔ ان میں بعض شخصیتیں چمکتے سورج کی مانند قارئین پر آشکار ہوتی ہیں اور بعض ٹمٹماتے ستاروں کی مانند ہماری نظروں سے فاصلے پر رہتی ہیں لیکن قارئین کو اپنے وجود کا احساس ضرور دلاتی ہیں۔ ان کے خاکے اس سایہ دار درخت کی مانند ہیں جس کے گھنے سایہ دار درخت تلے بیٹھ کر مسافر نہ صرف اپنی تھکاوٹ رفع کرتا ہے بلکہ روحانی کیف بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ خاکے ایسی فرحت بخش خوش بو کی مانند ہیں جن سے قاری اپنے ذہن و دل کو معطر کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء، ص ۸

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص ۱۷

۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص ۱۸

۶۔ قدرت اللہ شہزاد، اردو کے چند خاکہ نگار، بہاول پور، مکتبہ الہام، باراوّل، ۲۰۰۷ء، ص ۳۸

۷۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص ۲۶

۸۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص ۳۶

۹۔ قدرت اللہ شہزاد، اردو کے چند خاکہ نگار، محولہ بالا ۸، ص ۳۸

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص ۳۱، ۳۲

۱۱۔ ثمرین کوثر، احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے اردو، ۲۰۰۸ء، لاہور، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی مرکزی لائبریری، لاہور، ص ۴۷

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵، ۱۶

۱۴۔ مظہر محمود شیرانی، ''سانجھ بھئی چودیس'' مشمولہ ماہ نامہ مخزن، لاہور، شمارہ ۱۵، جلد ۱، ۲۰۰۸ء، ص ۸

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولا بالا ۱۴، ص ۱۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۸، ۳۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۲۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص ۱۸۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸۶

۲۴۔ قدرت اللہ شہزاد، اردو کے چند خاکہ نگار، محولہ بالا ۸، ص ۴۱

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا ۱۴، ص ۴۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۲۷۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری یا خودنوشت کے اوراق'' مشمولہ سہ ماہی معاصر، لاہور، شمارہ ۲، ۳، ۴، جلد ۷، ۸، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۹۲

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا ۱۴، ص ۱۴۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۰۔ ایضاً، ص ۷۲

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۳، ص ۳۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری یا خودنوشت کے اوراق'' محولہ بالا ۲۹، ص ۹۰

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۳، ص ۳۸، ۳۹

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۱۰، ۱۱۱

۴۳۔ عامر سہیل، ''میرے ہم سفر'' مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، جلد ۱، ۲، ۲۰۰۷ء، ص ۲۸۷

۴۴۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری یا خودنوشت کے اوراق'' محولہ بالا ۲۹، ص ۹۰، ۹۱

۴۵۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۹ء، ص ۲۶۰

۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۳، ص ۵۹

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۸

۴۸۔ ایضاً، ص ۷۲

۴۹۔ قدرت اللہ شہزاد، اردو کے چند خاکہ نگار، محولہ بالا ۸، ص ۴۰

۵۰۔ اسلم راحیل، پنجاب کے انقلابی راہنما، لاہور، ایشین پبلشرز، سن ندارد، ص ۱۸

۵۱۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا ۱۴، ص ۶۱

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۵۳۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۳، ص ۲۰۰

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۵۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا۳، ص۱۰۳

۵۶۔ احمد ندیم قاسمی، دوام، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۱۲

۵۷۔ پروین شاکر، (انتساب) خوش بو، اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، سن ندارد

۵۸۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا۱۴، ص۱۲۵

۵۹۔ ایضاً، ص۱۰۰

۶۰۔ ایضاً، ص۱۱۰

۶۱۔ ایضاً، ص۱۱۴

۶۲۔ ایضاً، ص۹۷، ۹۸

۶۳۔ ایضاً، ص۷۱

۶۴۔ ایضاً، ص۸۹

۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص۴۱

۶۶۔ ایضاً، ص۴۶

۶۷۔ ایضاً، ص۶۳

۶۸۔ ایضاً، ص۸۷

۶۹۔ ایضاً، ص۱۰۴

۷۰۔ ایضاً، ص۱۰۵

۷۱۔ ایضاً، ص۱۹۲

۷۲۔ ایضاً، ص۱۹۲، ۱۹۳

۷۳۔ ایضاً، ص۱۹۲، ۱۹۳

۷۴۔ ایضاً، ص۱۰۷

۷۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ہاجرہ مسرور'' مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر، لاہور، شمارہ نمبر۴۹، ۵۰، سن ندارد، ص۶۷۸

۷۶۔ احمد ندیم قاسمی ''اخگر سرحدی'' مشمولہ سالنامہ تحریریں، جلد، سن ندارد، ص۱۲۰

۷۷۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا۳، ص۲۰۹

۷۸۔ ایضاً، ص۲۲۲

۷۹۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا۱۴، ص۲۳

۸۰۔ ایضاً، ص۲۵

۸۱۔ احسان دانش، جہان دانش، لاہور، اے این پرنٹرز، سن ندارد، ص۳۴۵

۸۲۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا۱۴، ص۳۶

۸۳۔ ایضاً، ص۱۵۰

۸۴۔ عامر سہیل، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۴۵، ص ۲۸۷

۸۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، ص ۱۶۱

۸۶۔ عامر سہیل ''میرے ہم سفر'' محولہ بالا ۴۵، ص ۲۸۸

۸۷۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۳، ص ۱۷۳

۸۸۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۸۹۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا ۱۴، ص ۸۳

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۹۱۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۳، ص ۱۴۵

۹۲۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا ۱۴، ص ۱۱۱

۹۳۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، محولہ بالا ۳، ص ۱۲۸

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا ۱۴، ص ۱۱۲

۹۶۔ ایضاً

۹۷۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۹۸۔ ایضاً، ص ۳۹

۹۹۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۰۰۔ ایضاً

۱۰۱۔ عامر سہیل ''میرے ہم سفر'' محولہ بالا ۴۵، ص ۲۸۸

۱۰۲۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، محولہ بالا ۱۴، ص ۱۱۰، ۱۱۱

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۱۰۴۔ قدرت اللہ شہزاد، اردو کے چند خاکہ نگار، محولہ بالا ۸، ص ۴۲

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۴۱

✿✿✿✿✿

باب ہفتم

متفرقات

احمد ندیم قاسمی نے اظہارِ فن کے لیے متفرق نثری اصناف میں طبع آزمائی کی جن میں دیباچہ، فلیپ، ناول، ناولٹ، بچوں کا ادب، مکاتیب، فلم، ترتیب و تدوین، مزاح، ترجمہ اور پنجابی ادب شامل ہیں۔ اس ہمہ جہت فنی شخصیت کے مالک قاسمی نے ہر صنفِ ادب پر اپنی چابک دستی کے نقوش ثبت کر کے نثری نگارشات میں اپنا مقام متعین کیا۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ بسیار نویسی نے ان کے فکر وفن کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ بایں ہمہ ان کی نثری تخلیقات میں گراں قدر جواہر ریزوں کے آثار ملتے ہیں۔ انھوں نے ہر صنفِ ادب میں انفرادیت کا لوہا منوایا۔ اس اعتبار سے ان کی دیگر نثری اصنافِ سخن کا تذکرہ نہ کرنا ناانصافی ہو گا۔ سجاد شیخ اپنی کتاب "Selected Short Stories of Ahmad Nadeem Qasmi" میں لکھتے ہیں:

> "Ahmad Nadeem Qasimi is a very prolific writer and poet. He is renowned for his astute political commentary, humorous, satirical and sarcastic columns, delightful radio plays and feature programmes; inspiring patriotic songs." ۱

دیباچہ نویسی:

مصنف یا مولف کتاب کی ابتدا کے وقت جو تمہیدی گفتگو کرتا ہے جس میں کتاب سے متعلق چند ضروری امور کی نشان دہی تعارف کے طور پر کی جاتی ہے۔ اُسے دیباچہ، مقدمہ، پیش لفظ، سرآغاز، حرفِ اوّل، حرفِ چند، چند کلمات، تعارف، سخن ہائے گفتنی وغیرہ کے عنوانات دیے جاتے ہیں۔ دیباچہ بعض اوقات مصنف خود لکھتا ہے اور بعض اوقات کسی سینئر ادیب یا مربی سے لکھواتا ہے۔ اس کا مقصدِ تحریر مصنف کی شخصیت اور اس کے علمی و ادبی مقام و مرتبہ کو واضح کرنا ہے۔ اس کا انداز خواہ کیسا ہی ہے کتاب سے تعلق رکھنے کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے۔ قاسمی دیباچہ، مقدمہ یا پیش لفظ کے لیے کوئی مخصوص لفظ متعین نہیں کرتے بلکہ دیباچہ، مقدمہ، پیش لفظ کو مترادفات گردانتے ہوئے رطب اللسان ہیں:

> ''دیباچہ، مقدمہ، تمہید، پیش کلام، پیش لفظ، تعارف وغیرہ کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق کم سے کم اردو کتابوں کی حد تک روا نہیں رکھا گیا۔ یہ لکھنے والے پر موقوف ہے کہ کتاب یا مصنف کے بارے میں وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کا کیا عنوان رکھتا ہے۔'' ۲

اردو کی قدیم ادبی تصانیف میں دیباچہ، مقدمہ دونوں الفاظ ملتے ہیں۔ اگر دیباچہ نگار کا اپنا علمی و ادبی مرتبہ بلند ہو گا تو قارئین سنجیدگی سے تحریر کا مطالعہ کریں گے۔ اس کی تنقیدی آرا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین کی نفسیات کے عین مطابق صاحبِ کتاب اپنی کتاب پر مقدمہ و دیباچہ لکھوانے کے لیے بلند قامت

محقق، نقاد یا ادیب کا انتخاب کرتا ہے۔ مقبول نقاد آل احمد سرور دیباچہ اور مقدمہ کا فرق بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''۔۔۔دیباچہ، تعارف کتاب یا صاحبِ کتاب کا تعارف کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت متعین نہیں کرتا۔ متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مقدمہ اس سے ذرا آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ قدر و قیمت بھی متعین کرتا ہے اور قولِ فیصل بھی پیش کرتا ہے۔'' ۳

قاسمی کے دیباچہ، اس تعریف پر پورے اُترتے ہیں جس کی مثال ایک ایسے نفیس کپڑے کی ہے جو عمدہ بیل بوٹے سے مزین ہوتا ہے۔ عمدہ دیباچہ کی بدولت ہی قاری کو کتاب سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسی ادبی تصنیف ہے جو ادبی حلقوں میں فن کار کی شناخت کروانے کے ساتھ ساتھ قاری کی راہنمائی بھی کرتی ہے۔ اسی تحریر کی بدولت قاری کی موضوع سے دل چسپی پیدا ہوتی ہے اور صاحبِ کتاب کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ قاسمی کے دیباچے مندرجہ بالا امور کی تصدیق واثق کرتے ہیں۔

قاسمی ادبی شخصیات و رجحانات اور ان کے فکر وفن کو تحریری صورت میں پیش کرتے ہوئے مخصوص تنقیدی نظریات رکھتے ہیں۔ یہ دیباچہ کی کسوٹی پر ادبی رجحانات کو پرکھتے ہیں اور جب انھیں اپنے مخصوص نظریات و تصورات ہم عصر ادبی شخصیات میں مل جاتے ہیں تو ایک فرحت بخش طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ غلام محمد قاصر کے شعری مجموعہ ''تسلسل'' میں لکھتے ہیں:

> ''غلام محمد قاصر کا شروع کا کلام پڑھ کر بھی احساس ہوتا تھا کہ ''ڈیرے'' کا یہ شاعر غزل کی کسی نئی ڈائمنشن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بعد میں اس کی غزلوں میں ''دستک'' کا لفظ بار بار وارد ہوا تو یہ بلیغ علامت اس حقیقت کا ثبوت بن گئی کہ آگے چل کر قاصر کے فن میں فکر و احساس کے کئی نئے در کھلیں گے۔'' ۴

قاسمی نے ادب کی بیشتر کتب پر اظہارِ خیال کیا۔ انھوں نے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف پر تعریفی و توصیفی جملے تحریر کرتے ہوئے ہمت افزائی کی۔ جن مصنفین نے ان سے اپنی کتابوں پر دیباچے لکھوائے۔ ان کے خیالات سے واقف ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ یہ ادیب و شاعر کے کلام میں مثبت پہلو تلاش کر کے شائستگی اور توازن سے پیش کرتے ہیں مثلاً حبیب جالب کے مجموعہ میں فنی احتجاج کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''حبیب جالب کی نظموں اور بعض غزلوں کے اِکا دُکا اشعار میں تلخی اور طیش کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے لیکن یہ اس کے فن کا نقص نہیں ہے۔ اس کے فنی خلوص کا احتجاج ہے اور جس فن کار کو احتجاج کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ خود فن کی بے حرمتی پر بھی آنکھیں جھپک کر رہ جاتا ہے۔'' ۵

قاسمی کے دیباچوں کا وصفِ خاص ہے کہ ابتدا میں ہی قاری کی توجہ نہایت ہنرمندی سے اپنی جانب

مبذول کرواتے ہیں۔ دیباچہ کی تمہید باندھنے کے لیے روایت کا سہارا نہیں لیتے بلکہ براہِ راست شاعر کو موضوع بناتے ہیں۔ محمد افسر ساجد عصرِ حاضر کے مقبول شاعر ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ ''وجود اِک واہمہ ہے'' کا تعارف اس انداز سے کراتے ہیں:

> ''محمد افسر ساجدؔ نارسائی، آشفتہ حالی اور ناکردہ کاری کے شاعر ہیں اور یہ وہ کیفیات ہیں جو عمر کے کسی نہ کسی دور میں خاص طور سے عالمِ شباب میں ہر حساس انسان پر گزرتی ہیں اور اگر وہ حساس انسان شاعر ہو تو یہ کیفیتیں قیامتیں بن جاتی ہیں۔ ساجدؔ انہی قیامتوں کے جوہر شناس اور اندازہ داں ہیں۔'' ۶

قاسمی دورِ حاضر کے شعرا کا بیسویں صدی کے معروف شعرا سے موازنہ کرتے ہوئے یگانگت کے پہلو تلاش کرتے ہیں اور بعض اوقات نئے اور منفرد زاویے بھی تلاش کر لیتے ہیں مثلاً افسر ساجد کی شاعری کو قابلِ تحسین انداز سے دیکھتے ہوئے انھوں نے دُکھوں سے آشنائی، اہلِ جہاں کی بے وفائی، آرزوؤں کی شکست کی ناگہانی برسی، درد کے ساتھ منزلوں کی بے سراغی کی تلاش کی نشان دہی کی ہے۔

قتیل شفائی کا شمار اگرچہ اردو ادب کے خوش فکر، خوش گو اور کہنہ مشق شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی محنت، لگن، مسلسل مشق اور شعری اظہار سے اردو شاعری اور اردو گیت میں منفرد مقام حاصل کیا۔ انھوں نے قتیل شفائی کی شاعری میں شگفتگی، غضب کا لوچ، خلوص، پاکیزگی خیالات کی نشان دہی کی ہے۔ قتیل شفائی نے اردو شاعری کے میدان میں ایسی زقند بھری کہ مختصر عرصہ میں ہی ادبی اخبارات و رسائل میں چھا گئے۔ متذکرہ موضوع و شخصیت سے متعلق قاسمی لکھتے ہیں:

> ''یہ شاعر قتیل ہے۔ نہ وہ بے شمار ترقی پسند شعرا کی طرح اعلیٰ تعلیم سے بہرہ اندوز ہے اور نہ اُس نے لاہور، دہلی، لکھنو اور حیدر آباد کے ادبی اجتماعات دیکھے ہیں۔ نہ تو اُس نے فرائڈؔ اور ہیولاکؔ ایلس کا مطالعہ کیا ہے اور نہ حافظ و خیام کے چمنستانوں کی خوشہ چینی کی ہے۔ اُس نے اگر کسی چیز کا مطالعہ کیا ہے تو وہ کتابِ فطرت ہے۔ اس کے دل و دماغ پر اگر کوئی بیرونی اثرات ہیں تو وہ ابنِ آدم کی دوستیاں، دشمنیاں، محبتیں اور ریاکاریاں ہیں۔۔۔ وہ ہر نظم میں زندگی کی ایک نئی دھڑکن اور ہر گیت میں انسانی ذہن کے افق پر ایک نئے آفتاب کے طلوع کی نوید سناتا ہے اور پس منظر کے لیے ان دیہاتی۔۔۔ پنگھٹوں اور مرغزاروں کو منتخب کرتا ہے جہاں جدید تہذیب و تمدن کا دیو استعمار اپنے زہریلے پنجوں کو اتنی آزادی سے استعمال نہیں کر سکتا۔'' ۷

قاسمی نے اپنے دیباچوں میں موضوع کا بھرپور تعارف کراتے ہوئے شاعر کی علمی قابلیت، شعر فہمی،

سیرت و کردار، تعلیم و تربیت اور شخصیت کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ بلحاظ موضوع کتاب جس کمی کو پورا کرتی ہے جس مقصد کے تحت لکھی گئی اُسے تفصیلاً بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے قتیل کی فکر، قوتِ اظہار، احساسِ کرب، جذبے، تفکر اور بے تکلفی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ان کے گیتوں کو سراہا ہے۔ گیتوں سے لگاؤ اگرچہ انھیں بھی تھا۔ وہ قتیل شفائی کی تخلیق ''ہریالی'' پر ''تعارف'' کے عنوان سے دیباچہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''یہ ہلکے ہلکے، ننھے ننھے گیت ستاروں کی طرح خوب صورت اور پھولوں کی طرح نرم و نازک ہیں۔ گیت کہنے کے لیے جس بے پایاں مہارت اور زبان و بیان کی جس تکمیل و رفعت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ قتیل میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔۔۔ یہ گیت ایسے ہیں کہ یہ صرف گانے اور سننے ہی کی چیز نہیں ہیں، پڑھنے اور پڑھ کر لطف اندوز ہونے کی چیز ہیں اور بڑی شاعری کی یہی پہچان ہے۔'' ۸

قاسمی ماہر نفسیات کی مانند نہایت خوبی سے، غیر محسوس طور پر موضوع کی جانب ہلکے پھلکے انداز میں مافی الضمیر کا ابلاغ کرتے ہیں۔ وہ موضوع کے متعلق معلومات اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ دیباچہ نگار اسے کس ڈگر پر لا رہا ہے۔ اگرچہ جذبات و مشاہدات کو جذبہ بننے کے لیے بہت بڑے کرب سے گزرنا پڑتا ہے پھر کہیں وہ غمِ ذات کی صورت میں عیاں ہوتا ہے جو قاری کو سحر میں مبتلا کرتا ہے اور قاری اس غم کو اپنا ذاتی غم گرداننے لگتا ہے۔ قاسمی، مرتضٰی برلاس کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے کھو جانے کا احساس، تلخ ذاتی حالات کا اپنائیت سے تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری میں صداقت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے عصری آگہی کا پرتو قرار دیتے ہیں۔ یہ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ سچ کی کڑی چلچلاتی دھوپ فن کو بالیدگی اور ارتفاع بخشتی ہے۔ وہ مرتضٰی برلاس کے کلام میں موجود اپنے عصر، قوم، وطن، سیاست، معاشرے، ہم عصروں اور خود اپنے متعلق صداقت کو سراہتے ہیں اور شاعر کی مانند تصنع، تکلف، ریاکاری، منافقت، بداعتمادی جیسے رذائل اخلاق پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منافقت اور ریا اور تصنع کی عادی دنیا کو سچ کا کڑوا ذائقہ چکھانا بڑے حوصلے اور جرأت کا کام ہے مگر ایک سچے شاعر کو خود اعتمادی کی جو قوت ودیعت ہوتی ہے، وہ اس مرحلے کو آسان بنا دیتی ہے۔ مرتضٰی برلاس نے اس مرحلے سے بار بار گزرنا اپنا معمولِ حیات اور معمولِ فن بنا لیا ہے۔ چناں چہ ''تیشۂ کرب'' اپنے عصر، اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور اپنے ہم وطنوں کی ذہنیتوں کے بارے میں ان صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے جن کا سامنا کرنے سے ہم گریزاں رہتے ہیں کہ خود فریبی نے ہمیں یہی کچھ سکھایا ہے۔'' ۹

قاسمی اپنی شائستگی تحریر، سلیقے اور نہایت فن کاری سے مصنف و شاعر کی داخلی شخصیت اور فنی انفرادیت

کے خدوخال نہایت سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ شخصی کوائف سے تعلق رکھنے کی بجائے اجتماعی شخصیت کو مرکز توجہ بناتے ہیں۔ وہ تخلیق کار کے فن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادبی رجحانات پر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ وہ شعرا کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کے مستقبل سے پُرامید نظر آتے ہیں۔ سلیم طاہر کے شعری مجموعہ ''کہرام'' کا دیباچہ تحریر کرتے ہوئے انھیں یقین واثق ہے کہ ''سلیم طاہر اپنے اس جوہر کے ساتھ انصاف کرے گا جو تخلیقِ فن کی صورت میں اس کے اندر روشن ہے۔''[۱۰] قاسمی نے اگرچہ بیشتر دیباچے پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آنے والی کتابوں پر لکھے لہٰذا دیباچہ نگار گم نام مصنف و شاعر کے سوانحی کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں اور کبھی کتاب اور اس کے متن پر اظہارِ خیال کر کے بحیثیت مجموعی اس کتاب کی ادبی وتنقیدی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں کیوں کہ دیباچہ کتاب اور قارئین کے مابین تعارف کراتا ہے۔ انھوں نے دیباچہ نگاری کے اصولوں کے عین مطابق معتدل رویہ اپناتے ہوئے دیباچہ لکھا ہے۔ یہ فن کار کی انفرادیت کو دیباچے کے محدود کینوس پر دریافت کرتے ہیں۔ وہ نہایت ہنرمندی سے اساسی ماخذات کو کھنگالتے ہیں۔ ان کے دیباچوں کا وصف تضادات کو رفع کرنا، حقائق کا ادراک کرنا اور فکر ونظر کو عمومی مغالطوں سے آزاد کرنا ہے وہیں وہ شاعری کے فنی محاسن اور اسلوب کی توصیف میں بھی غلطاں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قاری اور کتاب کے مابین داخلی ہم آہنگی کو چابک دستی سے پیدا کرتے ہیں مثلاً قاسمی نے اپنی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد کی کتاب ''طلوع'' کا دیباچہ نہایت تفصیل سے اوردل لگا کر لکھا۔ اس دیباچے میں بھرپور تحقیق وتنقید سے کام لیا گیا ہے۔ انھوں نے مصنفہ کی علمی وادبی صلاحیتوں، ذہنی رسائی اور نئے اسلوب کا تذکرہ خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اردو کی جدید شاعری میں منصورہ احمد کا منفرد لحن یہ ارتقائی کیفیت بھرپور انداز میں پیدا کر رہا ہے۔ منصورہ کی شاعری یقیناً اردو شاعری کی عظیم روایت کے تسلسل کی ایک کڑی ہے اور اسے مثبت روایت کو فن کی جدیدیت میں نئے اسلوب سے برتنا آتا ہے۔ اس کی ہمہ جہت انفرادیت نے اس کی آواز میں اعتماد، گہرائی اور گھمبیرتا کی ایک ایسی گونج پیدا کر دی ہے جو صرف اسی سے مخصوص ہے۔۔۔ منصورہ بیسویں صدی کے آخری حصے کی وہ شاعرہ ہیں جس کا لہجہ منفرد اور جس کا لحن مستقبل گیر ہے۔ سچی، کھری اور معیاری شاعری کے متوالے منصورہ کے فن سے جتنی بھی اُمیدیں وابستہ کریں، وہ سب میرے اندازوں کے مطابق حرف بہ حرف پوری ہوں گی کہ وہ مثبت معنوں میں ایک غیر معمولی فن کار ہے۔''[۱۱]

قاسمی میں اگرچہ ناقدانہ حس بھی تھی۔ اس لیے ان کے تنقیدی عمل کو تخلیقی عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے احباب کی کتابوں پر بھی دیباچے لکھے لیکن ان دیباچوں میں قاسمی کی تنقیدی حس بھرپور انداز سے کام کرتی ہے۔ وہ دیباچوں میں مصنف وشاعر کے تعارف کے ساتھ ہی اس کے کلام میں انفرادیت کے پہلو بھی تلاش کر لیتے ہیں۔

ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے چھوٹے بھائی خالد احمد کی کتاب ''ایک مٹھی ہوا'' میں خالد کے اندازِ بیاں، طرزِ نگارش، انفرادیت کے پہلو کو بیان کرتے ہوئے ان کے علمی اور ادبی نظریات کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خالد احمد میرے ہاتھوں میں پلا بڑھا اور پڑھا ہے مگر مجال ہے جو اس نے میری شخصیت کا ذرا سا اثر بھی قبول کیا ہو۔ یہ اس کی انفرادیت کا ایک اٹل ثبوت ہے کہ میرے سائے میں رہنے کے باوجود نہ اس کے کلام میں میرے کلام کا کوئی عکس دست یاب ہے اور نہ میں اس کے عادات و خصائل میں کہیں موجود پایا گیا ہوں۔ یہ بھی خالد احمد کی بڑائی کا ایک پہلو ہے اور اس کا گواہ اس کا کلام بھی ہے۔ اس کی تنقیدی کاوشیں بھی ہیں اور اس کا مزاج و کردار بھی۔ یہ شخص منفرد ہے یعنی خالد احمد اوّل تا آخر خالد احمد ہے۔'' [۱۲]

وسیع مطالعے کے مالک، صمد انصاری کا کلام نپا تُلا ہے۔ ان کا مشقِ سخن برسوں سے جاری ہے۔ انھوں نے اپنے جذبوں کو نہایت حساسیت سے کلام میں پیش کیا ہے۔ صمد انصاری کی غزل میں چونکانے کے عنصر نے انھیں بہت متاثر کیا۔ یہ فنون کے لیے موصول شدہ غزلوں کو بطور خاص نوآموز شاعر و ادیب کے کلام کا مطالعہ نہایت غور و خوض سے کرتے کیوں کہ قاسمی کی رائے میں ''انھی میں مستقبل کے وہ اساتذہ موجود ہیں جو ہمارے دور کے مستند شعرا کی روایات کو آگے بڑھائیں گے جس طرح انھوں نے غالبؔ اور اقبالؔ کی روایات کو آگے بڑھایا۔'' [۱۳] یہ شاعروں کی حوصلہ افزائی میں بعض اوقات مبالغہ کی حد تک پہنچ جاتے ہیں جیسے اختر حسین جعفری کے مجموعہ کلام ''جہاں دریا اُترتا ہے'' کے دیباچے میں ان کے وجود کو فنِ شاعری کی تجسیم کہا ہے وہیں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''۔۔۔کم سے کم ۱۹۴۷ء کے بعد اس پائے کا پیکر ساز اور تمثال ساز اور علامت ساز اور تراکیب ساز شاعر بہ مشکل ہی دست یاب ہوگا۔۔۔ اختر حسین جعفری کا جسم یقیناً غروب ہوگیا ہے مگر اس کی شاعری کا آفتاب غروب ہونا نہیں جانتا۔ یہ انتہا درجے کی زندہ شاعری ہے کہ آنے والی صدیاں بھی اس کے لفظوں سے پھوٹتی ہوئی شعاعوں کو سمیٹتی اور اپنی راہیں روشن کرتی رہیں گی۔'' [۱۴]

قاسمی ایک منجھے ہوئے دیباچہ نگار کی مانند صاحبِ کتاب کے فن میں تجسس اور انہماک کو اس منزل پر لے آتے ہیں جہاں اس کے ذاتی نظریات مجروح نہ ہوں بلکہ یہ ایک لچک کو پیدا کریں اور قاری بھی اس بات کو بخوبی قبول کرے کہ اس مقام پر دیباچہ نگار اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے متوقع شخصیت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے مثلاً ثاقبہ رحیم الدین کے دیباچے میں یہی وصف نمایاں ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔اس کی مصنفہ مجسم تہذیب۔۔۔ مجسم شائستگی ہے۔ افسانہ ہو، انشائیہ ہو، شخصیت نگاری ہو یا بچوں کے لیے کہانیاں ہوں ثاقبہ رحیم الدین چار طرف تہذیب و شائستگی کی روشنیاں پھیلاتی محسوس ہوتی ہیں۔ دورِ حاضر کی منافقت اور زر پرستی کی آندھیوں میں محبت اور ایثار کے چراغوں کو بجھنے سے بچانا بیگم ثاقبہ کا محبوب اور پاکیزہ اصول ہے۔'' [۱۵]

قاسمی ماہرفن کار کی طرح صاحبِ کتاب سے قاری کا تعارف کرانے کے بعد اپنی شخصیت کو مخفی رکھتے ہیں۔ نہایت محنت سے صاحبِ کتاب کی تخلیق سے حکمت آمیز جملے تلاش کر کے دیباچے میں سجاتے ہیں جو زندگی کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ان جملوں کا مطالعہ ایک تلخ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے مثلاً:

> ''بھلا انگلی میں ہیرے اور یاقوت کی انگوٹھی کس کام کی جب ہاتھ کی پور پور دُکھ رہی ہو اور نس نس میں درد ہو۔'' ۱۶

قاسمی پر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ وہ ہر ادیب وشاعر کی کتاب پر دیباچہ تحریر کر دیتے تھے۔ اس اعتراض کی بابت عبداللہ ملک لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔یہ ان کی عظمت اور نوجوان نسل کو اچھے ادیب سے متعارف کرانے اور اس کو شاباش دے کر کچھ کر گزرنے کا سلیقہ فراہم کرنے کا اسلوب ہے جو کم لوگوں اور آج کے ادیبوں کو حاصل ہے۔'' ۱۷

قاسمی کی دیباچہ نگاری کا سفرفن سے شخصیت کی دریافت کا سفر ہے۔ شخصیت سے قریبی تعلق کی بنا پر نہایت احتیاط سے دیباچہ تحریر کرتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ ہم عصر ادبا وشعرا کی کتابوں پر بھی دیباچے لکھے جن پر رائے زنی کرتے ہوئے قلم بار بار ڈگمگا جاتا ہے لیکن فاضل دیباچہ نگار نہایت مہارت و روانی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> ''جلیل عالی نے اپنے۔۔۔ دل کی لوح پر سچائی کا اسم روشن کر رکھا ہے۔ یہ اس کے اپنے الفاظ ہیں مگر خودستائی سے مبرا۔ اس لیے سچے اور دیانت دارانہ ہیں۔ اس نے مرئی اور ظاہری سچائیوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ڈھکی چھپی سچائیوں کا بھی کھوج لگایا ہے اور ان سچائیوں کو ہر جہت سے پرکھا اور برتا ہے۔'' ۱۸

قاسمی نے حسن اختر جلیل کے شعری مجموعہ ''مقتل میں چراغ'' کا دیباچہ ''جلیل کی شاعری'' کے عنوان سے قلم بند کیا۔ یہ دیباچہ شاعری اور اس صنف کے ارتقا کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ دیباچہ مختصر مگر جامع ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں نہایت سلیقے سے اپنے ماحول کی جانب غیرجانب دارانہ انداز میں اشارہ کیا ہے اور جلیل کے کلام کی خصوصیات کا اظہار بھی سادگی سے کیا ہے۔ قاسمی اپنے تنقیدی مضامین کی طرح دیباچوں میں بھی ادیب وشاعر کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثرات و حالات کی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''حسن اختر جلیل اپنی ذات کو انسانوں کے اس جمِ غفیر کا ایک حصہ سمجھتا ہے جس کی محرومیاں اسے بے چین کر دیتی ہیں اور جس کی مسرتیں اُس کی سرشاری کا باعث بنتی ہیں۔ یوں حسن اختر جلیل کا فن مابعد الطبیعات کی دھند میں سانس لینے کی بجائے

حقائق کی اُس دنیا میں زندہ ہے جس میں گرد و غبار بھی بہت ہے مگر جہاں پھول بھی
کھل رہے ہیں اور کھیت بھی لہلہا رہے ہیں۔'' ۱۹

یاسمین حمید کے شعری مجموعے ''حصار بے دیوار'' میں شاعرہ کی سوچ کی پختگی، فن میں جذبہ وفکر کا وفور، زندگی سے محبت کے درس، مشاہدات کی گہرائی، صداقت کی علم بردار شاعری اور اُن کے مسحور کن اشعار کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے یاسمین کے اشعار میں اُداسی کی لہر کا موازنہ غالبؔ سے کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

'' میری آنکھیں گواہی دے رہی ہیں
کسی امید کے آزار میں ہوں

اس ''امید کے آزار'' سے مجھے غالبؔ یاد آ گئے جنھوں نے کہا تھا:

؎ پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار ، تمنا کہیں جسے

غالبؔ کا یہی ''افسونِ انتظار'' یاسمین کا ''اُمید کا آزار'' ہے۔ اس اُمید کو یاسمین کا وہ اعتماد اور اثبات کہنا چاہیے جو اس کے فن کا جلی عنوان ہے۔'' ۲۰

فرحت پروین انسانی ہمدردی، ہمہ گیر قوتِ مشاہدہ کی حامل حساس فن کار ہیں۔ بیرونِ ملک مقیم ہونے کے باوجود ان کی کہانیوں میں مظلوم و مقہور تنہا کرداروں کی بے بسی پر اظہارِ ہمدردی ملتی ہے۔ قاسمی نہایت فن کاری سے اور بسیط مطالعہ کر کے پیش لفظ میں ہی فرحت کے ہر افسانے پر تفصیلاً تنقید کی ہے۔ ان کی کہانیوں کی بابت رقم طراز ہیں:

''فرحت انسانوں میں عموماً مظلوم، مقہور، مفلس اور تنہا کرداروں کے ساتھ والہانہ ہمدردی اور دردمندی کا اظہار کرتی ہیں مگر کہیں بھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتیں۔ فنی توازن ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ ان کرداروں کا کرب افسانہ نگار کی ہڈیوں کے گودے تک میں اُترا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر وہ جانتی ہیں کہ وہ ایک تخلیق کار ہیں اور براہِ راست اظہار سے زیادہ رمز کا ایک لفظ۔۔۔ ایک اشارہ ان کا موثر ترین ہتھیار ہے۔ وہ واقعے یا شخص یا کیفیت کو بے لاگ سچائی سے بیان کرتی ہیں مگر بین السطور بیان کرتی ہیں اور قاری کی ذہانت پر اعتماد رکھتی ہیں۔'' ۲۱

طنز و مزاح کا آپس میں گہرا رشتہ ہے جب ان کا معانقہ ہو جائے تو دل دوز اشعار تخلیق ہوتے اور دل کش نثر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اگرچہ معیاری مزاح ایک مشکل فن ہے لیکن سرفراز شاہد کے ''ڈش اینٹینا'' میں معیاری مزاح کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ قاسمی نہایت ہنرمندی سے ڈش اینٹینا کا دیباچہ تحریر کرتے ہوئے معروف ادیبوں کے اقوال بھی درج کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''یہ ہے ہمارا نہایت تیکھے تیوروں والا سادہ و پرکار سرفراز شاہد جس نے اپنے مزاح میں

پھکڑ پن اور سوقیانہ پن کو پاس پھٹکنے نہیں دیا اور جسے بابائے مزاح سید ضمیر جعفری کی یہ
سند حاصل ہے کہ سرفراز شاہد کی تخلیقات سے مزاحیہ شاعری کی آبرو اور پاکیزگی میں
اضافہ ہوا ہے۔'' ۴۲

محولہ بالا متنوع مثالوں سے عیاں ہوتا ہے کہ قاسمی کے تحریر کردہ دیباچوں میں اوّلیت اس امر کو حاصل ہے کہ قاسمی کتاب کے صوری و معنوی حسن پر بھرپور توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ وہ دیباچے کی تحریر کو کتاب اور صاحبِ کتاب کے بھرپور تعارف میں تبدیل کرا لیتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ تنقیدی دیباچے کم لکھے جب کہ توصیفی دیباچوں پر زیادہ توجہ دی۔ ان کے بعض دیباچے تنقید و تنقیص باہم مربوط ہو گئے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی اور فن کی صداقتیں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ وہ دانش وری کی روایت کو آگے بڑھاتی ہیں۔ ان کا اسلوب صداقت، درد مندی، عدل، محبت اور انسان دوستی جیسی اقدار و روایات کا پابند ہے۔ ان کا دیباچہ نگاری کا فن اجتماعی اور انفرادی زندگی کو ذہنی و فکری انتشار سے بچانے کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قاسمی اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ راست فکر سے اُٹھایا ہوا ایک قدم بھی مستقبل میں اعتدال و توازن، مروت و مودّت کی صورت پذیری کر سکتا ہے اور یہ اُس وقت ہی ممکن ہو سکے گا جب شعر و ادب کے ذریعے علم و دانش کی روایت آگے بڑھتی رہے۔

قاسمی دیباچہ لکھنے میں بہت فیاض مشہور تھے۔ اردو ادب کی بیشتر اصناف پر انھوں نے مبسوط اور مدلل دیباچے لکھے بعض افراد کے نزدیک قاسمی کتابوں کے دیباچے لکھنے میں غیر محتاط تھے جو بھی پرانا یا نیا ادیب و شاعر اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنے کی گزارش کرتا، اُسے مایوس نہ کرتے۔ بعض افراد کے نزدیک انھوں نے اُجرت پر دیباچے لکھے لیکن منصورہ احمد اس رائے کی تردید کرتی ہیں۔ قاسمی اگرچہ بسیار نویس دیباچہ و فلیپ نگار تھے ان کی مروت کسی کی دل آزاری گوارہ نہ کرتی تو ان کی اس مروت کا استحصال کر کے کمزور سے کمزور فن کا مالک بھی اپنی کتاب پر تعریفی آرا لکھوا لیتا تھا۔ اگرچہ اس مروت نے ان کے فن پر منفی اثرات ثبت کیے۔ ان کی فیاضی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ انکار نہیں کرتے تھے اور اگر کبھی انکار کر دیتے تھے تو منصورہ احمد کے بقول:

''لوگ بابا کے پاؤں پکڑ لیتے اور اُس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک بابا دیباچہ یا
فلیپ لکھنے کے لیے وعدہ نہ کر لیتے۔'' ۴۳

بریں ہمہ ضعف صحت اور کمزوری بینائی کی وجہ سے عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے دیباچے پر توجہ کم مبذول کی اور فلیپ لکھے۔ اگر یہ دیباچہ لکھنے سے انکار کرتے تو دوست احباب فلیپ لکھنے کی درخواست کرتے اور اُس وقت تک اُٹھنے کا نام نہ لیتے جب تک قاسمی وعدہ نہ کرتے۔ اگرچہ ان کے دیباچوں میں ادبی چاشنی زبان کی گھلاوٹ نظر آتی ہے۔ یہ اس عمدہ طریقے اور لطافت سے مصنف کے سچے جذبات اور فن کارانہ صلاحیتوں کا اعتراف

کرتے ہیں کہ صاحب تصنیف کے معاشرتی و قلبی تعلق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریروں کا خاص وصف وضاحت، تشریح و توضیح، اعتدال اور عام فہم انداز ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچوں میں مصنف کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے صلاح نیک سے بھی نوازا ہے۔ دیباچہ نگاری تحریر کرتے وقت وہ تصنیف کا گہرا مطالعہ کرتے ہوئے صاحبِ کتاب کو مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ دیباچوں کے مطالعہ سے دیباچہ نویس کے تبحر علمی، وسعتِ مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

فلیپ نویسی:

فلیپ کتاب کے گرد وپیش یا سرورق کی پشت پر شایع کروایا جاتا ہے۔ یہ سینئر ادیب کی کسی کتاب یا مصنف کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ فلیپ کے متعلق ڈاکٹر گیان چند جین اپنے مضمون ''اردو کی ادبی نثر کی اصناف'' میں رقم طراز ہیں:

''اگر کسی اہل الرائے کو مقدمہ لکھنے کی فرصت یا رجحان نہیں ہوتا تو وہ اپنی مختصر رائے دے دیتا ہے۔'' ۲۴

دیباچہ نویسی کے ساتھ ہی فلیپ نگاری بھی قابلِ توجہ ہے۔ یہ ایک بسیار نویس فلیپ نگار تھے۔ بقول منصورہ احمد:

''وقت کی کمی کے باعث دیباچہ نہ لکھ سکتے تو فلیپ لکھ دیتے۔'' ۲۵

قاسمی نے جن تصانیف پر فلیپ تحریر کیے، ان میں نثری و شعری مجموعے بھی شامل ہیں۔ وہ شخصیت و فن سے متعلق معلومات بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے اردو فلیپ کے علاوہ پنجابی فلیپ بھی لکھے۔ ان میں فرق صرف زبان کا ہے۔ یہ فلیپ کسی بھی حیثیت سے اردو فلیپ کے ہم پایہ ہیں۔ ان کے فلیپ مروت کی روشنائی میں قلم ڈبو کر لکھے گئے ہیں۔ یہ تحریری فلیپ، نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی و تنقیدی ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ جس کتاب پر فلیپ لکھتے اس کے مطالب و مقاصد پر خاطر خواہ فہم و ادراک حاصل کرتے۔ پھر کتاب کے نفس مضمون پر غور و خوض کے بعد فلیپ لکھتے۔ انھیں صاحبِ کتاب کی تخلیق اور اپنے تصورات کی پختگی پر مکمل اعتماد تھا۔ محققین و ناقدین کی تحریروں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کے تحقیقی و تنقیدی امور کو سراہنا ان کا وصفِ خاص تھا۔ وہ لکھنے والوں سے پُرامید ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا واشگاف الفاظ میں اظہار کرتے مثلاً ڈاکٹر محمد سلیم ملک نے ''سید امتیاز علی تاج زندگی اور فن'' پر مقالہ تحریر کیا۔ قاسمی اس کتاب کی توصیف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر محمد سلیم ملک نے سید امتیاز علی تاج کی شخصیت اور فکر و فن کے بارے میں ہر لحاظ سے ایک مکمل دستاویز تیار کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں

کیا اور امتیاز مرحوم سے متعلق ہر شخص اور ہر تحریر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یوں انھوں
نے ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو اردو ادب، اردو ڈرامے اور اردو کتابوں کی اشاعت کی
تاریخ کا مستند حوالہ ثابت ہوگی۔'' ۲۶

قاسمی ادب کے نو وارد ادبا و شعرا کی فنی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ والہانہ طریقے سے استقبال کرتے۔ دوربین نگاہ کے مالک قاسمی؛ اس شاعر و ادیب کے مستقبل کا اندازہ اس کے فن سے لگا لیتے تھے مثلاً اسرار ایوب کی کتاب ''سرسوں برسوں کی'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔اس کے فن کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل قریب میں وہ اردو کے اہم شاعر کی
حیثیت سے نمایاں ہوگا۔ وہ اپنے محسوسات وتصورات کے فن کارانہ اظہار پر ابھی سے حاوی
نظر آتا ہے اور اس کے ہاں الفاظ کے مفاہیم کی نئی سے نئی پرتیں صاف صاف دکھائی دینے
لگتی ہیں۔ میں کھلی باہنوں کے ساتھ اس نہایت ہونہار شاعر کا خیر مقدم کرتا ہوں۔'' ۲۷

حبیب جالب دنیائے شاعری کا معروف نام، ترقی پسند ادب کا علم بردار، حق گو اور بے باک شاعر تھے۔ انھوں نے عام فکری میلان اور اسلوبِ بیان سے حبیب جالب کے اوصاف کو خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کا مجموعہ شاعری کے فلیپ پر رطب اللسان ہیں:

''۔۔۔اردو شاعری کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ اس نے نہ تو
دور از کار علامات کا سہارا لے کر خود کو چلمن کے پیچھے چھپایا اور نہ استعارے کو پھیلا کر
اپنے مافی الضمیر کو فنی پینتروں کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا۔ ہر بات براہ راست
کی اور قطعی طور پر غیر مبہم اور دوٹوک انداز میں کی اور اس نے یہ سب کچھ اس دور میں
کیا جب سچ بولنا اپنا سر کاٹ کر ہتھیلی پر دھر لینے کے مترادف تھا۔'' ۲۸

قاسمی شاعر و مصنف کی باطنی صلاحیتوں اور شخصیت کے رموز کو بھی منظرِ عام پر لے آتے ہیں۔ شاعر کی انفرادیت نمایاں کرنے کے بعد اسے درخشاں مستقبل کی نوید بھی سناتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی علمی و ادبی خدمات کو بھی قابلِ تحسین گردانتے ہیں۔ یہ فلیپ کی روشنی میں اس کتاب کی اہمیت متعین کرتے ہیں۔ ناقدانہ صلاحیتوں کے حامل قاسمی ادیب و شاعر کو صلاحِ نیک سے نوازتے ہیں مثلاً رخشندہ نوید دورِ حاضر کی شاعرہ ہیں۔ قاسمی نے اُن کے فنی ادراک کے بعد اس امر کی سراغ رسانی کی ہے کہ وہ غزل کی بجائے نظم کی شاعرہ ہیں۔ اپنے احساسات و افکار کو نہایت دل کش و عمدہ الفاظ میں کچھ ایسی فن کاری سے ادا کرتے ہیں کہ ادیب و شاعر بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرا اندازہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ اس کی نظموں کے موضوعات
میں تنوع ہے چناں چہ اس تنوع میں اس کے باطن کی ترجمانی بھی ہے اور خارج کی
عکاسی بھی۔ اس عکاسی میں عورت کے گھریلو مسائل کے علاوہ معاشرتی انتشار، سیاسی

بے یقینی۔۔۔بھی کارفرما ہے اور ان سب مسائل کے بارے میں شاعری کا اپنا رویہ اور
نظریہ بھی۔ جس پر کہیں اثبات کی روشنی پڑتی تو کہیں الیہ کی دھند چھا جاتی ہے اور لمحہ
رواں کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔'' ۲۹

قاسمی شاعر کےفن کی روح کے اعماق میں حیات و کائنات کے اسرار و رموز کو منکشف کرتے ہیں۔ ان
کی آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جس کا عصرِ حاضر کی حساس نسل کو سامنا ہے۔ قاسمی لفظ و معنی کے پس منظر میں پوشیدہ وسیع تر
امکانات میں محوِ سفر دکھائی دیتے ہیں۔ جمالیاتی آہنگ، فکری تشکیلات، متاثر کن اندازِ بیان کم کم افراد کے حصے میں
آتا ہے۔ وہ ناقدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعر کے مجموعے میں گہری باتیں بھی تلاش کرتے ہیں
جس سے شاعر کےفن کارانہ جوہر دمک اُٹھتے ہیں۔ وہ شاعری کی تخلیق پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور مجموعہ شائع
ہونے پر مبارک باد بھی پیش کرتے ہیں مثلاً فن کار کی شخصیت و فن پر اظہارِ خیال کے بعد خداداد صلاحیتوں کا
اعتراف کرتے ہوئے مخفی خامیوں کو بھی ساتھ پیش کرتے ہیں مگر اتنی فن کاری سے اور میٹھی زبان میں کہ شاعر و ادیب
پر گراں نہیں گزرتا۔ قاسمی خوب صورت خیالات کو دل کش الفاظ کا جامہ کچھ اس طرح پہناتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کے اندر ایک خوش فکر شاعر چھپا بیٹھا ہے۔ کہیں کہیں مشق کی کمی ان
کے اظہار میں رکاوٹ بنتی محسوس ہوتی ہے۔'' ۳۰

اشرف جاوید کی شاعری جدید عہد کی ترجمانی کرتی ہے۔ قاسمی نوجوان شعرا میں نئے پن اور انفرادیت
تلاش کرتے ہیں۔ یہ اگرچہ نوجوان نسل کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تحسین و توصیف کا عنصر بھی اپناتے ہیں۔ یہ
نوجوان نسل کے مستقبل کو پرامید نگاہوں سے دیکھتے۔ اشرف جاوید کے شعری مجموعے میں انفرادیت کے پہلو
تلاش کرتے ہیں۔ ''نخلِ نوا'' سے ''آنکھ بھر خواب'' تک کے شعری سفر میں وہ جوہرِ تدبر کی دولت سے مالا مال
دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں عمومی عصری بے حسی کو عیاں کرتے ہیں۔ اشرف جاوید کے شعری مجموعے
''آنکھ بھر خواب'' میں ان کے منفرد اسلوب اور لہجے کی تحسین کے بعد لکھتے ہیں:

''وہ اپنی غزلوں میں ایک مثبت جستجو میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس جستجو کو آخری حقیقت
تک رسائی کی جدوجہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظاہری اور باطنی مظاہرِ فطرت پر اس کی
تخلیقی حیرت اُس کی شاعری کی ایک منفرد خصوصیت بن چکی ہے اور اس کیفیت کے
اظہار میں وہ غزل کی جان دار اور خوب صورت روایات کی پاس داری کے ساتھ ساتھ
اپنی انفرادیت کو بڑی استقامت سے نمایاں کرتا چلا جا رہا ہے۔'' ۳۱

اے۔جی۔جوش غزل کے مقبول شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں نرم گفتاری، سلیقہ مندی، تنوع، رنگا رنگی،
بوقلمونی، عصری مسائل، سماجی شکست و ریخت اور سیاسی کم مائیگی کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں سمجھتا ہوں کہ
اے۔جی۔جوش کی یہ غزلیں اردو شاعری کے شیدائیوں میں بہت مقبول ہوں گی۔'' ۳۲ قاسمی کی یہ پیشین گوئی

حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ انسانی زندگی کی ایک خوب صورت حقیقت محبت بھی ہے، جس کی بدولت محفلِ دنیا میں رونق اور چہل پہل ہے۔ قاسمی ماہرِ نفسیات کی مانند ادیب و شاعر کے فن کے ذریعے اس کی شخصیت کی پرتیں کھولتے ہیں۔ بقول قاسمی:

> ''اسرار ایوب نے اپنی شاعری کے لیے وہ موضوع منتخب کیا ہے جو ہمیشہ نیا رہے گا، کبھی پرانا نہیں ہوگا۔ یہ موضوع حسن و محبت کی کارفرمائی کا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان سائنسی اور مادی لحاظ سے ہزار ترقی کر جائے اس کے باطن میں حسن سے متاثر ہونے اور محبت کرنے کی توانائی کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔'' ۳۳

قاسمی کی تنقیدی بصیرت فلیپ میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ رسمی تحسین و توصیف سے بھرپور فلیپ تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف کی داخلی شخصیت کو بھی پیش کرتے ہیں جو تخلیقات فن کار کے تار و پود میں بکھری ہوئی ہیں مگر عام قاری کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ حفیظ تائب نے نعت میں اپنا مقام پیدا کیا۔ ان کی کتاب کے فلیپ پر لکھتے ہیں:

> ''یہ دور اردو زبان میں نعت گوئی کا دورِ روشن ہے اور اس دورِ روشن کے آفتاب بلاشبہ حفیظ تائب ہیں کہ اس شخص نے حضورؐ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار اتنی گہرائی، اتنی شدت، اتنی تہذیب اور اتنے سلیقے سے کیا ہے کہ ان کی نعت کے الفاظ میں جذبے دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے اور نقطے نقطے میں صلی اللہ علیہ وسلم کی گونج سنائی دیتی ہے۔'' ۳۴

وزیر آغا، قاسمی کے ہم عصر ادیب، شاعر اور نقاد تھے۔ انھوں نے نہایت غیر جانب دارانہ رویہ اپناتے ہوئے دل کھول کر ان کی تخلیقات کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے وزیر آغا کی کتاب ''شام اور سائے'' کا فلیپ نہایت انہاک سے تحریر کیا۔ قاسمی، وزیر آغا کے فن کو سراہتے ہوئے فراخ دلی سے اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''وزیر آغا نے داخلیت اور خارجیت، روح اور مادہ، وجدان اور شعور کو جس انداز سے اپنی شاعری میں سمیٹا ہے۔ وہ کچھ انھی کا حصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ شعر کہتے ہیں تو اُن کی بصیرت اور بصارت دونوں بیدار اور بیک وقت مصروف کار ہو جاتی ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی اردو شاعری کے مستقبل کا رُخ متعین کرنے کے لیے شاعر کی فکر کا واضح ہونا اور اس کی فنی تخلیق کا حسین ہونا بے حد ضروری ہے۔ وزیر آغا کے فن میں یہ دونوں خصوصیات موجود ہیں اور یہ اردو شاعری کے حق میں ایک نیک فال ہے۔'' ۳۵

مندرجہ بالا رائے اُس دور کی ہے جب دوستانہ مراسم نے چپقلش کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ ان کی معاصرانہ چشمک اور ادبی نظریات میں اختلاف سے قارئین بخوبی آگاہ ہیں لیکن ایک حساس و باشعور فن کار مستقبل کو بھانپ

لیتا ہے۔ قاسمی آخری وقت تک ادب میں وزیر آغا کی فن کارانہ صلاحیتوں کے معترف رہے۔ قاسمی زندگی کے بطن میں اُتر کر اور فن کار کی شخصیت کا تجزیہ کرتے پھر اپنے مشاہدات و تجربات کو سلیس، عام فہم اور رواں زبان میں قاری کے سامنے اس انداز سے پیش کرتے کہ عام قاری بھی اس سے ذہنی و روحانی فیض حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حمید اکبر ایک بے باک، باریک بین اور نڈر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے صداقت کے پیکر اور معاشرتی زندگی کی بے راہ رویوں، انسانی الجھنوں اور نفسیاتِ انسانی کی باریکیوں کو عیاں کرتے ہیں۔ یہ گہرے، کھرے مشاہدے کے مالک افسانہ نویس ہیں جو اپنی تحریروں کو موثر بنانے کے فن سے کماحقہ آگاہ ہیں:

> ''حمید اکبر اپنے منصبی فرائض کی وجہ سے بہت وسیع المشاہدہ افسانہ نگار ہیں۔ ہر وقت ان کے سامنے انسانی رشتوں کی الجھنیں اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں، انبار در انبار موجود رہتی ہیں چناں چہ وہ وہاں سے اپنی کہانیوں کا مواد حاصل کر کے اسے ذہانت کے ساتھ ادبی تخلیق میں متشکل کرتے ہیں۔۔۔ وہ سچی بات کہنے والے کھرے افسانہ نگار ہیں۔'' ۳۶

ادب کو زندگی کا آئینہ دار کہا جاتا ہے جب کہ افسانے میں زندگی اپنے اسرار سمیت ظاہر ہوتی۔ ایسے افسانے ہی قاری کے دل میں جگہ بناتے ہیں جس کے مطالعہ سے زندگی کے بھید منکشف ہوتے ہیں۔ گلزار کے افسانوی مجموعہ ''دستخط'' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔گلزار نے مختصر افسانے کا بھید پا لیا ہے۔ اس لیے اس کا ہر افسانہ شہ پارہ کہلانے کا مستحق ہے۔ گلزار کے افسانوں کے اس مجموعے ''دستخط'' میں ایسا ایسا افسانہ شامل ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد زندگی کے بعض اسرار کا انکشاف سا ہونے لگتا ہے۔ قاری گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے اور جب افسانے کے تاثر یا سحر سے نکلتا ہے تو اپنے دل و دماغ میں ایک مثبت تبدیلی محسوس کرتا ہے۔'' ۳۷

قاسمی نے تسنیم منٹو کے عہد، ان کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع کا سراغ مہارت سے لگایا ہے۔ وہ اصل کتاب کی جانب رجوع کرتے ہوئے ادب میں اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انھوں نے تسنیم کے اندازِ بیان، ادبی مقام و مرتبہ، تحقیقی جستجو، محتاط اندازہ سنجیدہ و علمی کاوشوں کو تسلیم کیا ہے۔ تسنیم منٹو کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان افسانوں میں اُن کی قوتِ مشاہدہ نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی۔ اُن کا تجزیاتی مزاج کہیں بھی مبالغے کی زد میں نہیں آیا۔ اُن کے اسلوبِ اظہار کی روانی میدان میں بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے کہ وہ بہہ رہا ہوتا ہے مگر بہتا محسوس نہیں ہوتا۔ زبان و بیان کی وہ صفت ہے جو دورِ حاضر میں بہت کم افسانہ نگاروں کو ودیعت ہوتی ہے۔'' ۳۸

بعض اوقات قاسمی کے فلیپ میں مبالغہ بھی در آتا ہے۔ ایسا انسان دوستی، خلوص یا تعلق کی نوعیت پر ہوتا ہے اور بعض اوقات لاشعوری طور پر نہایت روانی سے لکھتے جاتے ہیں جس سے عبارت کا تسلسل تو برقرار رہتا ہے لیکن عبارت مبالغہ کی زد میں آجاتی ہے۔حمید شاہد کے فن کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''محمد حمید شاہد نے سچی اور کھری زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ کہانی کہنے کے فن پر حیرت انگیز طور پر حاوی ہے۔ اس کے افسانوں کے ہر کردار کو زندگی کے اثبات یا نفی، مسرت یا محرومی کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان افسانوں کا ایک ایک کردار ایک ایک لاکھ افسانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔'' ۳۹

دیگر تصانیف کی طرح فلیپ میں بھی قاسمی کی زبان شستہ، عام فہم اور رواں ہے جس سے فلیپ کی روانی اور ابلاغ میں بہاؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلوب بیان کھردرا، خشک اور رسمی نہیں بلکہ ایسا متوجہ کن ہے کہ قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہتا ہے مثلاً ابدال بیلا کے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''ابدال بیلا کے افسانوں میں کردار نگاری کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ یہ سب کردار اس نے اپنے آس پاس کی زندگی سے چنے ہیں اور انھیں ایسے باریک بلکہ مہین مشاہدے کے ساتھ ان کی نفسیات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کر پیش کیا ہے کہ اس کے بیشتر افسانے حقیقت نگاری کی اعلیٰ اقدار کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔'' ۴۰

مزاح نویسی ایک کٹھن فن ہے۔ زندگی کی بے راہ رویوں پر طنز کے نشتر چلانا اور دل میں درد کی اُٹھتی ہوئی ٹیسوں کو نہایت سلیقے سے اور خوش کن انداز میں پیش کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اس کرب مسلسل کا بخوبی اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو اس سے گزر چکا ہو۔ قاسمی، ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کی بے ساختگی مزاح کی توصیف کرتے ہوئے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مزاح نویسی ہر فن کی طرح نہایت مشکل فن ہے مگر ڈاکٹر سلیمان عبداللہ نے اس مشکل پر بڑے سلیقے، خوش دلی اور شگفتگی سے عبور حاصل کر لیا ہے۔ ان کے مزاح پر کہیں آورد کا شائبہ نہیں ہوتا۔ یہ صحیح معنوں میں بے ساختہ مزاح ہے۔ اردو میں بے ساختہ مزاح کی مقدار آہستہ آہستہ نہایت کم ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ اردو مزاح کو ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کے سے بے ساختہ مزاح نگار کی شدید ضرورت ہے۔ میں مزاحیہ ادب کی دنیا میں ڈاکٹر ڈار کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' ۴۱

قاسمی نے فلیپ میں عام فہم، سادہ اندازِ بیان کو قابلِ ستائش گردانا ہے۔ انور ندیم علوی، قاسمی کے ہم تخلص بھی تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی کتاب میں شیخ ایاز کی سندھی شاعری کے اردو تراجم بھی پیش کیے ہیں۔ قاسمی

نے متعدد جہات سے لائق تحسین ان تخلیقات کو سراہا بھی ہے اور مجموعہ کے نام کی تکرار سے ایک دل کش ترنم پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

> ''ندیم علوی کے یہ تراجم اتنے معیاری اور سچے ہیں کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ میری رائے میں ندیم علوی نے ان تراجم کے ذریعے شعر و ادب کی تاریخ میں اپنے نام کی شمولیت کا نہایت جائز جواز پیش کر دیا ہے۔ ان کی اوریجنل غزل بھی جدید اور عصرِ حاضر کی نمائندہ ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ ''ندیم تنہائی'' اہلِ ذوق کے لیے واقعی ندیم تنہائی ثابت ہوگا۔'' ۴۲

اگرچہ اردو ادب میں فلیپ نویسی کے خاص اصول و ضوابط متعین نہیں ہیں۔ کامیاب فلیپ اپنے لکھنے والے کے تبحر علمی، وسعتِ مطالعہ، ذہنی اُپج، تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں، وسعتِ نگاہ اور غیر جانب داری کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ قاسمی کے فلیپ مندرجہ بالا تمام اوصاف پر نہایت کامیابی سے پورے اُترتے ہیں۔ ان کے فلیپ جہاں ادیب و شاعر کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں خوش آئند مستقبل کی نوید دلاتے ہیں وہیں یہ فلیپ مجموعے کی خامیوں، کوتاہیوں کو بھی منظرِ عام پر لاتے ہوئے انھیں ماہر نقاد کی طرح نیک صلاح سے بھی نوازتے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں کہیں یہ نو وارد ادیب و شاعر پیچھے نہ رہ جائیں۔ فلیپ چوں کہ اس لیے تحریر کیے جاتے ہیں کہ ادبی حلقوں میں شاعر و ادیب کا معتبر حوالہ بن جائے۔ اس کی شناخت ہو سکے اور ادب میں دل چسپی رکھنے والوں کی طرف سے اس مجموعہ کو پذیرائی ملے۔ قاسمی نے محولہ بالا تمام نکات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فلیپ تحریر کیے۔ اگرچہ یہ فلیپ موثر، دل کش اسلوبِ بیاں کے حامل نہیں لیکن ان کے فلیپ چند کوتاہیاں بھی رکھتے ہیں جو قاری پر گراں گزرتی ہیں مثلاً:

۱۔ فلیپ میں دوستانہ رویہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

۲۔ قاسمی کی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد کے پبلشنگ ادارے اساطیر پبلی کیشنز کے زیرِ اشاعت کتب کے فلیپ انھوں نے دل لگا کر لکھے۔

۳۔ زیادہ فلیپ اپنے دوستوں، عزیز و اقارب کی کتب پر تحریر کیے مثلاً خالد احمد، اے۔ جی۔ جوش، حبیب جالب، قتیل شفائی، منصورہ احمد وغیرہ کے فلیپ عمدہ تحریر کیے۔

ترتیب و تدوین:

شاعری کا میدان ہو یا افسانے کا، کالم کا ہو یا دیگر صنفِ ادب کا، قاسمی ادب کے تقریباً ہر میدان کے شہ سوار تھے۔ ان کے ہمہ رنگ و ہمہ جہت کارناموں نے انھیں اہم سخن وروں کی صف میں کھڑا کیا۔ انھوں نے دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کے علاوہ کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی احسن طریقے سے کی۔ انھوں نے جن کتابوں کی

ترتیب و تدوین کے فرائض سرانجام دیے، یہ کتابیں زمانی ترتیب کے ساتھ درج ہیں:

ا۔	غنچے	۱۹۷۳ء	۲۔	انگڑائیاں	۱۹۴۴ء
۳۔	نقوشِ لطیف	۱۹۴۷ء	۴۔	نذرِ حمید احمد خاں	۱۹۸۰ء
۵۔	منٹو کے خطوط بنام ندیم	۱۹۹۱ء	۶۔	کیسر کیاری	۱۹۹۹ء

ا۔ غنچے:

غنچے پندرہ افسانہ نویس ادیبوں کے افسانوں اور قاسمی کے ایک ایکٹ کے ڈرامہ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ناقص الطرفین حالت میں دیکھی ہے جس میں شروع کے چھ صفحات ناپید تھے۔ اس لیے دیباچہ، فہرست کا تعین نہیں ہو سکا۔ بقیہ صفحات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ اس کتابچہ میں قاسمی کے دو افسانے ''سوز ناتمام'' اور ''ابتدا وانتہا'' کے علاوہ اوپندر ناتھ اشک کا ''بخیا''، لال چندر کا ''مصور کی موت''، حسن عزیز جاوید کا ''دو کانٹے''، صادق الخیری کا ''آخری رات''، عابد علی عابد کا ''سینما میں ایک شام''، غلام عباس کا ''طوطا''، خواجہ حسن عباس کا ''رئیس زادہ''، لالہ رام ناتھ کا ''حلیمہ''، پیارے موہن لال سری واستو کا ''منزل مقصود''، محمد عمر فاروق کا ''خیال کا جادو''، خلیل احمد کا ''اولین تصنیف''، سروری راجہ کا ''ریحانہ''، آغا ابوسعید کا ''پھٹی پھٹی آنکھیں''، نسرین حسن کا ''پھل کی طشتری'' اور آخر میں احمد ندیم قاسمی کا ایک ایکٹ کا ڈراما ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' پر مشتمل ہے۔ قاسمی کے پیش نظر دو افسانے ''سوزِ ناتمام'' اور ''ابتدا اور انتہا'' اختر شیرانی کے ادبی مجلّہ ''رومان'' میں ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئے۔

سوزِ ناتمام:

یہ افسانہ ایک شہزادی دل رُبا اور دہقانی کسان ریحان کی محبت پر مشتمل ہے۔ شہزادی دلربا غریب کسان ریحان کی مسحورکن آواز میں گیت سن کر اس کی عاشق ہو جاتی ہے۔ ریحان اُسے گانا سکھاتا ہے۔ چند روز میں شہزادی کے احساسات کی دنیا بدل جاتی ہے۔ جب ریحان پر یہ راز افشا ہوتا ہے کہ وہ جس پر فریفتہ ہے وہ شہزادی ہے تو وہ حیرت زدہ آواز میں کہتا ہے:

> ''تم تو ایک شہزادی ہو۔۔۔ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ میں تم سے الگ تھلگ رہتا، اب آنکھیں بند کر کے بے خبری میں میں زینے پر چڑھتا گیا، چڑھتا گیا! اب اس بلندی پر پہنچ چکا ہوں جہاں سے نیچے دیکھنے میں بھی جان کا خطرہ ہے، نیچے اُترنا تو کارے دارد! اور تم مجھے وہیں چھوڑ کر اور اوپر اُٹھ جاؤ گی! تم نے مجھے کیوں دھوکے میں رکھا؟ دہقان اور شہزادی کی محبت کبھی نہیں نبھ سکی۔ یہ رشتہ بہت نازک ہوتا ہے اور نازک رشتوں کی عمر تو تمھیں معلوم ہی ہے، ابھی کل ہی مجھے چھیڑتے ہوئے تمہاری کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔'' [۴۳]

ابتدا اور انتہا:

یہ افسانہ قاسمی کے تجربات و مشاہدات پر مشتمل، اُس دور کی کہانی ہے جب یہ بی۔اے کے طالب علم تھے اور ہوسٹل میں مقیم تھے۔ پیش نظر افسانے میں ایک یتیم اور مسکین نوجوان کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ محمود اپنے دوست کی بہن ناصرہ سے محبت کرتا ہے اور ناصرہ محمود کی محبت میں گرفتار ہے لیکن جب اس پر محمود کے بچپن کے حالات و واقعات اور یتیم خانے میں پرورش پانے کا راز افشا ہوتا ہے تو وہ محمود کو پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہ افسانہ محمود کی ناکام محبت اور ناصرہ کی بے وفائی پر مشتمل ہے۔ قاسمی بڑے خوب صورت پیرائے میں کہانی کے آغاز اور اختتام پر مندرجہ ذیل شعر رقم کرتے ہیں:

ابتدائے عشق میں دنیا کی نظریں مجھ پر تھیں
انتہا یہ ہے کہ تو نے بھی نہ پہچانا مجھے ۴۴

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ:

قاسمی کا ایک ایکٹ کا ڈراما بھی اس کتابچہ کے آخر میں شامل ہے۔ یہ ڈراما ۱۹۳۷ء میں مغربی پنجاب کی دیہی زندگی پر مشتمل ایک گھر کی کہانی ہے۔ پیش نظر ایکٹ کرماں اور شیر خاں کی محبت پر مشتمل ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ شیر خاں اور کرماں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں، عہد و پیماں ہوتے ہیں۔ شیر خاں فوج میں ملازم ہے۔ اُسے سرکار واپس بلا لیتی ہے۔ دونوں اگلے مہینے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ کرماں اپنی شادی کے خیالوں میں گم ہوتی ہے جب ہرکارہ دین محمد (شیر خاں کے والد) کی تلاش میں اِدھر آ نکلتا ہے۔ دین محمد کی تلاش سے مایوس ہو کر وہ واپس جانے لگتا ہے تو نوراں اس سے پوچھتی ہے:

نوراں: کب آئے گا شیر خاں؟___ کیا لکھا ہے اس میں!
ہرکارہ: شیر خاں پرسوں۔
نوراں: پرسوں آئے گا۔
ہرکارہ: پرسوں لڑائی میں مارا گیا ہے۔
کرماں چیخ مار کر چارپائی پر کھڑی ہو جاتی ہے۔
کرماں: شیرو مارا گیا ہے۔
کرماں بے ہوش ہو کر گرتی ہے۔ ایک بوڑھے کے رونے اور پیٹنے کی صدا آتی ہے۔ ہرکارہ سر جھکا لیتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ دُور سے بانسری کی بہت دردناک آواز آتی ہے۔ ۴۵

۲۔ انگڑائیاں:

یہ کتاب سعی بسیار کے باوجود دست یاب نہ ہو سکی۔ کتاب کے متعلق جو مختصر معلومات دیگر ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں ان سے یہ معلوم ہو سکا ہے کہ یہ کتاب مرد افسانہ نگاروں کے افسانوں کے انتخاب پر مشتمل تھی جو

فروغِ اردو لاہور سے ۱۹۴۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب صرف ایک بار ہی کم تعداد میں شایع ہوئی۔ اس کتاب کا نسخہ نہ تو کسی لائبریری سے دستیاب ہو سکا اور نہ ہی مرتب کے پاس اس کا کوئی نسخہ یا مسودہ موجود ہے۔

۳۔ نقوشِ لطیف:

نقوش لطیف چوبیس افسانہ نگار خواتین کے افسانوں، ادبی و فنی نظریات، نیز مختصر سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ زیر نظر مجموعہ خواتین کے چار مضامین ''ایک بات'' از عصمت چغتائی، ''نیا ادب'' از سرلا دیوی، ''ترقی پسند ادب'' از ممتاز شیریں، ''میرے فنی نظریات'' از طاہرہ دیوی، شیرازی کے تحقیقی و تنقیدی مقالات، چوبیس معروف افسانہ نویس خواتین کے سوانحی حالات اور افسانوں پر محیط ہے۔ کتاب کے آخر میں ''میرے خیال'' کے عنوان سے سترہ افسانہ نگار خواتین کے ادبی و فنی نظریات پیش کیے گئے ہیں جو افسانے میں جنس نگاری، پلاٹ، زبان و بیان، اسلوب اور اپنے مستقبل کے عزائم سے آگاہ کراتے ہیں۔ قاسمی کو جہاں مرد افسانہ نگاروں کے موضوعات میں یکسانیت بعد ازاں کمی کا احساس ہوا وہیں خواتین کے افسانوں بالخصوص عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں، تسنیم چھتاری، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، کوشلیا اشک وغیرہ نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ ان خواتین نے سماجی و معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی۔ پیش نظر مجموعہ ادب کی معروف خواتین کے افسانوں اور افکار و نظریات پر مبنی ہے۔ خواتین کے افسانوں میں انھیں ایک انفرادیت کا احساس ہوا چناں چہ انہی مرتب کردہ کہانیوں کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''میرے خیال میں کہانی سنانے کے لیے عورت، مرد سے زیادہ موزوں ہے، بشرطیکہ کہانی کو صحیح معنوں میں کہانی سمجھا جائے۔۔۔ عورت کی اس خصوصیت کا باعث یہ ہے کہ مرد کے مقابلہ میں سماج سے اس کا رابطہ گہرا اور حسین ہے۔ عورت ہماری منقلب سوسائٹی سے براہ راست متاثر ہے اور اس کا سماجی شعور مردوں سے پختہ ہے۔ اس لیے جب وہ دائمی رنگ کے افسانے سنائے گی تو اُن میں ایسی بے ساختگی واقعیت اور زندگی کی تعمیری تنقید کو سمو دے گی کہ اس کے سننے سے ہم اپنی معلومات میں اضافہ ہوتا محسوس کریں گے۔'' ۴۶

ابتدا میں ترقی پسند مرد افسانہ نگاروں نے جنس اور مزدور کے موضوعات پر افسانے تحریر کیے جب کہ دیگر موضوعات کو نظر انداز کر دیا۔ جب خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے مشاہدات و احساسات کو متنوع موضوعات میں قلم بند کیا تو مرتب کے خیال میں تب دیگر ادبا کو ایسے محسوس ہوا جیسے ادبی تالاب کی سطح پر موجود دل آویز لہروں میں انجماد کی بجائے، تموج پیدا ہوا چناں چہ خواتین نے موضوعات کے وسیع کینوس پر لکھا۔ بقول مرتب:

> ''اردو ادب میں اگر ان خواتین کا وجود نہ ہوتا، تو ہم میں سے بیشتر حضرات ابھی تک مزدور کی دیوالی اور بیوہ کی عید کے متعلق ہی لکھ رہے ہوتے۔'' ۴۷

''تہذیبِ نسواں'' اور ''ادبِ لطیف'' کی ادارت کے دوران انھوں نے کئی معروف خواتین کے افسانے پڑھنے کا موقع ملا جو فنی لحاظ سے پختگی کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ برسوں کی ریاضت کا نتیجہ بھی تھے چناں چہ خواتین نے اس میدان میں انفرادیت کو نمایاں کیا مثلاً عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں نے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کے حالات کو نہایت محنت و ریاضت سے منکشف کیا۔ تسنیم سلیم چھتاری نے اونچے طبقے کے نوجوان مرد اور خواتین کے ذہنی نشیب و فراز کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ قرۃ العین حیدر نے بورژوا طبقے کی کامیاب ترجمانی کی۔ صدیقہ بیگم نے کمیونزم سے اپنے افسانوں کو مزین کیا۔ حجاب امتیاز علی نے اپنے افسانوں کو زندگی کے تلخ حقائق کی بجائے رنگا رنگ پھولوں اور تخیلاتی دنیا سے عبارت کیا۔ غرض خواتین نے اپنی نگارشات میں ایک عمدہ نیز پائیدار ادب تخلیق کیا۔ ان کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر قاسمی نے ایک ایسا مجموعہ ترتیب دینے کا فیصلہ کیا:

> ''جو ادبی تاریخ میں ایک نمایاں مقام کا حامل ہو اور جس کے دم سے دورِ جدید کی افسانہ نگار خواتین کی ادبی خدمات کا ایک اٹل اور غیر فانی ثبوت مہیا کیا جا سکے۔'' ۴۸

چناں چہ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو طویل علالت سے صحت یابی کے بعد مجموعہ مرتب کرنے کا فیصلہ کیا اور مجموعہ میں شامل خواتین کی تحریروں کے ساتھ تصویروں کو بھی شامل کرنے کا سوچا لیکن خواتین سے تصویریں طلب کرنے پر معذرت کا اظہار پایا، بعض نے اپنے سوانح حیات بھیجنے سے انکار کیا، بعض شادی شدہ خواتین نے شوہروں کی سختی کی طرف توجہ دلائی۔ ایک خاتون (جس کا نام صیغہ راز میں رکھا گیا) نے تصویر طلب کرنے پر لکھا:

> ''ہاں یوں کہیے۔ ادبی نقطہ نظر سے نہیں، کاروباری لحاظ سے، اس طرح آپ کو خاص فائدہ رہے گا۔ عوام خواتین کے افسانوں کے ساتھ اُن کی تصاویر دیکھ کر بے حد محظوظ ہوں گے۔ بقول علامہ اقبال:
>
> ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
> آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار'' ۴۹

قاسمی نے چھے چھے ماہ کے طویل انتظار، سنگین خاموشی، طنزیہ جملوں سے گھبرا کر کئی بار انتخاب ترک کرنے کا ارادہ بھی کیا اور پھر موصول شدہ تحریروں کو شکریے کے ساتھ واپس کرنے کی بھی ٹھانی لیکن پرخلوص دوستوں مثلاً محمد طفیل، ابن انشا وغیرہ نے مرتب کے ارادے کو استقامت بخشی۔ یوں قاسمی کے بے پناہ برداشت، ادب سے لگاؤ، مستقل مزاجی، دوستوں کے تحرک کی بنا پر پیشِ نظر مجموعہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

۴۔ نذرِ حمید احمد خاں:

پاکستان کی جامع الحیثیات شخصیات میں پروفیسر حمید احمد خاں کا نام بھی شامل ہے۔ ان کی رحلت کے بعد مجلس ترقی ادب نے ان کے مرغوب موضوعات پر معروف اہلِ علم اور اہلِ قلم کے مقالات کو کتابی صورت میں

پیش کیا۔ اسلام، پاکستان، غالب، اقبال، اردو ادب، پروفیسر حمید احمد خاں کی عمر بھر کی علمی سرگرمیوں کے محور تھے۔ محولہ بالا موضوعات سے انھیں بطور خاص شغف تھا۔ اس لیے مرتب نے بھی انہی مضامین کا احاطہ کیا۔ پروفیسر حمید احمد خاں، ناظم مجلس ترقی ادب رہے۔ پروفیسر مرحوم رحلت کے بعد ان کے جانشیں احمد ندیم قاسمی نے عرق ریزی سے بخوشی مرتب کی۔ پیش نظر مرتبہ کتاب جہاں پروفیسر حمید احمد کے متعلق قاری کو معلومات فراہم کرتی ہے وہیں موصوف کے ادبی مقام و مرتبہ سے بھی آگاہ کراتی ہے۔ قاسمی ''عرضِ مرتب'' کے نام سے اس کتاب کے مرتب ہونے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم۔۔۔ کے انتقال کے کوئی دو ماہ بعد ۱۸رمئی ۱۹۷۴ء کو مجلس یادگارِ حمید احمد خاں کا قیام عمل میں آیا۔۔۔ اس اجلاس میں پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے علمی، ادبی اور تعلیمی کارناموں اور ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے مختلف اقدامات تجویز کیے اور ذیلی کمیٹیاں ترتیب دی گئیں۔ مجھے نذرِ حمید احمد خاں مرتب کرنے والی ذیلی کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا گیا۔'' ۵۰

کتاب کی اشاعت کے دوران جسٹس ایس۔اے رحمان اور پروفیسر سید وقار عظیم کے مشورے اور تعاون شامل حال رہا۔ اگرچہ یہ اشخاص وفات پا گئے۔ قاسمی اس نذرانہ عقیدت کو رجائی و باوثوق انداز سے لکھتے ہیں:

> ''مرتب کو امید ہے کہ ملک بھر کے علمی و ادبی حلقے اسلام، پاکستان، اقبال، غالب اور اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر ان مقالات کی اہمیت و افادیت کا اعتراف کریں گے۔'' ۵۱

۵۔منٹو کے خطوط بنام ندیم:

منٹو کا شمار برعظیم پاک و ہند کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ قاسمی کے چوں کہ منٹو سے دوستانہ مراسم تھے اس لیے انھوں نے منٹو کی زندگی میں ہی ان خطوط کو جمع کرنے کی ابتدا کر دی تھی۔ زیرِنظر مجموعہ سے منٹو اور قاسمی کے نجی مراسم، بے تکلفانہ گفتگو کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ان خطوط کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کا مقصد اولیٰ یہی تھا کہ منٹو کی شخصیت پوری تفصیل کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کی جائے۔ جب منٹو افق ادب پر طلوع ہو رہا تھا ''جب وہ عظیم فن کارانہ اڑانوں کے لیے پر تول رہا تھا اور پھر جب وہ ''نیا قانون''، ''ہتک'' اور ''خوشیا'' ایسے افسانے لکھنے کے بعد بھی کہہ رہا تھا کہ اگر مجھے اس زندگی میں یہی کچھ کرنا تھا تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔''[۵۲] پیش نظر مجموعے میں منٹو کی ذہانت و فطانت کے ساتھ ہی مرتب کے عقیدت مندانہ لہجہ کو بھی دخل ہے۔ اس میں منٹو کی شراب نوشی، نجی حالات، مشاغل، جوا کھیلنا، اعصابی کمزوری، معاشی بدحالی، عدم تحفظ، تلخ حقائق، نفسیاتی پیچیدگیوں، ذہنی کوفت، حساسیت، انا، بے تکلفی، ذہنی انتشار، دماغی حالت

غرض ذات کے ان گنت پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے مثلاً ایک خط میں جسمانی نقاہت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر نقاہت۔۔۔ وہ مستقل تھکاوٹ جو میرے اوپر طاری ہے کچھ کرنے نہیں دیتی۔ اگر مجھے تھوڑا سا سکون بھی حاصل ہو تو میں وہ بکھرے ہوئے خیالات جمع کر سکتا ہوں جو برسات کے پتنگوں کی مانند اُڑتے پھرتے ہیں۔۔۔ اگر۔۔۔ کسی روز مر جاؤں گا اور آپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے۔ منٹو مر گیا۔۔۔ منٹو تو مر گیا، صحیح ہے۔۔۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ وہ خیالات بھی مر جائیں گے جو اس کے دماغ میں محفوظ ہیں۔ اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ کریں کہ وہ میرے دماغ میں سے سارے خیالات نکال کر ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منٹو آج مرنے کو تیار ہے۔'' ۵۳

قاسمی، منٹو کے عجیب و غریب نفسیاتی حرکات کو بھی منظرِ عام پر لاتے ہیں مثلاً ان خطوط میں ایک جگہ منٹو اپنے فن کا رشتہ بیماری سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مجھ میں یہ عجیب بات ہے کہ بیماری کے دوران میری قوتِ فکر بہت تیز ہو جاتی ہے۔ دراصل اس کا باعث میری جسمانی حرارت کی کمی ہے جوں ہی میرا دل و دماغ جسمانی علالت کے باعث تپ جاتا ہے میری سوچنے کی قوت جس کو ایک خاص درجہ حرارت مطلوب ہوتا ہے، اچھی طرح کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔'' ۵۴

پیش نظر مجموعہ کے ذریعہ ہی اردو ادب کی مقبول شخصیات مثلاً کرشن چندر، منٹو، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نجی مراسم اور ذاتی زندگی کے احوال و آثار کی چند جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس مجموعے کے منظرِ عام پر آنے کے بعد بعض اہلِ قلم نے اعتراض کیا کہ اس مجموعے سے قاسمی کی خودنمائی کا پہلو مطلوب تھا جب کہ قاسمی لکھتے ہیں:

> ''اگر میرے پیش نظر خودنمائی ہوتی تو میں ان خطوط کو یکجا نہ کرتا۔ اس لیے کہ منٹو نے جگہ جگہ میری ناکام تحریروں کی طرف اشارے کیے ہیں، مجھے جذبات زدہ قرار دیا ہے۔'' ۵۵

پیش نظر مجموعہ منٹو اور قاسمی کی ذاتی زندگی، ادبی حالات و احوال، ان کے مابین دوستی کی نوعیت کو سمجھنے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔

۶۔کیسر کیاری:

قاسمی کے فکاہی کالموں کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' سیاسی، ملکی، ادبی، تعلیمی، سائنسی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی مسائل کا احاطہ طنزیہ و مزاحیہ انداز میں کرتا ہے۔ پیش نظر مجموعے میں مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے کالم شامل تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۳ء سے لے کر آخر تک میں نے لگ بھگ تیرہ چودہ ہزار کالم لکھے ہوں گے۔ اس انبار میں سے دو چار سو، یا زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سو کالموں کا انتخاب بہت

دشوار تھا چناں چہ میں نے منتخب کالموں کو کتابی صورت دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔
دراصل میرے پاس چالیس برسوں کے کالموں کا جو ریکارڈ تھا، وہ بہت حد تک تشنہ
اور نامکمل تھا۔" ۵۶

قاسمی کے پاس نامکمل کالم تھے۔ اُس کے بعد انتخاب کا معیار ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ چناں چہ اس دشواری کو محمد زبیر نے حل کر کے اس اشاعت کو ممکن بنایا۔ پیش نظر مجموعے کی اشاعت، بعدازاں پذیرائی کے بعد قاسمی کالموں کے دو تین مجموعے شایع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اگر صحت اور زندگی اجازت دیتے تو یہ مجموعے بھی اشاعت پذیر ہوتے لیکن مصروف زندگی کے باعث انھوں نے کٹھن کام کو بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس لیے ۱۹۹۱ء کے بعد کالموں کا کوئی مجموعہ منصۂ شہود پر نہ آ سکا۔

قاسمی نے محولہ بالا کتب مرتب و مدون کر کے اردو ادب میں ایک خاص مقام پیدا کیا۔ ان کے کارہائے نمایاں اور ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کتب کی ترتیب و تدوین، خاردار راستوں پر چل کر زیورِ ترتیب سے آراستہ ہوئیں اور قارئین کے ذاتی کتب خانوں اور ہاتھوں کی زینت بنیں۔ ان کی تفاصیل بھی "ابتدائیہ" یا "عرضِ مرتب" میں پیش کر دی گئی ہیں کہ بظاہر آسان نظر آنے والے امور کی انجام دہی کے لیے جہاں کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہیں بے پایاں لگن، محنت، صبر، استقامت، مستقل مزاجی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انھوں نے نہایت محنت و عرق ریزی سے صحتِ متن کے ساتھ ہی کتاب کی ظاہری دل کشی اور رعنائی کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

مدیر:

ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک قاسمی بڑے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء سے ۲۰۰۶ء تک تقریباً پچھتر برس تک مدیر کے فرائض خوش دلی سے سرانجام دیے۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے میگزین "نخلستان" کے حصہ اردو و انگریزی کی ادارت کی۔ بعدازاں ۴۲۔۱۹۴۶ء تک لاہور میں بچوں کا ہفت روزہ میگزین "پھول"، خواتین کا ہفت روزہ رسالہ "تہذیب نسواں" اور ادبی رسالہ ماہ نامہ "ادب لطیف" جیسے موقر جرائد سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۷ء۔۴۸ء تک ادبی رسالہ "سویرا" کے ابتدائی چار شمارے مرتب کیے۔ یکم مارچ ۱۹۴۸ء میں مقبول ادبی رسالہ "نقوش" کو نام کے ساتھ ساتھ عمدہ معیار بھی عطا کیا۔ ۱۹۵۰ء تک اس کے ابتدائی دس شمارے مرتب کیے۔ معروف افسانہ نگار ہاجرہ مسرور نے بطور معاون مدیر "نقوش" کی اعانت کی۔ محمد طفیل نے نقوش کی ساکھ اور شہرت کو برقرار رکھنے کی بھرپور سعی کی۔ قاسمی اور ہاجرہ کی چند برس کی خوش گوار معاونت محمد طفیل کے لیے مسرت اور اطمینان کا باعث تھی چناں چہ محمد طفیل سے اختلافات کی بنا پر ادبی مجلّے سے دست بردار ہو گئے۔ نقوش

سے دست کش ہونے کے بعد بھی اپنی تحریریں نقوش کو بھجواتے رہے۔ وہ تحریریں نہایت شان و شوکت سے شایع ہوتی رہیں۔ نقوش کی ادارت سے سبک دوش ہونے کے باوجود وہ نقوش کی کامیابی اور ترقی کے لیے کوشاں اور دعا گو رہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک وجہ یہ ہے کہ ''نقوش'' کی تعمیر میں میرے لہو کے چند قطرے بھی شامل تھے اور دوسری وجہ یہ کہ ''نقوش'' طفیل صاحب کا رسالہ تھا جو مجھے نقوش کے اجزا سے پہلے اور اس کی ادارت کے دوران جس طرح عزیز تھے اس طرح نقوش سے علیحدگی کے بعد بھی عزیز ہی رہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی عزیز ہو گئے۔'' [۵۷]

قاسمی نے ۱۹۵۸ء میں ماہ نامہ ''سحر'' مرتب کیا۔ ۱۹۵۳ء۔ ۵۹ء تک ''امروز'' کی ادارت سنبھالی۔ قاسمی نے حکیم حبیب اشعر کے ساتھ اپریل ۱۹۶۳ء میں لاہور سے اپنے نجی جریدہ ''فنون'' کا باقاعدہ اجرا کیا۔ یہ اہم ادبی واقعہ تھا۔ حرفِ اوّل میں قاسمی نے فرمایا کہ فنون کے اجرا سے پاکستان کے ادبی رسالوں کی فہرست میں ایک رسالے کا اضافہ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ''ایسا کرنے کو جی چاہا تھا۔''[۵۸] یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ فنون کی ابتدائی چند اشاعتوں نے ہی معروف ادبا و شعرا کو اپنی جانب متوجہ کیا، فنون نے دیگر فنونِ لطیفہ مثلاً مصوری، خطاطی، موسیقی، فوٹوگرافی اور فلم کو شامل کیا اور ان مقالات پر عبدالرحمٰن چغتائی، احمد علی خان، افضل پرویز، عنایت الٰہی ملک، یوسف سدیدی کے خیالات قلم بند فرمائے۔ تاہم فنون میں جس مضمون نے سب سے زیادہ توجہ کھینچی اس کا عنوان تھا: ''خدا''۔۔۔ اس میں ابوالخیر مودودی نے ضمیر انسانی کا تجزیہ کیا تھا اور انسان کو اس وجود کے بارے میں احساس دلایا تھا جو لاوجود ہے لیکن ہر انسان کے دل میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔ البتہ فنون کے پہلے پرچے میں ہی نئی تنقید اور آدھا آدمی از مظفر علی سید، نئی شاعری اور جدید شاعری از فتح محمد ملک، غالب کے غیر مطبوعہ خطوط از ڈاکٹر عبادت بریلوی، راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''جوگیا'' عصمت چغتائی کا بھیڑیں گراں قدر مقالات و افسانے شامل ہوتے رہے علاوہ بریں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مجید امجد، اختر انصاری، مختار صدیقی، وزیر آغا، احمد ظفر، فارغ بخاری، ظہور نظر کی تخلیقات نے فنون کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ فنون کو ابتدا سے ہی کہنہ مشق ادبا و شعرا کا تعاون حاصل رہا کیوں کہ اس پرچے کے مدیر احمد ندیم قاسمی تھے۔ فنون کے پہلے مجلّہ ہی سے اس کے روشن مستقبل اور کامیابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''مدت کے بعد اردو کا ایک پورا رسالہ دیکھنے میں آیا۔۔۔ یوں ملک میں بلند پایہ رسالے اور بھی ہیں، ان کو پڑھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے مگر فنون رنگ و بوئے دیگر رکھتا ہے۔'' [۵۹]

فنون کی امتیازی شان کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں ممتاز اور نام وَر ہندوستانی ادیب و شاعر مثلاً مخدوم محی الدین، اختر الایمان، اختر انصاری، مَیب الرحمان، بلونت سنگھ، انور عظیم، فراق، شاذ تمکنت، راجندر سنگھ بیدی،

کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اپنی تازہ تخلیقات فنون کو بھجواتے جسے قاسمی اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے بڑے بڑے اردو ادبا، شعرا کا جو اجتماع ''فنون'' میں ملتا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے دست یاب ہو سکے گی۔'' ۶۰

۱۹۶۶ء میں فنون نے نو وارد اہلِ قلم کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے کے لیے ان کے مجموعہ کلام کے ساتھ تصویریں شائع کرنے اور ان کے فن پر دیگر اہلِ قلم سے مقالات شائع کرانے کا سلسلہ شروع کیا چناں چہ محمد خالد اختر نے فہمیدہ ریاض پر، شہزاد احمد نے کشور ناہید پر مقالات شائع کرائے۔ کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی شاعری نے نوجوان طبقہ کو چونکانے کا کردار ادا کیا۔ چناں چہ فنون نے محولہ بالا نوجوان شعرا کو عنفوانِ شباب میں ہی شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ فنون کی ابتدائی پذیرائی حوصلہ افزا تھی۔ اس لیے اسے لکھنے والوں کے علاوہ قارئین بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے اور مجلّے کی اشاعت کا انتظار کرتے رہتے۔ فنون چوں کہ قاسمی کا ذاتی مجلّہ تھا اس لیے انتظامی امور کی نگہداشت بھی انھیں کے ذمے تھی چناں چہ ابتدائی چند اشاعتوں کے بعد فنون بے قاعدگی کا شکار ہوا اور قلمی معاونین کو شکایت ہوئی کہ ان کے مضامین نظم و نثر تاخیر سے شائع ہوتے ہیں چناں چہ مجلّے کو بروقت بنانے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ لکھتے ہیں:

''فنون کی سہ ماہی اشاعتوں میں آئندہ ہر قیمت پر باقاعدگی پیدا کی جائے گی اور اگر ہماری یہ کوشش ناکام رہی تو ہم ''فنون'' کو بند کر دینے کے اعلان میں کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے۔'' ۶۱

قاسمی اگلے شمارے میں بے قاعدہ اشاعت کو باقاعدہ اشاعت میں بدلنے کی کوشش کا اظہار فرماتے اور معذرت کا اظہار کرتے، کبھی کاغذ کی گرانی، کبھی مالی مشکلات کا اظہار کرتے، فنون کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک بار ہمارے ایک عزیز دوست اور فنون سے محبت کرنے والے ایک شاعر نے فنون کے بارے میں چند اشعار کہے تھے جن میں سے ایک شعر کا یہ مصرع ضرب المثل بن چکا ہے:

چھپتا ہے جنوری میں ، نکلتا ہے جون میں'' ۶۲

قاسمی قارئین سے فنون کو باقاعدہ بنانے کی دعاؤں کے طلب گار ہوتے، فنون کو باقاعدہ بنانے کی جانب کوشاں رہتے۔ فنون کے ابتدائی چند شمارے ہی ادبا و شعرا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب فنون نے دنیائے ادب میں اتنا معتبر مقام حاصل کر لیا کہ شاعر و ادیب حضرات اس پرچے میں اپنی تخلیقات شائع کرانا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ علی اصغر عباس لکھتے ہیں:

''جناب احمد ندیم قاسمی جدید اردو ادب کی تاریخ میں واحد شخصیت ہیں جنھوں نے تخلیقِ ادب کے لیے نہ صرف ان تھک کام کیا بلکہ گلشنِ ادب کی رونقیں دو چند کرنے

کے لیے لکھنے والوں کی تربیت بھی از خود اپنے کندھوں پر لی اور تادم زیست یہ کام عبادت کے طور پر کیا۔ ہماری پوری تاریخ میں ایسا اُستاد موجود نہیں جس نے پوری چار نسلوں کی تربیت ایسے انداز میں کی ہو کہ اس کا ہر تربیت یافتہ اپنی جگہ ایک انجمن اور ایک ادارہ بن جائے، کوئی چاند اور کوئی ستارہ ہے۔'' ۶۳

فنون تسلسل کے ساتھ شایع ہوتا رہا۔ اس کا معیار قائم کرنے میں قاسمی کی اَن تھک محنت اور برسوں کا طویل تجربہ شامل تھا۔ وہ نہایت جاں فشانی سے بطور مدیر اس جریدے کی ترتیب و تدوین کرتے رہے۔ وہ نئے شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات حاصل کرنے کے لیے کئی کئی خطوط لکھتے۔ انھوں نے اپنے جریدے کے ذریعے نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ شاعری و افسانے میں بہت سے شعرا اور ادبا کے فن کی آب یاری کی اور متعدد نو وارد ادبا و شعرا کو اردو ادب سے روشناس کرانے کا اہم فریضہ سرانجام دیا۔ وہ ایک جوہر شناس فن کار تھے۔ وہ ان نو وارد ادیبوں کے ذریعے اردو ادب کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ خالد احمد ''جدید تر پاکستانی ادب'' میں فنون کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''فنون ایک ادارے کی حیثیت سے ہمارے نوجوان ادبا کے لیے ایک ایسے گھر کا درجہ رکھتا ہے جہاں وہ ساتھ رہنا، ایک دوسرے کی کمزوریوں سے درگزر کرنا، ایک دوسرے کے لیے ایثار کبھی سے کام لینا، ایک دوسرے کی عزت کرنا اور ایک دوسرے کی عزت کا تحفظ کرنا سیکھتے ہیں اور پھر زندگی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے ساتھ بہہ کر ملک کے کونے کونے میں پہنچ کر اپنی اپنی جگہ وہ چراغ روشن کر لیتے ہیں جو لاہور میں فنون کی چھت کے نیچے ''حرمتِ فن'' کی لو بن کر جھلملا رہا ہے۔'' ۶۴

محسن احسان لکھتے ہیں:

''ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اور ادا جعفری سے لے کر فہمیدہ ریاض اور منصورہ احمد تک ادبی صلاحیتوں کی پرورش کا یہ سفر اتنا مبارک ہے کہ ادبی تاریخ اسے فراموش نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ وہ نئے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ندیم صاحب کی توجہ اور محبت کا مرکز رہی۔۔۔ یہ ایک پوری کہکشاں ہے جو آسمان ادب پر جگمگا رہی ہے۔'' ۶۵

قاسمی نے نئی نسل کی ادبی تربیت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ''سویرا''، ''نقوش''، ''ادب لطیف'' بالخصوص ''فنون'' کے صفحات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ''احمد ندیم قاسمی جانے سے پہلے کئی شمعیں روشن کر گئے۔۔۔ احمد ندیم قاسمی علم و ادب کا وہ بہتا ہوا دریا تھا کہ جس نے بہت سے پیاسوں کی پیاس بُجھائی ہے۔ جس نے بے شمار بنجر زمینوں کو تازگی اور زرخیزی بخشی۔''[۶۶] ۔ قاسمی کو اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ اس لیے فخریہ انداز میں کہتے ہیں:

'' ندیم میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل
میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا'' ۶۷

قاسمی ایک گھنے درخت کی مانند سب کو سایہ دیتے۔ انھوں نے لوگوں کو قلم پکڑنا سکھایا اور نو وارد ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کو معتبر جاننے کے ساتھ ساتھ بذریعہ فنون، پاکستانی و ہندوستانی ادبی فن کاروں کو اہم مقام دلوایا۔ بقول آفتاب شمیم:

> ''۔۔۔فنون ایک پرچے کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک، ایک تنظیم کا نام ہے جس نے کم از کم دونسلوں سے بڑے شہروں اور مضافات کے ادیبوں اور شاعروں کو باہم جوڑے رکھا۔۔۔ جس نے ادب کے تخلیقی کرشمے کو ماند نہیں پڑنے دیا'' [۶۸]

ناہید قاسمی نے راقم الحروف کو انٹرویو میں بتایا کہ عمر کے آخری حصے میں ''وہ ہمیشہ اس کھوج میں رہتے تھے کہ انھیں کوئی جوہر قابل ملے اور وہ اس کو تراشیں اور نکھاریں اور دنیائے ادب کے سامنے پیش کریں۔'' [۶۹] ادبی رسالے کے مدیر ہونے کی بنا پر اگر وہ تخلیق کار کی ہمت افزائی کرتے تو دوسری جانب اختلاف رائے کا اظہار بھی نہایت نرم، ہمدردانہ اور نصیحت آمیز لہجے میں کرتے۔

منصورہ احمد، ثمینہ راجہ، اختر شمار، اشرف جاوید، رفعت عباس، لطیف ساحل، ملکہ نسیم، منصور آفاق، حمایت علی شاعر، محسن احسان، سیف زلفی، جمیل یوسف، نوشی گیلانی، زاہد فخری، کاوش بٹ، احمد فراز، رضی اختر شوق، اختر ہوشیار پوری، عدیم ہاشمی، سلیم طاہر، ناصر سلطان کاظمی، خلیل رام پوری، محسن احسان، شہزاد احمد، امین راحت چغتائی، شاہین، خالد احمد، شہناز پروین سحر، انور مسعود، عزیز حامد مدنی، ظہور نظر، قتیل شفائی، مرتضیٰ برلاس، سیف زلفی، کشور ناہید، محمد انصاری، امجد اسلام امجد، لیث صدیقی، تنویر سپرا، روحی کنجاہی، پروین شاکر، افتخار عارف، حسن رضوی، نجیب احمد، اطہر نفیس، حزیں لدھیانوی، منظور عارف، امداد ہمدانی، اختر امان، غلام محمد قاصر، جلیل عالی، منور عزیز، شفیع ضامن، اقبال آفریدی، فیصل عجمی، غلام حسین ساجد، مختار جاوید، سلیم کوثر، یوسف حسن، زمان کنجاہی، معین عجمی، عشرت آفریں، شوکت عابد، صابر ظفر، صغیر ملال، سبط علی صبا، ایوب خاور، آصف ثاقب، طالب قریشی، قائم نقوی، غلام حسین ساجد، جمال احسانی، صغیر ملال، حسن ناصر، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر، گلزار بخاری، الفت رسول، عبدالحمید عدم، گوہر ہوشیار پوری، صادق نسیم، ظفر اقبال، جون ایلیا، صمد انصاری، سجاد بابر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اردو شاعری کے فروغ میں کسی دوسرے ادبی مجلّے نے اتنا حصہ نہیں لیا جتنی خدمات فنون نے سرانجام دی جب کہ اردو نظم میں صفدر سلیم میاں، خالد احمد، آفتاب اقبال شمیم، رضیہ فصیح احمد، قیوم راہی، مظہر الاسلام، ادا جعفری، رضی اختر شوق، اختر حسین جعفری، حسن طاہر، زہرا نگاہ، ادیب سہیل، عرفانہ عزیز ریاض، شاہین، قمر ہاشمی، سہیل احمد، امجد اسلام امجد، مسعود منور، یحییٰ امجد، سجاد بابر، اعجاز گل، پروین شاکر، خالد احمد، ناہید ندیم، ایوب خاور، یوسف حسن، اصغر ندیم سید، منصورہ احمد، جمیل الرحمٰن، اشرف جاوید، قتیل شفائی، محسن بھوپالی، اختر حسین جعفری، سعادت سعید، حلیم قریشی وغیرہ وغیرہ کی خدمات لازوال ہیں۔

انھی نو وارد اہلِ قلم نے فنون کو معیار بخشا اور فنون کے ذریعے ہی ادبی دنیا سے متعارف ہوئے چناں چہ ''فنون'' ان کے لیے ایک معتبر حوالہ بن گیا۔

اس طرح افسانے کے باب میں معروف افسانہ نگار درج ذیل ہیں۔ قاسمی ان کے افسانوں سے بھی فنون کو مزین کرتے اور مقالات کے ذریعے اُن کے فنی و فکری نظریات کو آشکار کیا جاتا مثلاً مسعود مفتی، محمد خالد اختر، رشید امجد، اشتیاق احمد، احمد جاوید، ڈاکٹر سلیم اختر، ضیا بٹ، منصور قیصر، احمد جاوید، ام عمارہ، مسرت لغاری، مرتضٰی اقبال، انیس صدیقی، فاروق خالد، محمد نصر اللہ، ہاجرہ مسرور، رام لعل، اسد محمد خان، عنایت الٰہی ملک، سائرہ ہاشمی، نیلوفر اقبال، بلقیس ظفر، محمد جمیل آفاقی، غلام محمد، میرزا ریاض، کمال مصطفٰی، مستنصر حسین تارڑ، اختر الایمان، واجدہ تبسم، مسعود اشعر، نگہت مرزا، فوزیہ رفیق، انور سجاد، نگہت مرزا، خالق تنویر، منیر احمد شیخ، عرفان علی شاد وغیرہ کے نام بطور خاص شامل ہیں۔ قاسمی ان نو وارد ادیبوں کے نام فنون کے حرف اول میں لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ عجلت سے کام نہ لیا کریں۔ ''فنون'' انھیں کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ البتہ ان سے یہ مطالبہ ضرور کرے گا کہ وہ اپنے اندر خود تنقیدی کا حوصلہ پیدا کریں۔'' ۷۰

بیسویں صدی کے مقبول ادبی مجلّہ فنون کے صفحات کو مستنصر حسین تارڑ، عطا الحق قاسمی، محمد اختر ممونکا، اکرام اللہ، حسین شاہد، محمد کاظم، مسعود اشعر کے سفرناموں نے تب و تاب عطا کی۔ خدیجہ مستور، مشکور حسین یاد، صلاح الدین حیدر کے انشائیہ اور محمد ضیا کیانی، غنی ملک کے تراجم بھی فنون کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ محمد خالد اختر نے طنز و مزاح کے میدان میں لوہا منوایا۔ فنون کے صفحات میں ان کے علاوہ احمد جمال پاشا، ایوب صابر، چوہدری محمد صادق، مسٹر دہلوی کی پرلطیف تخلیقات کا بیشتر خزینہ فنون میں موجود ہے۔ فنون میں فکر آموز اور فکر انگیز مقالات کا سلسلہ بھی شروع کیا مثلاً علامہ اقبال اور سردار امراؤ سنگھ از محمد صدیق، خیال و فکر کے بنیادی محرکات از اظہر قادری، ادب کے رقیب از کوکب جمیل، عربی ادب میں مطالعہ از خورشید رضوی، اقبال کا علم کلام۔ ایک تجزیہ از بشیر احمد ڈار، تنقیحات و تصریحات از سید علی عباس جلال پوری، ادب کی متبادل صورتیں از مظفر علی سید، یاسیت کی مابعد الطبیعات از محمد علی صدیقی کے مضامین و مقالات اردو ادب میں گراں قدر اضافے کیے۔ علاوہ ازیں بیشتر نثری و شعری کتب پر اور شاعر و ادیب کے فکر و فن پر مقالات فنون کی زینت بنتے رہے۔ فنون کے صفحات نے تحقیق کو نظر انداز نہیں کیا مثلاً ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، محمد اکرام چغتائی، قاضی فضل حق قریشی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، خورشید الاسلام نے تحقیقی مقالات فنون کی زینت بنتے رہے۔ علاوہ ازیں رضیہ فصیح احمد کے ڈرامے، غالب، اقبال، کرشن چندر، ابن انشا، محمد خالد اختر کے مکاتیب اور زہرہ جبیں کے خاکے بھی فنون میں شامل کیے جاتے رہے۔ فنون لطیفہ و مصوری پر شاکر علی، عنایت الٰہی ملک، افضل پرویز کے مقالات بھی شامل ہوئے۔ قاسمی نے ان نو وارد ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو اعتماد بخشا۔ ان سے

نئی تخلیق کا مطالبہ کرتے۔ وصول شدہ نگارشات پر اظہارِ تشکر کا خط ارسال کرتے اور اگلے شمارے کے لیے نئی تخلیق کی ترغیب دیتے۔ فنون کے لکھاریوں کا طبقہ بہت وسیع تھا۔ درحقیقت جن افراد کو انھوں نے ادبی دنیا سے متعارف کرایا وہ اب افقِ ادب پر تابندہ ستارے بن کر چمک رہے ہیں۔ فنون نے نئے ادبا کو متعارف کرانے اور مطلعِ ادب پر نئی روشنی ہویدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، انہی کا فیضانِ نظر تھا کہ نو وارد ادیب اب افقِ ادب پر تابندہ ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہیں۔

فنون کے شماروں میں اختلافات کے عنوان سے ۱۹۶۷ء میں مختلف قارئین، مختلف شاعر، ادیب، محققین و ناقدین کے ردِعمل کو اہمیت دی گئی۔ گزشتہ اشاعتوں پر قارئین کے خطوط پر مبنی اختلافات کے باب کا اجرا اہم اور منفرد زاویہ تھا۔ ابتدا میں اس میں خالد احمد، جابر علی سید کے خطوط شامل کیے گئے بعدازاں مکتوب الیہ کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ کبھی کسی غزل کو قابلِ ستائش گردانتے، کبھی افسانے میں گہری بصیرت کی داد دیتے، کبھی مقالات سراہتے، کبھی عالمانہ و مبصرانہ تجزیہ یا مقالہ پر مبارک باد پیش کرتے، کبھی کسی شاعر کی غزل کی تحسین کی جاتی، کبھی اس سے گلے شکوے کا اظہار کیا جاتا، کہیں اختلافات کو ہوا دی جاتی، کبھی کسی سفرنامہ کی تعریف کی جاتی، کبھی ڈراما، طنز و مزاح کی ستائش ہوتی، بہرحال فنون میں مختلف ادبا و شعرا نے اختلافات کے باب میں اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ”فنون نے اس حصے میں طغیانی مباحث پیدا کیے۔ تاثراتی آرا کو اہمیت دی اور بعض اوقات بحث کو سلسلہ در سلسلہ آگے بڑھانے میں بھی گراں قدر کاوش کی تاہم اس حصے میں بعض آرا کی نوعیت ہنگامی، قدرے جرات آمیز اور خالصتاً ذاتی تھی۔ اس سے لکھنے والوں کی تلخ مزاجی بھی آشکار ہوتی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فنون کا اختلافات کا حصہ سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور اس حصے میں شریف الدین اشرف، حبیب اسد علی اور امتیاز علی خان (شارجہ) جیسے مکتوب نگار اُبھرے جو خالصتاً فنون کی پیداوار تھے۔“ ۱۷

فنون نے ادب کو ساکن سمندر کی طرح قبول نہیں کیا بلکہ اس سمندر کی طغیاتی موجوں کو سطح پر نمودار کرنے میں زیادہ دل چسپی لی اور پھر تلاطم کا منظر بھی پیدا کیا ہے۔ اس تلاطم کا اظہار کبھی اختلافات کی شکل میں، کبھی مقالات کی صورت میں اور پھر تبصروں کی صورت میں ہوا۔ انھوں نے تعریف و تحسین اور سرسری رائے کے اظہار کی بجائے کتاب کو اس کی معنویت، انفرادیت اور مواد کی اساس پر پرکھا۔ یہ تبصرے نہ صرف کتاب کے داخلی، فنی، موضوعاتی معائب و محاسن کو اُجاگر کرتے ہیں بلکہ صاحبِ کتاب کو مشاورت کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب میں اس کی حیثیت بھی متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

فنون کے حرفِ اوّل یا بین السطور میں زبان کے مسائل، غزل کی مخالفت، صداقت کے مختلف معیار، شاعری اور دروغ گوئی، ادیبوں کے مسائل، شاعری اور عصری تقاضے، پاکستانی ادب کے خدوخال پر اظہارِ خیال کیا

جاتا۔ فنون میں علم وفن سے متعلق مقبول شخصیات کی وفات پر پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا جاتا۔ فقیرانہ زندگی بسر کرنے کو معاشرے کی بدسلوکی کا ردِعمل قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔اس بدسلوکی سے شاعر کے اندر قدرتی طور پر مشتمانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ایسے ظالم معاشرے پر ٹوٹ کر برستا اور اس کے معیاروں کو بدل ڈالنے میں کوشاں رہتا ہے مگر ساغر صدیقی بے حد شریف الطبع، قانع اور صابر قسم کا انسان تھا۔ چناں چہ اس پر معاشرے کی بدسلوکی کا ردِعمل یوں ہوا کہ اس نے معاشرے کی پرواہی کرنا چھوڑ دی اور اپنی پسند کی زندگی بسر کی جس میں ضروریات محدود ہو جاتی ہیں اور گوشہ تنہائی میں ایک اپنی دنیا آباد کر لی جاتی ہے۔۔۔ ساغر صدیقی تنہا جیا اور تنہائی ہی میں مر گیا۔ لاہور کے بیشتر اہلِ قلم کو شاداب ذہن کے اس شاعر کی موت کا علم اس وقت ہوا جب اس کی تدفین بھی ہو چکی تھی۔'' ۲؎

فنون میں ''وفیات'' پر دُکھ کا اظہار کیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اردو ادب کے افق سے ٹوٹ جانے والے ستاروں کی روشنیاں جمع کرنے کے لیے فنون نے متعدد ادبا پر گوشے مخصوص کیے اور بہت سے لوگوں پر ان کی وفات کے بعد عقیدت کے پھول ''حرفِ اوّل'' میں نچھاور کیے۔ اس سے یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ جن ادبا کو فنون نے ان کی زندگی میں اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی تھی۔ ان پر وفات کے بعد تعریف و توصیف کا در کھول دیا۔ اسی طرح ''فنون'' کے ''حرفِ اوّل'' پر اخبارات و رسائل میں تنقید و تبصرہ کا ایک نیا باب کھل جاتا۔'' ۳؎

اس طرح اخبار و رسائل میں تنقید کی جاتی۔ منصورہ احمد نے راقم الحروف کو بتایا کہ ''فنون کے اوراق ہر صنفِ ادب کے لیے کھلے تھے۔ پہلے تحریر کے معیار کو پیشِ نظر رکھا جاتا اور شخصیت کو ثانوی حیثیت دی جاتی۔'' ۴؎ فنون اگرچہ ترقی پسندانہ فکر کا حامل مجلّہ تھا لیکن اس میں نووارد ادبا و شعرا کی تحریروں کو خاص مقام دیا جاتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے نزدیک:

''فنون اگرچہ اردو ادب میں ترقی پسندانہ روایات کا حامل رہا مگر مدیر نے اپنے مزاج کے مطابق اسے معتدل بنائے رکھا اور مستند لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں اور جونیئر ادیبوں کی تحریریں بھی شایع کی گئیں۔'' ۵؎

فنون میں شامل ''وفیات'' کو قابلِ اعتراض گردانا گیا۔ قاسمی نہایت پُرملال انداز میں حرفِ اوّل میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔چند برس پہلے ایک دریدہ ذہن نے فنون کے حرفِ اوّل میں ''وفیات'' کے حوالے سے لکھا تھا کہ یہ رسالہ اپنی ہر اشاعت میں مرنے والوں کا قبرستان سجاتا ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کا شدید ردِعمل ہوا تھا۔ انھی نقاد نے ''فنون'' کے ایک شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے وفیات کے حوالے سے فرمایا ہے کہ یہ رسالہ اس دوران میں مرنے

والوں پر دو چار ''نمائشی آنسو'' ٹپکانے کا عادی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرنے والوں کو
یاد کرنے سے ان حضرات کو کیا اور کیوں تکلیف ہوتی ہے جب کہ مرنا تو سبھی کو ہے۔
پھر ''وفیات'' تو ہماری تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔'' ۷۶

قاسمی نے فنون کے بین السطور میں لاہور میں ادبی رسائل کی حالت زار ادبی جرائد کے مسائل، کاغذ کی کمیابی اور گرانی کے باوجود فنون شایع کرتے رہے۔ ایک ایک صفحہ پر تین تین نظمیں اور غزلیں شایع کرتے رہے۔ اگرچہ اس سے مجلّہ کا صوری حسن بھی اثر انداز ہوا اور شعرائے کرام نے بھی شکایات کا اظہار کیا تو مدیر فنون نے اس کا جواب درج ذیل الفاظ میں دیا:

''ہم ادب و فن اور تہذیب و ثقافت کی اس شمع فروزاں کو بجھنے سے بچائیں گے۔
ہم پاکستانی اہلِ قلم کی تخلیقات کے اس پیمانے کو ٹوٹنے نہیں دیں گے اور اسے بند
کر کے اور یوں ادب کی تخلیقی سطح پر ایک خلا پیدا کر کے مستقبل کے ادبی مورخ کو
مایوس نہیں کریں گے۔'' ۷۷

قاسمی اپنے قارئین سے اس کٹھن مرحلے میں بھی خلوص و محبت کے خواست گار رہے۔ ان مشکل حالات میں بھی فنون کی ضخامت پانچ سو گھٹا کر ڈیڑھ سو صفحات پر محیط کر دی۔ اپنے قارئین کو یقین دلاتے رہے کہ کاغذ کی گرانی کم ہوتے ہی گزشتہ ضخامت کی جانب پلٹ جائیں گے۔ فنون نے اگرچہ بہت سے نشیب و فراز بھی دیکھے اور کئی رکاوٹوں کو بھی عبور کیا تاہم یہ سفرِ حیات جاری رہا مگر مالی حالات کی بدولت اگر فنون کا پرچہ شایع ہونے میں تاخیر ہو جاتی تو مدیر فنون معذرت کا اظہار کرتے اور تاخیر میں آنے کی وجہ بھی بیان کرتے۔ اگر کبھی فنون کے مالی حالات اجازت دیتے تو خاص نمبر بھی اشاعت پذیر ہوتے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی فنون کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قاسمی صاحب نے ماہ نامہ ''فنون'' نکالا تو بد سے بدتر حالات میں بھی نکالتے ہی چلے
گئے۔ فنون نہ صرف برِعظیم میں بلکہ پوری اردو دنیا کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ فنون نے ایک
منظم، فعال اور موثر ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ فنون کے قاری اسے وصول کرنے
کے لیے دن گنا کرتے تھے اور ایک معشوق کی طرح اس کا انتظار کیا کرتے تھے۔'' ۷۸

قاسمی کو فنون سے عشق تھا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ ہر پرچہ پریس میں بھجوانے سے پہلے وہ ہر تحریر کو لفظ بہ لفظ خود پڑھتے، اگرچہ گرتی صحت، اعصابی کمزوری اجازت نہیں دیتے تھے لیکن قاسمی اپنی ذہنی و روحانی طمانیت، فرض کی لگن، فن سے محبت کے لیے ہر لفظ خود پڑھتے۔ رفعت مرتضیٰ لکھتی ہیں:

''۔۔۔مدیر ہونے کے حوالے سے یہ ان کی ذمہ داری سمجھی جائے گی مگر میں اس کو لفظ
سے ان کی کومٹمنٹ کہوں گی جو انھوں نے آخری سانس تک نبھائی۔'' ۷۹

قاسمی باریک بین اور ادب شناس مدیر تھے۔ وہ مشاورت پر ایقان رکھنے والے انسان تھے۔ انھوں نے

فنون کے لیے کچھ کام دیگر شعرا و ادبا کے حوالے کر رکھا تھا مثلاً افسانوں کا حصہ مرتب کرنے کی ذمہ داری ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے ذمے تھی۔ اس طرح دیگر مشاورت میں علی عباس جلال پوری، محمد کاظم، فتح محمد ملک شامل تھے۔ بعد ازاں منصورہ احمد نے یہ ذمہ داری سنبھالی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے الگ ہو جانے سے فنون کا افسانہ کمزور ہوتا گیا اور معیار بھی اثر انداز ہوا۔ اگر چہ غزل کا گہرا ادراک رکھتے تھے اس لیے حصہ غزل کی ذمہ داری خود قبول کی۔ ڈاکٹر ابرار احمد لکھتے ہیں:

''اگر کسی ایک پہلو سے ہم فنون کو تمام دیگر معاصر پرچوں سے بلاخوف تردید ممتاز قرار دے سکتے ہیں تو وہ اس کا حصہ غزل ہے۔ غزل کی اشاعت میں کہیں کوئی کمزوری یا کوتاہی دکھائی نہیں دیتی۔'' ۸۰

فنون کا فطری مزاج ترقی پسندانہ تھا اس لیے اس کے لکھاریوں میں ایسے افراد کی کثرت تھی جو موضوع کو فوقیت دیتے لیکن فنون ادب کے جمالیاتی پہلو کو بھی اہمیت دیتا ہے اور طغیانی کیفیت کی بجائے استدلال اور توازن کے فروغ پر یقین رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنون کبھی ناگوار بحث کے شکنجے میں گرفتار نہیں ہوا۔ قاسمی اگرچہ ترقی پسند فکر کے داعی تھے جب کہ ان کے معاصر ڈاکٹر وزیر آغا کا ادبی پرچہ ''اوراق'' جدیدیت کا علم بردار تھا۔ قاسمی ان نو وارد ادبا کی خوبیوں کو تسلیم کرتے اور ادبی دیانت داری کے ساتھ فنون میں جگہ دیتے۔ بقول عارف شفیق:

''یہ اُن کی ادبی دیانت داری تھی جو انھوں نے مجھ جیسے شاعر کو اپنے ادبی پرچے میں نمائندگی دی۔ وہ اس صورت میں جب کہ میرا کلام ''اوراق'' میں بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا تھا۔'' ۸۱

قاسمی اوسط درجے کے شاعر و ادبا کی اس طرح مدد کرتے کہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتے لیکن اس میں تخلیق کار کی مرضی و منشا کو دخل ہوتا تھا۔ تحریر میں سطور کے تغیر و تبدل اور اضافہ تخلیق کار کی منشا سے ہوتا تھا جسے تخلیق کار بخوشی قبول کرتا۔ اکبر حمیدی کے الفاظ میں:

''۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ اپنی نظم ''فنون'' کے لیے ارسال کی۔ چند ہی دنوں میں ندیم صاحب کی طرف سے مجھ جیسے نو آموز کے نام ایک نہایت محبت بھرا اور نرم لہجے کا خط موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ نظم ''فنون'' کے لیے رکھ لی گئی ہے لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں اس نظم کے مصرعوں کو ملا کر اسے تین بند کی نظم میں تبدیل کر لوں۔ اس طرح یہ زیادہ موثر ہو جائے گی اور اس کا impact اچھا ہو جائے گا۔'' ۸۲

اس طرح جب نو وارد تخلیق کاروں کو شفقت بھرا خط لکھا جاتا تو وہ حیرت زدہ ہو جاتے کیا اس نفسانفسی اور مادیت پرست دور میں اتنے اعلیٰ منصب کا مدیر و ادیب اتنا مہربان بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قاسمی اس کام کو ایک مشن سمجھتے تھے اور صدقہ جاریہ سمجھتے ہوئے احسن طریقہ سے یہ کام سرانجام دیتے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے

بہت بڑے ظرف، وقت اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ اب ناپید ہے۔

فنون نے خاص اشاعتوں کے ذریعے اپنے قارئین کو تخلیقی و تنقیدی ادب عطا کیا۔ خاص نمبر بڑے اہتمام سے شایع ہوتے۔ قاسمی اس کے لیے بڑی کوششوں سے معتبر اہلِ قلم سے مضامین و مقالات لکھواتے۔ فنون نے خدیجہ مستور نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر اور غزل نمبر شایع کیے۔ خدیجہ مستور کی وفات کے بعد ان کی یادوں، فکر و فن کے تجزیوں کا ایک ہمہ گیر مرقع پیش کیا۔ اس میں افسانہ نگار و ناول نویس خدیجہ مستور کی شخصیت و فن پر مبسوط مقالات تحریر کروائے گئے۔ علاوہ ازیں اس نمبر میں ادا جعفری، قتیل شفائی، اختر حسین جعفری، جمیل ملک، روحی کنجاہی، ایوب خاور، اظہر قادری، محشر بدایونی، گوہر ہوشیار پوری کے نوحے بھی شامل ہیں اور خدیجہ کے فن پر اہلِ قلم نے مبسوط مقالات کے ساتھ ساتھ نذرانہ عقیدت بھی پیش کیا۔ خاص نمبروں میں اقبال نمبر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مقصد اولیٰ یہی تھا کہ ہندوستان و پاکستان کے تعلیم یافتہ افراد ان مضامین کا غور سے مطالعہ کریں، کلام و پیغام اقبال کو سمجھنے کی کوشش کریں اور عمل پیرا ہونے کی شعوری کوشش کریں۔ اقبال نمبر میں انھوں نے اس ملی خدمت کو شعوری طور پر عمر بھر جاری رکھا اور اقبال دوستی کی روایت کو تابندہ کیا اور اقبال کی شخصیت و فن کو سمجھنے کے لیے خصوصی گوشے مخصوص کیے جس میں جولائی ۱۹۶۶ء، اپریل ۱۹۷۳ء، جون جولائی ۱۹۷۴ء کے شمارے شامل ہیں۔ یہ نمبر اقبال پسندوں کو نئے گوشوں سے آشنا کرتا، اس میں اقبال کے معاشی تصور، روحانی مادیت، وحدیت الوجود کے تصور، تعلیمی نظریات، اسلامی نظریہ تعلیم پر مستند ادبا کا اظہارِ خیال قلم بند کیا۔ علاوہ ازیں اقبال کے خطوط، کلام اور خطبات کو مربوط صورت میں پیش کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اقبالیات کے فروغ میں فنون کی خدمات کو سراہتے ہوئے، راقم الحروف سے، اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''علامہ اقبال کی تخلیقی شخصیت کی تفہیم، ان کے فکر و فن کے فروغ اور اقبالیات سے وابستہ فکر انگیز تخلیقات کا تعلق ہے تو ''فنون'' قیمتی اثاثے کا مخزن دکھائی دیتا ہے۔'' [۸۳]

۱۹۶۹ء میں فنون کا جدید غزل نمبر شایع ہوا۔ اس میں ہر مکتب و منہاج کے عمدہ شاعروں کا کلام موجود تھا۔ جدید غزل نمبر کی اشاعت فنون کا وقیع کارنامہ ہے۔ اس بے مثال نمبر کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔'' اور واقعہ یہ ہے کہ اتنا ضخیم غزل نمبر اردو ادب میں پہلے کبھی شایع نہیں ہوا۔ یہ غزل نمبر علامہ اقبال سے لے کر اعجاز گل تک کم و بیش اس صدی کے ستر سال کا احاطہ کرتا ہے اور اس میں سوا دو سو سے زائد شعرا کی غزلیات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ بیشتر شعرا کی دس دس غزلیں اور کچھ شعرا کی پانچ یا پانچ سے زیادہ غزلیں اس نمبر میں شامل کی گئیں اور تعداد کی کمی بیشی کے باوجود یہ التزام برتا گیا کہ شاعر کا پورا اسلوب نگارش اور فنی حسن نکھر کر سامنے آ جائے۔'' [۸۴] جدید اردو غزل اور غزل گو شعرا پر نئے مقالات لکھوائے گئے۔ متعدد شعرا کے حالاتِ زندگی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ غزل کا

تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا اور پاکستان و ہندوستان کے ممتاز غزل گوشعرا کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے فن کا جائزہ پیش کیا گیا۔ اس ضمن میں ''جدید غزل، چند اشارے'' از سید احتشام حسین اور آغا سہیل کے مبسوط، خیال افروز مقالات دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اس غزل نمبر کے متعلق حمید احمد خاں نے قاسمی کو ایک مکتوب میں لکھا:

''آپ نے کس کس طرح ''سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی'' تب کہیں نئی غزل کی یہ رنگارنگی اور نئی تنقید کی یہ دقیقہ سنجی صفحہ قرطاس پر جلوہ گر ہوئی ہوگی۔ نئی غزلوں کا یہ عظیم الشان ذخیرہ اربابِ ذوق کو برسوں تک دعوت نقد وتبصرہ دے گا۔ سبحان اللہ۔ [۸۵]

اس غزل نمبر کی اشاعت پر مدیر فنون کو مبارک باد کے خطوط موصول ہوئے۔ اس اشاعت کو اہلِ علم اور اہلِ ادب میں بہت پذیرائی ملی۔ یہ اس غزل نمبر کا وصفِ خاص ہے کہ برس ہا برس گزرنے کے بعد بھی اس کی اہمیت میں فرق نہیں آیا۔ اس کا محرک خاص مدیر کا معیار اور اپنے فن سے شیفتگی تھی۔ ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی رقم طراز ہیں:

''بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کم ہی پرچے ایسے ہوں گے جن کا کوئی خاص نمبر تقریباً چالیس سال گزرنے کے باوجود تازہ اور قابلِ مطالعہ معلوم ہو۔ وجہ ظاہر ہے قاسمی صاحب کا معیار انتخاب ذاتی یا نظریاتی تعصبات سے بالاتر تھا۔'' [۸۶]

مدیر فنون نے اپنے دوست احباب اور اہلِ علم و ادب کی شخصیت اور یادوں پر مشتمل گوشے شایع کیے۔ اہلِ علم کی وفات کے بعد خاص گوشوں کا اہتمام کیا جاتا مثلاً محمد خالد اختر، ظہیر بابر، ظہیر کاشمیری، محمد طفیل، محشر بدایونی، پروین شاکر، ممتاز مفتی، احمد داؤد، احسن احمد، محسن نقوی، صمد انصاری، دلدار پرویز بھٹی، اوپندر ناتھ اشک، ضمیر جعفری، غلام محمد قاصر، خدیجہ مستور وغیرہ وغیرہ۔ ان کے فکر وفن اور شخصیت پر مبسوط مقالات تحریر کیے جاتے۔ علاوہ بریں رُلا دینے والے نوحے بھی پیش کیے جاتے۔ مندرجہ بالا گوشوں میں مرحومین کا تذکرہ کئی صفحات پر محیط ہوتا جنھوں نے اردو ادب کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ علاوہ بریں مدیر فنون اپنے اہلِ علم و ادب کی تحریروں اور نوحے کو ہی شامل کرتے۔ قاسمی کی بیٹی نشاط ندیم کی وفات (۱۹۹۶ء) پر نوحے بھجوائے گئے لیکن انھوں نے فنون میں شامل کرنا نامناسب سمجھا کیوں کہ ان کے مطابق ''فنون کوئی نجی مجلّہ نہیں ہے، یہ ایک قومی رسالہ ہے اور اسے ذاتی مسائل ومصائب سے ہمیشہ الگ رکھا گیا ہے۔ ان سطور کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان دوستوں اور کرم فرماؤں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا جائے جنھوں نے ہمارے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھ کر اتنے بھرپور نوحے لکھے۔'' [۸۷] عمر کے آخری حصے میں جب ان کی صحت گرنے لگی تو منصورہ احمد کا تعاون معاون مدیرہ کے طور پر حاصل رہا چناں چہ فنون زوال آمادہ نہ ہوا اور قاسمی نے ہزار مشکلوں اور رکاوٹوں کے باوجود فنون کو قائم رکھا اور اپنے لازوال ضخیم و خاص نمبروں اور خاص گوشوں کی بدولت اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام پیدا کیا۔ انھوں نے فنون کو اپنی آرزوؤں کا ماحصل جانا اور اس کے ہر شمارے اور ہر نمبر کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ مدیر کی خواہش تھی کہ فنون ادب میں معیار کے

اعتبار سے وہ مقام حاصل کرے کہ حال کے علاوہ مستقبل بھی اس کے مقام و مرتبہ کو فراموش نہ کر سکے۔ انور سدید فنون کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''مجموعی طور سے فنون نے اردو ادب کی تقریباً سب اصناف کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ اس نے ممتاز ادبا و شعرا کی تخلیقات و مضامین کو پیش کرنے کے علاوہ نئے لکھنے والوں کے ذوقِ نظر کی آب یاری کی اور اردو ادب کو نئے شعرا اور شاعرات سے متعارف کرایا۔ بالفاظ دیگر فنون نے اردو ادب کو معنوی اور صوری دونوں طرح کے حسن سے آراستہ کیا ہے۔ فنون پر ترقی پسند ادب کی چھاپ پختہ ہے۔ اس میں اشاعت حاصل کرنے والوں کی نظریاتی جہت ادبی وابستگی اور حسنِ عقیدت کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات کمزور تخلیقات بھی فنون میں راہ پا جاتی ہیں۔ ان معمولی باتوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فنون نے ادب اور فن کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور فنون نے جتنی روشنی بھی پھیلائی ہے یہ سب اس کے قلم کاروں، تخلیق کاروں اور مضمون نگاروں کی گراں قدر کاوشوں سے پھوٹی ہے۔'' ۸۸

قاسمی نے فنون کی اشاعت کو زندگی بھر کے مشن کے طور پر قبول کیا اور تاعمر روگردانی اختیار نہ کی۔ یہ پرچہ ادب کے صالح اور مثبت جذبات لے کر میدانِ عمل میں آیا۔ اس نے ادب کی قندیل کو خلوصِ نیت اور صادق جذبے سے روشن کیے رکھا۔ قاسمی اور فنون ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے۔ قاسمی کا انتقال ۲۰۰۶ء میں ہوا۔ ہمارے معاشرے کی یہ تلخ روایت ہے کہ کسی شخص کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جانے سے اُس کے تمام منصوبے اور کام جس کے لیے اُس نے اپنا خونِ جگر صرف کیا، ادھورے رہ جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے قاسمی کے ورثا نے بھی اُسے فراموش کر دیا چناں چہ فنون انقطاعِ اشاعت کا شکار ہو گیا۔ جس نے کئی ادبا و شعرا کی ادبی، فکری آبیاری کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت میں مقدور بھر حصہ لیا اور اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت اردو ادب کی مختلف اصناف میں تحسین و خدمات سرانجام دیں۔ فنون کی ادبی عطا سے ایک عہد نے استفادہ کیا۔ فنون فروغِ ادب کا وسیلہ ہی نہ تھا بلکہ اپنے شاگردوں کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ عطا کرنے اور انھیں تاحیات اپنے حلقہ میں محبوس رکھنے کا وسیلہ بھی تھا۔ قاسمی کی وفات کے بعد ان کی بیٹی ناہید ندیم نے ''فنون ثانی'' کے نام سے فنون کا دوبارہ اجرا کیا لیکن یہ شمارے مقدار و معیار کے لحاظ سے قاسمی کے فنون سے لگا نہیں کھاتے۔

تبصرہ نویسی:

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت، فن اور ادبی خدمات سے نہ صرف اردو دان بلکہ شعر و ادب سے وابستہ تمام حلقے بخوبی آگاہ ہیں۔ قاسمی جہدِ مسلسل پر ایقان رکھنے والے چاق و چوبند اور ذہنی طور پر متحرک رواں دواں شخص

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات قارئین کے مطالعہ ذوق کی تسکین کرتی ہیں اور ان کے تبصرے اردو ادب میں قابلِ قدر اضافے کا محرک ہے۔

تبصرہ اگر چہ فنِ تنقید کی ایک شاخ ہے۔ قاسمی نے اپنے تبصروں میں بے جا ستائش نہیں کی اور نہ ہی تعریف و تحسین میں اتنے رطب اللسان رہے کہ دن کو رات سے اور رات کو دن سے ملا دیا بلکہ انھوں نے اپنے تبصروں میں آزادیٔ فکر سے بھرپور کام لیا ہے۔ وہ نہ تو فہم و ادراک کو پسِ پشت ڈالتے ہیں اور نہ ہی دیوانوں کی طرح ہذیاں سرائی پر اپنی ذہنی صلاحیتیں صرف کرتے ہیں۔ وہ نہ تو آپے سے باہر ہوتے ہیں اور نہ ہی فہم و ادراک، سچائی و انصاف کا سہارا لے کر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ قاسمی، مولوی عبدالحق کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے غیر جانب دارانہ رائے پیش کرتے ہیں۔ قاسمی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ تبصرہ کا مقصد کسی کتاب کے جوہر سے قارئین کو آگاہ کرنا، اس کی اہم خصوصیات و خامیوں سے پردہ اٹھانا اور اہم اوصاف کو منظرِ عام پر لانا ہیں۔ ایسا عمدہ معیار کی بدولت ہی ممکن ہے۔ قاسمی نے ''راست اور میں'' از مخمور سعیدی کی کتاب ناشر بک سنٹر دہلی سے شایع ہوئی، اس کی قیمت ۱۵۰ روپے ہے۔ قاسمی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مخمور سعیدی کو بطور شاعر ان کی خصوصیات کو اُجاگر کرتے اور ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مخمور سعیدی اردو شاعری کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی تخلیق کرتے ہیں اور ان دونوں اصناف میں اپنی فنی شخصیت کا بھرپور پن نہایت قرینے سے منتقل کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کسی بھی مدرسہ فکر سے متاثر نہیں بلکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں ان کے اپنے ہی ذاتی محسوسات و مشاہدات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔۔۔ یوں سمجھئے کہ مخمور ایک منفرد رنگ و روپ کے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام اردو شاعری کے خزانوں میں ایک اضافہ ہے۔'' ۸۹

قاسمی نے متفرق موضوعات پر تبصرہ نگاری کی۔ یہ تبصرہ مصنف کے ہمہ گیر اور گہرے مطالعے کی بھرپور مثالیں پیش کرتے ہیں۔ قاسمی نہایت باریک بینی سے کتب کا جائزہ لینے کے بعد تبصرہ شایع کرتے۔ ڈاکٹر نجیب جمال کے مجموعہ ''ندوۃ الفیل'' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اگر ان میں اقبال کے نظریہ تعلیم پر ایک مقالہ شامل ہے تو ساتھ ہی پروین شاکر کی شاعری کی اساس پر بھی مصنف کے رشحاتِ فکر موجود ہیں۔ اسی طرح اگر انھوں نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں روا داری کو موضوع بنایا ہے تو سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری پر ایک مقالہ تصنیف کیا ہے۔'' ۹۰

قاسمی کا قوتِ مشاہدہ نہایت تیز ہے۔ ''محبت'' ان کی زندگی کی اٹل حقیقت ہے۔ محبت ہی ان کا سرمایہ

حیات تھا۔ بعض اوقات تبصرہ کرتے ہوئے محبت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے محبت کی تفصیل تک پہنچ جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"۔۔۔اس غزل کی بنیادی خصوصیات میں۔۔۔بھرپور محبت۔ افلاطونی کی بجائے زمینی لسیاتی محبت، کہیں کہیں محبت میں بھی ان کی انا کا کوندا لپک جاتا ہے مگر کہیں کہیں سپردگی بھی اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ یہ تضاد نہیں ہے۔ محبت جذبہ ہی ایسا ہے کہ اس میں نشیب و فراز کا سلسلہ آخر تک چلتا ہے مگر یہ سلسلہ کہیں سے ٹوٹتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ محبت کی بنیاد تو ارضی ہوتی ہے وہ جب آسمانی ہونے لگتی ہے تو تصوف کا آغاز ہو جاتا ہے۔" ۹۱

قاسمی کی قوتِ فیصلہ تیز ہے انھیں کسی فن پارے کا تبصرہ کرتے ہوئے دقت پیش نہیں آتی۔ وہ نہایت غیر جانب داری سے تبصرہ کرتے ہیں مثلاً کنول کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے انھیں عدمؔ کی غزل، ان کا لہجہ، ان کا اسلوب یاد آ جاتا ہے تو برملا اظہار کرتے ہیں:

"کنول فیروز کی غزل میں موضوعات کی بوقلمونی ہے۔ انسانی زندگی کا قریب قریب ہر جذبہ اس کے ہاں انعکاس پذیر ہوا ہے مگر اس کی کلیدی لے لسیاتی محبت کی ہے۔

مرے بارے میں جب سوچا کرو گی
خود اپنی ذات میں مہکا کرو گی

یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے اشعار پڑھ کر مجھے عدمؔ مرحوم کی غزلیں بہت یاد آئیں۔" ۹۲

علمی اور تحقیقی کتب کے تبصروں میں قاسمی اس امر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ مصنف نے تلاشِ صداقت میں کتنی عرق ریزی اور جاں فشانی سے کام لیا ہے اور گم شدہ حقیقت کی کس طرح بازیافت کی ہے چناں چہ جب وہ "مکاتیب ظفر علی خاں اور سید عطا اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" سے روشناس ہوئے تو سب سے پہلے صاحبِ تالیف کے انہماک، خلوص اور موضوع سے مثالی شغف کی داد دیتے ہیں:

"جب سرگودھا کے زاہد منیر عامر سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے سید عطا اللہ شاہ بخاری اور پاکستان نیز مکاتیب ظفر علی خان کی سی معیاری کتابیں مرتب کر کے تحقیق و تالیف کی دنیا میں اپنی محنت و کاوش کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ یہ نوجوان لڑکا سرگودھا کالج کا طالب علم ہے مگر ابھی سے دینیات اور سیاسیات اور ساتھ ہی ادبیات میں اتنا درک رکھتا ہے کہ متذکرہ کتابیں مرتب کر کے اس نے اردو کے محققین کرام کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔" ۹۳

اس قسم کے تبصروں میں قاسمی پوری کتاب کا تعارف اجمالی طور پر کراتے اور ہر باب کے مطالب کا جوہر چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیتے۔ ان سب سے مولف جو نتائج اخذ کرتا قاری کو بھی ان سے آشنا کرا کر خوش

ہوتے اور دعائیہ کلمات سے نواز کر نوجوانوں کے حوصلے بلند کرتے:

> ''زاہد منیر عامر کو مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے خطوط جمع کرنے کا خیال آیا ہے۔ یہ مولانا کی سرگرمیوں کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کی طرف بڑے بڑوں کی توجہ نہیں دی گئی تھی مگر اس برخوردار نے نہ جانے کیسے اور کہاں کہاں سے متعدد خطوط جمع کر کے ساڑھے تین سو صفحات کی کتاب اتنے سلیقے سے مرتب کر دی ہے کہ اہلِ ادب کو اس نوجوان کی کاوشوں سے خوش بھی ہونا چاہیے اور اس کا ممنون بھی۔ اللہ تعالیٰ برکت دے۔'' ۹۴

معنوی زاویے سے قاسمی کے تبصروں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ تخلیقات کے فرداً فرداً مطالعے سے مصنف کے داخلی رجحان اور اس کے فن کو بطون میں گردش کرنے والے جواہر کو تلاش کرتے، بلاشبہ وہ لفظ اور خیال کے جمالیاتی پیکر کو ہی اپنے قریب آنے کی اجازت دیتے ہیں تاہم ان کے ہاں تصنیف سے مصنف کے منفرد اوصافِ فن دریافت کرنے کا رجحان نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ تحلیل و تجزیہ کو قاسمی کے تبصروں میں فوقیت حاصل ہے۔ وہ موازنہ و محاکمہ سے بھی تبصرے کو نتیجے کی سمت لانے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کی تنقید واضح طور پر توصیف کے زاویے تلاش کرتی اور تحسین کا کوئی موقعہ فروگذاشت نہیں کرتی۔ تاہم قاسمی کے ہاں اختلاف رائے کا زاویہ بھی موجود ہے وہ اپنے نقطہ نظر کے اظہار سے گریز نہیں کرتے لیکن خوبی یہ ہے کہ اپنے تحلیل عمل سے اختلافی نکتے کو تخلیق سے اس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ اس کا ڈنک نکل جاتا ہے اور اختلاف میں شہد آگیں محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ اختلاف کے مرحلے پر آبگینہ دل کو ٹھیس نہیں پہنچاتے بلکہ اس عیب کو شخصی بنانے کی بجائے عمومی حیثیت دیتے ہیں مثلاً بیچ بچولن از سلمیٰ اعوان کے افسانوں کی تعریف و توصیف کے بعد نہایت سادگی سے کمزوریوں کی جانب بھی توجہ مبذول کراتے ہیں:

> ''ہاں مجھے اس بھرپور افسانے پر یہ اعتراض ضرور ہے کہ آخر میں افسانہ نگار نے اس کے انجام کے بارے میں جو چار کردار شامل کرنا ضروری سمجھے ہیں وہ قطعی غیر ضروری ہیں کیوں کہ افسانہ تو وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں مرکزی کردار یہ الفاظ ادا کرتا ہے کہ میں اپنی تحلیل نفسی نہیں کر پائی۔'' ۹۵

قاسمی کا اختلاف نہ زخم لگاتا ہے، نہ صراحت پیدا کرتا ہے، اگرچہ وہ بعض اوقات غلط کو غلط العام قرار دے دیتے ہیں تو گویا وہ اختلاف کے زخم پر مرہم رکھ دیتے ہیں اور بعض اوقات جب وہ غلط کو غلط قرار دیتے ہیں تو ان کا رویہ سخت نہیں ہوتا نہ ہی الفاظ ترش ہوتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصروں کے اختلافی نکات کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا گیا ہے اور اس سے کبھی اہانت آمیز بحث نے بھی جنم نہیں لیا۔ کیوں کہ قاسمی تبصرہ نگاری کے فنی تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ تبصرہ نگار اگر فنی تقاضوں کی پروا کیے بغیر تبصرہ شایع کرے گا تو وہ ماہرین و قارئین کے لیے قابلِ قبول نہ ہوگا۔ قاسمی متعصب ہو کر نہیں لکھتے وہ جو بات بھی بیان کرتے ہیں مستند حوالوں سے بیان کرتے ہیں مثلاً جہاں انھوں نے ''نیرنگ اُندلس'' کو سراہا ہے وہیں وہ تنقیدی انداز اختیار کرتے ہوئے مصنف کی

لغزشوں کی جانب بھی قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں تبصرہ نگار کو ہلکی سی کھٹک محسوس ہوئی۔ طارق بن زیاد جب میدانِ جنگ میں گھوڑے پر سوار ہو کر اور رکابوں میں کھڑے ہو کر ایک ولولہ انگیز خطبہ دیتا ہے تو ایک مقام پر یہ کہتا ہوا بتایا گیا ہے کہ:
''اس ملک میں چشم غزال رکھنے والی روشن جبیں حسینائیں ہیں جنھیں عقد میں لا کر تم ہسپانوی شہزادوں کے داماد اور بہنوئی بن گے۔'' ۹۶

ممکن ہے یہ بات تاریخی حوالے سے درست بھی ہو تب بھی اسے نظرانداز کر دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کہ طارق بن زیاد نے مسلمان فوج کے مضمحل اعصاب کے مالک سپاہیوں میں توانائی پیدا کرنے کے لیے کہی ہو لیکن اس موقع پر یہ بات درست محسوس نہیں ہوتی اور طبع قاری پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔

مدیر فنون ہونے کے ناطے قاسمی نے اگرچہ تبصرہ نگاری کا فریضہ بھی قبول کیا۔ وہ کتاب پر سرسری یا اُچٹتی ہوئی نگاہ نہیں ڈالتے بلکہ کتاب کو اس طرح متعارف کراتے ہیں کہ اقدار و مسائل کے زاویے روشن ہو جاتے ہیں۔ فکر و فن کی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ مصنف کی نظریاتی کشادہ فکری آشکار ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی قاسمی کی تنقیدی جہت اور فکر و نظر کے گوشے بھی منور ہوتے چلے جاتے ہیں لہٰذا وہ قمر رضا شہزاد کو صلاح نیک سے نوازتے ہوئے کہتے ہیں:

''قمر رضا شہزاد کو میرا مشورہ ہے کہ وہ کسی کی تنقید و تحسین ___ میری بھی تنقید و تحسین سے گمراہ نہ ہو اور اس راہ کو ترک نہ کرے جس پر چل کر اس نے سفر کا آغاز کیا ہے۔ صرف یہی راہ اسے عظمتِ فن کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔'' ۹۷

قاسمی کے تبصرے جن میں سے بعض مقالات کا درجہ رکھتے ہیں ''فنون'' کی فائلوں میں ہی مدفون ہیں چناں چہ وہ روشن زاویے جو ان تبصروں کے وسیلے سے ادبی دنیا میں پھیلی اب لائبریریوں میں محبوس ہے۔ تبصروں تک رسائی حاصل کرنے پر احساس ہوتا ہے کہ قاسمی کی تنقید کے بیشتر زریں زاویے ان تبصروں ہی سے آشکار ہوتے ہیں۔ انیس ناگی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منٹو افسانہ نگاری کی ایک گراں بہا متاع ہے ہم نے اس متاع کے تحفظ کے سلسلے میں بڑی قدر ناشناسی اور احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انیس ناگی نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف اس ضمن میں ہماری ندامت کو کم کیا ہے بلکہ سچے منٹو کی بازیافت کا افتتاح کیا ہے۔ میں اپنے ہاں کے تنقیدی حبس میں اس موجۂ صبا کا خیر مقدم کرتا ہوں۔'' ۹۸

قاسمی کے تبصرے نہ صرف مُصنّف کی فنی اور ادبی اقدار کی دریافت کرتے ہیں بلکہ موضوع اور کتاب کو

اس طرح روشن کرتے ہیں کہ قاری کی دل چسپی کتاب میں بڑھ جاتی ہے اور وہ اس کے مطالعے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے مثلاً شہزاد احمد کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ شہزاد احمد فلسفے اور نفسیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور شاعری میں بطور خاص غزل میں انھیں ایک منفرد مرتبہ حاصل ہے مگر ہم میں سے بہت کم اصحاب کو علم ہوگا کہ آج کل کے دوسرے شاعروں کے برعکس وہ بے حد وسیع المطالعہ ہیں اور ان کا مطالعہ صرف شاعری یا ادب یا نفسیات یا فلسفے تک محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے قدیم و جدید سائنس کا بھی بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اس ضمن میں ان کی ایک اپنی رائے اپنا نقطہ نظر بھی ہے یعنی انھوں نے جو کچھ پڑھا ہے اُس کا خلاصہ پیش نہیں کر دیا بلکہ مسائل پر غور کیا ہے۔ نتائج اخذ کیے ہیں اور یوں اپنی ایک رائے مرتب کی ہے۔'' ۹۹

درحقیقت قاسمی کی تبصرہ نگاری تحسینِ فن کا زاویہ ہے۔ وہ کتاب اور مصنف کے درمیان تبصرے کے ذریعے ایک ایسا پُل تعمیر کرتے ہیں جس پر روشنیاں آویزاں ہیں اور دونوں کناروں میں ارتباط پیدا کرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں ان کا ایک منفرد طریق یہ ہے کہ قاسمی پہلے مصنف کا تعارف کچھ ایسے جذباتی انداز میں کراتے ہیں کہ مصنف و شاعر کی شخصیت کا ایک خوب صورت نقش قاری کے دل پر مرتسم ہو جاتا ہے اور مصنف سے ملاقات کی مسرت حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ قاسمی نے ''زرد آسمان'' پر اظہارِ خیال کیا تو مصنف انیس ناگی کے فن و شخصیت کی دھاک قاری کے دل پر بٹھا دی۔ لکھتے ہیں:

''انیس ناگی کی تخلیقی صلاحیتوں نے مجھے ہمیشہ خوشگوار حد تک حیران کیا ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ کیسا فن کار ہے جو شاعری بھی کرتا ہے۔ تنقید بھی کرتا ہے۔ ناول بھی لکھتا ہے دوسری زبانوں سے اردو میں تراجم بھی کرتا ہے۔ اردو کے فن پاروں کو دوسری زبان میں منتقل بھی کرتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہے اسے کتابی صورت میں بھی طبع کراتا چلا جاتا ہے اور ان تمام مصروفیات کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض بھی نہایت خوبی اور ذمہ داری سے انجام دے رہا ہے۔۔۔ میں اس کی فنی لگن کی عظمت سے انکار کو انتہا درجے کی بددیانتی شمار کرتا ہوں۔ وہ ہر حال میں ایک ایسی شخصیت ہے جس کا احترام کرنا چاہیے اور جس سے پیار بھی کرنا چاہیے۔'' ۱۰۰

خالد احمد کے شعری مجموعہ ''دراز پلکوں کے سائے سائے'' پر تبصرہ کیا تو شاعر کے تعارف کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت اور درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی بھی کر دی۔ لکھتے ہیں:

''آج اگر میں یہ اعلان کر دوں کہ خالد احمد دورِ رواں کا یکسر مختلف، سراسر منفرد اور مسلمہ طور پر بڑا شاعر ہے تو کتنی ہی جبینوں پر بل پڑ جائیں گے اور اپنے بارے میں کتنی ہی خوش فہمیوں میں مبتلا، کتنے ہی آسودہ مزاجوں کی نیندیں اُڑ جائیں گی مگر اس

> حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ خالد مختلف بھی ہے، منفرد بھی ہے اور بڑا بھی ہے اور آنے والے دور میں اس کی بڑائی طلوعِ آفتاب کی طرح تسلیم کی جائے گی۔'' ۱۰۱

ادبی تبصرے کا ایک وصفِ خاص یہ ہے کہ مبصر مصنف کے ساتھ مجادلہ نہ کرے بلکہ محاسن کتب کو خلقِ خدا سے اس طرح روشناس کرائے اور کتاب قاری کو اپنی طرف اس طرح کھینچے جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ قاسمی مصنف اور قاری کے مابین محبت کا معانقہ کرانا بھی ضروری سمجھتے ہیں چناں چہ مصنف کے ساتھ ایک گونہ جذباتی وابستگی ہو جاتی ہے تو کتاب کی طرف محبت سے دیکھنے کی راہ بھی ہموار ہو جاتی ہے۔ قاسمی ایک ماہر نفسیات کی طرح یہ فریضہ احسن طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ سلمیٰ اعوان کے افسانوی مجموعے ''بچ بچولن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سلمیٰ اعوان کا اندازِ بیان رواں اور زبان شستہ ہے۔ مکالمہ نگاری پر انھیں بے پناہ عبور حاصل ہے۔ خاص طور پر عورتیں آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں تو سلمیٰ کی مکالمہ نویسی میں حقیقت کے علاوہ طنز و مزاح کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ زبان کے بعض الفاظ اس سلیقے سے استعمال کرتی ہیں کہ ان الفاظ کو اردو میں مستقلاً کھپا لینے کو جی چاہتا ہے۔'' ۱۰۲

قاسمی کا روئے سخن چوں کہ مصنف کے علاوہ قاری کی جانب بھی ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے تبصرے میں پڑھے جانے کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ پیدا کرتے ہیں اور اسے ایک ایسا ادب پارہ بنا دیتے ہیں جسے الہامی یا روحانی تخلیق شمار کیا جا سکے۔ قاسمی تشبیہاتی انداز اپناتے ہوئے نہایت تیزی سے اپنے مطالب و مفاہیم کتاب سے قاری کی جانب مبذول کراتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''محشر بدایونی۔۔۔ وہ قدیم و جدید کی منتخب خوب صورتیوں، رعنائیوں اور ندرتوں کا شاعر ہے اور اس کی غزل کے ہر شعر میں انسان کے کسی نہ کسی نازک جذبے کا نفوذ اتنا بے ساختہ ہوتا ہے جیسے پھول کی پتی پر شبنم اُتری ہے۔'' ۱۰۳

قاسمی کی تبصرہ نگاری کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کتاب کی بحث کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے تنقیدی عمل کو ان کے مرصع، خوش وضع اور تہذیبی اسلوب نے سبکسار کیا ہے اور ان کا یہ جوہر تبصرہ نگاری میں نہایت کامیابی سے استعمال ہوا ہے تاہم تبصروں کو لطیف اور خوش گوار بنانے میں کتاب کے متن سے بھی گراں قدر فائدہ اٹھایا ہے۔ قاسمی کے اندر کا حیوان ظریف بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو مسرت و بہجت فراہم کرنے کا موقع فروگذاشت نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نئے سفرنامہ نگار بیشتر جوان لوگ ہیں۔ اس لیے اگر ان کے ہاں صنفِ نازک کی جھلکیاں زیادہ تعداد میں موجود ہوتی ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر محمد اختر ممونکا کے

ہاں ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ جب اس سیاحت نامے کے دو چار صفحات میں سے کوئی ایک بھی "الہڑ مٹیار" نہ جھانکے تو تشویش ہونے لگتی ہے کہ کہیں نصیب دشمناں ہمارے سیاح کے مزاج علیل تو نہیں ہو گئے یا کہیں مطالعے کے دوران کوئی سطر چھوٹ تو نہیں گئی۔" ۱۰۴؎

احمد ندیم قاسمی کے تبصرے شائستگی کے حامل ہوتے ہیں زبان و بیان، عام فہم اور روزمرہ زندگی کے قریب استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اگر مصنف یا مرتب کی کتاب پر تنقید کرتے ہوئے اس کی خامیوں کو بھی آشکار کیا ہے تو نہایت ہمدردی سے، شائستہ انداز اختیار کیا ہے۔ قاسمی تبصرہ کرتے ہوئے جابر ممتحن کا روپ اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی ایسا روپ اپناتے ہیں جس سے فن پارے کے خالق کی تحقیر کا کوئی پہلو نکلتا ہو بلکہ اپنے تبصروں میں فن پارے کے خالق کو اپنی مستقبل کی کاوشوں کو بہتر بنانے کے لیے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ وہ کتاب کی معاونت سے نہایت ہنرمندی سے مصنف کے ذہن میں موجود داخلی جواہر کو دریافت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

خطوط نویسی:

خط ایک دل چسپ صنفِ سخن ہونے کے باعث ادیب کے مزاج، ماحول اور نجی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ خط کے ذریعے ہی مکتوب نگار اپنے احساسات و جذبات کو نہایت بے تکلفی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے۔ خط نے اگرچہ تمام دنیائے ادب میں خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ انگریزی ادب میں شیلی، کیٹس، بائرن، موپاساں، نپولین کے خطوط اور اردو ادب میں غالبؔ، حالیؔ، اکبرؔ، شبلی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، اقبال، سجاد ظہیر، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے مکاتیب ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ قاسمی کی انفرادیت یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں مندرجہ بالا تمام مکتوب نگاروں کی موجودگی میں قاسمی نے اپنی حیثیت تسلیم کروائی۔ انھوں نے تقریر و تحریر کے فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے اور مکتوب الیہ سے اپنے دل کی بپا اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے دو اشخاص آمنے سامنے بیٹھے محوِ گفتگو ہوں۔ ان کے خطوط نفسیاتی لحاظ سے ایک ایسے آئینے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس میں مکتوب نگار و مکتوب الیہ کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے ہی قاسمی کی فنی و ادبی انفرادیت کا بھی اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ خطوط ایک شاعر، ادیب، دانش ور، کالم نویس کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ ان خطوط میں کہیں تو نسلِ نو کے نمائندوں کی حوصلہ افزائی اور تربیت ہے، کہیں اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں سے ذاتی باتیں کہی گئی ہیں، کہیں ناگواری اور ناراضی کا اظہار موجود ہے، کہیں معاشی تنگ دستی کی جانب اشارہ ہے۔ انھوں نے اگرچہ مختلف ادبا و شعرا کو خطوط لکھے۔ یہ خطوط کتابی صورت میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں مثلاً ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''خطوط احمد ندیم قاسمی'' کے نام سے ۱۹۹۵ء میں ادارہ ادب و تنقید لاہور سے خطوط شایع کروائے، بریں ہمہ ''آدھی ملاقات'' کے نام سے خورشید ربانی نے قاسمی مرحوم کے وہ خطوط شایع کروائے جو انھوں نے محمد فاضل کے نام

لکھے۔ ان مجموعوں کے علاوہ کتب اور رسائل و جرائد میں ان کے سینکڑوں خطوط ملتے ہیں جن کے مدون کرنے سے مکاتیب کا ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

مکاتیبِ قاسمی کی ابتدا کا انداز اپنائیت و خلوص سے بھرپور تھا مثلاً بھائی جان، خلوصِ مجسم، مخلص من، مخدوم و مکرم، محترمی و مکرمی، برادرِ محترم، برادر مکرم، پیارے بھائی وغیرہ تحریر کرتے جب کہ خط لکھتے ہوئے القابات میں تسلیم و آداب، سلام مسنون، تسلیم، سلام محبت، سلام مسنونہ، السلام علیکم وغیرہ تحریر کرتے اور خط کے اختتام پر آپ کا بھائی، آپ کا ندیم، آپ کا مخلص یا نادم وغیرہ لکھتے۔ اگر وقت اور حالات اجازت دیتے تو اپنے بے تکلف و مخلص دوستوں کو طویل خط لکھ کر اپنے حالات سے آگاہ کرتے جب کہ بحیثیت ایڈیٹر خط لکھنا ہوتا تو اختصار نویسی کو اپناتے۔ اس طرح قاسمی کے خطوط چار صفحات پر بھی مشتمل ہوتے اور چار سطور پر بھی۔ قاسمی کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ قدرت نے انھیں ایسی طبیعت ودیعت کی تھی کہ خط کا جواب دینا اپنے اوپر فرض کر لیتے۔ دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے۔ اگر کبھی مکتوب الیہ کے خط کا جواب دینے میں تاخیر ہو جاتی تو قاسمی کبھی مزاحیہ اور کبھی سنجیدہ انداز میں اپنے احساسات کا اظہار کرتے مثلاً محمد طفیل کے نام لکھتے ہیں:

> ''گرامی نامے کا شکریہ۔ میں تو گم شدہ کی تلاش کے عنوان سے اخبارات میں اشتہار دینے والا تھا۔'' ۱۰۵

اسی طرح ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آخر اس مسلسل خاموشی کی وجہ! مقصد؟ کیا میرے خلوص میں آپ کو کوئی دھبہ نظر آ گیا؟ کیا آپ نصیب دشمناں علیل ہیں؟ کیا آپ میری علالت کے باعث میری زندگی سے اور فطرتاً مجھ سے مایوس ہو چکے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' ۱۰۶

نہایت جامع انداز میں قاسمی نے اپنا مقصد، اپنے شکوے کا اظہار کیا ہے۔ دوستوں کے خطوط ہی ان کے لیے دل چسپی کا ذریعہ تھے۔ بطورِ خاص ایامِ علالت میں یہی خطوط ان کا دل بہلانے کا ذریعہ ہوتے۔ لکھتے ہیں:

> ''آج کل عزیزوں کے خطوط ہی تو میری دل چسپی کا باعث ہیں، ورنہ میری حالت تو بالکل صفر کے برابر ہے۔'' ۱۰۷

خط میں تصنع کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے کیوں کہ بہت کم اہلِ قلم خط تحریر کرتے وقت ان کی اشاعت کا خیال دل میں لاتے۔ اس طرح اپنا گریباں چاک کر کے دوستوں کے سامنے اپنا سینہ رکھ دینے کے مترادف ہے۔ مشفق خواجہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''مالی مشکلات کے شکنجے میں تو فنون سخت بدحالی کا شکار ہے مگر آپ لوگوں سے جنھوں نے فنون کو معیار بخشا ہے اگر سالانہ چندہ وصول کرنے لگوں تو اس سے زیادہ شرم ناک بات اور کیا ہو گی؟ نہیں بھائی۔'' ۱۰۸

مشفق خواجہ اور قاسمی کے مابین دوستی کا رشتہ پینتالیس برس سے زیادہ عرصے پر محیط تھا۔ قاسمی کے خطوط جو ہماری دسترس میں ہیں۔ ان کی منفرد شخصیت اور گوشہ گیر انسان کو سمجھنے کے لیے صبح کے دریچوں کا کام دیتے ہیں۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق، قاسمی کے خطوط بنام مشفق خواجہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''۔۔۔ یہ خط اس لحاظ سے اہم بلکہ بہت اہم ہیں کہ ان کے مطالعے سے ایک بڑے افسانہ نگار اور ایک بڑے شاعر کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں سے شناسائی کا موقع ملتا ہے جو عام طور پر ایک عام قاری کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔'' ۱۰۹

یہی وجہ ہے کہ ارباب علم و ادب خطوط کے اس سرمایہ کو ادبیات و شخصیت کا اَن مول اندوختہ گردان کر ان خطوط کو محفوظ کرنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ نثر میں قاسمی کا سرمایہ وہ مکاتیب ہیں جو انھوں نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کو لکھے جن میں دلی کیفیات کو ایک سیدھے سادے اور بے تکلف انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سادگی میں جو حسن اور تاثیر ہے وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ قاسمی خلوصِ دوستاں کے بہت معترف تھے وہ محبت و خلوص کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو لکھتے ہیں:

> ''میں آپ سے بے حد متاثر ہوں۔ آپ کے خلوص کے باعث مجھے آپ سے محبت ہے اور یہ دنیا داری نہیں۔ میں حقیقت میں آپ کو اپنا عزیز دوست سمجھتا ہوں اور دوست کا احترام میرے نزدیک بہت ہی بلند ہے۔'' ۱۱۰

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے گرامی نامے کے جواب میں تاخیر کے مرتکب ہوئے تو نہایت عاجزی سے معذرت خواہ ہوتے جس کا محرک طبیعت کی خرابی اور سال ناموں کے سلسلے میں مصروفیت تھی۔ لکھتے ہیں:

> ''اس حد تک شرمندہ ہوں کہ اپنی ندامت کی معافی مانگتے ہوئے بھی ندامت محسوس ہوتی ہے۔'' ۱۱۱

شاعر و ادیب ہونے کے علاوہ قاسمی فنون کے مدیر بھی رہے۔ اس لیے بعض خطوط میں انھیں اپنی تخلیقات کے متعلق اظہار رائے کرنا ہوتا تھا۔ بعض خطوط میں معاصر ادبا سے رابطہ کرنا پڑتا۔ یہ رابطہ بذریعہ خطوط ہوتا۔ ان میں فن پارے کے حسن و قبح کا تذکرہ بھی ہوتا اور قاسمی کُھل کر اپنے تنقیدی تصورات کا اظہار بھی کرتے۔ وہ ان نو وارد ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے جن کی تخلیقات میں انھیں زندگی اور ادب کو سمجھنے کی صلاحیت دکھائی دیتی۔ ان کو دل کھول کر داد دیتے اور مزید لکھنے پر اُکسانا ان کا وطیرہ حیات تھا۔ ممتاز شیریں کے متعلق ان کے میاں صمد شاہین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''اگر ممتاز شیریں باقاعدہ لکھتی رہیں اور اب ترجمے کو قطعاً چھوڑ دیں تو بہت بڑی افسانہ نگار ہو سکتی ہیں۔ ان کے قلم میں قوت ہے اور تحریر میں زندگی۔'' ۱۱۲

قاسمی آخری عمر تک ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی اور تربیت کرتے رہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک

لکھتے ہیں:

''ان کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ عمر بھر نوجوان اردو ادیبوں اور شاعروں کی ادبی اور شعری تربیت میں بڑے تخلیقی انداز سے حصہ لیتے رہے۔ اپنے اس فیضان کی بدولت ہی وہ ہمارے عہد کی بہت بڑی ادبی شخصیت بن گئے۔'' ۱۱۳

بحیثیت ایڈیٹر قاسمی کا وصفِ خاص تھا کہ ادبا وشعرا کو خط وہ اپنے قلم سے لکھتے۔ عمر کے آخری حصے تک قلم پر مضبوط گرفت رہی۔ نیلی روشنائی استعمال کرتے اور دست خط ہمیشہ صاف ہوتے۔ تمام عبارت رواں اور روشن ہوتی اور آخر میں اپنا پورا نام لکھتے۔ نوے برس کی عمر میں قلم پر اتنی مضبوط گرفت اور مہارت کی روانی اہلِ قلم کو حیران کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی کے الفاظ میں:

''ایڈیٹر کی حیثیت سے قاسمی صاحب میں ایک بڑی خوبی تھی جس پر میں نے ہمیشہ رشک کیا۔ قلمی معاونین کو خط وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ آخر عمر تک ان کا سوادِ خط بہت پاکیزہ اور حروف کی نشست بہت پختہ تھی۔'' ۱۱۴

نجی خطوط کی افادیت محدود ہوتی ہے لیکن جب منظرِ عام پر آجاتے ہیں تو علم و ادب کا قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف مکتوب نگار و مکتوب الیہ کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ بعض موضوعات پر بھی ان سے اہم معلومات حاصل ہوتی مثلاً قاسمی اپنی بیگم کا کتنا خیال رکھتے۔ ان کی عدم موجودگی میں گھر کی کیا صورتِ حال ہوتی۔ لکھتے ہیں:

''پیاری رابعہ! آج تمھیں لاہور سے گئے چھٹا دن ہے۔۔۔ مجھے سب سے زیادہ فکر تمہاری صحت کی ہے۔ نعمان بتا رہا تھا کہ سورکی میں بھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں سخت فکرمند ہوں۔ ایک تو تمہارے نہ ہونے سے پورا گھر خالی خالی نظر آتا ہے۔ اس پر تمہاری بیماری کا خطرہ۔ اللہ کرے تم تندرست ہو اور جلد واپس آسکو۔'' ۱۱۵

۳۰ر جون ۱۹۷۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''رابعہ۔۔۔ نعمان بالکل خیریت سے ہے۔ اب اسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ناہید اس کے لیے کھانا پکاتی ہے۔ وہ صرف دودھ گرم کرتا ہے اور چائے بناتا ہے۔ لڑکا برتن دھو دیتا ہے۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ برکتے روزانہ آتی ہے، صفائی کر جاتی ہے۔۔۔ تمہارے نہ ہونے سے گھر بہت اُداس ہے۔ تم کب آ رہی ہو؟ لفافہ بھیج رہا ہوں اس میں اپنا پروگرام لکھ بھیجو۔'' ۱۱۶

ان خطوط میں قاسمی ایک خاوند کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں بیوی کی عدم موجودگی میں انھیں گھر کی فضا سوگوار لگتی ہے، کہیں بیوی کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تلقین کرتے ہیں، کہیں سردی سے بچنے کی نصیحت

ملتی ہے۔ اگر چہ یہ خطوط قاسمی کے لمحہ تنہائی کی پیداوار ہیں۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود قاسمی کی زندگی کے بہت سے گوشوں کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے نہ صرف قاسمی کی خانگی زندگی کے خاص گوشے منور ہوتے ہیں بلکہ یہ ہمیں شخصیت کے بہت سے نرم و نازک پہلوؤں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔

مکاتیبِ قاسمی میں شخصیت کے سربستہ راز عیاں ہوتے ہیں۔ قاسمی اپنے مکاتیب میں سنجیدہ شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں جب کہ ان کے کالموں میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر کی چاشنی ہے۔ ان خطوط میں قاسمی بعض اوقات زندگی سے مایوس، دل گرفتہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ناسازگی طبیعت اور حالات و واقعات سے دل برداشتہ بھی ہو جاتے ہیں۔ آخر "انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں" والی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں تو اب زندگی تک سے تنگ آ گیا ہوں۔ دو دن اچھے گزرتے ہیں تو چار دن انتہائی عذاب میں، کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بالکل نکما اور مجہول سا ہو کر رہ گیا ہوں۔" ۱۷

ان خطوط سے ہی قاسمی کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب محمد طفیل یا دیگر بے تکلف احباب ان کی مدد کرتے۔ قاسمی جب روزگار کی تلاش میں تھے اور اقتصادی بدحالی کا شکار تھے۔ ان حالات میں فاقہ تک نوبت آ گئی۔ قاسمی علامتی انداز میں اپنے معاشی حالات سے محمد طفیل کو ۲۴ر اگست ۱۹۴۴ء کو تحریر کردہ خط میں لکھتے ہیں:

"آپ نے لفافہ بھیج کر کمال کر دکھایا ___ سمجھ گئے ہوں گے آپ۔ باقاعدہ روزے رکھ رہا ہوں۔ اس لیے دن بھر نہایت بھدی غنودگی طاری رہتی ہے۔" ۱۸

ایک اور مقام پر ۴ر مئی ۱۹۴۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میری شادی کی افواہ اڑ رہی ہے اور میری جیب میں کوڑی تک نہیں، جس قدر رقم آپ مجھے بھجوا سکیں، بھجوا دیں، لیکن فوراً، کیوں کہ میرے ذاتی خرچ کے لیے بھی ایک روپیہ تک میرے پاس نہیں، بالکل خالی ہو چکا ہوں۔" ۱۹

مکاتیبِ قاسمی ان کے ذہن اور زندگی کے زاویہ کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا احساسِ جمال، پسندیدگی و پرستاری، ذہنی قربت اور فکری وابستگی، ادبی شعور کو دل چسپ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"یہ خطوط اپنے موضوعات کے اعتبار سے بہت دل چسپ ہیں اور ایک ترقی پسند شاعر افسانہ نگار اور ادیب کی یہ تحریریں نہ صرف ادیبوں اور شاعروں کے لیے دل چسپ ہیں بلکہ عام پڑھنے والوں کے لیے بھی دل چسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔" ۱۲۰

مکاتیبِ قاسمی کی زبان دل کش، شگفتہ اور سادہ ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے افسانے کا لطف ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے اندازِ بیان سے سلیس اردو نویسی اور دیہاتی منظرکشی کو فروغ دیا۔ وہ اپنے مکاتیب میں افسانوی طرز

اپناتے ہوئے منظر کشی کے کامیاب نمونے پیش کرتے ہیں۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔بہت سی لڑکیاں اکٹھی ہیں اور میرے خیالات میں جنگ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ابھی ابھی گلی میں ایک نائی نے ایک ادھیڑ عمر زمین دار کو آواز دی ہے، کہ تم اپنی داڑھی کو بھگو رکھو۔ میں ابھی حقے کا ایک کش لگا کر آتا ہوں۔ میرے بڑے بھائی صاحب نے اپنے صحن کی بیری پر چڑھ کر شاخیں جھٹکائیں ہیں اور کچے بیروں سے ہم دونوں نے پیٹ بھرے ہیں۔ والدہ چائے پکا رہی ہیں۔ دو پالتو کبوتر میرے سر پر بل کھاتے اُڑ رہے ہیں۔'' [۱۲۱]

مکاتیبِ قاسمی میں سرور و انبساط، رنج و الم، بختی و مستی، تعریف و توصیف، طنز و تشنیع، نفرت و الفت غرض تمام جذبات موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جہاں ایامِ بے روزگاری میں روپے کی تاکید ہے وہیں خط پھاڑنے کی گزارش اور بعض اوقات یک مشت رقم بھیجنے کی نصیحت بھی ہے، کہیں خرابی صحت کا تذکرہ ہے کہیں گھریلو حالات کی ناچاقی کا ذکر، کہیں نجی معاملات پر مشورہ ہے اور کہیں کاروباری خطوط پر صلاح مانگنا۔ ان تمام حالات و واقعات سے قارئین کو آگاہ کرواتے ہیں۔

قاسمی اپنے خطوط میں کبھی فنون کے دگرگوں مالی حالات کا ذکر کرتے، کبھی اپنے نجی حالات و واقعات بیان کرتے اور دوست احباب سے مشورے کے طلب گار ہوتے، کبھی عزیز دوست کی ناراضی کا تذکرہ کرتے، کبھی کسی کے روشن مستقبل کی فکر میں مبتلا ہوتے، کبھی کسی کی ملازمت کے متعلق متفکر ہوتے اور کبھی کسی کے معقول رشتے کی جستجو میں لگے رہتے۔ مثلاً منصورہ احمد نے خود کو محبت بھرے انہماک کے ساتھ قاسمی کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ حقیقی بیٹی کی مانند قاسمی کے آرام و آسائش کا بھی بہت خیال رکھتی۔ قاسمی بھی حقیقی والد کی طرح ان کے حال اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے کوشاں رہے۔ منصورہ احمد کے والد حبیب احمد ایڈووکیٹ نے منصورہ کی شادی سمیت تمام اہم امور قاسمی کے سپرد کر رکھے تھے۔ قاسمی، منصورہ کی شادی خانہ آبادی کے لیے بہت متفکر رہتے۔ وہ خود کو ان تفکرات سے آزاد کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ فتح محمد ملک کے نام ۵ر فروری ۱۹۹۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ایک اور بہت ضروری معاملہ میں آپ کی مدد درکار تھی۔ مجھے منصورہ بیٹی کے لیے ایک معقول رشتے کی جستجو ہے مگر میرا حلقہ صرف اہلِ قلم تک محدود ہے اور ان کا حال آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بیٹی ۳۵ سال سے اوپر ہو رہی ہے۔ اگر کوئی ۳۵۔۴۰۔۴۱ عمر کا رشتہ مل جائے جو ادب کے معاملے میں خوش ذوق بھی ہو، خوش کردار بھی ہو اور برسرِ کار بھی ہو تو اس ضمن میں میرا ہاتھ بٹائیے۔ میں برسوں سے تلاش میں ہوں مگر میرا

حلقہ تعارف میں مجھے کوئی ایسا مستحق نظر نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں کہ چند ماہ کے اندر
کچھ ہو جانا چاہیے۔ بیٹی کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی بات بنے گی
تو بتائیں گے۔" ۱۲۲

قاسمی کا شمار ایسے مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے خطوط میں گفتگو کا نعم البدل مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ فاصلوں کو کم کیا۔ ان مکاتیب کے مطالعہ سے قاسمی کی جو شخصیت اُبھرتی ہے وہ ایسے درد آشنا دل رکھنے والے سنجیدہ و متین، کم آمیز اور وضع دار انسان کی ہے جو حساس طبیعت کا مالک تھا جس نے زندگی بھر روحانی و ذہنی اذیتیں برداشت کیں۔ بیماری و ناتوانی کا شکار ہوا لیکن اس کی طبیعت میں انسان دوستی، خلوص و بُردباری، مروت، احباب نوازی، وطن پرستی، سادگی پسندی، خودداری، خود اعتمادی، کشادہ قلبی وسیع النظری کے جواہر کم نہ ہوئے۔ عابدہ عباس مکاتیبِ قاسمی کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"قاسمی صاحب کے خطوط کی عبارت بہت رواں اور روشن ہے اور انھیں قلم پر بڑی
گرفت حاصل ہے۔ ان کے خطوط ان کی شخصیت نمائی کا بہترین ذریعہ ہیں۔" ۱۲۳

قاسمی کے خطوط بیک وقت افسردگی و لطافت کے حامل ہیں۔ اسلوب اگرچہ دھیما ہے لیکن اس کی تہوں میں جذبات کی گرم رو بھی بہتی ہے۔ سادگی، رومانیت، تجسس ہے جو قاری کو پراسرار کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ خطوط ان کی ایسی اُفتادِ طبع کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں ایک سوانح حیات مرتب ہو سکتی ہے، کیوں کہ یہ خطوط قاسمی کی دل نواز، پہلودار شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔

بچوں کا ادب:

بچے معاشرے کا درخشاں مستقبل ہیں۔ اس لیے دنیا کی ہر زبان میں بچوں کے ادب کے گراں قدر خزینے موجود ہیں۔ اکثر شعرا و ادیب بچوں سے محوِ گفتگو نظر آتے ہیں تو قاسمی اتنے اہم موضوع کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ کثیر المقاصد ادیب احمد ندیم قاسمی تاحیات اردو ادب کی خدمت سرانجام دیتے رہے وہاں انھوں نے ننھے نونہالوں کے لیے بہترین نظمیں، دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں تصنیف کیں۔ یہ کہانیاں سادگی و شگفتگی کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے جذبات کی عمدہ ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کے مستقبل کو شان دار بنانے اور کردار کو سنوارنے کا فریضہ بھی عمدگی سے سرانجام دیتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جنھوں نے قاسمی کو بچوں کا ادب تحریر کرنے کی ترغیب دی؟ اس سوال کا جواب قاسمی کے سوانح حیات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ قاسمی کا مخاطب انسان ہے اور بچہ چوں کہ نسل انسانی کا جزو لاینفک ہے اس لیے قاسمی دیگر ادبا کی طرح نژادِ نو کی ذہنی و روحانی تربیت کرنے کے خواہاں تھے۔ دوسری وجہ رسالہ "پھول" سے وابستگی نے قاسمی سے

طفلِ ادب تخلیق کروایا اور تیسری وجہ امتیاز علی تاج سے گہری وابستگی و رفاقت تھی۔ دنیا میں مسرت پھیلانے کے آرزومند قاسمی نہایت فن کاری سے بچوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس سطح پر اُتر آتے ہیں جو بچوں کے مزاج کے عین مطابق ہے جو اس امر کی شہادت ہے کہ قاسمی ایک بار پھر عہد طفلی میں لوٹ گئے۔ وہ بعض اوقات اپنے عالمِ موجود کو فراموش کر کے اتنے معصوم بن جاتے ہیں کہ چاند سے کھیلنے لگتے ہیں، کبھی ہواؤں میں اُڑنے لگتے ہیں اور کبھی عالم تخیل میں پریوں کے دیس میں چلے جاتے ہیں۔ جیسے قاسمی نے اپنے ایک ننھے کردار صفدر کی زبانی کہلوایا ہے:

''میں جب سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا ہوں تو پہلے میرے چاروں طرف ننھے ننھے بالکل ذرا ذرا سے، جوار کے دانوں کے برابر گھنگھرو بجتے ہیں۔ پھر چھوٹی چھوٹی میری چھنگلیاں اتنی رنگ برنگ کی پریاں جانے کہاں نکل پڑتی ہیں۔ چھنک چھنک کرناچتی ہوئی وہ ایک دائرہ بنا کر میرے پاس آتی ہیں تو میں دیکھتا ہوں کسی نے گلاب کی پتیوں کا لباس پہن رکھا ہے۔ کسی کے گلے میں موتیے کے پھولوں کا دوپٹہ لٹک رہا ہے۔ کسی نے گیندے کے پھولوں کا غرارہ پہن رکھا ہے اور کسی کے ہاتھ میں نرگس کے پھولوں کی چھڑی ہے۔ ان میں سے ایک پری کنول کے پھول میں کھڑی میرے پاس آتی ہے تو سب پریاں میرے پاس آتی ہیں۔ کوئی اپنے پروں سے پنکھا کرتی ہے۔ کوئی میری کنپٹیوں کو سہلاتی ہے بہت سی پریاں غوطہ مار کر میرے بالوں سے آر پار نکل جاتی ہیں۔'' ۱۲۳

قاسمی ماہر قصہ گو کی طرح مافوق الفطرت واقعات و کرداروں کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ وہ حقیقت پسند اذہان کو بھی مانوس لگتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی کہانیاں بچوں کی دماغی و روحانی تربیت میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ننھے نونہالوں کو محبت و شفقت کا درس دیتی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ عمدہ کتاب سے برائیوں کو کافور کیا جا سکتا ہے وہ متمنی ہیں کہ بچے صاحبِ کردار ہوں، دیانت، صداقت ان کا شعار ہو۔ عمدہ اخلاق کے مالک ہوں۔ ان کی ذات سے کوئی بھی رنج میں مبتلا نہ ہو''اور پریاں روٹھ گئیں'' میں صفدر نے اپنے دوست سلیم سے پیسے کی خاطر جھوٹ بولا تو پریوں نے کہا:

''ہم پریاں تو صرف اچھے بچوں کی دوست ہوتی ہیں اور صفدر میاں اچھے بچے وہ ہوتے ہیں جو بچے ہوتے ہیں۔ نڈر ہوتے ہیں۔ ایمان دار ہوتے ہیں۔ انصاف کرتے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے اور دھوکا نہیں دیتے۔'' ۱۲۴

پریوں کی زبانی قاسمی نے بچوں کو واعظ کیا ہے تا کہ بچوں کے ذہنوں پر جلد اور دیرپا اثر ہو۔ قاسمی کی تمنا تھی کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس کے مطالعہ سے بچے اچھے مسلمان اور عمدہ شہری، قوم کے ذمہ دار فرد بن سکیں۔ انھوں نے شعوری طور پر اپنی تحریروں میں بچوں کی بہترین تربیت کے لیے کوئی اخلاقی سبق، کوئی نصیحت

ذہن نشیں کرانے کی بلیغ سعی کی ہے۔ بچے جب اپنے پسندیدہ کرداروں کی زبانی یہ پند و نصائح کی باتیں سنتے ہیں تو عمل کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نصیحت کو براہِ راست اور بعض اوقات بالواسط ننھے قارئین کے ذہنوں میں اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً قاسمی جب اپنے بچپن میں پتنگ اُڑاتے ہوئے چھت سے گرے تو اپنے ننھے دوستوں کو نصیحت کرتے ہیں:

''بچو! تم کبھی ایسا نہ کرنا۔ پتنگ اگر اُڑانی ہی ہے تو کسی کھلے میدان میں اور احتیاط کے ساتھ۔'' ۱۲۵

قاسمی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ نصیحت بچوں کے لیے کونین کی گولی کی حیثیت رکھتی ہے جسے نگلنے سے سب انکار کر دیتے ہیں لیکن اگر اسی کونین کی گولی کو شہد کی پڑیاں میں لپیٹ کر پیش کیا جائے تو یہ ذہن میں تلخی پیدا کیے بغیر بآسانی حلق سے نیچے آتر کر معدے میں اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ اس لیے قاسمی نہایت شیریں و نرم انداز میں بچوں کو واعظ بھی کرتے اور درسِ محبت بھی دیتے ہیں:

''اپنے ملک سے، اپنی تہذیب سے، اپنی روایات سے، اپنی زبانوں سے، اپنے گیتوں سے محبت کرنا سیکھو۔ کیوں کہ یہی محبت تمھیں انسانیت کے ساتھ محبت کرنا سکھائے گی۔'' ۱۲۶

قاسمی نے بچوں کو نصیحتیں بھی کی ہیں مگر اس طرح کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بچوں کو ان کی پرلطف، دل چسپ کہانیوں کے علاوہ معلومات افزا مضامین بھی ان کے قلم کی مرہون منت ہے مثلاً:

''شیخوپورہ داخل ہونے سے پہلے ہمیں دور شیخوپورہ کا قلعہ نظر آیا۔ اونچا سا اور کالا سا۔ بس تیزی سے شیخوپورہ کی طرف جا رہی تھی۔۔۔ شیخوپورہ سے نکل کر ذرا آگے بڑھے تو دائیں طرف ہمیں ہرن مینار نظر آیا اور وہ بارہ دری بھی جو کہتے ہیں کہ تالاب کے بالکل بیچ میں بنی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں جہانگیر اور شاہ ہرنوں کا شکار کھیلتا تھا۔'' ۱۲۷

قاسمی کہانی لکھنے کے بڑے ماہر ہیں۔ وہ اس سلیقے سے قصے کو ترتیب دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بوڑھی دادی بچوں کو اپنے اردگرد بٹھا کر کہانی سنا رہی ہو جیسے:

''جوہرآباد کے پاس جو پرانا شہر ہے ناخوشاب نام کا۔۔۔ وہاں کی ایک مٹھائی بہت مشہور ہے جسے پتیسا کہتے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں اس کا نسخہ کسی بزرگ کو پریوں نے بتایا تھا۔ جتنا کھالو اتنا ہی اور بھی کھانے کو جی چاہتا ہے۔'' ۱۲۸

قاسمی بچوں کے لیے کہانی لکھنے کے خاص ڈھنگ سے واقف تھے۔ ان کی تحریروں کے موضوعات روزمرہ زندگی کے مشاہدات سے ہم آہنگ ہوتے تھے اور پیرایہ بیان ایسا دل کش ہوتا تھا کہ فوراً بچوں کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ قاسمی دولت کی مساوی تقسیم کے خواہاں اور طبقاتی کش مکش کے خلاف تھے۔ وہ تمام بنی نوع انسانوں کو ایک پلیٹ فارم

پر لانا چاہتے تھے جہاں تمام انسانوں کو مساوی درجہ وحقوق حاصل ہوں۔ کسی انسان کو بھی مفلسی و امارت کے ترازو میں نہ تولا جائے۔ لکھتے ہیں:

''یاد رکھو اب یہ بات عمر بھر نہ بھولنا کہ انسان امیر غریب نہیں ہوتا۔ انسان تو صرف انسان ہوتا ہے۔'' ۱۲۹

قاسمی انسان دوستی کو سراہتے ہوئے بچپن میں ہی ننھے ذہنوں میں اس انسان دوستی کے سبق کو سموتے ہیں۔ بقول محمود الرحمان:

''قاسمی کے پیش کردہ کرداروں کی وساطت سے بچے بچپن کی منزل میں ہی انسان دوستی کا سبق سیکھنے لگتے ہیں۔'' ۱۳۰

قاسمی کی کہانیاں مفلس کرداروں کے گرد گردش کرتی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں مظلوم کرداروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بچوں کے دل میں لاشعوری طور پر خلوص و ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''پیارے بچو! میری کہانی بڑے آدمیوں کے بارے میں نہیں۔ میری کہانی کے کردار بڑے غریب، سیدھے سادے اور چھوٹے چھوٹے ہیں۔'' ۱۳۱

بچوں کے ادب میں تصاویر کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ تصاویر تنوع اور کہانی کو حسن عطا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ نوعمر قارئین کی ذہنی نشو ونما کے ساتھ ساتھ مسرتوں میں اضافہ کا موجب بھی بنتی ہیں۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی لکھتے ہیں:

''ابتدا میں بچہ جن تصاویر کو دیکھتا ہے، اگر وہ اچھی اور بامقصد ہیں تو بچے کے ذہن پر اس کے وسیلے سے کہی ہوئی باتیں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتی ہیں۔'' ۱۳۲

قاسمی نے بچوں کی نفسیات کے مطابق انھیں علم و ادب کی جانب راغب کرنے کے لیے تصویری خاکوں سے اپنی کہانیوں کو مزین کیا ہے۔ تصاویری خاکے نہ صرف کتابوں اور کہانیوں کو قابلِ توجہ بناتے ہیں بلکہ بچوں کے دیدہ و دل کو بھی مسحور کرتے ہیں۔ بچے ان کہانیوں سے مسرت کشید کرتے ہوئے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

حب الوطنی کا احساس قاسمی کی تحریروں کا اہم اثاثہ ہے۔ اپنے قائد سے، جھنڈے سے، وطن سے محبت کا درس دیتے ہوئے ان قربانیوں کو دُہراتے ہیں جو حصولِ پاکستان کے لیے بوڑھوں، جوانوں اور خواتین نے دیں۔ قاسمی کی تحریر کردہ کہانی ''سبز جھنڈا'' اُس دور کی کہانی ہے جب حصولِ پاکستان کی کوششیں عروج پر تھیں۔ یہ کہانی ننھے صادق کے گرد گردش کرتی ہے۔ نوشہرہ میں مقیم یہ بچہ تحریکِ پاکستان کے جلسوں میں شرکت کرنے کا بے حد شائق تھا۔ ایک ایسے ہی جلسے میں صادق نے سنا کہ آنے والے کل میں ہر گھر کی چھت پر سبز جھنڈا لہرانا چاہیے۔ سبز رنگ کا کپڑا نہ گھر میں موجود تھا نہ ہی خریدنے کی سکت تھی۔ صادق نے اپنے اُستادِ محترم سے قائداعظم، علامہ اقبال، پاکستان کی باتیں سنیں اُسے ان شخصیات سے عشق ہو گیا۔ ماں سے دریافت کرنے کے باوجود بھی

سبز رنگ کے کپڑے تک رسائی نہ ہو سکی چناں چہ گہری سوچ کے بعد اس نے ماسی بختے سے اپنی قمیص کو سبز رنگ میں رنگوا دیا۔ پھر اسے جھنڈے کی صورت دے کر چھت پر لگا کر بولا:

"اماں اے اماں! ادھر آ! دیکھ تو سہی!
پورے گاؤں کے گھر گھر پر سبز پاکستانی جھنڈے لہرا رہے ہیں۔
آ دیکھ نا اماں!
پاکستان بن گیا ہے۔ ہمارے گاؤں میں تو پاکستان بن گیا ہے۔" ۱۳۳؎

صادق کا باپ اِسے جلوسوں میں شرکت کرنے سے منع کرتا۔ جب پورے گاؤں کی چھت پر سبز جھنڈا لہرایا ہوا دیکھا تو حیران رہ گیا اور اپنے گھر کی چھت پر بھی دیکھا تو فرطِ محبت سے صادق کو گلے لگا کر چومنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسوؤں کی برسات جاری تھی اور صادق نے طفلانہ معصومیت سے جواب دیا:

"میں اگر ایسا نہ کرتا تو پتہ ہے کیا ہوتا؟
ہم سے اللہ خفا ہو جاتا۔" ۱۳۴؎

ننھے صادق نے وطن سے محبت کا حق ادا کر دیا۔ یہ کہانی بڑوں کو بھی لمحہ فکریہ عطا کرتی ہے۔ جدوجہد آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ جب قاسمی نے یہ کہانی لکھنی شروع کی۔ یہ کہانی جذبہ آزادی کو اُبھارتی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ جان دار پلاٹ پر مشتمل اس کہانی میں قاسمی نے درس دیا ہے کہ عزائم کی پختگی حصولِ منزل کو آسان بنا دیتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں بچوں کے لیے بھرپور ذہنی تفریح بھی موجود ہے۔ ان کے نزدیک تفریح اتنی ضروری ہے جتنی اخلاقی تربیت۔ خوش حال زیدی لکھتے ہیں:

"احمد ندیم قاسمی نے بچوں کے لیے جو کہانیاں قلم بند کیں وہ بچے کی تفریحِ طبع کا بھرپور سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان کی کہانی "جلیبیاں" اس کی عمدہ مثال ہے جس میں بچوں کی فطرت کا دل چسپ مرقع پیش کیا گیا۔" ۱۳۵؎

قاسمی کی کہانیوں میں تفریح کے ساتھ ذمہ دارانہ رویہ بڑی سنجیدگی سے کارفرما نظر آتا ہے مثلاً "جلیبیاں" میں ہر طرح کے جتن کے بعد بھی چار روپے نہ مل سکے تو قاسمی اپنے احساسات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اگر اللہ میاں یوں ہی مانگنے پر دے دیا کرتے تو انسان آج بھی چیل کوؤں کی طرح درختوں میں گھونسلے بنائے بیٹھے ہوتے۔" ۱۳۶؎

قاسمی کی کہانیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کہانیوں میں آپ بیتی کا لطف موجود ہے۔ قاسمی نے کمالِ محبت و دیانت داری سے اپنے تجربات و مشاہدات ننھے نونہالوں کو منتقل کر دیے ہیں۔ ان کہانیوں میں مقصدیت کا خوب صورت استعمال ملتا ہے۔ ان کہانیوں کا دل کش اندازِ بیاں اس کی سلاست و روانی، دردمندی و خلوص، دل کش فضا بندی، پرتاثیر منظر کشی، عام فہم انداز انھیں ادب میں ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ قاسمی نے فن کی نزاکتوں کو

ملحوظ رکھتے ہوئے جو درس دیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ قاسمی کی کہانیاں نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے درس و تدریس کا ایک مسلسل ذریعہ ہے۔ یہ ایسا درس ہے جس کی ابدیت مسلم ہے۔

پنجابی ادب:

پنجابی ہونے کے ناطے قاسمی کی تخلیقات میں، مشرقی پنجاب کے دیہات سمائے ہوئے ہیں۔ چناں چہ اردو زبان میں کالم، افسانے، تنقیدی خاکے، شاعری کرتے ہوئے اس ماں بولی نے قاسمی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ قاسمی نے پنجابی زبان میں ایک افسانہ ''وخوش'' تحریر کیا جسے عبدالمجید بھٹی نے ترتیب دے کر بعنوان ''دل دیاں باریاں'' میں شامل کیا۔ ''وخوش'' کے لغوی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے قاسمی نے ایک غیر مہذب، اُجڈ، غیر مانوس، ان پڑھ دیہاتی خاتون کی کہانی دل پذیر انداز میں بیان کی ہے۔ قاسمی نے اپنے پنجابی افسانے ''وخوش'' کو بعینہٖ افسانوی مجموعہ ''برگ حنا'' میں ''وحشی'' کے نام سے شایع کیا۔ ''وخوش'' اور ''وحشی'' میں خیالات و جذبات کس قدر یکسانیت کے حامل ہیں اس کا اندازہ درج ذیل اقتباسات کے متن سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے:

> 'بڈھی مائی نے سرتوں چادر چک کے والاں تے ہتھ پھیریا، فیر چادر دا پلوگٹ کے مٹھی
> وچ پھڑلیا تے پاسیں بھیڑنوں جت دیاں نظراں نال ویکھدیاں کنڈکٹرنوں آکھیا:
> بچیا ٹوں تے بسم اللہ دا جم ایں۔'' ۱۳۷

اب اردو زبان کا افسانہ ''وحشی'' ملاحظہ ہو:

> ''بڑھیا نے سر پر چادر اٹھا کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کے ایک پلو کو مٹھی میں پکڑ
> لیا اور دو رویہ ہجوم پر فاتحانہ نظر ڈال کر کنڈیکٹر سے کہنے لگی:
> تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے۔'' ۱۳۸

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات کے متن میں فرق صرف زبان کا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قاسمی نے اردو کے افسانے میں پنجابی افسانے کا ترجمہ کر دیا ہو۔ بسیار نویس ادیب ہونے کی بنا پر ان کی تحریروں میں تکرار کا عنصر بھی ملتا ہے۔ ''وخوش'' میں سنِ اشاعت درج نہیں لیکن برگ حنا ۱۹۵۹ء میں ناشرین لاہور سے شایع ہوا۔ اُس دور میں میو اسپتال سے والٹن تک کا کرایہ ساڑھے پانچ آنے تھا۔ جب کہ دورِ حاضر میں مہنگائی کی بنا پر آنوں نے پیسوں کی بجائے روپوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بوڑھی عورت کنڈیکٹر سے التجا کرنے لگی کہ اسے کسی چار آنے والی جگہ پر بٹھا دے۔ اگلی نشست پر براجمان ایک خاتون نے بڑھیا کو بھکارن گردانتے ہوئے تلاشی لینے کا مشورہ دیا تو قاسمی کا قلم کمالِ فن دکھانے لگا۔ اُنھوں نے نہایت فن کاری سے اس قصہ کو بیان کیا۔ جیسے گاؤں میں دو دیہاتی خواتین ایک دوسرے سے جھگڑتیں اور گالی گلوچ کرتی ہیں۔ قاسمی نے نہایت ہنرمندی سے انھیں ان پڑھ خواتین

کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتے ہوئے نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے ہیں:

> ''بڈھی مائی جنویں اوہدے سر تے چڑھ کے چلکی:
>
> توں میرے پتر دی رن ایں۔ پئی تینوں میریاں جیباں دا پتہ اے۔ والاں وچ پُھل ٹانگ لے تے بھیجے وچ عقل نہیں آ جاندی بی بی رانئے!!!'' ۱۳۹

قاسمی نے اگرچہ کچھ نازیبا الفاظ استعمال کیے جو کانوں کو بھلے نہیں لگتے لیکن خواتین کے کلمات اور نفسیات کی ترجمانی عمدہ ہے۔ انھوں نے ٹھیٹھ پنجابی زبان استعمال کرتے ہوئے بوڑھی عورت، کنڈیکٹر اور شہری خاتون کے کردار و نفسیات کی منظرکشی عمدگی سے کی ہے۔ الفاظ سادہ عام فہم اور بآسانی سمجھ میں آنے والے ہیں۔ منظرکشی اتنے خوب صورت انداز سے کی ہے کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

احمد ندیم قاسمی نے ایک پنجابی شعری مجموعہ ''گلاں خون خمیر دیاں'' بھی ترتیب دیا جسے پاکستان رائٹرز گلڈ نے شایع کیا۔ اس میں بھارت کا پاکستان پر رات کے وقت حملہ کرنا، پاکستانی افواج کی دلیری، قوم کے اتحاد و جذبے اور جوش و خروش کو نظمیہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مرتبین میں اگرچہ قاسمی کا نام سرفہرست ہے تاہم ان کی کوئی نظم شامل نہیں ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے پنجابی ادبی تخلیقات کے دیباچے اور فلیپ بھی تحریر کیے۔ ان میں ''ترنجن'' از احمد رازی، بشیر منذر، ''گل پونجی''، رؤف شیخ کی ''بلدا شہر'' وغیرہ شامل ہیں۔ ترنجن کے متعلق خالد احمد لکھتے ہیں:

> ''ترنجن کا دیباچہ لکھا جسے ایم۔اے۔پنجابی کے کورس میں شامل کیا گیا اور مدتوں شامل رہا۔'' ۱۴۰

بشیر منذر کے پنجابی شعری مجموعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بشیر منذر دی پنجابی شاعری وی ایہہ سادہ پر سوہنی ادا نے ایہہ سوکھی پر اوکھی گھنڈی اوہناں پڑھن والیاں تے ای کھل سکدی اے جیہڑے پنجابی شاعری نوں زبان حرفاں تے لفظاں دا کھیل نیں۔ جادو سمجھدے نیں۔'' ۱۴۱

فلم نگاری:

احمد ندیم قاسمی نے ادب کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی اپنی لیاقتوں کا بھرپور مصرف کیا۔ انھوں نے فلموں کے لیے گیت لکھے، مکالمے تحریر کیے، منظرنامے لکھے، فلم کے اسکرپٹ لکھے۔ انھیں فلمی دنیا کی جانب راغب کرنے والے سعادت حسن منٹو تھے جو انھیں بمبئی مدعو کرتے، گیت لکھنے، فلم کی کہانی لکھنے اور مکالمہ لکھنے کی تحریک دیتے۔ علاوہ بریں قتیل شفائی، بشیر موجد نے بھی ان کی معاشی تنگ دستی، گھر کی تعمیر، دو جوان بیٹیوں کی شادی کے تفکرات میں کمی کے باعث فلم سے وابستگی کی ترغیب دی۔ غرض معاشی حالات میں سدھار کے لیے انھوں

نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۶ء تک کم و بیش چھتیس برس تک فلموں کے لیے لکھا۔ ان فلموں کے نام اور تیار ہونے کا سن اور تفصیل پیش کی جاتی ہے:

ادھورے گیت	۱۹۴۷ء	گیت
دھرم پتنی	۱۹۴۷ء	مکالمے اور گیت
بن جارہ	۱۹۴۷ء	کہانی
آغوش	۱۹۵۳ء	مکالمے، منظرنامے
دو راستے	۱۹۶۰ء	مکالمے
لوری	۱۹۶۲ء	مکالمے
درندہ	۱۹۷۰ء	گیت
ہزار سال	۱۹۷۶ء	گیت

قاسمی کی فلمی وابستگی کا اولین سراغ ایک غیر ریلیز فلم ''ادھورے گیت'' میں بحیثیت نغمہ نگار ملتا ہے۔''اس فلم میں احمد ندیم قاسمی کا ایک نغمہ شامل تھا۔ یہ فلم ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوگئی تھی مگر ریلیز نہ ہونے کے حوالے سے اسم با مسمیٰ ہو کر رہ گئی۔ قاسمی صاحب کا لکھا ہوا یہ نغمہ اپنے عہد کے جانے پہچانے اور بڑے مشہور و معروف گلوکار جی ایم درانی نے گایا تھا۔ فلم کے موسیقار نام ور میوزک ڈائریکٹر شیام سندر تھے۔''[۱۴۲] اس فلم میں ان کا یہ گیت بہت مشہور ہوا:

چاہنے والوں کو ملتا نہیں خوشی ہو یا غم

اسی دور میں ''قاسمی صاحب سے منسوب دو اور فلموں کا پتہ چلتا ہے۔ اولاً فلم ''دھرم پتنی'' میں بطور کہانی نگار و مکالمہ نگار ہمیں ان کا نام ملتا ہے۔ ثانیاً فلم ''بنجارہ'' کے لیے انھوں نے کہانی لکھی اور نغمہ نگاری کی۔ شومئی قسمت کہ دونوں ہی فلمیں اپنے انتہائی ابتدائی مراحل میں ختم ہوگئیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے فلم ''آغوش'' کے مکالمے اور منظرنامے لکھے۔ اس فلم کے متعلق پروفیسر سلیم الرحمٰن رقم طراز ہیں:

> ''قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں بننے والی فلم ''آغوش'' کی کہانی سعادت حسن منٹو نے لکھی جب کہ اس کے مکالمہ نگار منٹو کے علاوہ احمد ندیم قاسمی بھی تھے۔ مذکورہ فلم کے گیت نگار تنویر نقوی، سیف الدین سیف اور قتیل شفائی تھے۔ مرتضیٰ جیلانی اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ اسے فلم ساز تصدیق ریاض نے پروڈیوس کیا۔ کاسٹ میں یہ فن کار شامل تھے: صبیحہ، سنتوش، علاؤ الدین، غلام محمد، گلشن آرا، شاہ نواز، ایم اسماعیل، آزاد شیخ اقبال اور یاسمین۔ قاسمی کے لکھے گئے نصف مکالموں پر مشتمل یہ فلم ۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔'' [۱۴۳]

''آغوش'' کے سات برس بعد فلم ''دو راستے'' ملتی ہے۔ اس فلم میں احمد ندیم قاسمی پردہ سکرین پر بطور

مکالمہ نگار جلوہ افروز ہوئے تھے۔ کہانی اور سکرین پلے عزیز میرٹھی کا تھا۔ نامور موسیقار ماسٹر عنایت حسین نے اسے طرزوں سے مزین کیا تھا۔ نیو چاند فلمز کے بینر تلے اسے فلم ساز ملک رفیق نے قدیر غوری کی ہدایت میں بنوایا تھا۔ اس کے نغمات قتیل شفائی، تنویر نقوی، طفیل ہوشیار پوری، حبیب جالب نے لکھے۔ بہار، اعجاز، نیلو، طالش، علاؤ الدین، ایم اسماعیل، ایمنی منسیولا، ناصرہ اور اداکار یوسف خان کو قاسمی کے لکھے مکالمے بولنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ فلم ''دوراستے'' کے پانچ برس بعد ''لوری'' میں ان کا نام دکھائی دیا۔[۱۴۴]
اس فلم کے متعلق سلیم الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ اس فلم میں انھیں بہترین مکالمہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔ مذکورہ فلم کے فلم ساز و ہدایت کار حمایت علی شاعر تھے۔ ہدایت کار ایس سلیمان تھے۔ موسیقی خلیل احمد نے مزین کی تھی۔ کہانی اور سکرین پلے ذاکر حسین کا تھا۔ زیبا، محمد علی، سنتوش کمار، طلعت صدیقی اور سلونی کو قاسمی کی بے مثل اور یادگار ڈائیلاگ ادا کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ اس فلم میں محمد علی اور حمید وائیں بھی شامل تھے جب کہ چائلڈ سٹار روفی نے بھی بڑا عمدہ اور معیاری کام کیا تھا۔ قاسمی کے عمدہ، موثر اور دل نشین مکالمات پر مبنی یہ فلم ۱۹۶۶ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔'' [۱۴۵]

مندرجہ بالا فلموں میں انھوں نے اگرچہ گیت اور مکالمے لکھ کر فلمی دنیا میں اپنا نام شامل کیا۔ محولہ بالا فلموں کے متعلق ڈاکٹر حسن وقار گل رقم طراز ہیں:

> ''قاسمی صاحب نے قیامِ پاکستان سے قبل دو فلموں ۱۹۴۰ء میں ''دھرم پتنی'' اور ۱۹۴۱ء میں ''بنجارہ'' کے گیت اور مکالمے اور قیامِ پاکستان کے بعد فلم ''آغوش''، ''دوراستے'' اور ''لوری'' کے مکالمے لکھ کر فلم نگری میں بھی اپنا نام لکھوا گئے۔'' [۱۴۶]

۱۹۷۰ء میں فلم ''درندہ'' میں ان کا نام بطور نغمہ نگار ملتا ہے۔ اس فلم کے گیتوں کو علی بخش ظہور، مہدی حسن، نذیر بیگم کی دل کش آوازوں میں گانے کا سراغ ملتا ہے۔ اس فلم کے متعلق پاکستان میلینیم فلم ڈائریکٹری میں درج ہے: جاموٹ فلمز اردو ایس گل، شوکت ہاشمی، گل حیدر، سلونی، سدھیر، رخسانہ، عالیہ، طالش، ۱۲/جون ۱۹۷۶ء میں پنجابی فلم ''خوفناک'' کے لیے لکھے گئے ایک گیت کا علم ہوتا ہے۔''[۱۴۷] جسے موسیقار صفدر حسین نے مالا کی آواز میں ریکارڈ کیا۔ ایک فلم ''ہزار سال'' کے نام سے بنی مگر ریلیز نہ ہو سکی تھی۔ اس کے موسیقار بھی گل حیدر تھے۔ ہدایت کار شوکت ہاشمی اور کاسٹ میں یہ فن کار شامل تھے۔ نیر سلطانہ، سدھیر، طالش، رخسانہ، دل جیت مرزا، علی بابا ساون، حسن پہاڑی اور علاؤ الدین۔ اس فلم کے گیت احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے تھے مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بصورت نغمہ ریکارڈنگ کمپنی نے انھیں ریکارڈ کی صورت میں ریلیز کیا یا نہیں۔[۱۴۸] قاسمی کے معروف افسانے ''گنڈاسا'' پر بنائی

جانے والی فلم ''وحشی جٹ'' ۱۹۷۵ء کو مکمل ہوئی۔ اس فلم کے متعلق پروفیسر سلیم الرحمٰن رقم طراز ہیں:

''۱۹۷۵ء میں بننے والی فلم وحشی جٹ ندیم قاسمی کے شہرہ آفاق افسانے ''گنڈاسا'' پر بنائی گئی تھی۔ مکالمے اور سکرین پلے ناصر ادیب کا تھا۔ گیت وارث لدھیانوی نے لکھے تھے جب کہ میوزک ڈائریکٹر صفدر حسین تھے۔ افسانہ ''گنڈاسا'' کی تھیم پر مبنی قاسمی صاحب کو بہترین کہانی نویس کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اس طرح ۱۹۷۸ء میں بننے والی فلم نذرانہ (اردو) کا سکرین پلے شباب کیرانوی کا تھا۔ مکالمے ریاض الدین ساغر کے تھے۔ موسیقار ایم اشرف تھے جب کہ اس کی کہانی کی اصل بنیاد قاسمی صاحب کے افسانے ''فیشن'' پر رکھی گئی تھی۔'' [۱۴۹]

علاوہ ازیں قاسمی کے پرانے کاغذات سے ایک اسکرپٹ بعنوان ''سکرین پلے ___ برائے آغا گل'' کا مسودہ دست یاب ہوا جسے ناہید قاسمی نے سہ ماہی ''سورج'' جلد نمبر ۳۶، شمارہ ۳۔۴، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء میں شایع کروایا۔ ایک سو چار مناظر پر مشتمل اس دل چسپ انداز کی حامل کہانی کے متعلق ڈاکٹر ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

''یہ اُس زمانے کے فلمی رواج، فیشن اور پسند کے مطابق سادہ سی فلمی کہانی کا سکرین پلے ہے لیکن ندیم صاحب نے اسے خوب صورت انداز میں لکھا ہے۔ انھوں نے تجسس کی پرکشش طاقت کو آخری سین تک برقرار رکھا ہے اور دل چسپی کے عنصر کو بھی مستحکم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ تمام کرداروں سے مناسب موقع پر اچھا کام لیا ہے۔ اس فلم کے گیتوں کے لیے تجویز مقامات بھی بروقت ہیں۔'' [۱۵۰]

انھوں نے دل چسپ و دل کش انداز سے اسکرپٹ ترتیب دیا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے مذکورہ سکرین پلے کو اس دور کا ''ماڈل سکرپٹ'' کہا ہے۔ اگرچہ اس کا پلاٹ اختصار کا حامل ہے۔

''قصے کے عام موڑ روانی سے سامنے آتے اور مکمل ہو کر گزرتے جاتے ہیں۔ ان سب کو ندیم صاحب نے اپنے جاگتے مستعد شعور سے پُرتاثیر انداز میں ترتیب دیا ہے۔'' [۱۵۱]

ریڈیو:

قاسمی کے سوانحی حالات و کوائف سے یہ منکشف ہوا ہے کہ سجاد سرور نیازی ریڈیو اسٹیشن پشاور کے ڈائریکٹر نے ۱۹۴۶ء میں انھیں پشاور مدعو کیا۔ قاسمی نے ۱۹۴۸ء میں وہاں بحیثیت اسکرپٹ رائٹر کام کا آغاز کیا۔ پشاور میں ہی ان کی ملاقات فارغ بخاری، رضا ہمدانی، محسن احسان، خاطر غزنوی، احمد فراز اور حمید نسیم سے ہوئی۔ اس دوران چوہدری نذیر احمد کے ایما پر مجلّہ ''سویرا'' مرتب کیا اور پشاور ریڈیو اسٹیشن کے لیے اسکرپٹ لکھے۔ جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو انھوں نے اپنے من پسند موضوع اور شخصیات مثلاً تحریکِ آزادی، قیامِ پاکستان، ہجرت اور قائداعظم کی شخصیت اور ان کی جدوجہد آزادی کے موضوعات پر ترانے لکھے۔ ان ترانوں کی دھنیں ریڈیو اسٹیشن پشاور کے ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی نے بنائیں۔ قاسمی نے ان پر سوانحی خاکہ بھی لکھا۔ چناں چہ ''۱۳/اگست ۱۹۴۷ء کو

رات بارہ بجے جب آل انڈیا ریڈیو کو پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس میں بدلنا تھا تو پشاور والے ریڈیو اسٹیشن کا سارا سٹاف سٹیشن کے لان میں جمع تھا۔ سٹاف کے ایک رکن پروگرام اسسٹنٹ شوکت نے عمارت کے چھت پر کھڑے ہو کر ریوالور سے ہوائی فائر کر کے آزاد پاکستان کے قیام کا اعلان کیا۔ سجاد سرور نیازی بھائی (جو وہاں کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے) نے سبز ہلالی پرچم لہرایا۔'' [۱۵۲] چناں چہ جب ریڈیو پاکستان کا آغاز ان کے لکھے ہوئے گیتوں اور نغموں سے ہوا تو کافی دنوں تک خوشی و سرشاری کے عالم میں رہے۔ لکھتے ہیں:

> ''۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو حاصل ہونے والی آزادی سے اور ریڈیو پاکستان پشاور کا آغاز اپنے لکھے ترانوں اور نغموں سے ہونے کے بعد دنوں تک میں سرشاری کے عالم میں رہا۔'' [۱۵۳]

جب پشاور شہر میں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے محلے کو آگ لگا دی۔ حواس باختہ قاسمی یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ملک کی سیاسی صورت حال نے انھیں بہت پریشان کیا چناں چہ وہ اپنے ملک کی سیاسی صورت حال، اپنے ہم وطنوں کی اُمنگوں، ارمانوں اور خواہشات کو کہانی کی صورت میں ڈھالنے کے خواہش مند تھے چناں چہ اس صورتِ حال میں لاہور زیادہ موزوں پایا اور قاسمی پشاور سے لاہور کی جانب مراجعت کر گئے۔ اسلام شاہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''اس کے بعد اگرچہ باقاعدہ طور پر قاسمی صاحب ریڈیو سے منسلک نہ تھے البتہ مختلف حیثیتوں سے مکمل تعاون فرماتے رہے۔ قاسمی صاحب نے ریڈیو کالم کا آغاز کیا۔ ریڈیو کے لیے عالمی و ادبی پروگرام لکھے اور اُن میں شرکت فرمائی۔ مشاعروں میں شرکت فرمائی اور ان کی صدارتیں بھی کیں۔ ریڈیو کے موسیقی کے شعبہ کے زیرِاہتمام قاسمی صاحب کے لکھے ہوئے مقبول ترین نغمے جو پاکستان کے نام وَر گلوکاروں نے گائے۔'' [۱۵۴]

قاسمی کی لکھی ہوئی غزلیں، نغمے، گیت ملک کے مقبول گلوکاروں نے گائیں۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ گلوکار ان کی غزلیں گانا باعث عزت و افتخار سمجھتے تھے۔ ان کی غزلیں جن معروف گلوکاروں نے گائیں ان کی تفصیل پیش خدمت ہے:

۱۔	سانس لینا بھی سزا لگتا ہے	پرویز مہدی
۲۔	گل تیرا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں	//
۳۔	انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا	غلام علی
۴۔	شام کو صبحِ چمن یاد آئی	//
۵۔	وہ کوئی اور نہ تھا، چند خشک پتے تھے	//

۶۔ خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے — مہناز اور ساتھی

۷۔ کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا — نصرت فتح، ساتھی

۸۔ زندہ ہے پاکستان تو ہم سب زندہ ہیں، پائندہ ہیں — نذیر بیگم، سلیم رضا اور ساتھی [۱۵۵]

ان کی غزلیں بالخصوص سانس لینا بھی سزا لگتا ہے، خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے، زندہ ہے پاکستان تو ہم سب زندہ ہیں، پائندہ ہیں، اپنے وطن سے محبت پر مبنی ملکی حالات و واقعات پر مشتمل، ان نغموں کو شائقین، سامعین اور ناظرین نے بہت سراہا۔ قاسمی کی خدمات کے اعتراف میں ریڈیو پاکستان نے اسٹیشن ڈائریکٹر ستار سید کی زیرنگرانی خوب صورت تعزیتی پروگرام پیش کیا گیا۔[۱۵۶] جس میں ان کی ناقابلِ فراموش خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ۲۰۰۵ء تک ریڈیو پاکستان لاہور سے ہفتہ وار سماجی و ثقافتی کالم پیش کرتے جس کا نہایت بے تابی سے سامعین منتظر رہتے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے تاحیات ریڈیو سے رابطہ قائم رکھا۔

قاسمی نے ریڈیو کے لیے ''مصور'' ریڈیائی کھیل بھی لکھا۔ یہ ریڈیائی کھیل تصورِ فن، تصورِ حسن اور قدردانیِ فن پر مشتمل ہے۔ جذباتی و ڈرامائی عناصر پر مشتمل یہ کھیل رستم وسہراب کی یاد دلاتا ہے۔ یہ کھیل فن اور فن کار کی قدر کا درس دیتا ہے۔ انسانی محبت کے دعوی دار قاسمی کا یہ کھیل ان کی نظم ''انسان عظیم ہے خدایا'' کی یاد دلاتا ہے مثلاً جب پرویز کو دربارِ شاہی میں بلا کر اس کا وطن پوچھا جاتا ہے تو وہ استعاروں میں جواب دیتا ہے:

> ''ساری دنیا میرا وطن ہے، ندی کنارے کی ریت، میدان کا سبزہ اور پربتوں کی دھندلی گھاٹیاں میرا بستر ہیں اور تاروں بھرا آسمان میرا خیمہ ہے یہاں، وہاں، ہر مقام میرا ہے، میں کائنات کا دولہا ہوں، کیوں کہ میں انسان ہوں۔'' [۱۵۷]

شہزادی بلقیس کو دیکھنے کی پاداش میں پرویز کو دربار میں بلایا گیا تو پرویز اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے:

> ''حسن جہاں بھی ملے اور جس صورت میں بھی ملے، فن کار کا اثاثہ ہے۔'' [۱۵۸]

دبی دبی محبت اور فن کار کی موت، بادشاہ کا قتل کرنا بعدازاں احساسِ جرم المیہ کو جنم دیتا ہے۔ اس ریڈیائی کھیل کا پلاٹ اگرچہ پرانی روش پر ہے لیکن ریڈیائی خصائص کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ خارجی و داخلی تصادم پر مشتمل اس کھیل کے مکالمے برجستہ اور رواں ہے۔ زبان بھی عام فہم اور روزمرہ زندگی کے قریب ہے۔ پلاٹ میں کہیں کوئی جھول یا احساسِ تشنگی نہیں ہوتا۔ انھوں نے کھیل کے اختتام تک تجسس کی پرکشش روایت اور دل چسپی کے عنصر کو قائم رکھا ہے۔

ٹیلی ویژن:

احمد ندیم قاسمی نے ادب وثقافت، اخبار و جرائد، ٹیلی ویژن ہو یا ریڈیو تمام شعبوں پر نقوش ثبت کیے۔ ٹیلی ویژن پر ان کی غزلیں، گیت، نغمے، مختلف گلوکاروں نے خوب صورت آواز میں گائیں۔ بعض غزلیں دو دو مقبول گلوکاروں نے گائیں مثلاً:

انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا

یہ غزل اگرچہ غلام علی نے اپنی دل کش آواز میں گائی لیکن یہی غزل معروف مغنیہ روشن آرا بیگم نے اپنے ترتیب دیے ہوئے راگ ''نورانی'' میں سجا کر ۲۳راگست ۱۹۶۹ء کو راول پنڈی ٹیلی ویژن پر پیش کیا۔ ناظرین نے اس پروگرام کو بہت پسند کیا۔[۱۵۹]

بریں ہمہ ٹیلی ویژن پر قاسمی کے معروف افسانوں کو ڈرامے کی صورت میں پیش کیا گیا مثلاً قاسمی کہانیوں پر ان کی معروف کہانیوں پر مشتمل ڈراموں کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا جسے ناظرین سے بہت پذیرائی ملی۔ علاوہ ازیں ان کے معروف افسانوں ''گنڈاسا، ست بھرائی، پرمیشر سنگھ'' کو ڈرامے کی صورت میں پیش کیا گیا۔ ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر، ہدایت کاران کی کہانیوں پر کام کرنا باعثِ فخر گردانتے تھے۔ اس کی تصدیق ٹیلی ویژن کے معروف اداکار سہیل احمد کے درج ذیل قول سے ہوتی ہے:

> ''احمد ندیم قاسمی کے تخلیق کردہ کرداروں کو ادا کرنے کی کوشش کرنا ایک اعزاز ہے۔ پرمیشر سنگھ کے لیے ٹائٹل رول کرنے پر احمد ندیم قاسمی صاحب مجھ سے بہت خوش تھے۔ اس افسانے کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے والے ڈائریکٹر ایوب خاور کو بھارتی فلم انڈسٹری سے گلزار صاحب، شبانہ اعظمی اور جاوید اختر سمیت دوسرے فن کاروں نے بھی تعریفی ٹیلی فون کیے۔ اداکار منور سعید نے ''گنڈاسا'' میں مولا کا کردار ادا کرنے اور ریحانہ صدیقی، خیام سرحدی اور مہر النساء نے ''ست بھرائی'' میں رول کرنے کو اپنے لیے اعزاز کہا اور قاسمی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔''[۱۶۰]

مزید بریں ان کے خاص طور پر ٹی وی کے لیے لکھے ہوئے ڈراموں میں ''جیب کترا''، ''سلسلے ستارے''، ''اپنے پرائے'' وغیرہ بھی بہت مقبول ہوئے اور ناظرین کی فرمائش پر کئی کئی بار ٹیلی کاسٹ ہوئے۔[۱۶۱] انھوں نے مختار صدیقی کی فرمائش پر تیئیس مارچ یومِ پاکستان کے حوالے سے لاہور ٹی وی کے لیے ایک منظوم فیچر بھی لکھا تھا جسے خوب صورتی اور اہتمام سے پیش کیا گیا تھا۔ ندیم صاحب نے ۲۰۰۵ء تک ریڈیو پاکستان لاہور سے ہفتہ وار سماجی اور ثقافتی کالم پیش کیا۔ سامعین کو اس کا انتظار رہتا۔ یوں ندیم صاحب نے ریڈیو سے تاعمر رابطہ رکھا۔[۱۶۲]

ترجمہ نگاری:

ترجمہ کا بنیادی مقصد اصل متن کے مفہوم و خیال کو، مناسب الفاظ میں کسی دوسری زبان میں پیش کرنا ہے۔ قاسمی نے اشرف صدیقی اور میریلین لرچ کی انگریزی کتاب Toontoony Pie and other tales from Pakistan کا اردو ترجمہ بعنوان ''پاکستان کی لوک کہانیاں'' کیا۔ یہ کتاب بچوں کے ادب میں دل کش اضافے کا باعث ہے۔ ان کہانیوں کے موضوعات بڑی دل چسپی کے حامل اور تجسس سے بھرپور ہیں۔ بچوں کے علاوہ بڑے بھی ذوق وشوق سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں مثلاً ایک آدمی جس کا قد صرف تین انچ تھا، تونتونی کے سموسے، سودے باز چوہا، گیڈر اور مگرمچھن، چالاک گیڈر نے شیر کو کیسے چکرایا؟ پھٹی ہوئی ناک والا گیڈر وغیرہ وغیرہ خوب دل چسپی کے حامل عنوانات ہیں۔ ان کہانیوں میں صحت، صفائی، تفریح کے ساتھ ساتھ محبت، اتفاق، حب الوطنی، قومی یک جہتی کا درس ملتا ہے اور بچوں کے دلوں سے تعصب، نفرت، عداوت، کینہ اور تنگ دلی کا خاتمہ کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ ترجمہ کے دوران مترجم کو پانچ چھے برس کے بچوں کی ذہنی کیفیتوں سے گزرنے کا تجربہ ہوا۔ مترجم اس عمل سے ذہنی حظ اُٹھاتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں قاسمی کی عمر تقریباً باون (۵۲) برس تھی جب انھوں نے پیش نظر ترجمہ کیا۔ انھوں نے نہایت انہماک اور ذوق وشوق سے منظوم حصوں کے منظوم تراجم کیے اور بچوں کے جذبات و احساسات کو الفاظ کی صورت میں ڈھالا۔ تلاش بسیار کے باوجود اصل کتاب کے متن تک رسائی تو نہ ہو سکی تاہم ترجمہ کی بے ساختگی اور روانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عمدہ ترجمہ ہے جس پر طبع زاد کا گماں ہوتا ہے۔

قاسمی کہانی کی ابتدا اس انداز سے کرتے ہیں جیسے دادی اماں سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں یا گرمی کی چاندنی راتوں میں کشادہ صحن میں چارپائی پر بیٹھی اپنے اردگرد بچوں کو بٹھائے کہانی سناتی ہیں مثلاً:

> ''کسی دور دراز کے ملک کا ایک بادشاہ تھا۔ وہ ایک شان دار محل میں رہتا تھا۔ یہ محل صاف شفاف، نیلے پانی کے تالابوں میں گھرا ہوا تھا۔'' [۱۶۳]

''کسی دور دراز کے ملک کا ایک بادشاہ تھا'' اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کا وجود فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ بادشاہ کا صاف شفاف محل نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے۔ قاسمی نے اگرچہ چند انگریزی اور جاپانی نظموں کے تراجم بھی کیے لیکن ہمارا سروکار چوں کہ ان کے نثری تراجم سے ہے اس لیے نثری تراجم میں صرف اسی ترجمے کا سراغ ملتا ہے۔ پیش نظر ترجمہ میں قاسمی ایک سنجیدہ مترجم کے طور پر نظر آتے ہیں۔ درآں حالاں کہ زبان کا معیار آخر تک قائم رہتا ہے۔ ان کے ترجمے میں ابلاغ کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ وہ جہاں دل آفریں نثر لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہیں تراجم میں بھی دقت محسوس نہیں کرتے۔ یہ ترجمہ سلاست، روانی، برجستگی کا حامل ہے۔ اس میں پیچیدہ خیالات و تجربات کو روانی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ لفظی ترجمے کا خارزار میں نہیں الجھتے بلکہ اصل

عبارت کے مفہوم اور مصنف کے خیالات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے تراجم میں آمد ہی آمد ہے کہیں بھی آورد کا گماں نہیں ہوتا۔ کہیں بھی انھوں نے روانی، برجستگی، شگفتگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ زبان نہایت دھیمی، آسان فہم اور روزمرہ کے قریب ہے۔ سادگی و خلوص کی کارفرمائی ہے۔ ان کہانیوں میں پیش کردہ خیالات و جذبات بھی سبک، لطیف اور صالح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ترجمے پر طبع زاد کا گماں ہوتا ہے۔ انھوں نے صرف اصل مصنف کے خیالات و احساسات کو ایک ترتیب وسلیقے سے دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا بلکہ مصنف کے لب ولہجہ اور روح بھی دوسری زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ قاسمی کو جہاں اردو زبان پر عبور تھا وہیں انگریزی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تراجم میں کہیں بھی مترجم اُلجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنی محنت، لگن اور شوق سے یہ ثابت کر دیا کہ تخلیقی ادب کا ترجمہ بھی تخلیقی ہو سکتا ہے۔

ناول:

اردو ادب میں غیر معمولی شہرت کے حامل قاسمی نے بارہ برس کی عمر میں اسّی صفحات پر مشتمل، اپنے گردوپیش کے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر، مخصوص کیفیت میں ناول لکھا۔ اس ناول کے متعلق بتاتے ہیں:

> ''ساتویں جماعت میں، میں نے اسّی صفحات کا ناول بھی لکھا تھا جس میں ایک نوجوان نے ایک دوشیزہ کو دریچے سے جھانکتے دیکھا اور وہیں بے ہوش ہوگیا۔ دوشیزہ بھاگ کر آئی۔ طلمہ سنگھایا، محبت کی پینگیں بڑھیں لیکن لڑکی کے والدین کو سب راز معلوم ہو گیا اور دونوں سنکھایا پھانک کر قربان گاہِ محبت کی بھینٹ چڑھ گئے۔'' ۱۶۴

ناول کا مضمون اگرچہ پامال تھا۔ یہ ناول بچپن کی لاپرواہی کی نذر ہوگیا۔ یہ ناول نہ تو کسی ادارے سے شایع ہوا۔ نہ ہی مصنف کے پاس کوئی مسودہ موجود ہے۔ بعدازاں انھوں نے پنجاب کے دیہی افراد کی زندگیوں کو افسانوں کی صورت میں پیش کیا لیکن ان کے ذہن میں ناول لکھنے کا شوق بھی تھا۔ عمر کے آخری حصے میں ایک انٹرویو میں اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں:

> ''میرے ذہن میں آج بھی دو تین ناولوں کا نہ صرف خاکہ بلکہ کرداروں کے مکالمے تک محفوظ ہیں مگر میں قلم مزدور ہوں۔ معاش کی مجبوریاں مصروف رکھتی ہیں۔ اس لیے میں ارادے کے باوجود ناول نہیں لکھ سکا۔'' ۱۶۵

تاہم انھوں نے ایک ناول بعنوان ''پت جھڑ'' لکھنے کی کوشش کی لیکن بلاوا اجل آ جانے کے باعث پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ان کی وفات کے بعد ناہید قاسمی نے دس صفحات پر مشتمل اس نامکمل ناول کو شایع کرایا۔ یہ ناول دیہاتی پس منظر کی خوب صورت عکاسی کے ساتھ ساتھ دیہاتی معاشرت کی دل آویز تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ یہ ناول دو حصوں بنام فیصلہ اور گیت پر مشتمل ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں چراغ علی، زیتون، زینی اور آلی (زینی کی سہیلی)

شامل ہے۔ محبت و احساس کے جذبہ سے معمور یہ کہانی جوان بیٹی کے رونے، اس کی اُداسی اور آنسوؤں کا سبب جاننے کی کوشش پر مشتمل ہے۔ پیش نظر ناول دیہاتی معاشرت و ثقافت کی ترجمانی کرتا ہے۔ زینی والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ یہ حصولِ محبت کو ممکن بنانے کے لیے آنسوؤں کا سہارا لیتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ اس کی ماں (زیتون بی بی) تمام معاملات سے بخوبی آگاہ ہے لیکن ایک طرف وہ باپ کو سمجھانے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے تو دوسری جانب بیٹی کو بھی ناموسِ خاندان کے لیے محبت کو خاموشی سے سولی پر چڑھانے کی ترغیب دیتی ہے۔ زینی کو سمجھاتے ہوئے کہتی ہے:

> ''بیٹی! رونے سے کچھ نہیں بنے گا۔ مفت میں اپنی آنکھیں پھوڑو گی جو ہونا ہو گا ہو جائے گا۔ اب تیرے ماں باپ کریں تو کیا کریں کہ یہ تیرے اپنے نصیب ہیں۔ دو رشتے ہیں پر دونوں ایک دوسرے کی جان کے لاگو۔ سو تیرے بابا کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے کہ دونوں سے نہیں کہہ دو۔ دونوں جائیں بھاڑ میں۔ کسی تیسرے کی راہ تکو اور راہ تکنا بھی کیا، دنیا بھر کے جوان مر تو نہیں گئے۔ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں لیکھ تو کبھی جاگیں گے۔'' [۱۶۶]

لیکن زینی کی آنکھوں سے سیلاب کی جھڑی تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ چراغ علی اس کے آنسوؤں کا سبب جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ چراغ علی کے دل میں کئی اندیشے کھٹکتے ہیں لیکن زیتون بی بی تسلیاں دیتے ہوئے کہتی ہے ''تم زینی کی زیادہ چنتا نہ کیا کرو۔ اس نے میرا دودھ پیا ہے۔ خاندان کے نام کو بٹہ لگانے والیوں کی آنکھوں میں بے حیائی ننگی ہو کر بیٹھی رہتی ہے۔ پر تمہی کہو۔ کبھی زینی کی آنکھوں کو اُٹھا ہوا بھی دیکھا ہے کسی نے؟ ایسا لگتا ہے نظریں زمین سے سل گئی ہیں۔''[۱۶۷] محبت کا طلسم جلد ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ جب زینی چکی چلاتے ہوئے گیت گاتی ہے تو چراغ علی اس کے گیت میں عہد شباب کے ذکر اور آنکھوں میں آنسو کو محبت کی علامت سمجھتا ہے۔ ایسی بے بس محبت جس میں رونے اور آہ و بکا کے کوئی چارہ نہیں۔ زینی واقف ہے کہ اس کے باپ کا برچھا عتاب الٰہی بن کر نازل ہو گا۔ یہ ادھورا ناول دبی دبی محبت پر مشتمل ہے۔ قاسمی نے دیہاتی لینڈ اسکیپ اس پر اثر انداز ہونے والے موسمی تغیرات اور طبعی حالات کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس ناول میں جہاں خارجی ماحول، دیہاتی افراد کی زندگیوں، توہم پرستی کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔ وہیں اخلاق سے معمور انسان دوستی، مناظر قدرت سے والہانہ لگاؤ بھی ملتا ہے۔

ناولٹ:

''ایک ریوڑ، ایک انبوہ'' قاسمی کا ناولٹ ہے جو ان کی وفات کے بعد اشاعت پذیر ہوا۔ پیش نظر ناولٹ فنون میں باقاعدہ شایع ہوتا رہا۔ اس ناولٹ کی پہلی قسط فنون کے شمارہ ۱۲۳، نومبر، دسمبر ۲۰۰۴ء میں شایع ہوئی۔ دوسری قسط شمارہ ۱۲۴، جنوری، اپریل ۲۰۰۵ء میں، تیسری شمارہ نمبر ۱۲۵، مئی، اکتوبر ۲۰۰۵ء میں اور چوتھی قسط

شمارہ نمبر ۱۲۶، نومبر، دسمبر ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ ناولٹ کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ قاسمی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ ناولٹ کی کہانی باغیانہ اور انقلاب پسند انہ خیالات کے حامل کسانوں کے گرد گردش کرتی ہے جو فرسودہ، بوسیدہ، معاشرے کی اقتدار کو بدلنے کے خواہش مند ہیں۔ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی پاداش میں پابند سلاسل بھی کر دیا جاتا ہے۔ یہ ناولٹ دو طبقاتی کش مکش پر مشتمل ہے جس میں مارکس ازم کا فلسفہ بھی موجود ہے۔ یہ کہانی دو طبقوں بورژوا یعنی زمین داروں پر مشتمل ہے اور دوسرا پرولتاری پر اُستوار کسانوں، مزدوروں کی محنت پر مشتمل ہے۔ پانچ ذیلی عنوانات سودی، سنگاپور سے دور، پاکستان زندہ باد، آؤ ایکا کریں، اطمینان ناولٹ کا منظرِ عام پر آنے کا محرک اوّل یہی تھا کہ انھیں پرانے کاغذات اور فائلوں کی ورق گردانی کے دوران مسودہ ملا۔ پیش نظر ناولٹ کا مسودہ قاسمی کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ وقت کی گرد نے کاغذ کو خستہ کر دیا تھا لیکن تاحال عبارت محفوظ تھی۔ یہی محفوظ عبارت اشاعت کا باعث بنی۔ اس ناولٹ کا پس منظر دوسری جنگ عظیم کے ایام سے لے کر جب ''ہٹلر اور مسولینی کے بعد جاپان کے ہیرو ہٹو نے بھی اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا اور برطانیہ کے زیرِ نگیں اُس وقت کے پنجاب کے علاقوں میں رنگروٹوں کی دھڑا دھڑ بھرتی ہونے لگی تھی۔''[۱۶۸] یہ ناولٹ حصولِ پاکستان کی کاوشوں اور قیامِ پاکستان تک کے حالات و واقعات کو احاطۂ تحریر میں لاتا ہے۔ زیرِ نظر ناولٹ ''فنون'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس ناولٹ میں مصنف نے جنگ، پسماندہ ملکی حالات، انتشار، بدامنی، مفلسی، مہنگائی، انگریز سامراج کے تسلط، مسلم لیگیوں کے جلوسوں، قیامِ پاکستان کے لیے کوششوں، انسان دوستی، جذبہ ہمدردی، اتحاد، بے حسی، رومانی اقدار کے فقدان کو دل پذیر انداز میں بیان کیا ہے۔

پیش نظر ناولٹ میں زمین دار سیاسی طور پر بیدار نوجوانوں کی تحریص پسند قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کے لیے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ جب ان پڑھ گاؤں کے افراد کے دل و دماغ میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کا بیج کونپل بن کر پھوٹ پڑتا ہے جس نے شدہ شدہ تن آور درخت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس میں ان روح فرسا واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ جب غریب کسان کو زمین دار کا شکنوں بھرا ماتھا موت کا وارنٹ دکھائی دیتا ہے۔ کبھی اس کو جوتے سے للکارا جاتا ہے۔ پھر مفلس کسان بیگو سوچنے لگتا ہے کہ:

> ''ہم کس کس کا نمک کھاتے ہیں۔ انگریز کا، اور پھر ذیل دار کا، اور پھر زمین دار کا۔ ہم عمر بھر نمک ہی کھاتے رہتے ہیں اور اس نمک کو حلال ثابت کرنے کے لیے مر مٹ جاتے ہیں۔ جوتیاں کھاتے ہیں، بیٹیاں بیچتے ہیں، کھیسیں نکال نکال دیتے ہیں اور جب اپنے ہی اُگائے ہوئے کھیتوں سے مکئی کا ایک بھٹا یا باجرے کا ایک سٹا توڑتے ہیں تو نمک حرام ہو جاتے ہیں۔'' [۱۶۹]

مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھانے پر گالیوں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ جب بھی مفلس کسان ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے تو ان کی مذہبی و نفسیاتی نقطہ نظر سے سفید لباس میں ملبوس، ہاتھ میں تسبیح، سفید داڑھی والے مولوی کا تعاون حاصل کیا جاتا۔ مولوی انگریز حاکم کا حمایتی، ان سے بغاوت کو کفر کے مترادف سمجھتا ہے۔ پھر جب ظلم و جبر کی انتہا ہو جاتی تو یہ کسان نہ زمین دار کی مخالفت کی پروا کرتا۔ پھر بڑی جرات سے سماج کے ان ٹھیکے داروں سے مخاطب ہو کر بیگو کہتا ''اے ملک! زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا تیری۔۔۔ ہماری راہ میں روڑہ اٹکایا تو کچا چبا لوں گا تجھے!''[۱۷۰] قاسمی کسی نظام کو عوام پر تھوپنے کے قائل نہیں۔ وہ عوام کے اجتماعی شعور کی تربیت کے ذریعے ملک میں حق و انصاف اور امن و امان کا پرچار چاہتے ہیں۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد کی صورتِ حال کو مفلس بیگو کی زبانی یوں پیش کرتے ہیں:

> ''پہلے انگریز نے ہمیں اپنے اشاروں پر نچایا تھا۔ آج خود اپنے ملک کے امیر لوگ ہمیں انگلیوں پر نچا رہے ہیں اور ملک کی گندم اور پٹ سن کی طرح ہمارا لہو اور پسینہ بھی دساور میں بھیجتے ہیں اور بدلے میں پوڈر کے ڈبے اور شراب کی بوتلیں اور لمبی لمبی موٹریں پاتے ہیں۔'' [۱۷۱]

قیامِ پاکستان کے بعد اپنے ہی ملک میں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ پھر ان محنت کشوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ روشن ہونے لگتے ہیں وہ زمین دار کو جان سے مارنے کی بھی سوچتے ہیں۔ ان زمین داروں کو نہ صرف بکرے، مرغیاں، انڈے، گھی وغیرہ نذرانے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں بلکہ اپنی کنواری بیٹیاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جیل کی سزائیں سہنے کے بعد، زمین دار کے مظالم برداشت کرتے کرتے یہ مفلس کسان ان کی نفسیات سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ زمین دار کی تیاریاں وزیر کی آمد پر جوبن پر تھیں جب چوپال پر غالیچے بچھ گئے تھے۔ کھانا تیار ہو رہا تھا۔ تب زمین دار کے خلاف وزیر کو اطلاع دی گئی کہ وزیر کی جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے کیوں کہ کسانوں کی بڑی تعداد اس کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ ان کا مقصد محض زمین دار کے رعب و داب میں کمی تھی۔ بیگو ایک مزارع دوسرے کسان کو زمین دار کی نفسیات کے متعلق بتاتا ہے کہ ''تم انھیں ایک گالی دو گے تو وہ تمھیں دس گالیاں دے دیں گے۔ تم ان پر ایک لاٹھی اٹھاؤ گے تو وہ تم پر بیس کلہاڑے برسا دیں گے، لیکن تم ان کی کھوکھلی شان پر چوٹ لگاؤ گے، اُن کے پاؤں تلے کی زمین نکال لو گے تو وہ بوکھلا جائیں گے۔''[۱۷۲] غیور کسان اس امر سے واقف ہو چکے تھے کہ وزیر کی آمد پر زمین دار کو تمغوں، جاگیروں اور زمینوں کی بشارت دی جاتی۔ پیشِ نظر ناولٹ میں بیویاں اگر عملی طور پر مردوں کے شانہ بشانہ کام نہ کر سکتی

لیکن ذہنی طور پر مردوں میں جوش و خروش پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جب بگو کو زمین دار سے گستاخی کی سزا کے طور پر ہتھکڑیاں پہنائی جا رہی تھیں تو بگو کی فرمائش پر اس کی بیوی دوہے کا آخری مصرع گا رہی تھی:

''پکی گل اے، جیہاں پچیاں لائیاں، اوہ سولی چڑھدے ہسدے۔'' ۱۷۲

ایک ڈرامائی صورت حال پیدا کرتا ہے۔ یہ ناولٹ ظالم زمین دار کے سامنے حرف لب کھولنے کی پاداش میں پابند سلاسل کر گیا لیکن ذہنی و جسمانی زیادتیوں کے باوجود ان نوجوانوں کے دلوں میں حصولِ وطن کی خواہش، تیز تر ہوتی گئی اور زمین دار کا ظلم و جبر بھی ان کے بلند مقاصد کی راہ میں حائل نہ ہو سکا۔ مذکورہ ناولٹ اگرچہ استحصال پسند زمین دار طبقہ کی طرف سے کسانوں پر ظلم و استحصال کے اسباب و علل پر مشتمل ہے۔ ''ایک ریوڑ، ایک انبوہ'' کا اسلوب بہت موزوں ہے۔ فطری حسن کی منظر نگاری، کرداروں کا گہرا نفسیاتی مطالعہ، سیاسی حالات کا عمیق مشاہدہ پیش کیا گیا ہے۔ ناولٹ نویس نے بالیدہ تاریخی شعور کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔ اس پر مستزاد زبان کی رعنائی اور برجستگی، روانی، بلیغ استعارے اور تشبیہات، چست مکالمے ناولٹ کے حسن میں رنگینی و رعنائی کا موجب بنتے ہیں۔

طنز و مزاح:

خوشی اور غم انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ ایام زندگی میں مصائب و آلام کی آندھیاں منہ کھول کر انسان کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں۔ اگر طنز و مزاح نہ ہو تو شدائد زمانہ کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی انسان میں موجود نہ ہو۔

احمد ندیم قاسمی ایک عمدہ مزاح نگار تھے۔ قارئین کو یہ بات ورطہ حیرت میں ڈال دے گی کہ بظاہر سنجیدہ نظر آنے والا ادیب جو غور و فکر کے گہرے بھنور میں ڈوبا ہوا ہو، مزاحیہ حس بھی رکھتا تھا۔ قاسمی تخلیقِ مزاح کی پیش کش کے لیے قصہ بھی تخلیق کرتے ہیں۔ اس قصے کے مطالعے سے لطف و انبساط کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ قاسمی اسے اتنے فن کارانہ انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو زندگی کا شعور بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ حقیقت کے اس موجود زاویے کو دیکھ کر مسکراتا بھی ہے۔ قاسمی زندگی کی آسائشوں سے فیض یاب ہونے والے افراد پر ایک مخصوص زاویے سے نظر ڈالتے ہیں تو اس کے داخل سے مسکراہٹ بیدار ہونے لگتی ہے۔ انھوں نے زندگی کو شگفتہ طبعی سے دیکھنے کی سعی کی ہے اور متعدد ایسی صورتیں تلاش کر لی ہیں جنھیں دیکھ کر بہجت آفریں کیفیت پیدا ہوتی ہے مثلاً ''ہم ایک موٹر خریدیں گے'' میں قاسمی نے اعلیٰ طبقہ سے متعلق امیر افراد کی ذہنی کیفیت اور نفسیات کا اظہار کیا ہے۔

قاسمی کے دل میں موٹر خریدنے کا خیال آتا ہے۔ اپنی اہلیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کے لیے موٹر کی پچھلی سیٹ ریزرو کر دی جائے گی شاید اس طرح اُن کی پیشانی کی شکنیں کم ہو جائیں گی اور ہمیں کھانا وقت پر مل جایا کرے گا۔'' ۱۷۳

قاسمی ٹریفک کے مسائل اور لاہور میں تاخیر ٹریفک کے متعلق رقم طراز ہیں:

''یہاں لاہور میں تو یہ کیفیت ہے کہ والدین نے بچے کو پرائمری اسکول جانے کے لیے بس اسٹینڈز پر کھڑا کیا۔ مگر جب تک بس آئی، بچے کی داڑھی مونچھیں نکل آئیں اور والدین اسے دولہا بنانے کے لیے گھر بلا لائے۔'' ۴ے۱؎

بس کے مسائل کو فکاہیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا انداز واقعاتی اور بیانیہ ہے اور اظہارِ بیان جذباتی ہے۔ ایک بے ساختہ مسکراہٹ قاری کے لبوں پر کھل جاتی ہے۔ طنز کی وہ ہلکی سی لہر جو بعض مقامات پر فی البدیہہ پیدا ہوتی ہے، ان کے ہموار لہجے میں نمایاں نظر آتی ہے۔ قاسمی کو ماحول کے تجزیہ سے ہمیشہ دل چسپی رہی ہے اور اگر کوئی ناہمواری نظر آتی ہے تو وہ اس پر طنزیہ نگاہ ڈالنے سے گریز نہیں کرتے، حساس فن کار کی طرح وہ معاشرتی ناہمواریوں کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہوئے حکومت کو بھی معاف نہیں کرتے اور طنز کے نشتر چلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امن و امان کے لفظ کا استعمال حاکم یا افسر غلط کرتے ہیں۔ علاقے میں ڈاکہ، اجتماعی زیادتی، قتل و غارت، اغوا کے باوجود بے بس حکومت امن و امان کا دعویٰ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایسا امن و امان ہے جس سے شہری بے خبر ہیں اور حکومت باخبر۔'' ۵ے۱؎

معاشرتی قدروں اور حکومت کو حربہ طنز بناتے ہوئے قلم پر ان کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ وہ قدروں کی نگہبانی، معائب کی نشان دہی، برائیوں کے قلع قمع کرنے کے لیے طنز کو نشتر کی طرح استعمال کرتے ہیں کہ حکمران طبقہ اور عوام سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بقول وقار انبالوی:

''قاسمی نے جب سے یہ تازیانہ طنز و مزاح ہاتھ میں لیا ہے زندگی پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں کے دل بھی ہلا کر رکھ دیے ہیں۔'' ۶ے۱؎

قاسمی کے طنز و مزاح کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ کبھی زندگی کے گوناگوں مصائب کو منظرِ عام پر لاتے ہیں، کبھی حکمران طبقے پر طنز کرتے، کبھی معاشرے کے بے ڈھنگے پن پر غصہ و کرب کا اظہار کرتے، کبھی طنزیہ و مزاحیہ پیرائے میں تمام مسائل کا احاطہ کرتے کہ عام پڑھا لکھا قاری بھی ان سطور کے مطالعہ سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ وقار انبالوی لکھتے ہیں:

''۔۔۔وہ ہمیں ایک افسانہ نگار اور نثار، کبھی ایک صاحب طرز شاعر اور کبھی قافلہ ہائے حیات کی بے راہ روی سے اُڑنے والی دھول میں ظرافت و مزاح کے پھول کھلاتا نظر آتا ہے۔۔۔ اس کی نثر نگاری اور اس کے طنز و مزاح میں اس کے درد آمیز فکر و خیال کی مٹھاس بھی ہے اور کسک بھی۔'' ۷ے۱؎

ان کی تحریروں میں ہمارے موجودہ معاشرے کی ناہمواریوں کی تصویریں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ جن مضحک پہلوؤں کو

منظرعام پر لاتے ہیں ان کے پس منظر میں گہری دردمندی کا احساس بھی ملتا ہے۔ ان کی مزاح آفرینی، طرزِ اظہار اور اسلوب جاذبِ توجہ ہے۔ قاسمی کی نثری و تخلیقی نگارشات کے متعلق حمید اختر ملک رقم طراز ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ قاسمی صاحب نے جتنا کام کیا ہے جتنا تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے واقعی اس قابل ہے کہ ان کے بت بنا کر چوکوں میں لگائے جاتے اور لوگ ان کو یادگار کے طور پر دیکھتے۔'' ۷۸؎

ڈاکٹر سلیم اختر، قاسمی کی تخلیقی نگارشات کے متعلق رائے زنی کرتے ہیں:

''ایسی تخلیقی شخصیت جس نے نہ صرف اوراق زماں پر اپنے نام اور کام کا نقش ثبت کر دیا بلکہ آنے والا زمانہ بھی اس نقش کی آب و تاب میں کمی نہ کر سکے گا، کمی کیا اس کی چمک دمک میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔'' ۷۹؎

قاسمی عظیم المرتبت شخصیت کے مالک، ایک ہشت پہلو اور متحرک ادیب و شاعر تھے۔ وہ پون صدی تک میدانِ ادب میں سرگرم عمل رہے۔ انھوں نے اردو ادب کی ہر صنف میں اپنے قلم کے جوہر دکھا کر غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ قاسمی کے فنی و فکری کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے فخر زماں "Selected Poems of Ahmad Nadeem Qasmi" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"Ahmad Nadeem Qasmi can rightly be called the Grand Old Man of Urdu Literature in Pakistan." ۸۰؎

ایک طویل فن کارانہ ادبی سفر طے کرنے والے اس قلم کار کی نثری تخلیقات عوام سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہیں۔ انھوں نے مقبولیت کی ایسی بلندیوں کو چھوا جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوئی۔ قاسمی نے اپنی گراں قدر ادبی خدمات سے اردو ادب پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ ان کے فکروفن کا اثاثہ ایک قیمتی ورثے کی صورت میں قارئین ادب کے دلوں میں محفوظ ہے۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ ان کے فکر و فن کے گوناگوں پہلوؤں کے بغیر ادھوری رہے گی۔

حوالہ جات

1- Sajjad Sheikh, Selected Short Stories of Ahmad Nadeem Qasmi, Islamabad, National Book Foundation, 1996

۲۔ ارم سلیم، اردو ادب میں مقدمہ نگاری کی روایت، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹

۳۔ آل احمد سرور، تنقید کیا ہے اور دوسرے مضامین، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۱ء، ص ۹۶

۴۔ غلام محمد قاصر، (دیباچہ) تسلسل، لاہور، مکتبہ فنون، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷

۵۔ حبیب جالب، (دیباچہ) برگ آوارہ، امرتسر، آزاد بک ڈپو، سن ندارد

۶۔ محمد افسر ساجد، (دیباچہ) وجود اک واہمہ ہے، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

۷۔ قتیل شفائی، (دیباچہ) ہریالی، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص ۷، ۸

۸۔ ایضاً، ص ۸، ۱۰

۹۔ مرتضیٰ برلاس، (دیباچہ) تیشہ کرب، لاہور، آسمان پبلشرز، سن ندارد، ص ۹

۱۰۔ محمد سلیم طاہر، (دیباچہ) کہرام، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۱۱۔ منصورہ احمد، (دیباچہ) طلوع، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰

۱۲۔ خالد احمد، (دیباچہ) ایک مٹھی ہوا، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ص ۱۶

۱۳۔ صمد انصاری، (دیباچہ) موج فکر، لاہور، تخلیق، ۱۹۸۰ء، ص ۱۱

۱۴۔ اختر حسین جعفری، (دیباچہ) جہاں دریا اُترتا ہے، لاہور، فرول پبلشنگ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۸، ۱۹

۱۵۔ ثاقبہ رحیم الدین، (دیباچہ) تہذیب کے زخم، راول پنڈی، ۱۹۹۴ء،

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ عبداللہ ملک، میرا دوست اور بزرگ احمد ندیم قاسمی، مشمولہ مجلّہ راوی، لاہور، شمارہ ۸۹، ستمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۲

۱۸۔ جلیل عالی، (دیباچہ) خواب دریچے، لاہور، یوسف اختر صدیقی، ۱۹۸۵ء

۱۹۔ احسن اختر جلیل، (دیباچہ) مقتل میں چراغ، راول پنڈی، نیرنگ خیال، ۱۹۸۰ء، ص ۱۰

۲۰۔ یاسمین حمید، (دیباچہ) حصار بے دیوار، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۶

۲۱۔ فرحت پروین، (دیباچہ) منجمد، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۷ء، ص ۹، ۱۰

۲۲۔ سرفراز شاہد، (دیباچہ) ڈش انٹینا، لاہور، دوست پبلشرز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸

۲۳۔ راقم الحروف، استفسار از منصورہ احمد (قاسمی کی منہ بولی بیٹی) بمقام ۸۷۵۔ جوہر ٹاؤن لاہور، مورخہ ۴/ اگست ۲۰۱۰ء

۲۴۔ ڈاکٹر گیان چند جین، اردو کی ادبی نثر کی اصناف، مشمولہ ماہ نامہ "شب خون"، الہ آباد، شمارہ نمبر ۱۴۳، جلد ندارد، دسمبر ۱۹۸۶ء تا جنوری ۱۹۸۷ء

۲۵۔ راقم الحروف، استفسار از منصورہ احمد (قاسمی کی منہ بولی بیٹی) بمقام ۵۷۸۔ جوہر ٹاؤن لاہور، مورخہ ۲۰ رجون ۲۰۱۰ء

۲۶۔ ڈاکٹر محمد سلیم ملک، (فلیپ) سید امتیاز علی تاج زندگی اور فن، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء

۲۷۔ اسرار ایوب، (فلیپ) سرسوں برسوں کی، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۴ء

۲۸۔ حبیب جالب، (فلیپ) برگ آوارہ، جالب پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۲۹۔ رخشندہ نوید، (فلیپ) پھر وصال کیسے ہو، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۳۰۔ خالد عباس اسرار، (فلیپ) متاع ہنر، لاہور، اساطیر پبلشرز،

۳۱۔ اشرف جاوید، (فلیپ) آنکھ بھر خواب، لاہور، گورا پبلشرز، ۱۹۹۸ء

۳۲۔ اے جی جوش، (فلیپ) دید آید، لاہور، احمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

۳۳۔ اسرار ایوب، (فلیپ) سرسوں برسوں کی، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۴ء

۳۴۔ حفیظ تائب، (فلیپ) وسلیمو تسلیما، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء

۳۵۔ وزیر آغا، (فلیپ) شام اور سائے، لاہور، جدید ناشرین، ۱۹۶۴ء

۳۶۔ حمید اکبر، (فلیپ) کان کھلے ہونٹ سلے، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۸۸ء

۳۷۔ گلزار احمد، (فلیپ) دست خط، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۳۸۔ تسنیم منٹو، (فلیپ) ذرا سی بات، لاہور، ملٹی میڈیا افیرز پبلشرز، ۲۰۰۲ء

۳۹۔ محمد حمید شاہد، (فلیپ) مرگ زار، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء

۴۰۔ ابدال بیلا، (فلیپ) رنگ پچکاری، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۴ء

۴۱۔ ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار، (فلیپ) انداز بیاں اور، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۸ء

۴۲۔ انور ندیم علوی، (فلیپ) ندیم تنہائی، لاہور، آرٹ پریس، ۲۰۰۱ء

۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، غنچے، لاہور، امرت الیکٹرک پریس، ۱۹۳۷ء، ص ۱۷

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۷

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۴۶۔ احمد ندیم قاسمی (مرتب)، نقوش لطیف، لاہور، اساطیر پبلشرز، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲، ۱۳

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۰

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۰

۵۰۔ احمد ندیم قاسمی (مرتب)، نذر حمید احمد خاں، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء

۵۱۔ ایضاً، ص۲

۵۲۔ احمد ندیم قاسمی (مرتب)، منٹو کے خطوط بنام ندیم، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، ۱۹۹۱ء، ص ۷

۵۳۔ ایضاً، ص۹

۵۴۔ ایضاً، ص۲۵

۵۵۔ ایضاً، ص۷

۵۶۔ احمد ندیم قاسمی (مرتب)، کیسر کیاری، لاہور، شفیق پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۱۴

۵۷۔ احمد ندیم قاسمی، طفیل صاحب چند تاثرات، مشمولہ نقوش، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمان، ملتان، کارواں ادب، ۱۹۸۳ء، ص۵۵

۵۸۔ احمد ندیم قاسمی، حرفِ اوّل، سہ ماہی فنون، لاہور، شمارہ ا، جلد ۲، ۱۹۶۳ء

۵۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مشمولہ سہ ماہی فنون، شمارہ خاص نمبر (۲)، جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۳۰۷

۶۰۔ احمد ندیم قاسمی، مشمولہ سہ ماہی فنون، شمارہ خاص نمبر، ۱۹۶۳ء، ص۴

۶۱۔ احمد ندیم قاسمی، حرف اول، مشمولہ فنون، شمارہ ۷، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص۱۳

۶۲۔ احمد ندیم قاسمی، حرف اول، مشمولہ سہ ماہی فنون، جلد ۳، شمارہ ا، ۱۹۷۴ء

۶۳۔ علی اصغر عباس، قاسمی صاحب، مشمولہ ماہ نو، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵

۶۴۔ خالد احمد، جدید تر پاکستانی ادب، لاہور، مکتبہ بیاض، ۱۹۹۸ء، ص۳۴

۶۵۔ محسن احسان، محبتوں کا دیوتا، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

۶۶۔ راقم الحروف، استفسار از امجد اسلام امجد بمقام اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور، محررہ ۳۰ رمئی ۲۰۱۰ء

۶۷۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص۴۰۴

۶۸۔ آفتاب شمیم، ندیم ایک تحریک، ایک منتظم، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، شمارہ ۱۰، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء

۶۹۔ راقم الحروف، استفسار از ڈاکٹر ناہید قاسمی (قاسمی کی بیٹی) بمقام A-15 چوہدری کالونی سمن آباد لاہور، بروز ۱۴رجون ۲۰۰۸ء

۷۰۔ احمد ندیم قاسمی، حرف اوّل، فنون، ۱۹۸۷ء

۷۱۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۷

۷۲۔ احمد ندیم قاسمی، حرف اول، سہ ماہی فنون، جلد ۹، شمارہ ۱، ۲، جون جولائی ۱۹۷۴ء

۷۳۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، محولہ بالا ۶۸، ص۲۰۹

۷۴۔ راقم الحروف، استفسار از منصورہ احمد، محولہ بالا ۲۳

۷۵۔ راقم الحروف، استفسار از ڈاکٹر سلیم اختر، مکان نمبر 569، الجودت، گلی نمبر 17، جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور، مورخہ ۲ر نومبر ۲۰۱۰ء

۷۶۔ احمد ندیم قاسمی، حرف اول، فنون، جلد ندارد، شمارہ ۲۷، ستمبر دسمبر ۱۹۹۲ء

۷۷۔ احمد ندیم قاسمی، حرفِ اوّل، فنون، جلد ۱۸، شمارہ ۵، ۶، اپریل مئی ۱۹۷۴ء

۷۸۔ ڈاکٹر صابر آفاقی، قاسمی صاحب، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا ۶۵، ص ۳۸۷

۷۹۔ رفعت مرتضیٰ، وقت کب ستا ہے، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا ۶۵، ص ۱۸۳

۸۰۔ ڈاکٹر ابرار احمد، احمد ندیم قاسمی ایک مستقل مزاج مدیر، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، محولہ بالا ۶۲، ص ۱۵۹

۸۱۔ عارف شفیق، ممتاز شاعر احمد ندیم قاسمی، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا ۶۵، ص ۴۳۲

۸۲۔ اکبر حمیدی، ندیم عصر، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا ۶۵، ص

۸۳۔ راقم الحروف، استفسار از ڈاکٹر سلیم اختر، محولہ بالا ۷۵

۸۴۔ انور سدید، ادبی رسائل، محولہ بالا ۶۸، ص ۲۰۸

۸۵۔ حمید احمد خاں، مشمولہ سہ ماہی فنون، سال نامہ ۱۹۶۹ء، ص ۴۶۱

۸۶۔ ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی، قاسمی صاحب، مشمولہ ندیم نامہ مرتبہ اسلم فرخی، کراچی، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، ۲۰۰۶ء، ص ۸۱

۸۷۔ احمد ندیم قاسمی، حرف اول، سہ ماہی فنون، لاہور، شمارہ ۴۱، جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۱۱

۸۸۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، محولہ بالا ۶۸، ص ۲۱۰

۸۹۔ احمد ندیم قاسمی، سہ ماہی فنون، نومبر دسمبر، جنوری مارچ ۲۰۰۶ء، شمارہ ۱۲۶، ص ۳۳۲

۹۰۔ احمد ندیم قاسمی، سہ ماہی فنون، مئی، جون ۱۹۹۵ء

۹۱۔ احمد ندیم قاسمی، سہ ماہی فنون، جنوری اپریل ۱۹۹۴ء، شمارہ ۴۱، ص ۳۳۶

۹۲۔ ایضاً، ص ۳۴۷

۹۳۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۲۷، اکتوبر نومبر، ۱۹۸۸ء

۹۴۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۲۷، اکتوبر نومبر، ۱۹۸۸ء

۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۴۸، ۴۹، مئی تا دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۳۲

۹۶۔ ایضاً، ص ۴۳۸

۹۷۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۴۷، ۴۸، مئی دسمبر ۱۹۹۶ء

۹۸۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۲۲، مئی جون ۱۹۸۵ء، ص ۶۴۷

۹۹۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۲۸، نومبر دسمبر ۱۹۸۸ء

۱۰۰۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۳۵، نومبر دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۶۳۴

۱۰۱۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۵۰، جون تا دسمبر ۱۹۹۷ء، ص ۳۴۰

۱۰۲۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۴۷، ۴۸، مئی تا دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۳۳

۱۰۳۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۱۹، اگست ستمبر ۱۹۸۳ء،

۱۰۴۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، شمارہ ۱۹، اگست ۱۹۸۳ء

۱۰۵۔ احمد ندیم قاسمی، مکتوب بنام محمد طفیل از انگہ، محررہ ۱۶/مارچ ۱۹۸۴ء

۱۰۶۔ عبادت بریلوی، خطوط احمد ندیم قاسمی، لاہور، ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۹۵ء، ص ۵۴

۱۰۷۔ عبادت بریلوی، خطوط احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا ۱۰۳، ص ۵۶

۱۰۸۔ احمد ندیم قاسمی، مکتوب بنام مشفق خواجہ، مشمولہ سہ ماہی سورج، لاہور، جلد ۳۶، شمارہ ۳، ۴، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء، ص ۳۵

۱۰۹۔ احمد ندیم قاسمی، مکتوب بنام مشفق خواجہ، مشمولہ سہ ماہی سورج، محولہ بالا ۱۰۵، ص ۳۳

۱۱۰۔ عبادت بریلوی، خطوط احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا ۱۰۳، ص ۴۶

۱۱۱۔ ایضاً، ص ۵۱

۱۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، مکتوب بنام صمد انصاری از مقام انگہ، محررہ ۲/مارچ ۱۹۸۴ء

۱۱۳۔ پروفیسر فتح محمد ملک، مکاتیب ندیم آدھی ملاقات، مشمولہ ماہ نامہ اخبار اردو، اسلام آباد، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۴۷

۱۱۴۔ ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی، قاسمی صاحب، مشمولہ نیا ندیم نمبر مرتبہ آصف فرخی، کراچی، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، ۲۰۰۶ء، ص ۸۱

۱۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم صاحب کے خطوط، مشمولہ معاصر، لاہور، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۹

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۳۴۲

۱۱۷۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، خطوط احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا ۱۰۳، ص ۴۱

۱۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، مکتوب بنام محمد طفیل (بمقام انگہ)، محررہ ۲۴/اگست ۱۹۴۴ء

۱۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، مکتوب بنام محمد طفیل بمقام انگہ، ۴/مئی ۱۹۳۶ء

۱۲۰۔ عبادت بریلوی، خطوط احمد ندیم قاسمی، محولہ بالا ۱۰۳، ص ۱۱

۱۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، خطوط بنام محمد فاضل مشمولہ آدھی ملاقات، مرتبہ فضل ربانی، اسلام آباد، پورب اکادمی، طبع اوّل مئی ۲۰۰۷ء، ص ۵۵

۱۲۲۔ عابدہ عباس، ذخیرہ نقوش میں احمد ندیم قاسمی کے خطوط کی تدوین، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے اردو، مملوکہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۴

۱۲۳۔ احمد ندیم قاسمی، اور پریاں روٹھ گئیں، مشمولہ اخلاقی کہانیاں، مرتب رحمٰن ضیا، کراچی، فرید پبلشرز، ۱۹۹۲ء، ص۱۴، ۱۵

۱۲۴۔ ایضاً، ص۱۲۶، ۱۲۷

۱۲۵۔ آغا امیر حسین (تحریر و ترتیب) احمد ندیم قاسمی، نام ور پاکستانیوں کا بچپن، لاہور، چلڈرن لائبریری، سن ندارد، ص۲۴

۱۲۶۔ ایضاً، ص۲۷

۱۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، اور پریاں روٹھ گئیں، محولہ بالا ۱۲۰، ص۱۷

۱۲۸۔ ایضاً، ص۹

۱۲۹۔ ایضاً، ص۲۷، ۲۸

۱۳۰۔ محمود الرحمان، اردو میں بچوں کا ادب، لاہور، محمود الرحمان، سن ندارد، ص۳۷۵

۱۳۱۔ واجد فاروق علی خان (مرتبہ)، کلیاں ہی کلیاں، لاہور، سن ندارد، ص۶۲

۱۳۲۔ ڈاکٹر خوشحالی زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء، ص۱۵۷

۱۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، سبز جھنڈا، لاہور، فروغ اردو، سن ندارد، ص۱۱

۱۳۴۔ ایضاً، ص۱۵

۱۳۵۔ ڈاکٹر خوشحالی زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، محولہ بالا ۱۲۹، ص۳۹۸

۱۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، جلیبیاں، ص۵۹

۱۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، وخوش، مشمولہ دل دیاں باریاں، لاہور، عبدالمجید بھٹی، ۱۹۶۳ء، ص۱۰۹

۱۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، وحشی، مشمولہ برگ حنا، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۱۰۶، ۱۰۷

۱۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، وخوش، مشمولہ ''دل دیاں باریاں'' عبدالمجید بھٹی، محولہ بالا ۱۳۴، ص۱۱۵

۱۴۰۔ راقم الحروف، استفسار از خالد احمد بمقام دفتر بیاض لاہور، ۱۵ر اپریل ۲۰۰۹ء

۱۴۱۔ بشیر منذر، کل پونجی، لاہور، پبلشر ندارد، ۲۰۰۲ء

۱۴۲۔ پروفیسر سلیم الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی کا فلمی سفر، لاہور، محولہ بالا ۶۵، ص۲۰۲

۱۴۳۔ ایضاً

۱۴۴۔ ایضاً، ص۲۵۳

۱۴۵۔ ایضاً، ص۲۰۴، ۲۰۳

۱۴۶۔ ڈاکٹر حسن وقار گل، احمد ندیم قاسمی ایک نظر میں، مشمولہ نیا ندیم نمبر مرتب آصف فرخی، محولہ بالا ۱۱۱، ص۴۹

۱۴۷۔ پاکستان سنیم فلم ڈائریکٹری، ۲۰۰۳ء، ص۱۵۵

۱۴۸۔ سلیم الرحمان، احمد ندیم قاسمی کا فلمی سفر، مشمولہ مونتاج، محولہ بالا ۶۵، ص ۲۰۴

۱۴۹۔ ایضاً

۱۵۰۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، میرے ہم سفر، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۲۔۲۰۳

۱۵۱۔ ایضاً

۱۵۲۔ ایضاً

۱۵۳۔ ایضاً

۱۵۴۔ اسلام شاہ، احمد شاہ، احمد ندیم قاسمی، ریڈیو کا تفریحی پروگرام، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا ۶۵، ص ۴۲۷

۱۵۵۔ ایضاً

۱۵۶۔ ایضاً

۱۵۷۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، لاہور، اساطیر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵۵

۱۵۸۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۱۵۹۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت وفن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶۸

۱۶۰۔ سہیل احمد، احمد ندیم قاسمی، شوبز روزنامہ ایکسپریس، لاہور، ۱۲ر جولائی ۲۰۰۶ء

۱۶۱۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی شخصیت وفن، محولہ بالا ۱۵۶، ص ۲۷۱

۱۶۲۔ ایضاً

۱۶۳۔ احمد ندیم قاسمی، ترجمہ پاکستان کی لوک کہانیاں، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۲

۱۶۴۔ احمد ندیم قاسمی، خودنوشت، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء

۱۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، نسل نو سے گفتگو، انٹرویو مشمولہ ادب سرائے خصوصی شمارہ احمد ندیم قاسمی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۳

۱۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، پت جھڑ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۹۱،۹۰

۱۶۷۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۶۸۔ احمد ندیم قاسمی، ایک ریوڑ، ایک انبوہ، مشمولہ پت جھڑ، محولہ بالا ۱۶۳، ص ۹۸

۱۶۹۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۱۷۰۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۷۱۔ ایضاً، ص ۱۲۵،۱۲۶

۱۷۲۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۷۳۔ احمد ندیم قاسمی، ایک موٹر خریدیں گے، مشمولہ منتخب شاہکار طنز و مزاح، مرتبہ قائم نقوی، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹

۱۷۴۔ احمد ندیم قاسمی، حرف و حکایت، مشمولہ طنز و ظرافت، از فوزیہ چودھری، لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۳

۱۷۵۔ ایضاً

۱۷۶۔ وقار انبالوی، قاسمی بطور مزاح نگار، مشمولہ ندیم نامہ، مرتب محمد طفیل، بشیر موجد، ملتان، کاروان ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۳۲۱

۱۷۷۔ ایضاً، ص ۳۲۰

۱۷۸۔ حمید اختر، چند یادداشتیں، چند خیالات، مشمولہ مجلّہ راوی، لاہور، جلد ۸۹، ستمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۳

۱۷۹۔ ڈاکٹر سلیم اختر، احمد ندیم قاسمی سب اچھا کہیں جسے، مشمولہ فکر تاباں (احمد ندیم قاسمی نمبر)، لاہور، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، سمن آباد، ۲۰۰۸ء۔۲۰۰۹ء، ص ۹

180- Baidar Bakht and Perveen Shakir, Selected poems of Ahmad Nadeem Qasimi, Islamabad, Pakistan Academy of Letters, 1995.

باب ہشتم

محاکمہ

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رُکن، دورِ حاضر کے ہمہ پہلو ادیب و شاعر، ممتاز کالم نویس، باکمال صحافی اور اعلیٰ پایہ کے افسانہ نگار تھے۔ اُنھوں نے جہاں طنز و مزاح کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا وہیں تنقید کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور خاکے لکھ کر ادبی شخصیات کے عادات و خصائل اور زندگی کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کیا۔ انھوں نے ہر صنفِ ادب میں قلم کے جوہر دکھا کر غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ قاسمی کی شخصیت کی تعمیر میں کام آنے والے واقعات و شخصیات اور ان کے اثرات نے انھیں ایک خاص مقام عطا کیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں، قاسمی نے وادی سون سکیسر کے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد، چن پیر درویش منش انسان تھے جو ریاضت خداوندی میں فنا فی اللہ ہو چکے تھے۔ انھیں دنیا سے کوئی رغبت نہ تھی۔ چن پیر کے عزیزوں نے اسی بے نیازی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گدی پر قبضہ کرلیا۔ جس کے باعث ان کی اولاد ضروریاتِ زندگی سے محروم رہی۔ قاسمی کی والدہ (غلام بی بی) ایک سادہ، روشن خیال اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ انھوں نے بچوں کی تربیت عمدہ انداز سے کی۔ قاسمی چھے برس کے ہوئے تو سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ بعدازاں ان کے چچا پیر حیدر بخش نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کی۔ لاولد چچا نے وفات تک یہ فرائض احسن طریقے سے نبھائے۔ قاسمی نے مہربان چچا کے سایہ شفقت میں رہ کر اعلیٰ درس گاہوں میں بی۔اے تک تعلیم پائی۔ چچا کی وفات کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اگر مشفق چچا کی کرم فرمائیاں ہم رکاب نہ ہوتیں تو حالات اس کے برعکس ہوتے۔ چچا کی رحلت کے بعد تلاشِ روزگار کے سلسلے میں لاہور آئے جہاں اختر شیرانی اور عبدالمجید سالک کے سایہ شفقت میں رہے۔ انھوں نے کرشن چندر، منوہر لال جی، سعادت حسن منٹو اور اختر شیرانی جیسے علم پرور نوجوانوں کی صحبتیں اُٹھائیں، فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی جیسے دوستوں کی رفاقتیں ان کا سرمایہ حیات بنیں۔

قاسمی، نہایت نفیس اور شریف النفس انسان تھے: مزاج میں رکھ رکھاؤ تھا۔ ہر ایک سے نرم روی سے پیش آتے، دوسروں کی عزتِ نفس کی پاس داری کرتے، دوسروں کے دُکھ درد میں شریک ہوتے، ان کا غم غلط کرتے، ماتحتوں سے مشفقانہ و مربیانہ برتاؤ کرتے؛ نوجوانوں، ادیبوں اور شاعروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے؛ بے تکلف احباب کی محفلوں میں خوش کلامی کا مظاہرہ کرتے، خود تخلیق کردہ لطائف سے محفل کو زعفران زار بنائے رکھتے، جو شخص بھی ایک بار ملتا، دوسری بار ملاقات کی آرزو دل میں لے کر رخصت ہوتا۔

قاسمی نے سولہ برس کی عمر میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ایک نظم سے ہوا جو ایک عزیز کے سانحہ ارتحال پر لکھی۔ پھر باقاعدہ مطبوعہ تخلیقی نگارش نظم کی ہیئت میں محمد علی جوہر کی وفات پر لکھی جسے پڑھ کر شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے روشن مستقبل کی نوید سناتے ہوئے بے حد سراہا۔ یہ نظم روزنامہ ''سیاست'' لاہور

کے صفحہ اوّل پر ۱۹۳۱ء میں شایع ہوئی۔ محمد خالد اختر نے فکشن کی جانب ان کے آتش شوق کو بڑھایا تاہم اختر شیرانی کے رسالہ ''رومان'' میں ''بدنصیب بُت تراش'' کے عنوان سے پہلا افسانہ شایع ہوا۔

قاسمی زمانہ طالب علمی میں ہی صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے ادبی مجلّہ ''نخلستان'' کے مدیر رہے۔ پھر ''پھول''، ''تہذیبِ نسواں''، ''ادبِ لطیف'' کی ادارت کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں ادارت کے تجربے کے ساتھ ساتھ معاصر ادبی رجحانات سے بھی کماحقہ آگاہی ہوئی اور وہ ''سویرا''، ''نقوش''، ''سحر''، ''امروز''، ''اقبال'' اور ''صحیفہ'' کے باضابطہ مدیر رہے۔ اُنھوں نے کچھ عرصہ بعد ۱۹۶۳ء میں ذاتی ادبی مجلّہ ''فنون'' کا اجرا کیا جس نے اردو ادب کی اصناف کو فروغ دیا اور ادبی لکھاریوں کی ایک کھیپ تیار کی جو فلکِ ادب پر چمک دار ستاروں کے مانند جگمگا رہے ہیں۔

قاسمی ترقی پسند تحریک کے متحرک رکن تھے۔ اُس دور میں ترقی پسندی اور مذہب بیزاری لازم وملزوم سمجھی جاتی تھی مگر قاسمی نہ تو اپنے مذہب سے دست بردار ہوئے اور نہ ہی مشرقی اقدار سے روگردانی کی اور نہ ہی ترقی پسند ادیب و شاعر کہلانے کے شوق میں ساغر و مینا کو تھاما۔ ان کی نعت گوئی، رسول پاک صلعم سے عشق اور عمیق مذہبیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ انھوں نے ایک فنی نصب العین سے مستقل وابستگی رکھتے ہوئے، مذہبیت، مشرقی تہذیب وثقافت اور ادب کی اقدار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ قاسمی زندگی کے نشیب وفراز کی بہت ہی کٹھن راہوں سے گزرے۔ معاشی حالات میں آسودگی کے پیش نظر کالم نگاری کی جانب متوجہ ہوئے اور روزنامہ ''امروز''، ''ہلال پاکستان''، ''احسان'' اور ''جنگ'' میں کالم لکھتے رہے۔ چناں چہ اُنھوں نے ذریعہ معاش میں بہتری کے پیش نظر کالم نگاری کو جاری رکھا۔

اردو افسانہ نگاری کی فہرست میں قاسمی کا نام منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے افسانے قارئین سے بھی خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف پریم چند کی افسانوی روایت کو فروغ دیا بلکہ بہت دل پذیر انداز میں مغربی پنجاب کے دیہات کی بھی عکاسی کی۔ بیانیہ افسانے کے کامیاب تجربے بھی کیے۔ اُنھوں نے دیہی زندگی میں مفلوک الحالی، استحصال کا شکار افراد کی زندگیوں اور دیہاتی عوام کے مسائل سے اپنے افسانوں کو مزین کیا۔ ان کی افسانہ نگاری کے موضوعات وسعت کے حامل ہیں۔ کہیں یہ افسانے اخلاقی معیاروں کا زوال پیش کرتے ہیں تو کہیں قومی اور اجتماعی نقطہ نظر کے فقدان کے حامل ہیں۔ کہیں یہ افسانے انسان دوستی کا درس دیتے ہیں تو کہیں سنگین حقائق سے قاری کو روشناس کراتے ہیں۔ کہیں یہ افسانے عالمی جنگوں کے اثرات، فرقہ وارانہ فسادات کو ظاہر کرتے ہیں تو کہیں پس ماندہ افراد کی زندگیوں کی اونچ نیچ پر نگاہ دوڑانے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہیں قدروں کی تبدیلی کا نوحہ سناتے ہیں تو کہیں عورت کی عزت وتکریم کا درس دیتے ہیں۔ کہیں داستانِ عشق رقم کرتے ہیں تو کہیں یہ معاشرتی برائیوں

اور پابندیوں کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کہیں احترامِ آدمیت کا درس دیتے ہیں تو کہیں دردمند، مایوس اور بے گھر افراد کے موضوعات کو افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ کہیں لڑکیوں کے گیت، صبح کے وقت بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز سناتے ہیں تو کہیں جاڑے کے دنوں میں چوپال کا منظر اور الاؤ کے روشن ہونے کی روداد بیان کرتے ہیں۔ کہیں چلچلاتی دھوپ میں کسانوں کی محنت کا نقشہ کھینچتے ہیں تو کہیں شہریوں کی حالتِ زار کو بیان کرتے ہیں۔ یہ افسانے جہاں قاری کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں وہیں دعوتِ فکر دیتے ہیں اور آنسو بہانے پر بھی اُکساتے ہیں۔ اُنھوں نے دیہی معاشرت کے مسائل و مصائب کا فن کارانہ اظہار کیا۔ ان کے کردار انسانی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ انسان کی اندرونی تہوں میں جھانک کر سچائیوں کو منکشف بھی کرتے ہیں۔ دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ وہ شہری زندگی کے مسائل و میلانات مثلاً شہریوں کی مفلسی، بے روزگاری، گداگروں، کلرکوں، افسروں، سفید پوش طبقہ کی حقیقتوں سے ہم آہنگ کراتے ہیں۔ ان کے افسانوی کرداروں کے خدوخال، زبان و بیان کی دل کشی موضوع کی معنویت مشاہدہ و تجربہ کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کے امتزاج نے عریانی کا منظر پیش نہیں کیا ہے۔ ان افسانوں میں منٹو کی طرح جنسی لذت نہیں اور نہ ہی کرشن چندر کی طرح رومان میں ڈوبی حسین زندگی۔ ان کے افسانوں میں جذباتی فضا افسانے کی دل کشی میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ اگرچہ تقسیمِ ہند کے بعد افسانوں میں جنس کا ذکر پلاٹ اور کردار کی ضرورت کے پیشِ نظر کیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں مبالغے کا شائبہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی شاعرانہ اُفتادِ طبع ہے۔ قاسمی نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری کی روایت کو بیان کرتے ہوئے دیہاتی زندگی کے حسن اور وہاں کے باشندوں کی مجبوریوں کی عمدہ مرقع کشی کی۔ ان کے افسانوں میں فطرت اپنی مکمل رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ حسنِ فطرت کے گرویدہ تھے اور الفاظ، انداز اور اسلوب کے تغیر و تبدل سے حسن فطرت کی مرقع کشی کرتے تھے۔ ان کے افسانوں میں حسن فطرت کے ساتھ ہی انسانی المیے بھی اُجاگر ہوتے ہیں۔ انھوں نے معاشرہ کے جبر و استحصال کے نتیجہ میں افراد کے بدلتے رشتوں کو حقیقت نگاری سے پیش کیا۔ انھوں نے اسی دیہاتی معاشرت کے تناظر میں استحصال پسند اور استحصال زدہ افراد کی جان دار تصویریں پیش کی ہیں۔ انسانی قدروں کا گہرا شعور اور ابدی حقیقتوں کا اظہار کرنے والے ادیب نے بنی نوع انسان کی بھلائی، کرہ ارض کو ظلم و استحصال سے چھٹکارا دلانے اور امن و امان کا گہوارہ بنانے کے لیے افسانے لکھے۔ قاسمی کے مغربی پنجاب کے دیہات پر مشتمل افسانوں اور ان یادگار کرداروں کے متعلق حمید اختر کی رائے ہے:

> ''افسانہ نویسی میں بھی انھوں نے پنجاب کے پسماندہ دیہات اور اس میں رہنے والے عام انسانوں کی زندگیوں کی ایسی بھرپور عکاسی کی کہ اس میدان میں ان کے بعد

آنے والے کسی لکھاری کو بھی اس ملک کی ستر اسی فیصدی دیہی آبادی کے بارے میں
کچھ لکھنے کی جرات نہیں ہوئی۔'' [۱]

قاسمی کے افسانے رومانی فضا میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان پر تخیل اور رومان کی حکومت ہے۔ ہر شے رنگین اور کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ افسانہ نگار طلسماتی دنیا میں گھرا ہوا ہے جہاں منظر بھی خیال کے پابند ہیں مگر خیال میں افسانہ نگار نے فطرت کی رنگ آمیزی کے ذریعہ افسانوں کو جو تابانی اور انفرادیت عطا کی ہے وہ دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں مفقود ہے۔

قاسمی معاشرتی اصلاح کا جذبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے حقیقت کی آنکھ سے انسان اور انسانی مسائل کو دیکھا۔ ایک سچے فن کار کی مانند اُنھوں نے اپنے علم، بصیرت، مشاہدے اور عمدہ ذوق سے اپنے فن کو مزین کیا اور عالمگیر حقائق کو مشاہدے اور تجربے کی بھٹی میں کندن بنا کر پیش کیا۔ سید وقار عظیم ان کی فنی نگارشات میں پرخلوص جذبے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں قاسمی کے افسانوں میں:

''۔۔۔سب سے زیادہ دخل اُس کے ان انہماک کو ہے جس کا عکس اُس کے مشاہدے، مطالعے، فکر اور بیان ہر چیز سے نمایاں ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے۔۔۔ موضوع فن اور شخصیت کی کم آہنگی اور رچاؤ کے مظہر بھی ہیں اور فنی انہماک توجہ اور حسن بیان کے لطیف پیکر بھی۔'' [۲]

قاسمی نے کالموں کے ذریعے سماج کے سنگین حقائق اور گھمبیر حالات کو نہایت سادہ زبان اور موثر انداز میں قارئین اور اہلِ حکومت کے دلوں میں اُتارا۔ کثیرالابعاد قاسمی نے عصری آگاہی کے شعلہ آفریں احساس اور زریں کیفیات کو اپنے کالموں میں نہایت چابک دستی سے پیش کیا۔ اُنھوں نے عمر بھر سیاسی پیچ وخم، سماجی خستہ حالی، رومانی حسیت، عوامی مصائب، اہلِ حکومت کی بے حسی کو بڑی دردمندی سے پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے کہیں مزاحیہ واقعات، کہیں طنزیہ اور کہیں سنجیدہ پیرایہ اظہار اختیار کیے ہیں۔ یہ کالم معاشرتی زوال پر ناآسودگی اور سماج کی ابتر حالت کو فن کارانہ تاثرات میں پیش کرتے ہیں۔ تخلیقی سطح پر آخر وقت تک سرگرم عمل رہنے والے قاسمی کے کالم اپنے دور کے واقعات و حوادث کو تلخ سچائیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ تا حیات اس جنگ کے خلاف برسرِ پیکار رہے جو معصوم ان پڑھ افراد کا مقدر قرار پاتی ہے۔ قاسمی اپنے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ساری زندگی حالتِ جنگ میں رہے لیکن اس حالت سے کبھی مایوس نہ ہوئے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''انسان پاکستان جیسے ملک میں زیست کرتا ہو، جہاں جھوٹ، فریب، مکاری، منافقت سکہ رائج الوقت ہوں، جہاں کے اعلیٰ حکام فرعون صفت اور سیاستدان منڈی کا مال ہوں اور جہاں بھینس صرف لاٹھی والے کی ہو اور ان سب پر مستزاد جبر و احتساب کا

ماحول اور قدغنوں کا چلن، مگر احمد ندیم قاسمی نے کبھی بھی مایوسی یا قنوطیت کا اظہار نہ کیا،
نہ عملی زندگی میں اور نہ ہی اپنی تخلیقات میں۔'' ۳

قاسمی نے اپنے احساس کی شدت کو کالموں کے ذریعے عظمت بخشی۔ ان کے کالموں میں جذبہ بھی ہے، فکر و استغنا بھی اور ہنگامہ خیزی بھی۔ یہ اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کے کالموں میں دھیماپن موجود ہے جو ذہن کو منتشر کرنے کی بجائے فکر و دانش کے چراغ جلاتا ہے۔ کبھی یہ فکر و عمل پر اُکساتے ہیں، کبھی مزاح میں ڈوبا ہوا طنزیہ وار کرتے ہیں۔ یہ ابتدا میں فکاہیہ کالم لکھتے رہے، بعدازاں سنجیدہ کالم روزنامہ ''جنگ'' میں شایع ہونے لگے لیکن قاسمی کی پہچان بطور فکاہیہ کالم نگار ہی ہے۔ ان کالموں کا رشتہ عوامی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ یہ کالم جہاں طنزیہ و مزاحیہ انداز میں مسائل کی منظرکشی کرتے ہیں وہیں ارباب حکومت کی نالائقیوں کو منظرعام پر لاتے ہوئے ان مسائل کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ قاسمی کے کالم تجربات و مشاہدات کی بھٹی میں تپ کر نئے نئے سانچوں میں ڈھل کر منظرعام پر آتے ہیں۔

قاسمی اگرچہ باقاعدہ نقاد ہونے کا شرف تو حاصل نہ کر سکے لیکن ان کی تنقیدی اہمیت سے کسی صورت صرفِ نظر ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ ایک پختہ شعور، بالیدہ فکر ادیب کا نقطہ نظر ہے جو جزئیات پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے اپنی زمین، اپنے ماحول اور مقامی مسائل سے مضبوطی سے وابستہ ہے۔ ان کی تنقید مختلف افکار و نظریات سے آشنا کرتے ہوئے الفاظ کے تقدس اور معنی کی حرمت پر بھی بحث کرتی ہے۔ ان کی تنقید جہاں اقبال کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالتی ہے وہیں غالب کے فکر و فن، ان کی جدت طرازی، جمالیاتی شعور، تصورِ حسن کو گہرے احساس کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اُنھوں نے جہاں قدیم شعرا کے فن پر اظہارِ خیال کیا ہے وہیں جدید شعرا مثلاً فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، مجید امجد، پروین شاکر، شکیب جلالی اور فراق گورکھپوری کے فن و فکر کو بھی احاطۂ تحریر میں لائے ہیں۔ ان شعرا کا فنی محاکمہ کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنے نظری افکار سے مدد لی ہے۔ قاسمی چونکہ مثبت اور تعمیری فکر کے مالک بھی تھے اسی لیے وہ کسی فن پارے کے نقائص تلاش کرنے سے زیادہ اس کے محاسن تلاش کرنے پر توجہ مرکوز کرتے۔ اگر کہیں فروگزاشت کا نشان ملے تو وہ اُچھالتے نہیں بلکہ ہمدردانہ نظر ڈالتے ہیں۔ یہ سلیس و سادہ انداز میں ادب اور تعلیم کے رشتہ، انسان دوستی اور پاکستانی تہذیب و ثقافت سے محبت کرنا بھی سکھاتے ہیں۔ قاسمی کے تنقیدی خیالات مختلف رسائل و جرائد میں منتشر پڑے ہیں۔ قاسمی کے تنقیدی تصورات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو قدرتی اور وہبی عطیہ قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک شاعری ایک ودیعتی ملکہ ہے جو کسب و اکتساب سے حاصل نہیں کیا جا سکتا لیکن جو شخص ان خداداد صلاحیتوں سے آراستہ ہے اُس کو چاہیے کہ وہ مسلسل محنت اور مشق سے بلند معیار تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ ان کے نزدیک جذبات انسانی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں لہٰذا شاعری کو جذبات کے تابع ہونا چاہیے۔

وہ جذبات کے بہترین اور خوب صورت اظہار کو شعر کا نام دیتے ہیں۔ قاسمی نے غزل، نظم کے متعلق اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے ہاں نظم اور غزل دونوں کا پلڑا ہم وزن رہتا ہے۔ قاسمی کے یہ تنقیدی مقالات ان کے سالہاسال کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ اہلِ فکر کو ان کے فرائض سے بھی آگاہ کراتا ہے۔ انھوں نے نہایت جرات کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی رائے کو مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے جن مسائل پر قلم اٹھایا، اس تیقن سے اٹھایا کہ انھیں حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

قاسمی نے اپنے دوست احباب کی یادوں کو خاکے کی صورت میں محفوظ کر لیا۔ یہ موضوعِ خاکہ کے کردار کے تعمیری پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ ادبی و غیرادبی شخصیات پر مشتمل یہ خاکے اُن شخصیات کو منظرعام پر لانے کے ساتھ ساتھ قاسمی کی سوانح عمری بھی مرتب کرتے ہیں۔ یہ خاکے ان شخصیات سے لگاؤ کا پتہ دیتے ہیں جو اس دنیا میں موجود نہیں۔ یہ خاکے مصنف اور موضوعِ شخصیت کے مابین روابط کی نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ قاسمی کے خاکے سپاٹ یا روکھے نہیں بلکہ یہ ہلکے پھلکے مزاح کو شامل کرتے ہیں جس سے یہ خاکے تبسم زیرلب کی صفت سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ خاکہ نگار کہیں کرداروں کی چھوٹی چھوٹی بذلہ سنجیوں کو تحریک دیتے ہیں اور کہیں موضوعِ خاکہ کی کسی خامی کو ظریفانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ قاسمی بعض خاکوں میں موضوع اشخاص کے حالاتِ زندگی کو رقم کرتے ہوئے اُس شخصیت کی کامرانیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ مزید برآں ان خاکوں سے خود مصنف کے حالاتِ زندگی کا سراغ بھی ملتا ہے۔ موضوعِ خاکہ سے قلبی تعلقات بیان کرتے ہوئے، متعدد واقعات ایسے لکھ دیتے ہیں جن کی ترتیب سے ان کے اپنے سوانحی حالات مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ قاسمی کے خاکوں میں کچھ خامیاں بھی ملتی ہیں لیکن ان کی مذکورہ بالا خوبیوں کے مقابلے میں یہ کوئی خاص وقعت نہیں رکھتیں۔ ان خاکوں کی سنجیدگی و شگفتگی، متانت و رواداری، واقعات کی دل چسپی اور مثبت پہلوؤں پر گرفت انھیں بڑے خاکہ نگاروں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ ان خاکوں میں بعض شخصیات چمکتے سورج کی مانند قارئین پر آشکار ہوتی ہیں اور بعض ٹمٹماتے ستاروں کی مانند ہماری نظروں سے فاصلے پر رہتی ہیں لیکن قارئین کو اپنے وجود کا احساس ضرور دلاتی ہیں۔ یہ خاکے ایسی فرحت بخش خوش بو کی مانند ہیں جس سے قاری اپنے ذہن و دل کو معطر کرتا ہے۔

قاسمی کی وجہ شہرت، بنیادی طور پر افسانہ نگاری ہی ہے مگر اُنھوں نے نثری میدان میں بھی تخلیقی و فنی کمال کے مظاہرے کیے ہیں۔ افسانے، کالم، تنقید، سوانحی خاکے اور مضمون نگاری میں اُنھوں نے اپنا زورِ قلم صرف کیا تاہم دیگر اصناف مثلاً ناول، ناولٹ، ترجمہ، بچوں کا ادب، پنجابی ادب، ریڈیائی کھیل، فلم، دیباچے، فلیپ، تبصرے، ادارت، مکتوب نگاری اور طنز و مزاح وغیرہ میں طبع آزمائی کر کے اپنی شخصیت کو جامع الحیثیت بنایا۔

قاسمی کی نثری خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ اُن کی ژرف نگاہی نے فن پاروں کو نہ صرف حیات سے ہم کنار کیا بلکہ ان کے مقدموں اور دیباچوں کی صورت میں اہلِ زمانہ کو بھی ادبی اور تاریخی اہمیت سے آگاہ کیا جس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ حمید اختر لکھتے ہیں:

''قاسمی صاحب نے جتنا بھرپور تخلیقی کام کیا، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔'' ۲۶

قاسمی نے اردو ادب کی معاصر کتابوں پر مبسوط اور مدلل دیباچے تحریر کیے۔ قاسمی وضع دار شخص تھے۔ جو بھی پرانا یا نیا ادیب و شاعر کتاب پر دیباچہ لکھنے کی گزارش کرتا، اُسے مایوس نہ کرتے۔ ان کی مروت کسی کی دل آزاری گوارا نہ کرتی تھی۔ ان کی اس مروت کا استحصال کر کے کمزور سے کمزور لکھاری بھی اپنی کتاب پر تعریفی جملے لکھوا لیتا تھا۔ اگر ضعف صحت اور کمزوری بینائی کی وجہ سے دیباچہ لکھنے سے معذرت کر لیتے تو دوست احباب فلیپ لکھنے کی درخواست کرنے لگتے۔ ان کے دیباچوں میں مصنف کے جذبات وفن کارانہ صلاحیتوں کا اظہار ادبی زبان میں ہوا ہے۔ ان کے تحریر کردہ دیباچوں کے مطالعے سے تبحر علمی، وسعتِ مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ نووارد ادبا و شعرا کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں خوش آئند مستقبل کی نوید دیتے۔

قاسمی نے ترتیب و تدوین کے فرائض بھی احسن طریقے سے سرانجام دیے جو ان کے ذوقِ جمال اور علم و ادب کے میدان میں حسن انتخاب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے نہایت محنت و عرق ریزی سے صحتِ متن کے ساتھ ہی کتاب کی ظاہری دل کشی اور رعنائی کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

ادبی شخصیت کے مالک قاسمی، بڑے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے نخلستان، پھول، تہذیب نسواں، ادبِ لطیف، سویرا، نقوش، صحیفہ اور فنون کی ادارت کی۔ قاسمی ۱۹۳۵ء سے ۲۰۰۶ء تک مختلف اوقات میں متفرق ادبی رسائل و جرائد کے مدیر رہے۔ ۱۹۶۳ء میں انھوں نے ذاتی مجلّہ فنون جاری کیا اور پھر عمر بھر اسے ایک مشن کے طور پر قبول کیا اور تاحیات اپنے مقصد سے روگردانی نہ کی۔ یہ پرچہ ادب کے صالح اور مثبت جذبات لے کر میدان میں آیا۔ فنون نے نووارد لکھنے والوں کے ذوقِ نظر کی آبیاری کی۔ فنون نے ادب وفن کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ فنون کی خاص اشاعتوں کے ذریعے اپنے قارئین کو تخلیقی و تنقیدی ادب عطا کیا اور خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع ہوئے۔ قاسمی ایک جوہر شناس قلم کار تھے۔ وہ نو وارد لکھنے والوں کے ذریعے اردو ادب کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے نئے لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کی جو اردو ادب کے آسمان پر ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ قاسمی کے تبصرے بھی شائستگی کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ جابر ممتحن کا روپ اختیار نہیں کرتے۔ وہ کتاب کی معاونت سے مصنف کے ذہن اور داخلی جواہر کو تلاش کرتے ہیں۔

قاسمی ایک دردآشنا دل رکھنے والے سنجیدہ و متین، کم آمیز، وضع دار اور حساس انسان تھے۔ ان کے خطوط

بیک وقت افسردگی اور لطافت کے حامل ہیں۔ اسلوب اگرچہ دھیما ہے لیکن اس کی تہوں میں جذبات کی گرم رو بھی بہتی ہے۔ ان خطوط میں سادگی، رومانیت اور تجسس ہے جو قاری کو پراسرار کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

قاسمی نے ننھے نونہالوں کے لیے دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں میں قاسمی نے کمالِ محبت اور دیانت داری سے اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے ننھے دوستوں میں منتقل کیا ہے۔ ان کہانیوں میں مقصدیت کا خوب صورت استعمال ہے۔ یہ کہانیاں نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے درس وتدریس کا ذریعہ ہیں۔

قاسمی کی تخلیقات میں مشرقی پنجاب کے دیہات سمائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس ماں بولی نے بھی ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ قاسمی نے ٹھیٹھ پنجابی زبان کے الفاظ ومحاورات استعمال کر کے ان پڑھ دیہاتی افراد کے کردار ونفسیات کی منظرکشی عمدگی سے کی ہے کہ قاری نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بلکہ داد دیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔

قاسمی نے ادب کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی لیاقتوں کا بھرپور مصرف کیا۔ انھوں نے فلموں کے لیے گیت لکھے، مکالمے تحریر کیے، منظرنامے لکھے اور فلم کے لیے اسکرپٹ لکھے۔ فلم کی جانب متوجہ ہونے کی خاص وجہ معاشی تنگ دستی تھی۔ غرض معاشی حالات میں سدھار کے لیے انھوں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۶ء تک کم وبیش چھتیس برس تک فلموں کے لیے لکھا، لیکن فلم میں انھیں پذیرائی نہ مل سکی چنانچہ جلد ہی اس صنف کو خیرباد کہہ دیا۔

قاسمی ریڈیو سے بھی بحیثیت اسکرپٹ رائٹر وابستہ رہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے ہفتہ وار سماجی وثقافتی کام پیش کرتے تھے جس کے سامعین بے تابی سے منتظر رہتے۔

قاسمی نے ادب وثقافت، اخبار وجرائد، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ ٹیلی ویژن پر ان کی غزلیں، گیت، نغمے مختلف گلوکاروں نے خوب صورت آواز میں گائے۔

قاسمی نے نہایت محنت ولگن سے ”پاکستان کی لوک کہانیاں“ کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مترجم کی محنت، لگن اور اعلیٰ شوق کا ضامن ہے۔ اس پر ترجمہ کا کم اور طبع زاد کا گماں زیادہ ہوتا ہے۔

قاسمی نے دیہاتی معاشرت وثقافت پر مشتمل ایک نامکمل ناول ”پت جھڑ“ لکھنا شروع کیا تھا لیکن چند صفحات ہی لکھ پائے تھے کہ اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ناہید ندیم نے اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

قاسمی کی وفات کے بعد ایک نامکمل ناولٹ ”ایک ریوڑ۔ ایک انبوہ“ ملتا ہے۔ یہ ناولٹ باغیانہ اور انقلاب پسندانہ خیالات کے حامل کسانوں کے گرد گردش کرتا ہے۔ یہ کہانی تحریک پاکستان کی کوششوں سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے حالات وواقعات کو طبقاتی کش مکش کے ساتھ منظرِ عام پر لاتی ہے۔

ادب کی دنیا میں کثیر الجہت اوصاف کی حامل شخصیات معدودے چند ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ان میں ایک اہم نام ہے۔ ہمہ جہت کہلوانے کا شوق بعض اوقات ادیب کو مہنگا پڑتا ہے۔ ایک بات کو مختلف انداز اور مختلف اصناف کے ذریعے سے بیان کرنے کا ڈھنگ اگر ایک طرف ادیب کو کثیر الجہتی ادب کا مبلغ بناتا ہے تو دوسری جانب اُسے تکرار کے فنی عیب سے بھی دو چار کرتا ہے۔ قاسمی کی تحریریں مذکورہ عیب سے پاک نہیں۔ معاشرتی اقدار کے بگڑتے اور ٹوٹتے نقوش اس تکرار کی زد میں خاص طور پر آتے ہیں۔

قاسمی اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دیگر ہم عصروں کی مانند ترقی پسند مارکسی نظریہ کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا اور نہ ہی اشتہاری ادب کی ترویج کی۔ یہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ضرور رہے لیکن انتہا پسندی کی بجائے اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ وہ رجحانات ومیلانات اپنائے جو معاشرے میں قابل قبول تھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے ان نظریات سے اختلاف کیا جو مذہب کی مخالفت اور دہریت میں ایقان کو ضروری سمجھتے تھے۔ مجموعی طور پر ان کی تحریریں مادی و روحانی زندگی کی قدروں کو احسن طریقے سے پیش کرتی ہیں اور ان میں اشتراکی نظریے کے اثرات ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی و اخلاقی رجحانات بھی موجود ہیں۔ ان کی تحریریں ہر اعتبار سے فکر وفن کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں۔ اُنھوں نے نہایت ہنرمندی سے انھی موضوعات پر قلم اُٹھایا جن پر دیگر ہم عصروں کی نگاہ کم تھی مثلاً ضعیف الاعتقادی، پیری فقیری، تعویذ گنڈے، خاندانی رقابتیں اور توہمات وغیرہ کا اظہار اپنے علم و آگہی کی روشنی میں کیا۔ قاسمی نے اپنی تحریروں میں ان معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو بیان کیا جس میں انسان کے نفسیاتی رویے، اخلاقی اقدار و روایات اور اقتصادی تعلقات کی تشکیل وتعمیر ہوتی ہے۔ قاسمی کے نزدیک بنی نوع انسانوں کے مسائل کا حل ایک غیر طبقاتی معاشرے کی تشکیل تھی جس میں کوئی دولت مند کسی مفلس کا استحصال نہ کرے۔

قاسمی ہشت پہلو شخصیت کے مالک اور متحرک انسان تھے۔ وہ مقبول افسانہ نویس، ممتاز شاعر، موقر اخبار و جرائد کے مدیر اور فکاہیہ کالم نویس ہونے کے علاوہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں۔ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے مقبولیت کی ایسی بلندیوں کو چھوا جو بہت کم ادبا وشعرا کے حصے میں آئیں۔ ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کو قارئین ادب کبھی نظر انداز نہ کر سکیں گے۔ قاسمی کا فنی وفکری مقام و مرتبہ ان کی زندگی میں ہی متعین ہو چکا تھا۔ سید عابد علی عابد ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''انسان ایک شعر سے غیر فانی ہو جاتا ہے۔ انھوں نے (ندیم نے) تو مجموعے قلمبند کیے ہیں۔ جن میں ابدیت کی جھلک گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی خدمات کا

اعتراف ہم لوگ رسماً کر رہے ہیں۔ زمانہ اپنا فیصلہ کر چکا ہے۔ گو وہ اس کے محتاج
نہ تھے نہ ہیں۔'' ۵

قاسمی زرخیز دماغ کے ساتھ ساتھ لازوال اور فکرانگیز تحریروں کے مالک تھے۔ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ تعمیر ادب اور تعمیر حیات میں گزارا۔ ان کے قلم کی روشنائی عمر کے آخری حصے تک خشک نہ ہوئی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا فرماتے ہیں:

''اردو ادب کی پوری تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسری مثال ایسی ہو کہ کسی مصنف کا قلم
پون صدی تک مسلسل رواں دواں رہا ہو۔ قاسمی صاحب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا
آسان نہیں کہ وہ بڑے شاعر ہیں یا بڑے افسانہ نویس۔ غالباً دونوں میں ان کی اہمیت
ترازو کے دو برابر پلڑوں کی طرح ہے۔'' ۶

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، قاسمی کی تحریروں کے موضوعات کی رنگا رنگی، نت نئے فنی تجربات، آزادہ روی اور وسعت نظر کو سراہتے ہیں۔ قاسمی کے ادبی مقام و مرتبہ کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''زندگی کی مثبت قدروں کے محافظ اور پاکستانی قومی شعور کے داعی کی حیثیت سے ہماری
ادبیات میں ان کا کردار بہت نمایاں ہے۔ میرے زاویہ نظر سے وہ اپنے ہم عصروں میں
تنہا ادیب تھے جن کے فکر و فن میں ضعف و اضمحلال کے آثار کبھی پیدا نہیں ہوئے۔'' ۷

انتظار حسین ان کی نگارشات کے ان مٹ نقوش اور ادبی قد کاٹھ کے متعلق لکھتے ہیں:

''۔۔۔وہ ایک بہت بڑی ادبی شخصیت تھے، کیونکہ ادیب ہونا تو کوئی بڑی بات نہیں۔
لیکن ان جیسا ادبی قد کاٹھ کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ وہ ادیب گر بھی تھے۔'' ۸

قاسمی بطور نثر نگار، اردو ادب کے کامیاب ادیب تھے جنھیں زمانے نے قبول عام کی سند پیش کی اور صف اوّل کے فن کاروں کی فہرست میں بھی شامل کیا۔ ان کی نثری خدمات کا اعتراف اعلیٰ پائے کے ادبا و شعرا نے عمدہ الفاظ میں کیا۔ اردو نثر کی دنیا میں قاسمی شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند درجے پر فائز رہیں گے۔

✿✿✿✿✿

حوالہ جات

۱۔ حمید اختر، زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، شمارہ ا، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۷

۲۔ سید وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۱

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، احمد ندیم قاسمی تخلیقی شخصیت، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا ا، ص ۷۵

۴۔ حمید اختر، زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، محولہ بالا ا، ص ۳۵۷

۵۔ سید عابد علی عابد، اپنی رائے، مشمولہ سہ ماہی مونتاج، لاہور، محولہ بالا ا، ص ۵۰

۶۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء

۷۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، قومی شعور کے داعی، مشمولہ ندیم نامہ مرتبہ اسلم فرخی، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۶

۸۔ انتظار حسین، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء

✿✿✿✿✿

کتب

۱۔ آغا شیدا کاشمیری، آتش زیرپا، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۔ آل احمد سرور، تنقید کیا ہے اور دوسرے مضامین، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۱ء

۳۔ ابدال بیلا، رنگ پچکاری، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۴ء

۴۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، رہبر پبلشرز کراچی، ۱۹۹۵ء

۵۔ احسان دانش، جہانِ دانش، اے۔این پرنٹرز لاہور، س۔ن

۶۔ احسن اختر جلیل، مقتل میں چراغ، نیرنگ خیال راول پنڈی، ۱۹۸۰ء

۷۔ احمد غزالی، وادی سون سکیسر، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۳ء

۸۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۴۶ء

۹۔ احمد ندیم قاسمی، آس پاس، مکتبہ فساں خواں لاہور، ۱۹۴۸ء

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، آنچل، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۴۴ء

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، اقبال سوانحی کتابچہ، غالب پبلشرز لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، ادارہ فروغِ اردو لاہور، ۱۹۵۵ء

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، کتاب نما لاہور، ۱۹۵۹ء

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، بگولے، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۴۱ء

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، پاکستان کی لوک کہانیاں، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، پت جھڑ، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، پس الفاظ، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، تعلیم اور ادب وفن کے رشتے، مکتبہ فنون لاہور، ۱۹۷۴ء

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ لاہور، ۱۹۷۵ء

۲۰۔ احمد ندیم قاسمی، جلال و جمال، التحریر پبلشرز لاہور، ۱۹۴۳ء

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، چوپال، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۳۹ء

۲۲۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۴۹ء

۲۳۔ احمد ندیم قاسمی، دوام، ادارہ مطبوعات لاہور، ۱۹۸۰ء

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، سبز جھنڈا، نقوش پریس لاہور، س۔ن

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا، نیا ادارہ لاہور، ۱۹۵۲ء

۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، سیلاب و گرداب، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۴۳ء

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع و غروب، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۴۳ء

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، غنچے، امرت الیکٹرک پریس لاہور، ۱۹۳۷ء

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، مکتبہ فنون لاہور، ۱۹۴۳ء

۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، کیسر کیاری، شفیق پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء

۳۱۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۰ء

۳۲۔ احمد ندیم قاسمی، معنی کی تلاش، مکتبہ اساطیر لاہور، ۲۰۰۳ء

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو کے خطوط ندیم کے نام، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ لاہور، ۱۹۹۱ء

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم سفر، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء

۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، نذر حمید احمد خاں، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ لاہور، ۱۹۸۰ء

۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، نقوش لطیف، اساطیر پبلشرز لاہور، ۱۹۸۹ء

۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، غالب پبلشرز لاہور، ۱۹۸۰ء

۳۹۔ اختر حسین جعفری، جہاں دریا اُترتا ہے، فردا پبلشنگ لاہور، ۱۹۹۳ء

۴۰۔ ارم سلیم، اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء

۴۱۔ اسرار ایوب، سرسوں برسوں کی، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۴ء

۴۲۔ اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ، تعبیر و تنقید، موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۶ء

۴۳۔ اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۲ء

۴۴۔ اسلم راحیل مرزا، پنجاب کے انقلابی رہنما، ایشین پبلشرز لاہور، س۔ن

۴۵۔ اسلم فرخی (مرتب)، ندیم نامہ، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی، ۲۰۰۶ء

۴۶۔ اشرف جاوید، آنکھ بھر خواب، گورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۸ء

۴۷۔ اشرف جاوید، داغ چراغ ہوئے، ملٹی میڈیا افیرز لاہور، ۲۰۰۹ء

۴۸۔ افروز اسماعیل، ترقی پسند افسانہ نگاروں میں رومانوی رجحانات کے عناصر، کاروان ادب ملتان، ۱۹۹۸ء

۴۹۔ افسر ساجد، محمد، وجود اِک واہمہ ہے، بیکن بکس ملتان، ۱۹۹۵ء

۵۰۔ افشاں ملک، احمد ندیم قاسمی آثار و افکار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۶ء

۵۱۔ الطاف حسین قریشی، ادبی مکالمے، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۶ء

۵۲۔ الطاف گوہر، تحریریں چند، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء

۵۳۔ امیر حسین، آغا، نامور پاکستانیوں کا بچپن، کلاسیک چلڈرن لائبریری لاہور، س۔ن

۵۴۔ انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۵۵۔ انوار احمد، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، بیکن بکس گلگشت کالونی ملتان، ۱۹۸۸ء

۵۶۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۸۵ء

۵۷۔ انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو لاہور، ۱۹۹۸ء

۵۸۔ انور سدید، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء

۵۹۔ انور سدید، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، ابلاغ پبلشرز لاہور، ۲۰۰۵ء

۶۰۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

۶۱۔ انور سدید، فکر و خیال، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۶ء

۶۲۔ انور ندیم علوی، ندیم تنہائی، آرٹ پریس لاہور، ۲۰۰۱ء

۶۳۔ انیس ناگی، پاکستانی اردو ادب کی مختصر تاریخ، جمالیات لاہور، ۲۰۰۴ء

۶۴۔ بشیر سیفی، خاکہ نگاری فن و تنقید، نذیر پبلشرز لاہور، ۱۹۹۲ء

۶۵۔ بشیر منذر، گل پونجی، پبلشر ندارد لاہور، ۲۰۰۱ء

۶۶۔ بشیر موجد، بولتے رنگ، سوچتی لکیریں، فنون پریس رائل پارک لاہور، ۲۰۰۲ء

۶۷۔ پروین اظہر، ڈاکٹر، اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، میاں چیمبرز لاہور، ۲۰۰۶ء

۶۸۔ پروین شاکر، خوش بو، مراد پبلی کیشنز اسلام آباد، س۔ن

۶۹۔ تسنیم منٹو، ذرا سی بات، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۰۲ء

۷۰۔ ثاقب رحیم الدین، تہذیب کے زخم، راول پنڈی، ۱۹۹۴ء

۷۱۔ جلیل عالی، خواب دریچہ، یوسف اختر صدیقی لاہور، ۱۹۸۵ء

۷۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۷۳۔ جمیل ملک، ندیم کی شاعری، نوید پبلی کیشنز راول پنڈی، ۱۹۷۲ء

۷۴۔ حبیب جالب، برگ آوارہ، آزاد بک ڈپو امرتسر، س۔ن

۷۵۔ حفیظ تائب، وسلیمو تسلیما، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۱ء

۷۶۔ حمید اکبر، کان کھلے، ہونٹ سلے، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۸۸ء

۷۷۔ حمید شاہد، محمد، مرگ زار، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۴ء

۷۸۔ خالد احمد، ایک مٹھی ہوا، الحمد پبلی کیشنز لاہور، س۔ن

۷۹۔ خالد احمد، جدید تر پاکستانی ادب، بیاض لاہور، ۱۹۹۸ء

۸۰۔ خالد عباس اسرار، متاع ہنر، اساطیر پبلی کیشنز لاہور

۸۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۲ء

۸۲۔ خورشید ربانی، آدھی ملاقات (مرتبہ خطوط)، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۸۳۔ خورشید عالم، اردو افسانوں میں گاؤں کی عکاسی، نیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۹۴ء

۸۴۔ خوشحال زیدی، ڈاکٹر، اردو میں بچوں کا ادب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۸۵۔ راجا فاروق علی خان (مرتبہ)، کلیاں ہی کلیاں، لاہور، س۔ن

۸۶۔ رحمٰن ضیا (مرتب)، اخلاقی کہانیاں، فرید پبلشرز لاہور، ۱۹۹۲ء

۸۷۔ رحیم گل، پورٹریٹ، مکتبہ ارژنگ پشاور، ۱۹۷۹ء

۸۸۔ رخشندہ نوید، پھر وصال کیسے ہو، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء

۸۹۔ ریاض احمد، شیخ، افلاس سماجی ناہمواری اور ترقی کا تصور، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۶ء

۹۰۔ سرفراز شاہد، ڈش اینٹینا، دوست پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۰ء

۹۱۔ سرور اعوان، محمد، وادی سون سکیسر، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۱۹۲۹ء

۹۲۔ سلمان باقر، آغا، پاکستانی کہانیوں کے افسانوں کا مطالعاتی اور تنقیدی جائزہ، ابلاغ پبلشرز لاہور، ۲۰۰۴ء

۹۳۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۲۰۰۰ء

۹۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء

۹۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء

۹۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ہماری جنسی و جذباتی زندگی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء

۹۷۔ سلیم ملک، ڈاکٹر، سید امتیاز علی تاج زندگی اور فن، اردو اکیڈمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۳ء

۹۸۔ سلیمان عبداللہ ڈار، ڈاکٹر، اندازِ بیاں اور، یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۸ء

۹۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ادب و فن، مغربی پاکستان لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۰۰۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۱۰۱۔ شکیل الرحمان، ڈاکٹر، احمد ندیم قاسمی ایک لیجنڈ، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۰۲۔ شہزاد منظر، علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، منظر پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۹۰ء

۱۰۳۔ شیدا کاشمیری، آغا، آتش زیر پا، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۰۴۔ صادق محمد، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، اردو مجلس دہلی، ۱۹۸۱ء

۱۰۵۔ صلاح الدین درویش، انسان دوستی، نظریہ اور تحریک، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۱۰۶۔ صہر انصاری، موج فکر، تخلیق لاہور، ۱۹۸۰ء

۱۰۷۔ ضیا ساجد، مٹی کا سمندر، مکتبہ القریش لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۰۸۔ طفیل محمد، بشیر موجد (مرتبہ)، ندیم نامہ، مجلس اربابِ فن لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۰۹۔ ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر، اردو صحافت میں طنز و مزاح، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۱۰۔ عاصم بٹ، دوسرا آدمی، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۱۱۔ عالم خان، محمد، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، علم و عرفان پبلشرز لاہور

۱۱۲۔ عباس طوروی، محمد، احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۱۳۔ عبدالغفار کوکب، ڈاکٹر، اردو صحافت اور فکاہیہ کالم نگاری کی روایت، بیکن بکس لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۱۴۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء

۱۱۵۔ عبدالمجید بھٹی (مرتبہ)، دل دیاں باریاں، لاہور، س۔ن

۱۱۶۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، کاروان ادب ملتان، ۱۹۹۳ء

۱۱۷۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور عورت، زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۱ء

۱۱۸۔ غافر شہزاد، ندیم کے افسانوی کردار، اوراک پبلشرز لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۱۹۔ غلام محمد قاصر، تسلسل، مکتبہ فنون لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۲۰۔ غیاث الدین، شیخ محمد، ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ، نگارشات لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۲۱۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۲۲۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، جب بادل اُمڈے، شفیق ناز الحمرا پبلشنگ اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

۱۲۳۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، ندیم شناسی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء

۱۲۴۔ فرحت پروین، منجمد، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۲۵۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۲۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۲۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کا افسانوی ادب، بیکن بکس ملتان، ۱۹۹۷ء

۱۲۸۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۱۲۹۔ فوزیہ چودھری، طنز و ظرافت، تخلیقات لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۳۰۔ فیض احمد فیض، میزان، ناشرین لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۳۱۔ قاسم ظفر خاں، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، ڈاکٹر قاسم ظفر بہار، ۱۹۹۶ء

۱۳۲۔ قائم نقوی (مرتبہ)، منتخب شاہکار طنز و مزاح، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۳۳۔ قتیل شفائی، ہریالی، ماورا پبلشرز لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۳۴۔ قدرت اللہ شہزاد، اردو کے چند خاکہ نگار، مکتبہ الہام بہاول پور، ۲۰۰۷ء

۱۳۵۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۳۶۔ گلزار احمد، دست خط، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء

۱۳۷۔ گلزار جاوید، براہ راست (حصہ اول)، ایریز پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۴ء

۱۳۸۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء

۱۳۹۔ مبشر عزیز حسن، پاکستانی کہانیاں، ڈیفوڈلز پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء

۱۴۰۔ محمود الرحمان، اردو میں بچوں کا ادب، محمود الرحمان لاہور، س۔ن

۱۴۱۔ مرتضیٰ برلاس، تیشہ کرب، آسمان لاہور، س۔ن

۱۴۲۔ مسعود مفتی، ٹریول گائیڈ آف پاکستان، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۴۳۔ مشتاق احمد بیگ، اردو افسانہ میں بچوں کے کردار کا سماجی و نفسیاتی مطالعہ، محبوب پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۴۴۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر، شخصیات و ادبیات، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۵ء

۱۴۵۔ ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ لاہور، بار اوّل، ۱۹۶۳ء

۱۴۶۔ منصورہ احمد، طلوع، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۴۷۔ منصورہ احمد، منصور آفاق (ترتیب)، گل پاشی، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۴۸۔ منور ملک، پس تحریر، بک مارک، ٹیمپل روڈ لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۴۹۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، احمد ندیم قاسمی شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

۱۵۰۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، بک وائز لاہور، ۱۹۹۸ء

۱۵۱۔ وارث سرہندی، قاموس مترادفات، اردو سائنس بورڈ لاہور، س۔ن

۱۵۲۔ وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، جمہور پبلشرز لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۵۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور احتساب، جدید ناشرین لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۵۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دائرے اور لکیریں، مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۵۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے، جدید ناشرین لاہور، ۱۹۶۴ء

۱۵۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر اور پاکستانی کلچر، القمر انٹر پرائزز لاہور، ۲۰۰۹ء

۱۵۷۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۵۸۔ وقار عظیم، سید، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۰ء

۱۵۹۔ یاسمین حمید، حصار بے دیوار، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۶۰۔ یاسین گریجہ (مرتب)، پاکستانی فلم ڈائریکٹری، ۱۰۔ آصف بلڈنگ لکشمی چوک لاہور، ۱۹۷۸ء

رسائل

۱۶۱۔ اخبار اردو، اسلام آباد، ماہ نامہ، جلد۲، شمارہ۲، فروری تا اگست ۲۰۰۸ء

۱۶۲۔ ادب دوست، لاہور، ماہ نامہ، جلد۱۲، شمارہ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۶ء

۱۶۳۔ ادب سرائے، لاہور، سہ ماہی، خصوصی شمارہ (احمد ندیم قاسمی نمبر)، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء

۱۶۴۔ ادبیات، اسلام آباد، سہ ماہی، جلد۱۷، شمارہ۷۳، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء

۱۶۵۔ احساس، پشاور، ستمبر تا نومبر ۲۰۰۶ء

۱۶۶۔ افکار، کراچی، ماہ نامہ، جلد۳۰، شمارہ۵۸۔۵۹، جنوری فروری ۱۹۷۵ء

۱۶۷۔ الحمرا، لاہور، ماہ نامہ، جلد۹، شمارہ۷، جولائی ۲۰۰۹ء

۱۶۸۔ بیاض، لاہور، ماہ نامہ، جلد۱۴، شمارہ۸، اگست ۲۰۰۶ء

۱۶۹۔ بیاض، لاہور، ماہ نامہ، جلد۱۴، شمارہ۱۱، نومبر ۲۰۰۶ء

۱۷۰۔ بیاض، لاہور، ماہ نامہ، جلد۱۷، شمارہ۱، جنوری ۲۰۰۹ء

۱۷۱۔ تحریریں، حیدر آباد، سالنامہ، ۱۹۶۸ء

۱۷۲۔ دنیائے ادب، کراچی، ماہ نامہ، ستمبر ۲۰۰۶ء

۱۷۳۔ دی ٹیلنٹ انٹرنیشنل، فیصل آباد، سہ ماہی، ستمبر ۲۰۰۶ء

۱۷۴۔ راوی، لاہور، گورنمنٹ کالج، جلد۸۹، ستمبر ۲۰۰۲ء

۱۷۵۔ سورج، لاہور، سہ ماہی، جلد۳۶، شمارہ۳، جون ۲۰۰۸ء

۱۷۶۔ شب خون، الہ آباد، ماہ نامہ، شمارہ۱۴۴، دسمبر ۱۹۸۶ء

۱۷۷۔ شب خون، الہ آباد، ماہ نامہ، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۷۸۔ صحیفہ، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۱۹۸۔۲۰۰، احمد ندیم قاسمی نمبر، جولائی ۲۰۰۹ء تا مارچ ۲۰۱۰ء

۱۷۹۔ عالمی اردو ادب، دہلی، سہ ماہی، جلد۱۴، ۱۹۹۶ء

۱۸۰۔ عبارت، حیدرآباد، سہ ماہی، اکتوبر ۱۹۹۶ء

۱۸۱۔ عبارت، حیدرآباد، سہ ماہی، مارچ ۱۹۹۷ء

۱۸۲۔ فکرتاباں، لاہور، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین سمن آباد، احمد ندیم قاسمی نمبر، ۲۰۰۹ء

۱۸۳۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، جلد۲، شمارہ۱، ۱۹۶۳ء

۱۸۴۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۲، جولائی ۱۹۶۳ء

۱۸۵۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۷، دسمبر ۱۹۶۶ء

۱۸۶۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، ۱۹۶۹ء

۱۸۷۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، جلد۳، شمارہ۱، ۱۹۷۴ء

۱۸۸۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، جلد۱۸، شمارہ۵۰، اپریل مئی ۱۹۷۴ء

۱۸۹۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، جلد۹، شمارہ۱، ۲، جون جولائی ۱۹۷۴ء

۱۹۰۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، جلد۳۵، نومبر ۱۹۸۶ء

۱۹۱۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۱۹، ستمبر ۱۹۸۳ء

۱۹۲۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۲۷، اکتوبر نومبر ۱۹۸۸ء

۱۹۳۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۲۸، نومبر دسمبر ۱۹۸۸ء

۱۹۴۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۲۷، دسمبر ۱۹۹۲ء

۱۹۵۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۴۱، جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء

۱۹۶۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۴۷، ۴۸، مئی تا دسمبر ۱۹۹۶ء

۱۹۷۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۵۰، جون تا دسمبر ۱۹۹۷ء

۱۹۸۔ فنون، لاہور، سہ ماہی، شمارہ۱۲۶، جنوری مارچ ۲۰۰۶ء

۱۹۹۔ کتاب نما، نئی دہلی، جلد۴۷، شمارہ۲، فروری ۲۰۰۷ء

۲۰۰۔ ماورا، لاہور، ماہ نامہ، جلد۸، شمارہ۵، مئی ۲۰۰۷ء

۲۰۱۔ معاصر، لاہور، سہ ماہی، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء

۲۰۲۔ مخزن، لاہور، ماہ نامہ، شمارہ ۱۵، جلد ا، ۲۰۰۸ء

۲۰۳۔ ماہِ نو، لاہور، ماہ نامہ، ۲۰۰۷ء

۲۰۴۔ مونتاج، لاہور، سہ ماہی، شمارہ ا، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء

۲۰۵۔ مونتاج، لاہور، سہ ماہی، شمارہ ۳۰، ستمبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء

۲۰۶۔ مونتاج، لاہور، سہ ماہی، شمارہ ۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء

۲۰۷۔ مونتاج، لاہور، سہ ماہی، شمارہ ۹۰، اپریل تا جون ۲۰۱۰ء

۲۰۸۔ نقوش، لاہور، سہ ماہی، شخصیات نمبر، شمارہ ۴۹، ۵۰

۲۰۹۔ ہماری زبان، نئی دہلی، سہ ماہی، دسمبر ۲۰۰۷ء تا جنوری ۲۰۰۸ء

روزنامے

۲۱۰۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲؍جولائی ۱۹۶۲ء

۲۱۱۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲۴؍جولائی ۱۹۶۲ء

۲۱۲۔ امروز، لاہور، روزنامہ، یکم جنوری ۱۹۷۲ء

۲۱۳۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۴؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۱۴۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۷؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۱۵۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۸؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۱۶۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲۰؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۱۷۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲۲؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۱۸۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲۴؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۱۹۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲۶؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۲۰۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۳۰؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۲۱۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۳۱؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۲۲۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۳؍جون ۱۹۷۲ء

۲۲۳۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۹؍اکتوبر ۱۹۷۲ء

۲۲۴۔ امروز، لاہور، روزنامہ، یکم نومبر ۱۹۷۲ء

۲۲۵۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۵؍نومبر ۱۹۷۲ء

۲۲۶۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۶؍نومبر ۱۹۷۲ء

۲۲۷۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۷؍نومبر ۱۹۷۲ء

۲۲۸۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۰؍نومبر ۱۹۷۲ء

۲۲۹۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۴؍دسمبر ۱۹۷۲ء

۲۳۰۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۰؍مئی ۱۹۷۳ء

۲۳۱۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۶؍مئی ۱۹۷۳ء

۲۳۲۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲۴؍مئی ۱۹۷۳ء

۲۳۳۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۷؍نومبر ۱۹۷۳ء

۲۳۴۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۲۱؍نومبر ۱۹۷۳ء

۲۳۵۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۴؍مئی ۱۹۷۴ء

۲۳۶۔ امروز، لاہور، روزنامہ، ۱۲؍مئی ۱۹۷۴ء

۲۳۷۔ ایکسپریس، لاہور، روزنامہ، ۱۳؍جولائی ۲۰۰۶ء

۲۳۸۔ جنگ، کراچی، روزنامہ، ۱۹؍اکتوبر ۱۹۷۴ء

۲۳۹۔ جنگ، کراچی، روزنامہ، ۳؍مارچ ۱۹۷۸ء

۲۴۰۔ جنگ، کراچی، روزنامہ، ۲۸؍مارچ ۱۹۷۸ء

۲۴۱۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۱۸؍مئی ۱۹۷۲ء

۲۴۲۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۱۹؍اکتوبر ۱۹۷۲ء

۲۴۳۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۱۰؍مئی ۱۹۷۳ء

۲۴۴۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۱۶؍مئی ۱۹۷۳ء

۲۴۵۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۲۶؍مئی ۱۹۷۳ء

۲۴۶۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۷؍نومبر ۱۹۷۳ء

۲۴۷۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۲۱؍نومبر ۱۹۷۳ء

۲۴۸۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۴؍مئی ۱۹۷۴ء

۲۴۹۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۱۲؍مئی ۱۹۷۴ء

۲۵۰۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۲۵؍نومبر ۱۹۹۳ء

۲۵۱۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۱۳؍جولائی ۲۰۰۶ء

۲۵۲۔ جنگ، لاہور، روزنامہ، ۱۴؍جولائی ۲۰۰۶ء

۲۵۳۔ حریت، کراچی، روزنامہ، ۳؍مارچ ۱۹۷۸ء

۲۵۴۔ حریت، کراچی، روزنامہ، ۱۹؍اکتوبر ۱۹۷۴ء

غیر مطبوعہ مقالات

۲۵۵۔ بشریٰ شیرازی، سناٹا از احمد ندیم قاسمی کا فکری وفنی جائزہ، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء۔۲۰۰۷ء

۲۵۶۔ ثمرین کوثر، احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد، ۲۰۰۶ء۔۲۰۰۸ء

۲۵۷۔ رابعہ اختر، احمد ندیم قاسمی کے نسوانی کرداروں کا جائزہ، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۵۸۔ شازیہ اسلم، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کی عکاسی، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۲۰۰۴ء۔۲۰۰۶ء

۲۵۹۔ عابدہ عباس، ذخیرہ نقوش میں احمد ندیم قاسمی کے خطوط کی تدوین، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۶ء۔۲۰۰۸ء

۲۶۰۔ غلام حسین ورک، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

مکاتیب

۲۶۱۔ صمد انصاری از انگہ، محررہ ۲/مارچ ۱۹۴۵ء

۲۶۲۔ محمد طفیل (مدیر نقوش) از انگہ، محررہ ۲۴/اگست ۱۹۴۴ء مملوکہ جاوید طفیل

۲۶۳۔ محمد طفیل (مدیر نقوش) از انگہ، محررہ ۱۶/مارچ ۱۹۴۵ء، مملوکہ جاوید طفیل

استفسارات راقم الحروف

۲۶۴۔ ارشاد احمد (ملازم) بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۲۴ر نومبر ۲۰۱۰ء

۲۶۵۔ اشرف جاوید (دوست قاسمی) بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۲۷ر جنوری ۲۰۰۹ء

۲۶۶۔ اشرف جاوید (دوست قاسمی) بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۱۰ر جون ۲۰۱۰ء

۲۶۷۔ امجد اسلام امجد (دوست قاسمی) بمقام اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور، مورخہ ۳۰ر مئی ۲۰۱۰ء

۲۶۸۔ انیس ناگی (نقاد) بمقام الحمرا آرٹ کونسل لاہور، مورخہ ۲۷ر اکتوبر ۲۰۰۹ء

۲۶۹۔ بشیر موجد (مصور) بمقام رہائش گاہ، مکان نمبر ۵۴، F-A بلاک واپڈا ٹاؤن لاہور، مورخہ ۱۳ر اکتوبر ۲۰۱۰ء

۲۷۰۔ بشیر موجد (مصور) بمقام رہائش گاہ، مکان نمبر ۵۴، F-A بلاک واپڈا ٹاؤن لاہور، مورخہ ۲۸ر دسمبر ۲۰۱۰ء

۲۷۱۔ خالد احمد (دوست قاسمی) بمقام دفتر بیاض ملتان روڈ لاہور، مورخہ ۲۸ر اپریل ۲۰۰۹ء

۲۷۲۔ خالد احمد (دوست قاسمی) بمقام دفتر بیاض ملتان روڈ لاہور، مورخہ ۱۵ر اپریل ۲۰۰۹ء

۲۷۳۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، بمقام گورنمنٹ کالج لاہور، مورخہ ۲۸ر جون ۲۰۱۰ء

۲۷۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر (نقاد) بمقام الجودت، مکان نمبر ۵۶۹، گلی نمبر ۱۷، جہانزیب بلاک، اقبال ٹاؤن لاہور، مورخہ ۲ر نومبر ۲۰۱۰ء

۲۷۵۔ شہزاد احمد (شاعر و نقاد) بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۲۴ر نومبر ۲۰۱۰ء

۲۷۶۔ عبدالغفار (ڈرائیور) بمقام مجلس ترقی ادب لاہور، مورخہ ۲۴ر نومبر ۲۰۱۰ء

۲۷۷۔ عطاء الحق قاسمی، بمقام دفتر معاصر، وارث روڈ لاہور، مورخہ

۲۷۸۔ مظہر محمود شیرانی، بمقام شعبہ فارسی، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور، مورخہ ۲۱ر جولائی ۲۰۱۱ء

۲۷۹۔ منصورہ احمد (قاسمی کی منہ بولی بیٹی) بمقام ۵۷۸ بی بلاک، جوہر ٹاؤن لاہور، مورخہ ۱۰ر اگست ۲۰۱۰ء

۲۸۰۔ منصورہ احمد (قاسمی کی منہ بولی بیٹی) بمقام ۵۷۸ بی بلاک، جوہر ٹاؤن لاہور، مورخہ ۱۱ر جولائی ۲۰۱۰ء

۲۸۱۔ ناہید ندیم، ڈاکٹر (دختر قاسمی) بمقام رہائش گاہ چوہدری کالونی، 15-A سمن آباد لاہور، مورخہ ۱۴ر جون ۲۰۰۱ء

۲۸۲۔ ناہید ندیم، ڈاکٹر (دختر قاسمی) بمقام رہائش گاہ مکان نمبر ۲۵۱، بلاک نمبر F-4 واپڈا ٹاؤن لاہور، مورخہ ۲۸ر دسمبر ۲۰۱۰ء

۲۸۳۔ نجیب احمد (دوست قاسمی) بمقام الحمرا آرٹ کونسل لاہور، مورخہ ۱۰ر جون ۲۰۱۱ء

۲۸۴۔ نعمان ندیم (صاحب زادہ قاسمی) بمقام غالب کالونی، سمن آباد نزد ندیم شہید روڈ لاہور، مورخہ ۲۸ر دسمبر ۲۰۱۰ء

انگریزی کتب

285- Afsar Sajid, Muhammad, Profiles and Dialogues, Abdul Jabbar, 2005.

286- Afshan Farooqi, Mehr, The Oxford India Anthology of Modern Urdu Literature, Oxford University Press, 2008.

287- Baidar Bakht, Perveen Shakir, Selected Poems of Ahmad Nadeem Qasmi, Pakistan Academy of Letters, Islamabad, 1995.

288- Farooq Hassan, The Rest House, Katha Publishers, New Delhi, year of publication unknown.

289- Sadiq, Muhammad, A History of Urdu Literature, Oxford University Press, New York, Delhi, Second edition, 1985.

290- Sadiq, Muhammad, Twentieth Century of Urdu Literature, Royal Book Company, 1983.

291- Sajjad Sheikh, Selected Short Stories of Ahmad Nadeem Qasmi, National Book Foundation, Islamabad, 1996.

292- Sajjad Sheikh, Selected Poems of Ahmad Nadeem Qasmi, Alhamra Publishing Islamabad, First edition, 2004.

AHMAD NADEEM QASMI KI NASR NIGARI KA TANQEEDI JAIZA

THESIS SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF
DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN
URDU
Session : 2005 — 2011

BY

SABINA AWAIS

Supervisor

DR. MUHAMMAD SALEEM MALIK

PROFESSOR DEPARTMENT OF URDU

ORIENTAL COLLEGE, UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE.

2011